Khawateen Digest July 2018

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

معزز قارئین آپ سے التماس ہے www.urdusoftbooks.com پر آپ حضرات کے لیے مسلسل اچھی اچھی کُتب فراہم کرنے کے لیے کوشاں رہتے ہیں جس کے لیے وقت اور رقم دونوں صرف ہوتے ہیں جس کی غرض سے ہماری اِس ویب سائٹ کچھ سپانسر اشتہارات لگائے گئے ہیں جب ویب سائٹ وزٹرز اُن اشتہارات میں سے کسی اشتہار پر کلک کرتے ہیں تو ویب سائٹ کو تھوڑی سی آمدن حاصل ہوتی ہے، یہ آمدن ویب سائٹ کے اخراجات کو برداشت کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے ۔اس لیے آپ حضرات سے گزارش ہے کہ اپنے Google Chrome یا Mozilla Firefox کی Adblocker Extension کو Pause کر دیں یا صرف ہماری ویب سائٹ کے لیے Pause کر دیں۔ نیچے نظر آنے والی تصویر میں دکھایا گیا ہے کہ Adblocker کے Pause ہونے یا انسٹال نہ ہونے کی صورت میں اشتہارات **Green Box** والی جگہ پر ظاہر ہوں گے۔

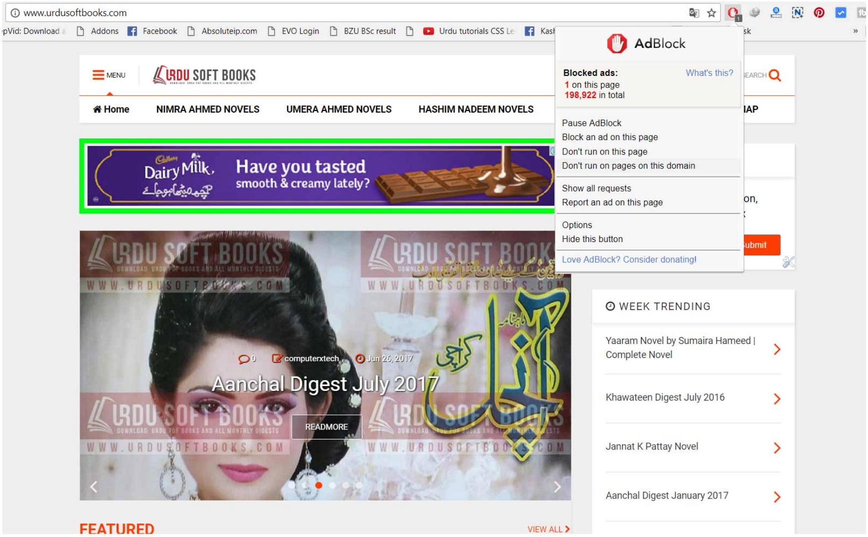

Click Here to Visit UrduSoftBooks.com

خواتین ڈائجسٹ

بانی و مدیر اعلیٰ ــــ محمود ریاض

مدیرہ ــــ نادرہ خاتون

مدیر ــــ آذر ریاض

نائب مدیرہ ــــ رضیہ جمیل

مدیر خصوصی ــــ امت الصبور

بلقیس بھٹی

نفسیات ــــ عدنان

اشتہارات ــــ خالد جیلانی

قانونی مشیر ــــ نورالدین سرکی اینڈ کمپنی

ایڈوکیٹس اینڈ لیگل کونسلرز

خط و کتابت کا پتہ

خواتین ڈائجسٹ

37- اردو بازار کراچی

MEMBER APNS CPNE

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

کہنی سُنی — مدیرہ — 14
کرن کرن روشنی — ادارہ — 15
ہمارے نام — نادرہ خاتون — 272

آپ سے کیا پردہ

ڈھکریاں — انشا جی — 20

خاتون کی ڈائری

میری ڈائری سے — امت الصبور — 268

مجھ سے ملئے

باتیں نعمان سمیع سے — شاہین رشید — 22

انٹرویو

قیصو حیات سے ملاقات — شاہین رشید — 27
خاموشی کو زباں ملے — ادارہ — 32

ناول

حاصل — نمرہ احمد — 158

مکمل ناول

یہ کوئی اور کہانی — فاخرہ جبیں — 36
پیپل کے پتوں پر — فرزانہ کھرل — 78
نسخہ ہائے وفا — نعیمہ ناز — 120
میں اور تم — صدف ریحان گیلانی — 212

ناولٹ

ریشم کہانی — افراح سکندر — 190

افسانے

آئینہ — سنیعہ عمیر — 149
ہم کہاں جا رہے ہیں — کاشفہ حسین — 116
سبق — شازیہ جمال طارق — 70
ہمارے یہ رشتے — طاہرہ فرد عبداللہ — 205

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ----- 700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ ---- 6000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا --- 7000 روپے
subscriptions@khawateendigest.com

ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے پرچوں ماہنامہ شعاع اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ٹی وی چینل پہ ڈراما، ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

نظمیں غزلیں

غزل، فیضان سروری 263
غزل، ڈاکٹر عزیزہ انجم 262
نظم، اعتبار ساجد 263
غزل، فراق گورکھپوری 262

رنگا رنگ پھول

رنگا رنگ سلسلہ، شگفتہ جاہ 264
خبریں ویریں، واصفہ سہیل 279

میری بیاض سے

آپ کی بیاض سے، خالدہ جیلانی 267

پکوان

موسم کے پکوان، خالدہ جیلانی 286
آپ کا باورچی خانہ، قرۃ العین انصاری 282

بیوٹی بکس

بیوٹی بکس کے مشورے، امت الصبور 290

نفسیات

نفسیاتی ازدواجی الجھنیں، عدنان 288

جولائی 2018
جلد 46 شمارہ 3
قیمت 70 روپے

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872
Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com

Download These Beautiful PDF Books

Click on Titles to Download

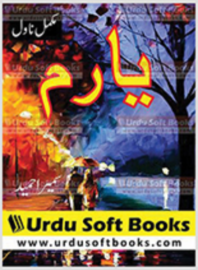

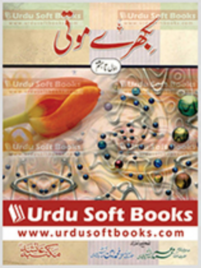

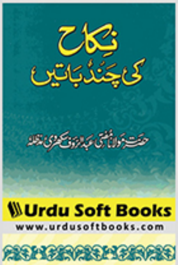

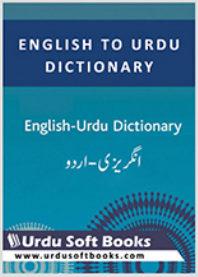

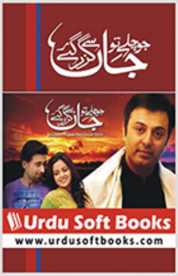

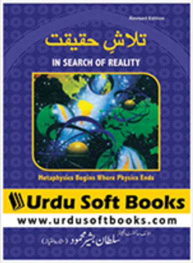

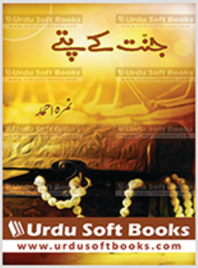

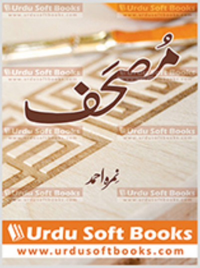

Download These Beautiful PDF Books

Click on Titles to Download

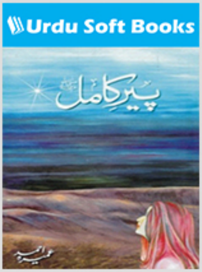

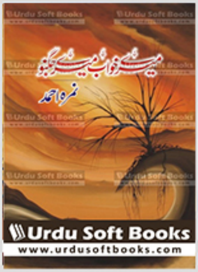

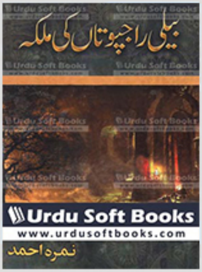

Download These Beautiful PDF Books

Click on Titles to Download

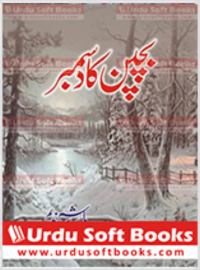

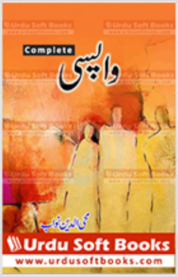

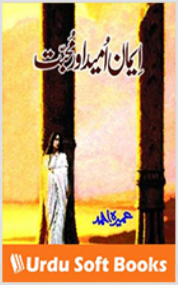

مُدیر

کہی سُنی

خواتین ڈائجسٹ کا جولائی کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

کچھ دن، کچھ تاریخیں قوموں کے لیے بہت اہم ہوتی ہیں۔ ان میں کیے گئے فیصلے قوموں کی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ان کی تاریخ کو بدلنے کی طاقت رکھتے ہیں۔

جمہوری نظام میں انتخابات کا دن بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس دن عوام اپنے نمائندے منتخب کر کے پارلیمنٹ میں بھیجتے ہیں اور وہ آئندہ پانچ سال کے لیے ملک کے سربراہ کا انتخاب کرتے ہیں۔

2013ء میں جب انتخابات منعقد ہوئے تو ملکی افق پر دو بڑے مسائل تھے۔ امن و امان کا مسئلہ اور توانائی کا بحران۔ دہشت گردی، بم دھماکے شدت اختیار کر چکے تھے۔ بجلی کی عدم فراہمی سے صنعتیں بند ہو رہی تھیں۔ سی این جی اسٹیشن پر گاڑیوں کی لمبی لمبی قطاریں نظر آتی تھیں۔

اس وقت جو منظر نامہ ہے اس میں اگرچہ سب کچھ بہت اچھا نہیں ہے لیکن صورت حال میں بڑی حد تک بہتری نظر آ رہی ہے۔ گزرے پانچ سال کے دوران نقل و حمل اور مواصلات کا انفرا سٹرکچر واضح طور پر بہتر ہوا ہے۔ لوڈ شیڈنگ تقریباً ختم ہو گئی۔ سی این جی کے حصول کے لیے گاڑیوں کی لمبی لمبی قطاریں نظر نہیں آتیں۔ بم دھماکوں اور دہشت گردی میں نمایاں کمی ہوئی ہے۔ سب سے بڑھ کر عروس البلاد کراچی کا امن لوٹ آیا ہے۔ اگر جمہوری عمل اسی تسلسل سے جاری رہا تو آگے بھی ملک کے لیے خوش آئند امکانات نظر آ رہے ہیں۔

دنیا میں کسی قوم کو اپنا وجود منوانے اور اسے قائم رکھنے کے لیے اخلاق و کردار بہت معنی رکھتے ہیں۔ عوام کے مزاج، اخلاق اور کردار کی تشکیل میں اس ملک کے سربراہ کا بہت بڑا حصہ ہوتا ہے۔ ملک کا سربراہ اور اس کے مشیر وزیر ہی قوم کا کردار بناتے ہیں اور ان کا انتخاب عوام کے فیصلے کا مرہونِ منت ہوتا ہے۔

ایک بار پھر انتخاب آپ کے ہاتھ میں ہے۔ ہر قسم کے لسانی، صوبائی، برادری اور رشتہ داری کے تعصب سے بالاتر ہو کر اپنے ملک کے لیے، اپنے اور اپنی آنے والی نسلوں کے بہتر مستقبل کے لیے نیک، باعمل اور باکردار قیادت کا انتخاب کریں۔ پاکستان میں پڑھے لکھے لوگوں کی اکثریت اپنا حق رائے دہی استعمال ہی نہیں کرتی۔ وہ الیکشن کے دن کو عام تعطیل کا دن سمجھتے ہیں۔ یہ انتہائی حیرت کی بات ہے کہ ہم اپنے حکمرانوں پر تنقید تو کرتے ہیں لیکن جب ان کے انتخاب کا موقع آتا ہے تو لاتعلقی کا اظہار کرتے ہیں۔

دعا ہے کہ انتخابات کا عمل پرامن طور پر انجام پائے اور آنے والی قیادت ملک و قوم کے لیے بہتر ثابت ہو۔

قارئین کے لیے خوش خبری

آبِ حیات کے بعد قارئین کی فرمائش تھی کہ عمیرہ احمد خواتین ڈائجسٹ کے لیے نیا ناول لکھیں۔ آپ سب کی خواہش کو مدِنظر رکھتے ہوئے آئندہ ماہ یعنی اگست کے شمارے میں عمیرہ احمد کا نیا ناول "الف" شروع کیا جا رہا ہے۔

اس ناول کے بارے میں عمیرہ احمد کہتی ہیں۔

"الف" آبِ حیات کے بعد میرا اگلا ناول ہے جو آبِ حیات کی طرح ضخیم اور طویل نہیں ہے لیکن آج کے انسان کو اس دُنیاوی زندگی میں درپیش چیلنجز کا احاطہ کرتا ہے۔

شہرِ ذات کے بعد میں نے ایک بار پھر کسی ناول کو اللہ تعالیٰ کے نام کیا ہے اور میں امید کرتی ہوں کہ

میرے دل سے نکلنے والی یہ تحریر آپ کے دل کو چھو لے گی۔

اس شمارے میں،

- فائزہ جبیں کا مکمل ناول۔ یہ کوئی اور ہی کہانی ہے، ، نعیمہ ناز کا مکمل ناول۔ نسخۂ ہائے وفا،
- فرزانہ کھرل کا مکمل ناول۔ پیپل کے پتوں پر، ، صدف ریحان گیلانی کا مکمل ناول۔ میں اور تم،
- ریشم کہانی۔ افراح سکندر کا ناولٹ، ، نمرہ احمد کا ناول۔ حالم،
- شازیہ جمال طارق، کاشمہ جبیں، سنیعہ عمیر، طاہرہ فردوس عبداللہ کے افسانے،
- ناول نگار، ڈراما نگار قیصرہ حیات سے ملاقات، ، ٹی وی فنکار نعمان سمیع سے باتیں،
- کرن کرن روشنی۔ احادیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ، ، نفسیاتی ازدواجی الجھنیں اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

خواتین کا جولائی کا شمارہ آپ کو کیسا لگا؟ اپنی رائے سے ضرور نوازیے گا۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے، اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

قاضی کی ذمہ داری

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''جسے لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنے والا (جج) مقرر کیا گیا، اسے (گویا) بغیر چھری کے ذبح کر دیا گیا۔'' (ابوداؤد)

فوائد و مسائل:

1۔ لوگوں کے جھگڑوں کا فیصلہ کرنا ایک اہم ذمہ داری ہے لیکن یہ بہت نازک ذمہ داری ہے کیونکہ صحیح فیصلوں سے معاشرے میں امن و سکون قائم رہتا ہے اور غلط فیصلوں کا نتیجہ بدامنی اور فساد کی صورت میں سامنے آتا ہے۔

2۔ غلط فیصلے سے کسی بے گناہ کی جان بھی جا سکتی ہے اور ایک آدمی کا حق دوسرے کو مل سکتا ہے، اس لیے جج کو اپنی اس ذمے داری کا احساس کرتے ہوئے صحیح فیصلے تک پہنچنے کی زیادہ سے زیادہ کوشش کرنا ضروری ہے۔

3۔ ''بغیر چھری کے ذبح ہونے'' سے اس منصب کی نزاکت اور اس فریضے کی انجام دہی کی مشکل کی طرف اشارہ ہے، اس کے باوجود معاشرے میں اس منصب کا وجود ضروری ہے، اس لیے جس شخص میں صلاحیت موجود ہو، اسے یہ ذمہ داری قبول کرنا اور اسے انصاف کے ساتھ کما حقہ ادا کرنا ضروری ہے۔

منصب مانگنا

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''جس نے قاضی کا منصب طلب کیا، وہ اپنی جان کے حوالے کر دیا جاتا ہے، اور جسے اس (منصب کو قبول کرنے) پر مجبور کیا گیا، ایک فرشتہ نازل ہو کر اس کی رہنمائی کرتا ہے۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے،

انہوں نے فرمایا: ''مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن روانہ فرمایا تو میں نے عرض کیا۔

''اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! آپ مجھے روانہ فرما رہے ہیں کہ ان کے فیصلے کروں، حالانکہ میں جوان ہوں (تجربہ کار نہیں)، مجھے تو معلوم نہیں فیصلہ کیسے کیا جاتا ہے؟''

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: ''آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے سینے پر ہاتھ مارا اور فرمایا۔

''اے اللہ! اس کے دل کو ہدایت دے اور اس کی زبان کو (صحیح بات پر) قائم فرما۔''

وہ فرماتے ہیں: اس کے بعد مجھے دو شخصوں کے درمیان فیصلہ کرتے وقت کبھی شک پیش نہیں آیا۔'' (ابوداؤد)

فوائد و مسائل:

1۔ کسی منصب کے لیے اس شخص کو مقرر کرنا چاہیے جس میں اس سے متعلقہ فرائض انجام دینے کی اہلیت موجود ہو۔

2۔ اگر ایک شخص محسوس کرے کہ وہ ان فرائض کو ادا کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا جو اس کے ذمے لگائے جا رہے ہیں تو اسے حق حاصل ہے کہ وہ منصب قبول کرنے سے انکار کر دے۔

3۔ اپنے بزرگ یا سربراہ کے سامنے اپنی کمزوری یا مشکلات بیان کرنا حکم عدولی میں شمار نہیں ہوتا۔

4۔ جس شخص کو نئی ذمہ داری سونپی جائے، اس کی مناسب رہنمائی کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے حق میں دعا کرنا بھی اس کے لیے بہت مفید ہے۔

غلط فیصلے کا عذاب

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''جو بھی قاضی لوگوں کے درمیان فیصلے کرتا ہے، قیامت کے دن وہ اس حال میں حاضر ہوگا کہ ایک فرشتے نے اسے گُدّی سے پکڑ رکھا ہوگا، پھر آسمان کی طرف سر اٹھائے گا، اگر اللہ نے فرمایا: اسے پھینک دے تو فرشتہ اسے (جہنم کے) گڑھے میں پھینک دے گا (جس میں وہ) چالیس سال تک (گرتا چلا جائے گا۔)'' (مسند احمد)

نا انصافی کرنا

حضرت عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ قاضی کے ساتھ ہوتا ہے جب تک وہ ظلم (بے انصافی) نہ کرے۔ جب وہ ظلم کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے اس کے نفس کے سپرد کر دیتا ہے۔'' (طبرانی)

فوائد و مسائل:

1۔ جب انسان صحیح کام کی نیت رکھتا ہو تو اسے اللہ کی طرف سے توفیق اور مدد حاصل ہوتی ہے۔ اسی طرح قاضی اگر صحیح فیصلہ کرنا چاہے تو اللہ تعالیٰ اس کی رہنمائی فرماتا ہے اور اس کے لیے حقیقت تک پہنچنا آسان ہو جاتا ہے، اگر نیک نیتی کے باوجود غلطی بھی ہو جائے تو وہ غلطی معاف ہے۔

2۔ جب قاضی کا ارادہ بے انصافی کرنے کا ہو تو اللہ کی تائید و نصرت حاصل نہیں رہتی۔ اس کے نتیجے میں شیطان کو داؤ لگانے کا موقع مل جاتا ہے اور قاضی غلط فیصلہ کر کے ظلم کا مرتکب ہو جاتا ہے۔

3۔ ہر اچھا کام اللہ کی توفیق و عنایت سے ہوتا ہے، اس لیے فرائض کی انجام دہی میں اللہ سے مدد مانگتے رہنا چاہیے۔

رشوت

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''رشوت دینے والے اور رشوت لینے والے پر اللہ کی لعنت ہے۔'' (ابوداؤد)

فوائد و مسائل:

1۔ رشوت دینے کی ضرورت تب ہی پیش آتی

ہے جب کوئی شخص غلط موقف پر ہونے کے باوجود اپنے حق میں فیصلہ کرانا چاہتا ہے۔اس طرح رشوت دینے والا حق دار کا حق بھی مارتا ہے اور قاضی کو بھی گناہ پر آمادہ کرتا ہے۔ یہ دگنا گناہ اسے اللہ کی رحمت سے محروم کردیتا ہے۔

2۔ رشوت لینے والا دنیا کے معمولی سے مفاد کے لیے ایک بے گناہ پر ظلم کرتا ہے اور اس سے اس کا حق چھین لیتا ہے، حالانکہ اسے مقرر ہی اس لیے کیا گیا ہے کہ دوسروں کو ظلم سے روکے۔ اس لحاظ سے اس کا گناہ دوسرے ظالم سے کہیں زیادہ سنگین ہو جاتا ہے، اس لیے وہ بھی اللہ کی رحمت سے محروم ہو جاتا ہے۔

3۔ لعنت کا مطلب اللہ کی رحمت سے محروم ہونا اللہ کا کسی بندے کو اس کے کسی جرم کی وجہ سے اپنی رحمت سے محروم کرنا ہے۔ لعنت کا مطلب کسی کو یہ بد دعا دینا بھی ہے کہ وہ اللہ کی رحمت سے محروم ہو جائے۔

4۔ (راشی) رشوت دینے والے کو (مرتشی) رشوت لینے والے کو اور (رائش) ان دونوں کے درمیان معاملہ طے کرانے والے کو کہتے ہیں۔ یہ سب بڑے گناہ گار ہیں۔

صحیح فیصلہ کرنے کی کوشش کرے

حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ آپ نے فرمایا:

''جب فیصلہ کرنے والا فیصلہ کرے اور اجتہاد کر کے صحیح بات تک پہنچ جائے تو اس کے لیے دو ثواب ہیں۔ اور جب فیصلہ کرے لیکن اجتہاد کرنے میں اس سے غلطی ہو جائے تو اس کے لیے ایک ثواب ہے۔''

(بخاری)

یہی روایت ایک دوسری سند سے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔

فوائد و مسائل:

1۔ اجتہاد کے لفظی معنی کوشش کرنا ہیں۔ یہاں یہ مطلب ہے کہ دلائل و شواہد کی روشنی میں اخلاص کے ساتھ پیش آمدہ مسئلے میں صحیح موقف تک پہنچنے کے لیے پوری توجہ اور کوشش سے سوچ بچار کی جائے، اور یہ فیصلہ کرنے والے کا فرض ہے کہ اپنی طرف سے صحیح فیصلہ کرنے کی پوری کوشش کرے۔

2۔ اس کوشش اور اجتہاد کے نتیجے میں صحیح بات سمجھ میں آجانا اللہ کا فضل ہے، جس کے نتیجے میں حق دار کو اس کا حق مل جاتا ہے، یا مسئلہ پوچھنے والے کو صحیح مسئلہ معلوم ہو جاتا ہے اور مسلمان کو فائدہ پہنچانا ایک نیکی ہے، لہٰذا اجتہاد کرنے والے کو اس کا بھی ثواب ملتا ہے۔ یہ ثواب اللہ کی خاص رحمت ہے۔

3۔ جس شخص سے اجتہاد میں غلطی ہو جائے اور اس کے نتیجے میں کسی کو غلط مسئلہ بتایا جائے یا حق دار اپنے حق سے محروم ہو جائے تو اجتہاد کرنے والے قاضی یا عالم کو گناہ نہیں ہوگا کیونکہ اس نے صحیح بات کو سمجھنے کی پوری کوشش کی ہے، لہٰذا اسے اس کوشش کا ثواب بہر حال ملے گا۔

4۔ اگر بعد میں آنے والوں کو معلوم ہو جائے کہ عالم سے مسئلہ معلوم کرنے میں غلطی ہوئی ہے تو انہیں اپنی تحقیق کے مطابق عمل کرنا چاہیے اور غلطی کرنے والے عالم کے بارے میں حسن ظن رکھنا چاہیے کہ اس نے جان بوجھ کر غلط مسئلہ نہیں بتایا۔

قاضی تین قسم کے ہیں

حضرت ابو ہاشم رحمتہ اللہ سے روایت ہے کہ اگر حضرت عبداللہ بن بریدہ رحمتہ اللہ کی وہ حدیث نہ ہوتی جو انہوں نے اپنے والد (حضرت بریدہ بن حصیب اسلمی رضی اللہ عنہ) سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''قاضی تین (طرح کے) ہیں۔ دو جہنم میں جائیں گے اور ایک جنت میں۔ (ایک) وہ آدمی (ہے) جس نے حق معلوم کرلیا پھر اس کے مطابق

فیصلہ دیا تو وہ جنت میں جائے گا۔ (دوسرا) وہ آدمی (ہے) جس نے (حق سے) لاعلم ہوتے ہوئے لوگوں میں فیصلہ کیا، وہ جہنم میں جائے گا۔ (تیسرا) وہ آدمی (ہے) جس نے فیصلہ کرتے ہوئے ظلم سے کام لیا، وہ بھی جہنم میں جائے گا۔" (اگر یہ حدیث نہ ہوتی) تو ہم کہتے کہ قاضی جب اجتہاد سے کام لے (اپنی پوری کوشش کرے) تو وہ جنتی ہے۔
(ابوداؤد)

فوائد و مسائل:

1۔ جج کے لیے ضروری ہے کہ فیصلہ کرتے وقت اسے یقین ہو کہ صحیح بات یہ ہے، پھر اس کے مطابق فیصلہ کرے۔

2۔ سرسری سماعت کے بعد فیصلہ دے دینا، جب کہ معاملے کی پوری طرح چھان بین کر کے حق معلوم نہ کیا گیا ہو، جائز نہیں۔

3۔ جب یقین ہو جائے کہ حق فلاں فریق کا ہے، پھر فیصلہ دوسرے کے حق میں دے دیا جائے، یہ ظلم ہے اور اس کی سزا جہنم ہے۔ اس ناانصافی کی وجہ بعض اوقات کوئی وقتی دنیوی مفاد ہوتا ہے۔ یہ مفاد رشوت میں شامل ہے جس کی وجہ سے لعنت پڑتی ہے۔

4۔ اجتہادی غلطی معاف ہونے کے باوجود حق تبدیل نہیں ہوتا، اس لیے جب معلوم ہو جائے کہ غلطی ہو گئی ہے تو قاضی یا مجتہد کو اپنے پہلے فیصلے یا فتوے سے رجوع کر لینا چاہیے۔

غصے کی حالت میں فیصلہ کرنا

حضرت ابوبکرہ (نفیع بن حارث بن کلدہ ثقفی رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"قاضی دو آدمیوں کے درمیان فیصلہ نہ کرے جب کہ وہ غصے میں ہو۔" (بخاری)

فوائد و مسائل:

غصے کی حالت میں انسان کی ذہنی حالت درست نہیں رہتی اور جذبات کی وجہ سے معاملات کے تمام پہلوؤں پر غور کرنا ممکن نہیں رہتا، اس لیے خطرہ ہوتا ہے کہ اس حالت میں دیا ہوا فیصلہ درست نہیں ہو گا۔

جھوٹ بول کر مال حاصل کرنا

ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"تم میرے پاس اپنے تنازعات لے کر آتے ہو اور میں ایک انسان ہی ہوں۔ شاید کوئی شخص اپنی دلیل کو دوسرے کی نسبت بہتر طور پر بیان کر سکتا...... اور میں تو جو کچھ تم (فریقین اور گواہوں) سے سنتا ہوں اسی کے مطابق فیصلہ کرتا ہوں، لہٰذا جس کو میں اس کے بھائی کے حق میں سے کوئی چیز دے دوں تو وہ اسے نہ لے۔ میں تو اسے آگ کا ایک ٹکڑا دے رہا ہوں۔ قیامت کے دن وہ اسے لے کر حاضر ہو گا۔"
(بخاری)

فوائد و مسائل:

1۔ قاضی کو فریقین کے دلائل، گواہوں کی گواہی اور قرآن کی روشنی میں صحیح فیصلہ کرنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ اس کے باوجود اگر اس سے غلط فیصلہ ہو گیا تو اسے گناہ نہیں ہو گا۔

2۔ اگر ایک شخص کو معلوم ہے کہ اس معاملے میں میرا موقف درست نہیں لیکن قاضی اس کے حق میں فیصلہ دے دیتا ہے تو اس سے اصل حقیقت میں فرق نہیں پڑتا، لہٰذا اس کے لیے وہ چیز لینا جائز نہیں جسے قاضی اس کی قرار دے چکا ہے۔

3۔ اس حدیث کی روشنی میں علمائے کرام نے یہ اصول بیان فرمایا ہے: "قاضی کا فیصلہ ظاہراً نافذ ہوتا ہے، باطناً نہیں۔" اس کا یہی مطلب ہے کہ قاضی کے فیصلے سے کسی دوسرے کی چیز حلال نہیں ہو جاتی، مثلاً: اگر جھوٹے گواہوں کی مدد سے یہ فیصلہ لے لیا جائے کہ فلاں عورت سے نکاح ہو چکا ہے تو مرد کے لیے اس عورت کے ساتھ ازدواجی تعلقات قائم کرنا

جائز نہیں ہوگا۔ اگر وہ ایسا کرے گا تو زنا کا مرتکب ہو گا، اور قیامت والے دن اسے اس کی سزا ملے گی۔ اسی طرح اگر قاضی یہ فیصلہ کردے کہ فلاں عورت کو طلاق ہوچکی ہے جبکہ حقیقت میں مرد نے طلاق نہ دی ہو تو مرد اپنی اس بیوی سے ازدواجی تعلقات قائم رکھنے پر اللہ کے ہاں مجرم نہیں ہوگا۔

4۔ ناجائز طور پر حاصل کیا ہوا مال قیامت کے دن سزا کا باعث بھی ہوگا اور رسوائی کا سبب بھی، جب مجرم سب لوگوں کے سامنے اپنے جرم کے ثبوت سمیت موجود ہوگا اور اسے اس کے مطابق سرعام سزا ملے گی۔

5۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی شریعت کے احکام کے مطابق عمل کرنے اور فیصلہ کرنے کے مکلف تھے۔

6۔ کسی کے حق سے ٹکڑا کاٹ کر دینے کا مطلب یہ ہے کہ جتنا حق دار کا حق تھا اسے پورا نہیں دیا گیا بلکہ کچھ حصہ غلطی سے دوسرے کو دے دیا گیا۔ واللہ اعلم۔

جھوٹا دعوا کرنا

حضرت ابوذر (جندب بن جنادہ غفاری رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے، انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے:

''جو شخص اس چیز کا دعویٰ کرے جو اس کی نہیں تو وہ ہم میں سے نہیں، اسے اپنا ٹھکانا جہنم میں بنا لینا چاہیے۔''

فوائد و مسائل:

1۔ ''ہم میں سے نہیں۔'' کا مطلب یہ ہے کہ اس کا یہ عمل مسلمانوں کا عمل نہیں اور اس کا ایمان کامل نہیں۔

2۔ ''جہنم میں ٹھکانہ بنا لینا چاہیے۔'' کا مطلب یہ ہے کہ اسے یقین ہونا چاہیے کہ وہ جہنم میں جائے گا، لہٰذا اس سے بچنے کے لیے اسے اس گناہ سے اجتناب کرنا چاہیے۔ اور اگر یہ گناہ ہو گیا ہے تو حق دار کو اس کا حق واپس کر کے توبہ کر کے جہنم سے بچ جانا چاہیے۔

3۔ ارشاد نبوی ہے: ''جس نے گواہی دی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں، اللہ اسے (جہنم کی) آگ پر حرام کر دیتا ہے۔'' (صحیح مسلم، حدیث:۲۶) اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسے اس کے گناہوں کی سزا نہیں ملے گی بلکہ یہ مطلب ہے اسے جہنم میں ہمیشہ رہنے کا عذاب نہیں ہوگا۔

ظالم کی مدد

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جس نے کسی مقدمے میں ظلم میں (ظالم کی) مدد کی، وہ ہمیشہ اللہ کی ناراضی کا مستحق رہتا ہے حتیٰ کہ (اس گناہ سے) باز آجائے۔'' (ابوداؤد)

فوائد و مسائل:

1۔ لوگوں کے آپس کے اختلافات میں ہر شخص کو چاہیے کہ اس شخص کی حمایت کرے جس کا موقف درست ہو اور جو غلطی پر ہو اسے سمجھائے اور منع کرے۔

2۔ ظالم کی حمایت اور مدد کرنا بڑا گناہ ہے۔ حق کی حمایت میں دوستی یا رشتے داری کے تعلقات کو رکاوٹ نہیں بننے دینا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (النساء۴:۱۳۵)

''اے ایمان والو! تم انصاف کے لیے ڈٹ جانے والے اور اللہ کے لیے سچی گواہی دینے والے بن جاؤ، خواہ وہ تمہارے اپنے خلاف یا تمہارے والدین اور رشتے داروں کے خلاف ہو، معاملے کا فریق امیر ہو یا غریب، دونوں صورتوں میں تمہاری نسبت اللہ زیادہ ان کا خیر خواہ ہے، لہٰذا تم نفسانی خواہش کے پیچھے پڑ کر انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑو۔''

ڈگریاں بڑی نعمت ہیں

انشا جی

لاہور کے ایک اخبار میں ایک وکیل صاحب کے متعلق یہ خبر مشتہر ہوئی ہے کہ کوئی عالم دین کا سرمایہ علم وفضل اور دولت صبر وقرار اور آلات کاروبار لوٹ لے گیا ہے۔

تفصیل مال مسروقہ کی یہ ہے۔

ڈگری بی اے کی ایک ایل ایل بی کی، ایک کریکٹر سر ٹیفکیٹ بدیں مضمون کہ حامل سرٹیفکیٹ ہذا کبھی جیل نہیں گیا۔ اس پر ہر قسم کے مقدمے چلے لیکن یہ ہمیشہ بری ہوا۔ وکیل صاحب نے اعلان کیا ہے کہ یہ صاحب غلطی سے میری الماری کا تالا توڑ کر یہ سرٹیفکیٹ لے گئے ہوں یا سہواً خود ان کے پاس چلے گئے ہوں۔ وہ براہ کرم واپس کردیں۔ ان کو کچھ نہیں کہا جائے گا۔ اگر کوئی اور صاحب اس نابکار چور کو پکڑ کر لائیں تو خرچا آمدورفت بھی پیش کیا جائے گا۔

حلیہ یہ ہے۔ چور کا نہیں، سرٹیفکیٹوں کا کہ ان پر بندے کا نام لکھا ہے۔ گلشن علی ثمر قندی، سابق سوداگر شکر قندی، مقیم گوالمنڈی، بعض کم فہم ظاہر بین کہیں گے کہ ڈگری سے کیا ہوتا ہے وکیل صاحب! شوق سے کاروبار جاری رکھیں۔ وکالت علم وعقل بلکہ زبان سے کی جاتی ہے۔ ڈگری کوئی تعویذ تھوڑا ہی ہے کہ جس کے بازو پر باندھا وہ گونگا بھی ہے تو پٹ پٹ بولنے لگا۔ فصاحت کے بتاشے گھولنے لگا۔ لیکن ہماری سنیے تو ڈگری اور عہدہ دونوں کام کی چیزیں ہیں۔ بلکہ علم اور لیاقت کا نعم البدل ہیں۔

آناں راکہ ایں وہند، ان نہ وہند

تم نے منصب دار لوگوں کو دیکھا ہوگا کہ بظاہر بے علم معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن وقت آنے پر ادب اور آرٹ کے اسرار وغوامض پر ایسی مدبرانہ گفتگو کرتے ہیں کہ داناں اندراں حیراں بماند، جتنا بڑا عہدہ دار ہوگا۔ اتنی ہی وہ اونچی بات کرے گا۔ نیچے والوں کو خاطر میں نہ لائے گا۔ ڈگری کو بھی ہم نے اسی طرح لوگوں کے سر چڑھ کر بولتے دیکھا۔

ایک ہمارے مہربان ہیں اردو زبان وادب کے پروفیسر۔ ایک روز دست نگر کو دست نگر پڑھ رہے تھے اور استفادہ حاصل کرنا بول رہے تھے۔ ہم نے بڑے ادب سے ٹوکا۔ لیکن وہ بگھر گئے اور پوچھنے لگے۔

''کتنا پڑھے لکھے ہو تم؟''

ہم نے کہا۔'' کچھ بھی نہیں، بس حرف شناس ہیں۔ الف بے آتی ہے۔ گنتی بھی لکھ لیتے ہیں۔ اس پر وہ اندر سے فریم شدہ چوکھٹے اٹھا لائے۔ ان پر ایک ڈگری ایم اے کی تھی۔ دوسری پی ایچ ڈی کی۔ بولے۔'' اب کہو تمہارا کہا سند ہے یا ہمارا فرمایا ہوا؟''

اس دن پہلی بار ہمیں اپنی غلطی معلوم ہوئی۔ اب ہم بھی ریڈیو اور ٹیلی ویژن والوں کی طرح دست نگر، چشم دیدہ، دم زدن اور استفادہ حاصل کرتے ہیں بولتے اور لکھتے ہیں۔

ڈگری اور سرٹیفکیٹ کا چلن پرانے زمانے میں اتنا نہ تھا جیسا آج کل ہے۔ اس زمانے کے لوگ بیمار بھی سر ٹیفکیٹ کے بغیر ہوجایا کرتے تھے اور بعض اوقات تو شدت مرض سے مر بھی جایا کرتے تھے۔ اب کسی آدمی کی علالت کو خواہ سامنے پڑا ایڑیاں رگڑ رہا ہو۔ بلا سرٹیفکیٹ کے ماننا قانون کے خلاف ہے۔ پرانے زمانے میں لوگوں کے اخلاق بھی بلا سر ٹیفکیٹ شائستہ ہوا کرتے تھے۔ اب جس کے پاس کریکٹر سر ٹیفکیٹ نہیں، سمجھو کہ اس کا کچھ اخلاق نہیں۔ اس کی نیک چلنی مشتبہ۔ اب تو مرنے جینے کا انحصار بھی سرٹیفکیٹ پر ہے۔ سانس کی آمد وشد پر نہیں۔

آپ نے اس شخص کا قصہ سنا ہوگا۔ جو خزانے سے پنشن لینے گیا تھا۔ جون کی پنشن تو اسے مل گئی۔ کیونکہ اس ماہ کے متعلق اس کے پاس بقید حیات ہونے کا سرٹیفکیٹ تھا۔ لیکن مئی کی پنشن روک لی گئی کہ جب مئی میں زندہ ہونے کا سرٹیفکیٹ لاؤ گے، تب ادا کی جائے گی۔ اصول، اصول ہے۔ اس منطق سے تھوڑا ہی توڑا جاسکتا ہے کہ جو شخص جون میں زندہ ہے۔ اس کے مئی میں بھی زندہ ہونے کا غالب امکان ہے۔ باقاعدہ سر ٹیفکیٹ ہونا

چاہیے۔

عشق کاریست کہ بے آہ وفغاں نیز کنند......

وکیلوں کے لیے بے شک ڈگری کی پابندی ہے۔

اسی لیے وہ ڈگریاں چوری ہو جانے پر پریشان اور بے بس ہو جاتے ہیں۔ لیکن موکلوں اور گواہوں کو ان کے بغیر ہی ایسی لیاقت پیدا کرتے دیکھا ہے کہ ڈگری والا تیری قدرت کا تماشا دیکھے۔ آپ نے ان میر صاحب کا ذکر سنا ہے جو ہاتھ میں چھڑی، لیے پھندنے دار ٹوپی پہنے۔ بغل میں بستہ مارے کچہری کے احاطے میں گھومتے رہتے تھے کہ اگر لکھوائے کوئی ان کو خط تو ہم سے لکھوائے یعنی...... مناسب معاوضے پر گواہی دے کر حاجت مندوں کے آڑے وقت کام آتے تھے۔

ایک روز کی بات ہے کہ کوئی جائیداد کا مقدمہ عدالت میں تھا۔ مدعی کا وکیل تیار نہ تھا۔ اسے پوری امید تھی کہ آتے ہی تاریخ لے لے گا۔ لیکن مجسٹریٹ نے جانے کیوں اصرار کیا کہ سماعت آج ہی ہو گی۔ گواہ پیش کیے جائیں۔ ورنہ یک طرفہ ڈگری دیتا ہوں۔ وکیل صاحب بوکھلائے ہوئے باہر نکلے کہ میر صاحب دکھائی دیے۔ ان کی جان میں جان آئی۔ فوراً انہیں بازو سے پکڑ کر اندر لے گئے۔ مقدمہ سمجھنے سمجھانے کا تو وقت ہی نہ تھا۔ بس اتنی بھنک کان میں پڑی کہ کوئی خان بہادر رضا علی مر گئے ہیں۔ ان کی جائیداد کا قصہ ہے۔

یہ کون تھے...... کیا تھے...... جھگڑا کیا ہے...... کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ بہرحال پیش ہو گئے اور حلف اٹھا کر کٹہرے میں کھڑے ہو گئے۔ وکیل مخالف کو معلوم تھا کہ...... یہ بھاڑے کے ٹٹو ہیں۔ ابھی ان کے قدم اکھاڑ دوں گا...... جرح...... شروع کر دی۔

''میر صاحب...... آپ خان بہادر رضا علی مرحوم کو جانتے تھے؟''

میر صاحب نے فرمایا۔ ''اجی جاننا کیا معنی...... دانت کاٹی روٹی تھی۔ بڑی خوبیوں کے آدمی تھے۔ خدا مغفرت کرے۔ ان کی صورت ہمہ وقت آنکھوں کے آگے پھرتی ہے۔''

''کیا عمر تھی ان کی؟''

''بس چالیس اور اسی کے درمیان ہوں گے۔ بدن چور تھے اسی لیے صحیح اندازہ آج تک کوئی نہیں لگا سکا۔''

''اچھا یہ بتائیے کہ وہ لانبے تھے یا ناٹے۔''

میر صاحب نے کہا ''خوب لانبا قد تھا۔ لیکن از راہ خاکساری جھک کے چلتے تھے۔ اس لیے ناٹے معلوم ہوتے تھے۔''

وکیل نے دوسرا سوال داغا...... ''ان کی رنگت تو آپ بتا ہی سکتے ہیں۔ گورے تھے یا کالے؟''

میر صاحب نے کہا۔ ''خوب سرخ و سفید رنگت تھی۔ لیکن بیماری کے باعث جلد سنولا جاتی تھی تو کالے نظر آنے لگتے تھے۔''

وکیل نے ایک اور وار کیا۔ ''یہ بتائیے کہ داڑھی مونچھ رکھتے تھے یا صفاچٹ تھے۔''

میر صاحب ہنسے اور کہا۔ ''مرحوم کی طبیعت عجب باغ و بہار تھی۔ کبھی جی میں آیا تو مونچھیں رکھ لیں۔ وہ بھی کبھی پتلی، کبھی گچھے دار، داڑھی بھی چھوڑ دیتے تھے، خشخشی کبھی یک مشت۔ کبھی یہ لمبی ناف تک اور پھر ترنگ آئی تو سب کچھ منڈا صفاچٹ ہو جاتے تھے۔''

''اچھا آپ نے ان کی داڑھی دیکھی ہو گی۔ سفید ہوتی تھی یا کالی۔''

میر صاحب نے کہا۔ ویسے تو سفید ہی ہوتی تھی لیکن جب خضاب لگا لیتے تھے تو بالکل کالی نظر آتی تھی۔ ان کی طبیعت ایک رنگ پر نہیں تھی۔ وکیل صاحب! کہہ دیا نا کہ باغ و بہار آدمی تھے۔''

وکیل صاحب نے کہا۔ ''اچھا یہ فرمائیے کہ ان کا انتقال کس مرض میں ہوا۔''

میر صاحب نے ایک لمبی آہ بھری اور کہا۔ ''رونا تو یہی ہے کہ آخر تک کچھ تحقیق نہ ہوئی۔ ڈاکٹر کچھ کہتے تھے۔ حکیم کچھ...... مرگ چو آید طبیب ابلہ شود ہم...... تو یہی کہیں گے کہ ان کو مرض الموت تھا۔ ہائے! کیسی نورانی صورت تھی ہمارے خان بہادر صاحب کی۔ ان کی یاد آتی ہے تو سینے میں تیر سا لگتا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ ڈس ڈس رونے بھی لگے۔

مجسٹریٹ نے کہا۔ ''اچھا'' اب دوسرے مقدمے کی باری ہے۔ اگلی بدھ کو دوسرے گواہان پیش ہوں۔''

ڈراما سیریل "ماں صدقے" کا نومی

باتیں نعمان سمیع سے

شاہین رشید

1۔ "اصلی نام؟"
"نعمان سمیع"
2۔ "پیار کا نام؟"
"کافی سارے ہیں۔ "نومی"، "مانی"، اور "شاہ میر"۔ جس کا جو دل چاہتا ہے، پیار سے پکار لیتا ہے۔"
3۔ "تاریخ پیدائش/شہر؟"
"3 مئی/ کراچی"
4۔ "قد/ستارہ؟"
"ستارہ "ٹورس" ہے جبکہ قد کی لمبائی کبھی چیک نہیں کی لیکن لگتا ہے کہ 5 فٹ 8 انچ ہوگی۔"
5۔ "بہن بھائی/ آپ کا نمبر؟"
"دو بہنیں اور میں۔ میں گھر میں بڑا ہوں۔"
6۔ "تعلیم؟"
"میں نے اے سی سی اے کیا ہے۔ یو کے سے اکاؤنٹنگ میں ڈگری لی۔ اور پھر ایک آڈٹ فرم میں چھ سال جاب بھی کی بہ حیثیت آڈیٹر کے۔"
7۔ "شادی ہوئی؟"
"جی نہیں......ابھی نہیں ہوئی۔"
8۔ "شوبز میں آمد؟"
"ایکٹنگ کورس کیا، پھر آڈیشنز دیے۔ کامیاب ہوا۔ اور سب کام گھر والوں کی اجازت سے کیے۔"
9۔ "پہلا ڈرامہ؟"
"دلدل"
10۔ "وہ ڈراما جس نے شہرت دی۔"
"ماں صدقے" نومی کے کردار نے۔
11۔ "پہلی کمائی/ کہاں خرچ کی؟"
"جب لندن میں تعلیم حاصل کر رہا تھا تو میکڈونلڈ میں جاب کی تھی اور پہلی کمائی میں جو کچھ ملا دوستوں کے ساتھ مل کر کھا پی لیا۔ پہلی کمائی 18 سال کی عمر میں کی۔"
12۔ "شوبز کی بڑی برائی؟"
"ہر شعبے میں اچھائیاں، برائیاں ہوتی ہیں۔ اس میں بھی ہیں تو کوئی حیرانی کی بات نہیں۔"
13۔ "آپ کی صبح کب ہوتی ہے؟"
"جب بھی سوتا ہوں' اس کے سات' آٹھ گھنٹے کے بعد میری صبح ہوتی ہے۔"
14۔ "آنکھ کھلتے ہی کیا دل چاہتا ہے؟"
"کہ پھر سے سو جاؤں۔"
15۔ "دنیا میں تبدیلی لانے کو کہا جائے؟"
"مسلمانوں کے بارے میں جو ایک تصور

بنادیا گیا ہے، اسے بدلنا چاہیے۔"
16۔ "اچھی یا بری خبر سب سے پہلے کس کو سناتے ہیں؟"
"اچھی خبر گھر والوں کو اور بری کے لیے کوشش کرتا ہوں کہ کسی کو نہ سناؤں۔"
17۔ "خود میں کیا تبدیلی لانا چاہتے ہیں؟"
"بہت ساری تبدیلیاں لانا چاہتا ہوں۔"
18۔ "فخر کا کوئی لمحہ؟"
"جب جب زندگی میں کوئی کامیابی حاصل کی، مثلاً جب ڈگری ملی، جب جاب ملی اور جب پروموشن ملی۔"
19۔ "بچپن کی کوئی بُری عادت جو ابھی بھی ہے؟"
"جب کچھ کرنے کی ضد آجائے اور جب تک وہ کام نہ کرلوں، دھیان ادھر ہی لگا رہتا ہے۔"
20۔ "ضدی ہیں؟"
"جی ہاں جیسا کہ پہلے بتا چکا ہوں۔"
21۔ "کھیلوں سے رغبت؟"
"کوئی خاص لگاؤ نہیں، کرکٹ پسند ہے۔"
22۔ "زندگی سے کیا سیکھا؟"
"صبر کرنا اور ہر حال میں خوش رہنا۔"
23۔ "اپنے آپ کو کس ایج کا تصوّر کرتے ہیں؟"
"بائیس سال کا۔"
24۔ "عشق اور محبت میں کیا فرق ہے؟"
"جی مجھے اس کا کوئی علم نہیں، مجھے محبت ہے گھر والوں سے، اللہ سے اور اللہ کے نبی حضرت محمد ﷺ سے۔"
25۔ "پہلی بار کیمرے کے سامنے آئے تو؟"
"خوش بھی بہت تھا اور نروس بھی بہت تھا۔"
26۔ "کبھی ہجوم میں تنہائی محسوس کی؟"
"بہت بار، بہت دفعہ۔"

27۔ "دل کی دھڑکن کب تیز ہوتی ہے؟"
"ایکسرسائز کرتے وقت (مسکراتے ہوئے)"
28۔ "مارننگ شو کی میزبانی ملے تو؟"
"تو ضرور کروں گا۔"
29۔ "گھر میں سب سے زیادہ پیار کس سے ملا؟"
"میں بہت لکی ہوں کہ مجھے سب کا پیار ملا۔ ماں باپ اور دونوں بہنوں کا پیار ملا۔"
30۔ "کبھی بیمار ہوئے تو سیریس ہوجاتے ہیں؟"
"نہیں کبھی نہیں۔ بس اللہ بڑی بیماری سے بچائے۔"
31۔ "بھوک میں آپ کی کیفیت؟"
"بھوک لگنے سے پہلے ہی بہت کچھ کھالیتا ہوں۔"
32۔ "اگر ہوائی جہاز کا اوپن ٹکٹ ملے تو؟"

''سعودی عرب جاؤں گا۔ گھر والوں سے بھی ملاقات ہو جائے گی اور مکہ مدینہ بھی چلا جاؤں گا۔''

33۔ ''اگر کسی ارب پتی کا بلینک چیک ملے تو کتنا اماؤنٹ لکھیں گے؟''

''جتنی غربت آس پاس نظر آتی ہے اس لحاظ سے تو جتنا بھی لکھوں گا کم ہی محسوس ہوگا۔''

34۔ ''سیاست میں آئے تو کس کو فالو کریں گے؟''

''جب آؤں گا تب پتا چلے گا کہ کون بہتر ہے پھر ہی بتا سکوں گا۔''

35۔ ''ایک نصیحت جو لڑکیوں کو کرنا چاہتے ہیں؟''

''اپنی تعلیم مکمل کریں۔''

36۔ ''جھوٹ کب بولتے ہیں؟''

''نہیں بولنا آتا جس کی وجہ سے اکثر نقصان اٹھاتا ہوں۔''

37۔ ''گھر آکر کیا دل چاہتا ہے؟''

''لیٹنے کو، آرام دہ بستر پر۔''

38۔ ''کسی کی تعریف میں دو جملے بولنے ہوں تو؟''

''اللہ کی تعریف میں دو جملے بولوں گا کہ اللہ بڑا رحم کرنے والا ہے۔''

39۔ ''شوبز میں جگہ بنانے کے لیے ضروری ہے کہ؟''

''اچھی قسمت اور بھرپور محنت۔''

40۔ ''کس فنکارہ کے ساتھ رومینٹک سین کرنا اچھا لگتا ہے؟''

''فی الحال تو صرف کام کرنا ہی اچھا لگتا ہے۔''

41۔ ''خواہش ہے کہ ایسی فلم میں کام کروں جو؟''

''جو ہمارے کلچر کو دنیا کے سامنے پیش کرے۔''

42۔ ''اپنی کمائی کا کتنے فیصد بچاتے ہیں؟''

''بچ جاتا ہے۔ بچاتا نہیں ہوں۔''

43۔ ''ایک محبت جو بھول نہیں سکتے؟''

''اپنے گھر والوں کی محبت کو بھول نہیں سکتا۔''

44۔ ''کہاں جانے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے ہیں؟''

''کھانا کھانے کے لیے اور میٹھا کھانے کے لیے ہمیشہ تیار رہتا ہوں۔''

45۔ ''کس کو دیکھے بنا نیند نہیں آتی؟''

''ایسا کچھ نہیں...... نیند آرام سے آجاتی ہے۔''

46۔ ''گھر کے کس کمرے میں سکون ملتا ہے؟''

''اپنے کمرے میں۔''

47۔ ''کبھی کرائسس میں وقت گزارا؟''

''بہت بار کرائسس میں وقت گزرا ہے۔''

48۔ ''بی پی ہائی ہو جاتا ہے جب؟''

''کبھی چیک نہیں کیا۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ جب میں غصے میں ہوتا ہوں تو بی پی ہائی ہو جاتا ہوگا۔''

49۔ ''آپ کے والٹ کی تلاشی لیں تو؟''

''روپے، کارڈز وغیرہ نکلیں گے۔''

50۔ ''نصیحت جو بری لگتی ہے؟''

''شادی کرلو۔''

51۔ ''کھانے کی ٹیبل پر کیا نہ ہو تو کھانے کا مزہ نہیں آتا؟''

''میٹھا نہ ہو تو مزہ نہیں آتا۔''

52۔ ''کھانے کا مزہ آتا ہے، ڈائننگ ٹیبل پر چٹائی یا اپنے بیڈ پر؟''

''جب گھر میں ہوتا ہوں تو کھانے کا مزہ اپنے بیڈ پر ہی آتا ہے۔''

53۔ ''ایف بی، انسٹا گرام اور انٹرنیٹ سے دلچسپی؟''

''جی کافی ہے۔''

54۔ ''وقت کی پابندی کرتے ہیں؟''

''سوائے صبح اٹھنے کے ہر جگہ جانے کے لیے وقت کی پابندی کرتا ہوں۔''

55۔ ''کوئی کھانا جو کئی دن تک کھا سکتے ہیں؟''
''گرلڈ چکن، گرلڈ چکن بہت پسند ہے مجھے۔''
56۔ ''کوئی ایسی ڈیٹ جو بھول نہیں سکتے ؟''
''والدین کی شادی کی سالگرہ اور بہنوں کی برتھ ڈے۔''
57۔ ''دوسرے ملک جا کر کیا بات نوٹ کرتے ہیں؟''
''یہ منحصر ہے کہ میں کس ملک میں ہوں۔ کیونکہ ہر ملک میں الگ الگ قوانین ہوتے ہیں۔''
58۔ ''اپنے لیے سب سے قیمتی چیز کیا خریدی؟''
59۔ ''گاڑی''۔
60۔ ''کوکنگ سے آپ کا لگاؤ؟''
''کوئی خاص نہیں۔''
61۔ ''ایک کردار جو آپ کرنا چاہتے ہیں؟''
''ایک نہیں بہت سارے' وراسٹائل بننا چاہتا ہوں۔''
62۔ ''ایک کردار جو مقبول ہوا؟''
''ماں صدقے میں نومی کا کردار بہت مقبول ہوا۔''
63۔ ''ایک کردار جو کر کے پچھتائے ؟''
''ہے ایک کردار جو بتانا نہیں چاہتا۔''
64۔ ''آپ کی فیوچر پلاننگ؟''
''کچھ خاص نہیں۔ ابھی جو چل رہا ہے وقت، وہی اچھا ہے۔''
65۔ ''عورت حسین ہونی چاہیے یا ذہین؟''
''ذہین، ذہانت، حسن سنوار دیتی ہے۔''
66۔ ''ایک خواب جو بار بار دیکھتے ہیں؟''
''میں نے سنا ہے کہ خواب بتانے نہیں چاہئیں، ہاہاہا''۔
67۔ ''پسندیدہ فوڈ اسٹریٹ؟''
''صرف فوڈ اسٹریٹ نہیں، کھانے کی بہت سی جگہیں ہیں جو پسندیدہ ہیں۔''
68۔ ''شادی میں پسندیدہ رسم؟''
''پسندیدہ رسم؟......سوچنا پڑے گا۔''
69۔ ''ناشتا اور کھانا کس کے ہاتھ کا پسند ہے؟''
''ناشتہ امی کے ہاتھ کا اور کھانا باہر کا۔''
70۔ ''بدلہ لیتے ہیں؟''
''سوچتا ہوں کہ لوں......مگر پھر لے نہیں سکتا۔''
71۔ ''کب فریش ہوتے ہیں؟''
''جب نیند پوری ہو۔''
72۔ ''اپنے تجربے سے سیکھتے ہیں یا دوسروں کے؟''
''اپنے تجربے سے سیکھتا ہوں۔''
73۔ ''دنیا میں اللہ کا بہترین گفٹ؟''
''ماں باپ اور بہنیں......میری تو کل کائنات ہی یہی ہیں۔''
74۔ ''لوگ ملتے ہیں تو کیا فرمائش کرتے ہیں؟''

''دعا کیجیے گا۔''

75۔ ''آپ کی کوئی عجیب وغریب خواہش؟''

''عجیب وغریب خواہش بتاتے تھوڑی ہیں۔''

76۔ ''فلم، ماڈلنگ کی آپ نے؟''

''ماڈلنگ کی ہے۔ فی الحال فلم تو نہیں کی۔''

77۔ ''بچپن کا کوئی کھلونا جو آج بھی آپ کے پاس ہے؟''

''تصویریں اور ویڈیوز ہیں کچھ۔''

78۔ ''شادی میں کیش دینا چاہیے یا گفٹ؟''

''جو حسب حیثیت ہو وہ دیں۔''

79۔ ''کیا محبت اندھی ہوتی ہے؟''

''جی.....بالکل۔''

80۔ ''اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتے ہیں؟''

''جی بالکل.....اس میں کوئی برائی نہیں ہے۔''

81۔ ''دل کی سنتے ہیں یا دماغ کی؟''

''دل کی سنتا بھی ہوں اور مانتا بھی ہوں۔''

82۔ ''غصے میں پہلا لفظ؟''

''منحصر ہے اس بات پہ کہ کس بات پر آیا ہے اور کس پر آیا ہے۔''

83۔ ''کیا بستر پہ لیٹتے ہی نیند آ جاتی ہے؟''

''یہ بھی منحصر ہے کہ کس ٹائم پہ لیٹ رہا ہوں۔ تھکاوٹ کے ساتھ لیٹ رہا ہوں یا ریلیکس ہو کے لیٹ رہا ہوں۔''

84۔ ''سونے سے پہلے ایک کام جو لازمی کرتے ہیں؟''

''منہ، ہاتھ اور پاؤں دھو کر سوتا ہوں۔''

85۔ ''محنت سے پیسہ ملتا ہے یا قسمت سے؟''

''قسمت سے ملتا ہے.....محنت تو بہت لوگ کرتے ہیں۔''

86۔ ''تہوار جو آپ کو پسند ہیں؟''

''جس میں سب خوش ہوں اور ساتھ ہوں۔''

87۔ ''زندگی کب بری لگتی ہے؟''

''جب صبح بہت جلدی اٹھنا پڑے۔''

88۔ ''مارننگ شوز کیسے لگتے ہیں؟''

''مارننگ شوز دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔''

89۔ ''کن چیزوں کو لیے بغیر گھر سے نہیں نکلتے؟''

''موبائل، والٹ اور دیگر ضروری چیزیں۔''

90۔ ''پاکستان کے لیے کیا سوچتے ہیں؟''

''کہ اچھے اور ایمان دار لوگ حکومت میں آجائیں تاکہ پاکستان ترقی کرے۔''

91۔ ''آپ کی اچھی اور بری عادت؟''

''بہت ساری ہیں.....لمبی لسٹ ہے۔''

92۔ ''شوبز میں نہ ہوتے تو؟''

''امی ابو کے ساتھ سعودی عرب میں ہوتا اور جاب کر رہا ہوتا آڈٹ فرم میں۔''

93۔ ''ایک وہم جو پریشان کرتا ہے؟''

''نہیں کوئی وہم نہیں ہے.....اللہ کا شکر ہے۔''

94۔ ''کون سی چیزیں نشے کی حد تک پسند ہیں؟''

''اچھا کھانا، میٹھا اور چاکلیٹ۔''

95۔ ''خدا کی حسین تخلیق؟''

''ہر چیز حسین ہے جو اللہ تعالیٰ نے بنائی ہے۔''

96۔ ''شہرت کب مسئلہ بنتی ہے؟''

''جب پرائیویٹ لائف پرائیویٹ نہ رہے۔''

97۔ ''کبھی آنسوؤں سے روئے؟''

''بہت بار.....کئی مرتبہ۔''

98۔ ''آنکھ کھلتے ہی بستر چھوڑ دیتے ہیں؟''

''نہیں، اٹھنے میں کافی ٹائم لگ جاتا ہے۔''

99۔ ''اپنا فون نمبر کتنی بار تبدیل کیا؟''

''پاکستان میں ایک ہی ہے مگر جس ملک میں جاتا ہوں وہاں کی سم لینا پڑتی ہے۔''

100۔ ''اگر آپ کی شہرت کو زوال آ جائے تو؟''

''تو اللہ کی مصلحت سمجھ کر خاموش ہو جاؤں گا۔''

ڈراما نگار/ناول نگار

قیصرہ حیات سے ملاقات

شاہین رشید

گلے میں سُر ہو یا قلم تخلیق کا جوہر رکھتا ہو، یہ خدا داد صلاحیت ہوتی ہے اور بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو ان صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں۔ کسی عام سی بات کو کہانی بنانا یا کسی کی کہانی کو الفاظ کا پیراہن دینا بھی ایک رائٹر کا ہی کمال ہوتا ہے۔

ڈراموں کی دنیا ہو یا ناولوں اور افسانوں کی، خوب صورت تحریر دیکھنے اور پڑھنے والوں کو مسحور کر دیتی ہے۔ کل تک خوب صورت تحریریں صرف کتابوں تک محدود تھیں۔ مگر اب اسکرین کے ذریعے ہم ان سے محظوظ ہوتے ہیں۔ پہلے صرف چند ڈراما رائٹرز ہوتے تھے مگر اب ایسا نہیں...... اب بے شمار چینلز کی بدولت باصلاحیت لکھنے والوں کو سامنے آنے کا موقع مل رہا ہے...... خواتین میں آج کل کے ڈرامے زیادہ مقبول ہیں کیونکہ انہیں خواتین لکھ رہی ہیں، جن کا مشاہدہ گہرا ہوتا ہے۔

ڈراموں کی دنیا کا ایک معتبر نام قیصرہ حیات کا بھی ہے، جنہوں نے جب بھی لکھا، بہترین لکھا۔ ''الف اللہ اور انسان'' اور ''دلدل'' ایسے سیریلز ہیں جنہیں لوگ برسوں فراموش نہیں کر پائیں گے۔ اس کے علاوہ ''سراب، پل صراط، مسیحا، آئیڈیلز، وارڈ، بے عیب، آبگینے اور احساس'' ان کی قابل ذکر تحاریر ہیں۔

''کیا حال ہے قیصرہ حیات صاحبہ؟''

''جی...... اللہ کا شکر ہے...... اور میں آپ کی اور آپ کے ادارے کی انتہائی ممنون ہوں کہ آپ نے مجھے اپنے ڈائجسٹ کا مہمان بنایا اور مجھے کچھ کہنے کا موقع دیا۔''

''آپ ماشاء اللہ بہت اچھا لکھتی ہیں۔ آپ کے قلم میں کافی طاقت ہے۔ لوگ آپ کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں اس لیے زحمت دی...... اچھا جی...... پہلے تو آپ اپنے نام کی وضاحت کریں۔ ''قیصرہ'' بہت کم بلکہ یہ نام خواتین میں سنا ہی نہیں...... تو کس نے رکھا تھا یہ نام؟''

''میرا اصلی نام ''قیصرہ گل ناز'' ہے اور یہ نام میرے تایا ابا (مرحوم ''ابو رشید'') نے رکھا۔ میں اکثر ان سے پوچھا کرتی تھی کہ آپ نے میرا یہ نام کیوں رکھا تو وہ صرف مسکرا دیا کرتے تھے...... کہ ابھی نہیں تمہیں بعد میں پتا چلے گا کہ میں نے یہ نام کیوں رکھا...... انہوں نے تو مجھے کبھی نہیں بتایا لیکن میں سمجھتی ہوں کہ یہ نام میرے لیے بہت لکی ثابت ہوا کہ اسی نام سے مجھے شہرت و عزت ملی......

تو جب میں چھوٹی تھی اور پھر جب بڑی ہوئی تو میرے علاوہ کسی کا یہ نام نہیں تھا، اسکول، کالج اور پھر ٹیچنگ کے دوران بھی مجھے کوئی ''قیصرہ'' نام کی لڑکی نہیں ملی...... میں خود بھی اس نام کو پسند نہیں کرتی تھی...... پھر جب میں نے لکھنا شروع کیا تو قیصرہ کے نام کے ساتھ ''گل ناز'' کو ہٹا کر اپنے والد صاحب کا نام شامل کر لیا۔ اور یوں مجھے اپنا نام ''قیصرہ حیات'' اچھا لگنے لگا۔''

''ہوں...... اچھا...... اپنا فیملی بیک گراؤنڈ بتائیے پھر فیلڈ کی طرف آتے ہیں؟''

''جی...... میرا تعلق سیالکوٹ سے ہے۔ سیالکوٹ میں ہی میں نے تعلیم حاصل کی اور سیالکوٹ میں ہی میری شادی ہوئی۔ ہم لوگ چھ بہنیں اور دو بھائی ہیں۔ والد صاحب ''بینک آفیسر'' تھے، اب

ریٹائرڈ زندگی گزار رہے ہیں۔ والدہ صاحبہ (مرحومہ) بہت گھریلو اور سادہ مزاج خاتون تھیں اور بہت زیادہ مذہبی بھی تھیں اور انہوں نے ہماری تربیت بھی مذہبی انداز میں کی جو کہ ہم سب بہنوں میں نمایاں ہے۔

گھریلو ماحول مذہبی اور تعلیمی تھا۔ سب کو ہی پڑھنے کا شوق تھا۔ میں بہن بھائیوں میں تیسرے نمبر پر ہوں اور میں نے ایم اے انگریزی اور ایم اے ہسٹری کی ڈگریاں حاصل کی ہیں۔ آرمی پبلک اسکول سیالکوٹ میں بطور انگریزی ٹیچر جاب بھی کی۔ میری شادی مکمل طور پر ارینج میرج ہے اور میں نے تو اپنے ہونے والے میاں کو شادی سے پہلے نہ دیکھا نہ بات کی۔ چٹ منگنی پٹ بیاہ ہوا...... چار سال شادی کو ہو گئے ہیں...... اللہ تعالیٰ کی ''نعمت اور رحمت'' کا انتظار ہے۔''

''لکھنے کا عمل کب سے جاری ہے اور کس عمر سے لکھنا شروع کیا اور پہلی بار کیا لکھا؟''

''لکھنے کا عمل اس وقت سے جاری ہے جب میں فرسٹ ایر کی طالبہ تھی۔ اسکول لائف میں بہت دل چاہتا تھا کہ کچھ لکھوں مگر پتا نہیں کیوں ہمت نہیں ہوتی تھی...... مگر جب فرسٹ ایر میں آئی تو میں نے ایک کہانی لکھی ''وعدہ'' کے نام سے اور اسے گھر والوں سے چوری چھپے جنگ اخبار کے ''فرائیڈے میگزین'' (ان دنوں فرائیڈے میگزین آیا کرتا تھا) میں بھیج دی اور خوش قسمتی کہ وہ شائع بھی ہو گئی۔ خوشی خوشی گھر والوں کو بتایا تو سب بہت خوش ہوئے۔ ابو نے بہت تعریف کی۔ حوصلہ افزائی کی ...... ابو ہمیشہ میرے ہر کام کو پسند کرتے تھے...... اس حوصلہ افزائی کے بعد پھر میں نے جنگ میگزین میں ہی تسلسل کے ساتھ کچھ کہانیاں لکھیں، اور یوں یہ سلسلہ جاری ہو گیا...... یہ بات ہے 87-1986ء کی۔

پڑھائی بھی جاری تھی۔ اس دوران ایک ''روحانی'' بزرگ سے ملاقات ہوئی اور ان سے میں بہت متاثر ہوئی اور میں نے ناول ''ذات کا سفر'' لکھا۔ یہ میرا پہلا ناول تھا...... اس کے بعد میں نے افسانوں کا مجموعہ ''بارش کے بعد'' لکھا۔ ناول شائع ہونے سے پہلے افسانوں کا مجموعہ شائع ہوا۔ پھر ایک ناول ''وقت جو ٹھہر گیا، لکھا، اس کے بعد 2000ء میں، میں ڈائجسٹ رائٹنگ کی طرف آئی...... اور کافی کچھ لکھا۔

2004ء میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے 102 ناموں پہ ریسرچ بک لکھی ''انوار اسماء النبی'' کے نام سے، میرا زیادہ رجحان مذہب اور روحانیت کی طرف رہا...... میں نے ''پل صراط'' ''سایہ دیوار بھی نہیں'' ناولز لکھے۔ 2010ء میں ''الف اللہ اور انسان'' ناول لکھا اور 2014ء میں ''آخری امید'' لکھی، اور اب جو ڈرامے میں لکھ رہی ہوں انہیں ناول کی شکل میں لانے کا ارادہ ہے میرا۔''

''آپ ڈراما فیلڈ میں کیسے آئیں؟ اس سوال سے پہلے میں آپ سے یہ پوچھنا چاہوں گی کہ ڈرامے کی کامیابی میں کہانی زیادہ اہم ہے یا چینل کی مقبولیت؟''

''میرا نظریہ یہ ہے کہ جب تک ڈرامے کی اسٹوری اسٹرونگ نہیں ہوگی وہ ڈراما کبھی بھی مقبولیت حاصل نہیں کرے گا...... آج کل لوگوں کے پاس دیکھنے کے لیے بہت ورائٹی ہے مگر ڈراما صرف اپنی مضبوط کہانی کی وجہ سے شہرت حاصل کرتا ہے جبکہ ہر چینل پر بے شمار ڈرامے نشر ہو رہے ہیں ان کے بارے میں کسی کو پتا بھی نہیں......

یہ صحیح ہے کہ چینل کی مقبولیت کا بھی بڑا ہاتھ ہوتا ہے مگر ضروری نہیں کہ ناظرین جس چینل کو پسند کرتے ہیں اس کے ہر ڈرامے کو بھی پسند کریں...... اب ...... ناظرین بہت سمجھ دار ہو گئے ہیں، انہیں آئیڈیا ہو جاتا ہے کہ کون سا اچھا ہے، بہتر ہے یا بہترین ہے۔ میں نہیں سمجھتی کہ چینل کی مقبولیت سے ڈراما بھی مقبول ہوتا ہے۔''

''ہر ڈرامے میں ہیروئن کے لیے ایک ایکسٹرا مرد کیوں ہوتا ہے اور ہیرو سے ہی آخر میں شادی

کیوں ہوتی ہے؟"

"حقیقی زندگی میں اور ڈراموں میں دکھائی جانے والی زندگی میں فرق ہے۔ حقیقی زندگی میں ہم کوشش کرتے ہیں کہ بس کمپرومائز کرنا ہے.....اگر ڈرامے کو اسی ٹریک پہ لے جائیں گے تو ہمارے دیکھنے والے ہی شور مچانا شروع کر دیں گے کہ یہ کیا ہو رہا ہے.....ناظرین — ڈرامے میں سنسنی چاہتے ہیں۔ تھوڑی فینٹسی چاہتے ہیں۔ مسالا چاہتے ہیں..... پھر پروڈکشن ہاؤس والے بھی ایک عام سیدھی سادی اسٹوری نہیں لیتے اور بار بار کہتے ہیں کہ کہانی میں جان ڈالیں تاکہ ناظرین متوجہ ہوں۔ جس نے پیسہ لگایا ہوتا ہے وہ صرف سادہ سی اسٹوری نہیں چاہے گا اور ہر ہیروئن کے لیے دو مرد بھی نہیں ہوتے۔ کہانی کی ڈیمانڈ ہوتی ہے تو دو ہیرو لیے جاتے ہیں۔"

"خواجہ سرا کے کردار کے لیے ہمیشہ فنکار کو بک کیا جاتا ہے.....اصل خواجہ سرا کو کیوں نہیں بک کیا جاتا؟"

"میرا خیال ہے کہ اگر اصل خواجہ سرا کو لیں گے تو وہ پروڈیوسر اور ڈائریکٹرز کی ڈیمانڈز کو پورا نہیں کر پائے گا، کیونکہ وہ پروفیشنل اداکار نہیں ہوتے..... ہر انسان کو اللہ تعالیٰ نے جو رول دیا ہے اسے وہ ہی کرنا ہے..... پھر ایک نئے بندے کو اداکاری سکھانا بہت مشکل ہوتا ہے جبکہ پروفیشنل اداکار کو تو صرف اسکرپٹ دینے کی دیر ہوتی ہے اور پروڈکشن ہاؤس کی بھی کچھ مجبوریاں ہوتی ہیں کہ وہ ان کو کاسٹ نہیں کر سکتے۔"

"مجھے آپ کی بات سے اختلاف ہے کیونکہ اصل خواجہ سرا بھی بہت اچھے پرفارمر ہوتے ہیں.....خیر.....آپ نے بھی دیگر رائٹرز کی طرح اپنے ناولز کیش کرائے یا اوریجنل اسٹوریز دیں؟"

"میں نے جو پہلا ڈراما کیا تھا وہ میری اوریجنل اسٹوری تھی۔ ڈراما سیریل تھا "سراب"۔

میں نے لکھنے کا آغاز ادبی کہانیوں سے کیا تھا اور ڈائجسٹ رائٹر بننے سے پہلے ہی میرے دو تین ناولز شائع ہو چکے تھے جو کہ روحانی ناولز تھے، اسی طرح ڈراما سیریل "پل صراط" میں نے پہلے لکھا اور اسے ناول کی شکل بعد میں دی..... میں نے اپنے بہت کم ناولز کو کیش کرایا ہے۔

"الف اللہ اور انسان" میرا یہ ناول شائع ہو چکا تھا — مومنہ درید نے مجھے کہا کہ اس ناول پہ کام کرتے ہیں۔ یہ کام میرے لیے مشکل تھا کیونکہ اس میں چار ٹریکس تھے اور کہانیاں بھی آپس میں ملتی جلتی نہیں تھیں — یہ مومنہ درید کا کمال ہے کہ اس نے بہت خوب صورتی سے کہانیوں کو لنک کیا، اس لیے ڈراما روٹین سے زیادہ لمبا ہو گیا کہ اس کی دو تین کہانیوں کو آپس میں سمونے کی کوشش کر رہے تھے.....اب ان شاء اللہ ایک سیریل کن فیکون آئے گا اسے ناول کی شکل بعد میں دوں گی۔"

"ڈرامے کی کامیابی میں ٹیم ورک تو ہوتا ہی ہے، مگر سب سے زیادہ اہم رول کون ادا کرتا ہے، رائٹر، ڈائریکٹر یا اداکار؟"

"اس میں سب سے اہم رول "رائٹر" کا ہے۔ ڈرامے کا ڈھانچہ "کہانی" ہے۔ ڈھانچہ مضبوط نہیں ہوگا تو باڈی بھی مضبوط نہیں ہوگی۔ رائٹر کو بہت سوچ سمجھ کر اپنے ٹریک کو چلانا پڑتا ہے۔ لفظوں کو زبان دینا پڑتی ہے۔ کرداروں کو بولنا بھی رائٹر ہی سکھاتا ہے تو جناب سب سے مشکل کام رائٹر کا ہے۔ اس کے بعد ڈائریکٹر کا کام اہم ہے۔ ڈائریکٹر کمزور ہو تو بعض اوقات اچھی کہانیاں بھی فلاپ ہو جاتی ہیں اور تیسرے نمبر پر اداکار آتے ہیں۔"

"ڈراما رائٹنگ کی طرف آپ کو کون لے کر آیا؟"

"ڈراما رائٹنگ کی طرف میری دوست عمیرہ احمد مجھے لے کر آئیں، وہ میرے ساتھ آرمی پبلک اسکول میں پڑھاتی تھیں، وہاں دوستی ہوئی۔ عمیرہ احمد ہی مجھے ڈائجسٹ رائٹنگ کی طرف لے کر آئیں اور کہا کہ اس سے ریڈر شپ بڑھے گی۔ ساتھ ہی ہم کہانیاں بھی ڈسکس کرتے تھے.....انہوں نے مجھے اپنے اسکرپٹ بھی دکھائے.....یوں سمجھیں کہ ڈراما رائٹنگ میں انہوں نے مجھے انگلی پکڑ کر چلنا سکھایا اور

میں ان کی بہت شکر گزار ہوں۔"

"ڈراما لکھنا آسان ہے یا افسانے اور ناولز؟"

"ناولز اور افسانے سے زیادہ مشکل کام ڈراما لکھنا ہے اور مجھے اس کے لیے بہت پاپڑ بیلنے پڑے۔ شروع شروع میں تو پورا کا پورا اسکرپٹ تبدیل کرنا پڑتا تھا۔ ٹریک چینج کرنا پڑتے تھے۔ تو میں پریشان بھی بہت ہو جایا کرتی تھی...... لیکن شکر ہے کہ اچھے لوگوں کا تعاون رہا۔ عمیرہ بھی ساتھ ساتھ رہیں، ان سے گائیڈ لائن لیتی رہی۔ انسان جب بھی کسی مقام پر پہنچتا ہے تو اس کے پیچھے جدوجہد کی ایک لمبی کہانی ہوتی ہے۔ ایسا نہیں ہوتا کہ آپ کو راتوں رات ہی کچھ مل جائے، یہ ناممکن سی بات ہے۔

ڈراما رائٹنگ کی فیلڈ میں اپنے آپ کو اسٹیبلش کرنا بہت مشکل کام ہے...... اس میں بہت محدود ہو کر لکھنا پڑتا ہے اور اپنی بات چند کرداروں کے ذریعے آگے پہنچانی ہوتی ہے تو میرے لحاظ سے یہ خاصا مشکل کام ہے۔"

"سنا ہے کہ اسکرپٹ چوری ہو جاتے ہیں پھر کوئی اور اپنے نام سے ڈراما بنا لیتا ہے اور اصلی رائٹر احتجاج ہی کرتا رہ جاتا ہے...... ایسا ہے؟"

"ہوتا ہے...... مگر اتنا زیادہ نہیں کہ چوری کر لیا اور پورا ڈراما بنا لیا...... میرے ساتھ اللہ کا شکر ہے کہ بہت کم ایسا ہوا ہے۔ مجھے ایک دو کہانیوں میں جھلک دکھائی دی کہ یہ میں نے "ون لائنر" بھیجا تھا اور یہ کہانی اس پہ بیس کر رہی ہے۔ تو میں نے کوئی خاص نوٹس نہیں لیا...... سوچا چلو کر لیا تو کیا کر سکتے ہیں۔"

"کہتے ہیں کہ ڈائریکٹرز پورا پورا اسکرپٹ چینج کروا دیتے ہیں اور رائٹر خاموش رہتا ہے کہ چلو نام اور پیسہ تو کما رہے ہیں؟"

"نہیں...... ایسا تو بالکل نہیں ہوا، مجھے اچھے ڈائریکٹرز ملے ہیں اور کسی نے کہانی کو اس حد تک چینج نہیں کیا کہ کہانی اصل ٹریک سے ہٹ گئی ہو۔ ڈائریکٹر نے کہانی کو ہر پوائنٹ آف ویو سے دیکھنا ہوتا ہے۔ کمرشل اینگل سے بھی دیکھنا ہوتا ہے...... تو بہت معمولی تبدیلی ہوتی ہے، زیادہ نہیں...... کیونکہ ڈراما اور عام رائٹنگ میں بہت فرق ہوتا ہے۔ اور ڈائریکٹرز بھی ہماری بہتری کے لیے کام کر رہے ہوتے ہیں اور کبھی کبھی زیادہ تبدیلیاں بھی کرنا پڑتی ہیں اور چینج بھی، تو ہم ہی کر رہے ہوتے ہیں اپنی ہی تحریروں کو سنوار رہے ہوتے ہیں۔ تو میں تو کبھی بھی برا نہیں مانتی اور جتنی بار کہیں، میں ان کے کہنے پہ چینج کر دیتی ہوں۔ باہم مشورے سے چیز زیادہ نکھر کر سامنے آتی ہے۔"

"ڈراموں میں آپ تمام مسائل کو بلکہ ہر رائٹر تمام مسائل کو بڑی خوش اسلوبی سے حل کر لیتا ہے...... عام زندگی میں بھی ایسا ہوتا ہے کیا؟"

"اصل زندگی میں ہمارے مسائل حل کرنے والی ذات اللہ کی ہے، لیکن ہمارے ڈراموں میں ہمارے کردار کے الجھے ہوئے دھاگے ہمارے ہاتھ میں ہوتے ہیں اور ہم انہیں اپنی مرضی کے مطابق ادھر سے ادھر کرتے ہیں اور مسائل کو سلجھاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ بھی ہمارے ساتھ ایسا ہی کرتا ہے، الجھاتا ہے پھر سلجھاتا ہے۔ تو ہماری کیا اوقات کہ ہم اپنے مسائل کو خود سلجھائیں۔ تو ڈراما اور عام زندگی میں بہت فرق ہوتا ہے۔"

"فلم کے لیے آفرز آئیں اور سیریلز ہی کیوں...... سوپ بھی لکھا آپ نے؟ اور نہ لکھنے کی وجہ؟ اور اپنے پروجیکٹ کو خود کتنا ٹائم دیتی ہیں؟"

"میرا کام اسکرپٹ لکھ کر دینا ہے سو میں وہ دیتی ہوں۔ باقی کام پروڈکشن ہاؤس کا اور ڈائریکٹر کا ہوتا ہے۔ انہیں میری ضرورت ہوتی ہے تو ڈسکس کرنے کے لیے بلا لیتے ہیں۔

سوپ لکھنے کی طرف میرا بالکل رجحان نہیں ہے۔ سیریل لکھنا مجھے آسان اور اچھا لگتا ہے۔ سیریل کی زیادہ سے زیادہ اقساط پینتیس ہوتی ہیں جبکہ سوپ کی سو یا ڈیڑھ سو ہوتی ہیں اور اتنی اقساط کا سوچ کر ہی میرا ذہن تھک جاتا ہے۔ اس کے علاوہ فلم کے لیے بہت آفرز ہیں مگر فلم والا میرا مزاج نہیں ہے اس لیے میں صرف ڈراموں پر ہی فوکس کروں گی۔"

"لکھنے کے لیے آپ کے نزدیک بہترین ٹائم کون سا ہے؟"

"ابتدائی دور میں تو میں رات کو ہی زیادہ لکھا کرتی تھی۔ کالج لائف میں مجھے خاموشی اور تنہائی بہت پسند تھی تو لکھنے کے لیے رات کا وقت ہی بہترین لگتا تھا۔ اب چونکہ گھریلو ذمہ داریاں بڑھ گئی ہیں تو جیسے جیسے ٹائم ملتا ہے، لکھ لیتی ہوں۔ ہاں جب اسکرپٹ لکھتی ہوں تو پھر دوسروں کا خیال رکھنا پڑتا ہے، اپنے ٹائم کا نہیں، کیونکہ کام کروانے والا ہمارے ٹائم سے نہیں، اپنے ٹائم سے چلے گا۔"

"چلیں جی کچھ نجی سوال ہو جائیں، اپنے مزاج کے بارے میں بتائیں؟"

"مزاج شروع میں تو بہت گرم تھا...... مگر اب آہستہ آہستہ کافی تبدیلی آ گئی ہے، تھوڑی نرمی آ گئی ہے مگر غلط بات تو بالکل بھی برداشت نہیں ہوتی۔ بہت ینگ ایج میں تو بہت جلدی ہائپر ہو جاتی تھی...... مگر پھر وہی بات کہ وقت کے ساتھ ساتھ تبدیلی آ ہی جاتی ہے۔"

"اور کیا مشاغل ہیں آپ کے؟ سیاست سے دلچسپی ہے؟"

"کتابیں پڑھنے کا بہت شوق ہے مگر اب کچھ گھریلو ذمہ داریاں اور کچھ لکھنے کی ذمہ داریوں کی وجہ سے ٹائم بہت کم ملتا ہے کہ مطالعہ کر سکوں...... سیاست سے کچھ خاص دلچسپی نہیں ہے، مگر سیاسی حالات سے باخبر ضرور رہتی ہوں...... کھیلوں سے کچھ خاص لگاؤ نہیں ہے...... شروع سے ہی کمرے میں بیٹھ کر پڑھنے کی عادی ہوں یا میرا کمرہ ہوتا تھا یا پھر لائبریری۔"

"کوکنگ وغیرہ سے شغف ہے؟"

"کوکنگ سے بہت لگاؤ ہے۔ کھانا خود ہی بناتی ہوں۔ گھر کے کام میری پہلی ترجیح ہیں۔ صبح اٹھ کر پہلا کام گھر کے کاموں کو دیکھنا، پھر کوکنگ کرنا...... اور اس کے بعد لکھنے کا عمل شروع ہوتا ہے۔"

"اچھا...... گڈ...... ورنہ عموماً قلم کی دنیا کے لوگوں کو دیگر کاموں سے بیزار ہی پایا ہے؟"

"نہیں ایسا نہیں ہے...... میں تو دنیا کے سارے ہی کام خود کرتی ہوں۔ بہت ایکٹو رہتی ہوں۔ ملنا جلنا، گھر داری، شاپنگ سب کچھ خود ہی کرتی ہوں اور جو چیز بہت زیادہ رغبت سے بناتی ہوں وہ ہی کم کھاتی ہوں۔"

"رائٹرز میں کس سے متاثر ہیں؟ کل اور آج میں؟"

"اپنے بچپن سے جن لوگوں کو پڑھا، جن لوگوں کے ڈرامے دیکھے اور جن سے متاثر ہوئی، ان میں نورالہدیٰ شاہ، اشفاق احمد، اصغر ندیم سید اور امجد اسلام امجد شامل ہیں، یہ سب بہت کمال کا لکھتے تھے، اور مزاح نگاری میں عطاالحق قاسمی سے بہتر کسی کو نہیں پایا...... اور آج کل سب ٹھیک لکھ رہے ہیں...... کوئی ایسا نہیں لکھ رہا کہ جس کے لیے ہم سب کچھ چھوڑ کر بیٹھ جائیں۔

مجھے ابھی تک یاد ہے اشفاق احمد کا وہ ڈراما "فہمیدہ کی کہانی استانی راحت کی زبانی" اس وقت میں اسکول میں پڑھا کرتی تھی...... تو انہوں نے کس خوب صورت انداز میں ایک محروم لڑکی کی نفسیات کو دکھایا تھا اور میں حیران رہ جاتی تھی سب کچھ دیکھ کر اور آج کل کے زمانے میں بھی وہی مسائل ہیں، وہی محرومیاں ہیں اور وہ ہی دکھ ہیں...... ان کے پائے کے ڈراما نگار مجھے آج تک نہیں ملے۔ انہوں نے انسانی نفسیات کی جو عکاسی کی ہے وہ آج کل کے ڈراموں میں نظر نہیں آتی۔"

"باتیں بہت تھیں مگر جگہ کی کمی...... ہم نے قیصرہ حیات سے اجازت چاہی...... اس شکریے کے ساتھ کہ انہوں نے ٹائم دیا۔"

"آپ کا بھی شکریہ، آپ کے لیے، آپ کے ادارے کے لیے اور ادارے کے تمام اراکین کے لیے میری نیک خواہشات ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس طرح اس ادارے کو اور اس کے تمام میگزین کو ترقی کی راہ پر گامزن رکھے اور آپ کے ڈائجسٹ کے ذریعے قارئین اچھی اچھی تحریریں پڑھتے رہیں...... شکریہ۔"

☆

خاموشی کو بیاں ملے

ادارہ

زینب علی خان ...... کراچی

1) نہ قابل تعریف ہوں، نہ قابل تحسین
میں سلجھے مزاج کی، الجھی سی لڑکی

آہم! نام تو آپ جانتے ہی ہوں گے، زینب علی خان۔ میرے نام کی کہانی بڑی دلچسپ ہے۔ چلیں تو سنتے چلیں کہ آخر زینب، نام میری وراثت میں کیسے آیا۔

یہ آج سے لگ بھگ پچاس سال قبل پہلے کی بات ہے۔ ارے نہیں، نہیں، میں ابھی اتنی بوڑھی نہیں ہوئی بلکہ مابدولت تو ابھی صرف 19 سال کے ہیں۔ ہاں تو ہم سنا رہے تھے اپنی داستانِ حیات۔ پچاس سال قبل میری سب سے چھوٹی پھوپھو کی پیدائش سے ایک سال پہلے میرے پردادا اپنے گاؤں سے کراچی واپس آ رہے تھے۔ اسٹیشن پر اتر کر۔ بس یا رکشا لینے کے بجائے پیدل ہی گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہ علاقہ کافی سنسان تھا۔ وہاں انہیں اچانک ــــ ایک باریش بزرگ نظر آئے۔

ان بزرگ نے میرے پردادا سے کہا کہ ''تمہارے گھر خوشی آنے والی ہے، اس کا نام زینب رکھنا۔'' اور کہہ کر چلے گئے۔

جب میری پھوپھو پیدا ہوئیں تو پردادا نے میری دادی کو یہ واقعہ سنایا اور زینب نام رکھنے کو کہا۔ تو میرے دادا، دادی نے کہا یہ سب بے کار باتیں ہوتی ہیں ہم اس کا نام گل ناز رکھیں گے کیونکہ بڑی کا شہناز پھر دوسری کا مہناز ہے اور زینب نام رکھنے سے ربط بھی ٹوٹ جائے گا (ہمارے ہاں Rhyming names رکھے جاتے ہیں) لہٰذا پھوپھو کا نام گل ناز رکھ دیا گیا جس کے بعد وہ اس حد تک بیمار ہو گئیں کہ ان کے بچنے کے امکانات ناممکن ہو گئے۔ اس کے بعد تو میری دادی کی جان پر بن آئی، تب میری دادی نے دعا کی۔

''میں اپنی کسی پوتی یا نواسی کا نام زینب رکھوں گی اللہ تعالیٰ تو اسے شفا دے دے۔''

اس دعا کے بعد پھوپھو ٹھیک ہو گئیں پھر وقت بیتا۔

بڑی پھوپھو کی کوئی اولاد نہیں ہوئی، دوسری پھوپھو کی بیٹیوں کے نام ان کے ددھیال والوں نے رکھنے نہیں دیے اور چھوٹی پھوپھو کے چاروں بیٹے ہوئے۔

پھر میرے تایا کی سب سے بڑی بیٹی ہوئی جو کہ سعودیہ میں ہوئی تھی، اس کے ہونے کے بعد دادی نے تایا سے کہا کہ اس کا نام زینب رکھو تو میرے تایا نے کہا۔ ''یہاں تو پیدا ہونے سے پہلے برتھ سرٹیفکیٹ بن جاتا ہے اور ہم اس کا نام رکھ چکے۔''

چنانچہ جب میں اور میری کزن پیدا ہونے والے تھے تو دادی نے میرے بابا اور تایا کو پہلے سے ہی کہہ دیا تھا کہ جس کی بیٹی ہوئی اس کا نام زینب رکھنا۔ ہوئیں تو دونوں کی بیٹیاں مگر میں اس سے چند دن پہلے ہوئی تھی لہٰذا یہ نام میرا نصیب بنا اور الحمدللہ یہ نام مجھے ملا کیونکہ مجھے بہت پسند ہے یہ نام چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے بڑی بیٹی کا نام تھا۔ اوہو! آپ لوگ بور تو نہیں ہو گئے میری کتھا سے، چلیں آگے چلتے ہیں۔

روشنیوں کے شہر کراچی کی باسی ہوں۔ تعلیم بھی جاری ہے، انٹر کے بعد جامعتہ الرشید سے درس نظامی (عالمہ) میں طفل مکتب ہوں۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ مجھے باعمل عالمہ بنائے، آمین۔

2) اچھی ہوں یا بری ہوں، خود اپنے لیے ہوں
میں خود کو نہیں دیکھتی اوروں کی نظر سے

خوبیاں ...... آہاں پتا نہیں ہیں بھی یا نہیں، ہاں خامیاں بہت زیادہ ہیں۔ بہت شدت پسند ہوں، مستقل

مزاجی نہیں، بھولتی بہت ہوں۔ بہت سُست، کاہل ہوں، غلطیاں بہت کرتی ہوں پھر پچھتاتی ہوں۔ بہت حساس ہوں، خاص کر دوستوں کے معاملے میں۔ میرے دوست میری سانسوں میں بستے ہیں۔

3) ویسے تو خواتین، شعاع سے بچپن کی علیک سلیک ہے مگر پڑھنا پچھلے چار سال سے شروع کیا جب میٹرک میں تھی اور اب بھی چھپ کر پڑھتی ہوں کیونکہ بابا، دادی وغیرہ کو بالکل پسند نہیں۔ کتابوں اور رسائل کی دیوانی' شاعری کی جنونی...... راز میرے کھولتی ہے، شاعری سچ بولتی ہے۔ سب سے زیادہ دینی کتب کا مطالعہ کرتی ہوں۔

ادبی کتابوں میں نسیم حجازی اور اشتیاق احمد لاجواب ہیں۔ ابن انشاء کا مزاح بے مثال ہے۔ عمیرہ احمد' فرحت اشتیاق' نبیلہ عزیز' نبیلہ ابر راجہ' مریم عزیز، ام مریم، عفت سحر طاہر، نایاب جیلانی' سمیرا شریف اور بھی لاتعداد لکھاری بہنیں ہیں جن کا لکھا بہت نایاب ہے۔ جن سے میں نے زندگی کے مدوجزر سے نبرد آزما ہونا سیکھا اور ان سب کی بے حد شکر گزار ہوں۔

4) سالگرہ، صرف ایک بار دوستوں نے بڑی دھوم دھام سے منائی تھی باقی اس کے علاوہ نہ پہلے کبھی منائی، نہ بعد میں۔ مجھے تو اکثر یاد بھی نہیں رہتا کہ میری سالگرہ ہے۔ مجھے نہیں پسند کہ میں عیسائیوں اور یہودیوں کی رسومات اپناؤں۔ جو چیز ہمارے مذہب کا حصہ نہیں، ہمیں کوشش کرنا چاہیے ہم اس سے دور رہیں۔

5) ہاہ! کتابیں تو اتنی پڑھی ہیں کہ تعداد یاد بھی نہیں اور اس سال تو اگلے پچھلے تمام ریکارڈ توڑ ڈالے۔ کیا دینی، کیا ادبی سب ہی چاٹ ڈالیں مگر جب سے درسِ نظامی میں داخلہ لیا ہے پڑھنے کا اتنا وقت نہیں ملتا بلکہ آج کل تو صرف اور نحو کی گردانوں اور صیغوں میں ایسی مدغم ہوئی ہوں کہ خواب میں ضرب، ضربا اور ضربوا ہی نظر آتے ہیں۔

6) اف...... پسندیدہ اشعار...... بڑا مشکل سوال ہے، مجھے فیصلہ کرنا نہیں آتا۔ چوائس کرنا نہیں آتی بہرحال بہت سے پسندیدہ اشعار میں سے ایک کو قلم بند کرتی ہوں۔

تیرے عشق کی انتہا چاہتا ہوں
میری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں
ستم ہو کہ وعدۂ بے حجابی
کوئی بات صبر آزما چاہتا ہوں

7) آخر میں تمام امت سے میری درخواست ہے کہ دین کو صحیح طریقے سے سمجھیں اور اس پر عمل کریں۔ علماء کو برا بھلا کہنے کے بجائے اہل حق علماء کی صحبت اختیار کریں اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا درس دیں۔

اگرچہ بُت ہے جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکم اذاں لا الہ الا اللہ

ثمن شفیق......راولپنڈی

1) جہاں تک بات ہے رسالوں سے وابستگی کی تو وہ تو میں اس وقت سے پڑھتی ہوں جب چار سے پانچ حروف کو ملا کر پڑھنے میں دقت ہوتی تھی۔ اندازہ کریں...... جب میں اپنی فرینڈز کے ساتھ ٹیچر ٹیچر کھیلتی تھی تو اسٹوڈنٹس کے نام، ناول کے ہیرو، ہیروئن کے ناموں پر رکھتی تھی اور میرا بڑا بھائی جو کہ مجھ سے صرف 360 دن بڑا ہے، اتنا ہنستا تھا، اتنا مذاق اڑاتا تھا میرا کہ حد نہیں......

واقعہ تو کوئی خاص پیش نہیں آیا کیونکہ ہمارے درمیان کوئی ظالم سماج نہیں تھا (بھئی میرے اور خواتین وشعاع کے) شعاع پاپا لا کر دیتے ہیں جبکہ خواتین پھوپھو سے لے کر پڑھتی ہوں۔

2) صبح اٹھ کر نماز پڑھتی ہوں اس کے بعد گھر آتی ہوں (دادو کے گھر سوتی ہوں نا) سب بھائیوں کے اسکول اور پاپا کے کام پر جانے کے بعد میں اور ماما ناشتا کرتی ہیں۔ اس کے بعد ماما برتن دھوتی ہیں اور میں سارے گھر میں جھاڑو، پونچھا، ڈسٹنگ وغیرہ کر کے ٹی وی لگا لیتی ہوں۔ ساتھ ساتھ ڈائجسٹ بھی

پڑھتی ہوں پھر بارہ، ایک بجے آٹا گوندھ کے نماز کی تیاری اور ماما دوپہر کا کھانا تیار کرتی ہیں جب تک چھوٹے بہن، بھائی بھی آجاتے ہیں اسکول سے تو کھانا وغیرہ کھا کے اور برتن سمیٹ کر سو جاتی ہوں۔

شام میں اٹھ کر دوپہر کے برتن اور آٹا گوندھنا میری ذمہ داری ہے اس کے بعد مغرب کی نماز پڑھتی ہوں۔ پھر رات کے کھانے تک فارغ ہوتی ہوں، اس دوران بھی خواتین وشعاع زیر مطالعہ آتے ہیں۔

پاپا جب کام سے واپس آتے ہیں تو پاپا کو پانی، جوتے اور تکیہ وغیرہ دینا میرا کام ہے۔ پاپا کے شوز، جرابیں بھی میں خود اتارتی ہوں اور پھر پاپا کے پاس بیٹھ کر پورے دن کی روداد بیان کرنا میرا پسندیدہ ترین کام ہے۔ پھر میں کھانا کھا کر دادو کے گھر چلی جاتی ہوں، ڈائجسٹ بغل میں دابے...... سونے سے پہلے کسی بھی اچھی سی کتاب کا مطالعہ کرنا بچپن کی عادت ہے۔

۳) ''جنت کے پتے'' بہت پسند ہے، اف بتا نہیں سکتی کہ مجھے ''جہان'' کتنا پسند ہے۔ ان فیکٹ نمرہ احمد کے تمام ناولز کے ہیروز...... اور جی نہیں کسی بھی کردار میں اپنی جھلک نظر نہیں آئی۔

۴) خوبیاں، خامیاں......

(آہم آہم) سب سے پہلے ماما سے پوچھا بقول ماما کے ''جب گھر میں ہوتی ہوں تو کام کرنے میں بے پروائی دکھاتی ہوں (یہ خامی ہے) اور جب میں کہیں جاتی ہوں تو اچھے طریقے سے ہر کام کرتی ہوں، بہن بھائیوں کو سنبھالتی ہوں (یہ خوبی ہے) ہم ماشاء اللہ سے سات بہن بھائی ہیں اور میرا نمبر دوسرا ہے، باقی سب چھوٹے ہیں، خیر...... بھائی کہتا ہے کہ ہر بات مانتی ہو۔ ماما کی غیر موجودگی میں چپس بنادیتی ہوں، ناراض نہیں ہوتی۔

پھوپھو سے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ ''پیاری سی۔ جب کوئی اچھا لگتا ہے تو اس میں کوئی خامی نظر نہیں آتی، خوبیاں ہی خوبیاں دکھائی دیتی ہیں (تھینک یو پھوپھو جی)۔ میرے خیال میں، میں ڈرپوک ہوں بہت زیادہ شاید۔ آپ یقین نہ کریں لیکن میں بلی اور مرغی سے بھی ڈرتی ہوں، اجنبی لوگوں سے زیادہ جلدی فرینک نہیں ہوتی جس کی بنا پر اکثر ''مغرور'' کا لقب دیا جاتا ہے لیکن کیا کریں بس...... اکثر کسی کی کوئی بات بری لگے تو جتاتی نہیں ہوں لیکن دل خراب سا ہوجاتا ہے لیکن دو، تین دن میں ٹھیک ہوجاتی ہوں۔ اگر کسی پر غصہ آئے تو بالکل چپ کر جاتی ہوں اور چاہتی ہوں کہ اگلا بندہ دو، تین گھنٹے میرے سامنے نہ آئے اور نہ ہی منائے۔ میں خود ہی مان جاتی ہوں کچھ دیر میں...... کزن سائرہ کہتی ہے کہ تم بہت وعدہ خلاف ہو اور خوبی یہ ہے کہ مخلص ہو۔ بقول ثاران (چھوٹے بھائی) کے کہ تم مجھے پاپا کی مار سے بچاتی ہو لیکن مار پڑواتی بھی تم ہی ہو۔

۵) پسندیدہ شعر یہ ہے......

غضب تھا آج گلشن میں یہ حسرت خیز نظارہ
ادھر بلبل کا دم نکلا، ادھر فصل بہار آئی......!!

۶) جی ساون...... اف...... بالکل نہیں پسند۔ ہر وقت بارش اور جو ہمارے یہاں بارش میں لوڈشیڈنگ ہوتی ہے کچھ نہ پوچھیں۔

☆ فصل غم کا گوشوارہ رضیہ جمیل قیمت: -/300 روپے
☆ زرد موسم راحت جبیں قیمت: -/1000 روپے
☆ حساب دل رہنے دو نبیلہ عزیز قیمت: -/400 روپے

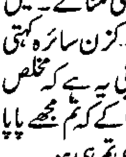

منگوانے کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37۔ اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

English®
English
Prickly Heat
Soap Bar
THANDAAA
English
THANDAAA
Prickly Heat
Non Greasy Cream
Instant and complete relief from prickly heat
20% EXTRA
English
Prickly
Heat
THANDAAA
Powder
GARMI KO
THAND KARAO
20% EXTRA
English
Prickly
Heat
Powder
ActivNeem
English
Neem
Soap Bar
Natural
English
Prickly Heat
Non Greasy Cream
ActivNeem
SnScares
@SnSca

فاخرہ جبیں

یہ کوئی اور ہی کہانی ہے

وجاہت حسین نے اپنی نصف بہتر ثریا خاتون عرف روما کے ساتھ ایک عمر وطن سے باہر گزاری تھی۔ انگریزوں کے رہن سہن سے اس قدر متاثر تھے کہ جو گھر وطن کے پہاڑی علاقے میں تعمیر کرایا۔ اس کی بیرونی عمارت تکون چھت والی تھی اور کسی حد تک گرجا گھر سے مشابہ تھی۔ کمرے بے حد وسیع اور غیر ملکی سامان سے بھرے ہوئے۔ گھر کے چار اطراف میں سرسبز لان اور لان میں کھلتی وسیع و عریض کھڑکیاں جن پر موسم کے مطابق کبھی بھاری دبیز پردے گرے رہتے اور کبھی جالی دار پردے لہراتے۔ گھر کے ہر کمرے میں آتش دان موجود...... دیواروں پر سجے نوادرات اور گھر کی طویل راہداریوں میں گھومتے درجن بھر ملازم......جن کا کام صرف اور صرف گھر کی اور اہل خانہ کی دیکھ بھال کرنا تھا۔

لیکن یہ گزرے وقتوں کی باتیں تھیں، وجاہت

مکمل ناول

حسین پردیس میں ہی جہان فانی سے کوچ کر گئے۔ بڑے بیٹے سطوت حسین ہو بہو باپ پر تھے۔ عقل، شکل، مزاج میں اور اسی لیے بڑی آسانی سے باپ کی جگہ سنبھال لی۔ اعلا خاندان میں بیاہے گئے تھے۔ بیوی مہرین ساتھ دینے والی نکلی، دو ہی بچے پیدا کیے، بڑا بیٹا شان اور بیٹی وریشہ۔ دونوں ہی بچے لاڈلے، سر چڑھے۔

ثریا خاتون عرف روما شوہر کی وفات کے بعد دیس میں اپنے گھر آ بسیں۔ یہ گھر ان کے شوہر کو بہت عزیز تھا، سو انہیں بھی پیارا تھا۔ مگر اب پہلے جیسی بات نہ تھی، ملازموں کی بھیڑ سے انہیں کوفت ہونے لگی تھی، سوا کا دُکا کے سوا باقی سب کو فارغ کر دیا گیا۔

وجاہت حسین کا دوسرا بیٹا فارقلیط شاید غلطی سے اس خاندان میں آ گیا تھا۔ مزاج اور عادت میں یکسر مختلف ثابت ہوا تھا، وہ اس شاہانہ زندگی سے متنفر تھا، آئے روز کی تقریبات 'لوگوں سے گھلنا ملنا، دولت کا بے دریغ استعمال اسے ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ خود وہ ایک ہی جوڑے میں کئی کئی دن گزار دیتا، روما اور وجاہت اپنے حلقہ احباب میں متعارف کراتے ہوئے اکثر ہی شرمندگی محسوس کرتے تھے۔

فارقلیط نے ماں باپ کی مرضی کے خلاف شادی اپنی پسند سے کی، کسی غریب گھرانے کی لڑکی کو بیاہ کر لایا، جو پہلے سے کسی موذی مرض میں مبتلا تھی۔ ڈاکٹرز اس کی زندگی سے مایوس ہو چکے تھے اور فارقلیط اس کی باقی ماندہ زندگی میں خوشیاں اور رنگ بھر دینا چاہتا تھا۔

یہ ایسی خواہش تھی کہ جس پر ماں اور باپ دونوں اپنے بیٹے کی ذہنی حالت پر شبہ ہی کر سکتے تھے پھر وہ لڑکی صبا اس قدر ڈری سہمی اور خوب صورت تھی کہ روما اور وجاہت نے فارقلیط کے فیصلے پر چپ سادھ لی۔

اور پھر وہی ہوا......

بہترین علاج اور زندگی میں خوشیوں بھرے رنگوں کے باوجود صبا کی زندگی نے وفا نہ کی اور وہ ایک بچی کو جنم دے کر رخصت ہو گئی۔

فارقلیط بھی شاید اسی انتظار میں تھا، ڈیڑھ سال بعد روڈ ایکسیڈنٹ میں وہ بھی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔

اور اب اس بات کو بھی کئی برس بیت گئے تھے......

یہ اس خاندان کا تعارف تھا جس کے تین افراد آج بھی اس گرجا گھر جیسی تکونی عمارت والے گھر میں اپنی زندگی کے شب و روز گزار رہے ہیں۔

روما عرف دادی جان......

وریشہ سطوت حسین......

ماورا، صبا......

ان تینوں افراد کی زندگی میں ایک چوتھے فرد کی آمد سے زندگی کے معاملات اور واقعات اس انداز سے وقوع پذیر ہوتے ہیں کہ ان کی زندگی خود بخود ایک کہانی کا روپ دھارتی چلی جاتی ہے۔

کہانی کیا ہے؟ آیئے...... دیکھتے ہیں۔

☆☆☆

موسم اپنی پوری شدت سے حملہ آور ہوا تھا۔ کہر آلود صبحوں میں سورج کی کرنیں جیسے زمین کا راستہ ہی بھول گئی تھیں۔

سردی، جاڑا، پالا...... ہر لفظ کا مفہوم اچھی طرح سمجھ میں آ رہا تھا۔ ایسے ہی موسم میں ماورا دانت کٹکٹاتی، ٹھٹھرتی، کپکپاتی کالج سے واپس آئی تو بوا جی کو اس پر بے طرح ترس آیا۔

''کہو تو ہیٹر چلا دوں؟''

''چلا تو دیں گی، لیکن پھر وریشہ کو کون بھگتے گا، آپ کو پتا ہے اسے ہیٹر پسند نہیں۔ وہ سردی کو بھرپور طریقے سے انجوائے کرنا چاہتی ہے۔''

''ارے انجوائے کرنا چاہتی ہے تو پھر کالج سے چھٹی کیوں کی؟ پورے گیارہ بجے بستر سے نکلی ہے شہزادی 'اور ناشتا پونے بارہ پر آنکھ کھلنے کے بعد بس یہ ہی ایک کام کیا ہے اور تب سے اب تک لگی ہیں ٹیلی فونوں پر۔'' بوا جی کو وریشہ کی عادات ایک آنکھ نہیں بھاتی تھیں۔ خوب چڑتیں اور پھر ماورا کے سامنے دل ہلکا کرتیں۔

''سارا قصور تمہاری دادی کا ہے، عادتیں خراب

کردیں لڑکی کی۔'' بوا جی بڑبڑاتے ہوئے ڈریسنگ ٹیبل پر پڑا سامان ٹھیک کررہی تھیں۔

''سردی کی وجہ سے چھٹی نہیں کی تھی اس نے، رات بھر فلمیں دیکھتی رہی ہے۔ مجھے بھی ڈھنگ سے سونے نہیں دیا۔'' ماورا نے بھی لگے ہاتھوں شکایت جڑ دی۔

''بس یہ ہی کچھ تو آتا ہے اسے، ابھی دیکھو۔ بن ٹھن کے گھوم رہی ہے لان میں، مجال ہے جو اپنے کمرے کو ہی دیکھ لے۔ میری بوڑھی ہڈیوں میں اتنی جان کہاں کہ سارا پھیلاوا سمیٹ سکوں۔ تم اٹھو تو کچھ نہ کچھ دیکھ لینا، الماریوں کو بھی کھول کر دیکھ لینا۔ جانے کپڑوں کی کیا حالت ہوگی، میں ذرا باورچی خانے تک جارہی ہوں۔''

''جا ہی رہی ہیں تو گرم گرم کافی ہی پلادیں بوا جی! خوب کریمی اور میٹھی سی۔''

''اچھا، بھجواتی ہوں۔'' بوا جی اس کا ہر کام شوق سے کرتی تھیں۔

وہ باہر نکل گئیں تو اونی ٹوپی کو مزید کانوں تک کھینچتے ہوئے اس نے گردن لمبی کرتے ہوئے کھڑکی سے باہر جھانکا۔

وریشہ لان کے بیچوں بیچ بنی پختہ روش پر ٹہل رہی تھی۔ اور موبائل پر اپنی کسی دوست کے ساتھ باتوں میں خوب محو تھی۔

''پتا نہیں، اس لڑکی کو ٹھنڈ کیوں نہیں لگتی؟'' ماورا کو ہمیشہ کی طرح حیرت ہوئی۔ وریشہ نک سک سے درست، سرخ کوٹ اور سرخ مفلر میں سیاہ بال کندھوں تک بکھرائے بہت مزے میں لگ رہی تھی۔

''سرخ رنگ کتنا جچتا ہے وریشہ پر۔'' اس نے مسکراتے ہوئے سوچا۔

تب ہی گیٹ کھلا۔ ماورا بے ساختہ ہی ادھر متوجہ ہوئی۔

آنے والا کوئی اجنبی تھا۔ بھاری جیکٹ میں لمبا چوڑا وجود...

''کون ہوسکتا ہے؟'' ماورا اسے پہچان نہیں پائی۔ مارے تجسّس کے وہ کھڑکی کے قریب ہوئی تھی، عین اسی لمحے وریشہ پلٹی تھی، جانے کیسے اس کا پاؤں پھسلا تھا۔ وہ لہرا کر گرنے کو تھی کہ اجنبی نے اسے یوں تھاما جیسے پھولوں کی ڈال اس کے مضبوط بازوؤں میں آ گری ہو۔

''اللہ!'' ماورا کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ ایسا سین تو صرف ڈراموں، فلموں میں دیکھا تھا۔ آج حقیقت میں دیکھا تو دل بڑے زور سے دھڑک اٹھا تھا۔

وہ ساری سردی بھول کر کھڑکی سے چپک گئی۔

وریشہ چند ثانیے بعد سنبھلی تھی اور اب بُری طرح اس اجنبی پر برس رہی تھی، جو اسے صرف سہارا دینے کا گناہ گار تھا اور اب اس خوب صورت لڑکی کی ڈانٹ پھٹکار سن کر حیران اور ناراض ہورہا تھا۔

ماورا، وریشہ کو اچھی طرح جانتی تھی۔ وہ ہمیشہ ہر ناگوار بات، معاملات اور حادثات کا ذمے دار دوسروں کو ہی قرار دیتی تھی، خود تو وہ دودھ کی دھلی تھی۔

صد شکر کہ بوا جی نے مداخلت کی۔

کچھ کلمات کے تبادلے کے بعد بوا جی اس اجنبی کو لے کر گھر کے اندرونی حصے کی طرف بڑھ گئیں۔ وریشہ پہلے ہی وہاں سے جا چکی تھی۔

☆☆☆

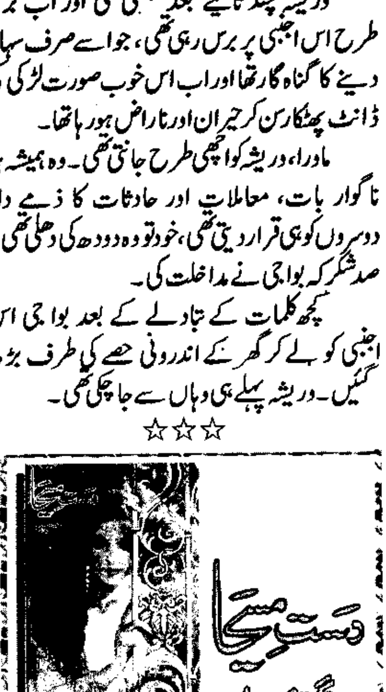

قیمت -/400 روپے

منگوانے کا پتہ

مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔ فون نمبر: 32735021

آتش دان میں لکڑیاں ایک تواتر سے جل رہی تھیں۔ وسیع وعریض، بھاری سازو سامان سے آراستہ ڈائننگ روم خاصا گرم تھا۔

دادی اور فارس ایک صوفے پر بیٹھے تھے۔ برابر کے صوفے پر وریشہ، روما سے جُڑی مسلسل کا جو کھا رہی تھی یا پھر بول رہی تھی۔

''ہاں بھئی فارس! کھانے میں کیا.....'' دادی کچھ پوچھ رہی تھیں، وریشہ نے سننے نہیں دیا۔

''فارس..... دی نائٹ، فاسٹ' سپیریٹر، عوام کے ہیرو.....'' اس سے قبل کہ فارس نام کو مزید کھنگالا جاتا، دادی نے ہولے سے کھنکھار کر اس کی سرگوشی پر تنبیہی انداز میں اسے دیکھا اور پھر دوبارہ سے مہمان کی طرف متوجہ ہوگئیں۔

فارس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ کو پھیلتے اور پھر غائب ہوتے دیکھ کر جہاں ماورا کو ہلکی سی خفت نے گھیرا، وہیں وریشہ تپ کر رہ گئی تھی۔ کسی اور پہ بس نہ چلا تو کافی کا مگ ہی پٹخ دیا۔

''کسی کام کی کافی نہیں بنائی بوا نے، انتہائی بکواس۔''

''آپ دونوں جائیں کچن میں، بوا جی کی مدد کروائیں۔ فارس کھانا کھا کر جائے گا۔'' دادی نے دونوں سے مخاطب ہو کر کہا تھا۔

''فارس کھانا کھا کر جائے گا، ہونہہ.....!'' وریشہ باورچی خانے میں آتے ہی شروع ہوگئی تھی۔

''کیا ضرورت ہے بھلا اس قدر سر چڑھانے کی، اول تو اس گھر میں کوئی آتا نہیں اور اگر کوئی آجائے تو وبالِ جان ہی بن جاتا ہے۔ کافی پلادی، تواضع ہوگئی۔ اب اسے باہر کا راستہ دکھانے کے بجائے کھانا کھلانے بٹھالیں گی دادی اور وہ بھی مزے سے بیٹھ گیا ہے خاطر کروانے۔'' وریشہ سیب اٹھا کر دانتوں سے کتر رہی تھی۔

''بتایا تو ہے دادی نے، کئی برس بعد وطن واپس آیا ہے۔ پتا نہیں یہاں کوئی دوست، رشتے دار ہے بھی یا نہیں۔'' ماورا کبابوں کا پیکٹ نکالتے ہوئے بولی۔

''ایسے لوگوں کے لیے بڑے عالی شان ہوٹلز بنے ہوئے ہیں، اس لیے دوسروں کے لیے پرابلم بننے کے بجائے انہیں سیدھا وہاں جانا چاہیے۔'' وہ بڑی ڈھٹائی سے مشورہ دے رہی تھی۔

''اور یہ تم کہاں جارہی ہو؟ دادی نے ہمیں بوا جی کی ہیلپ کے لیے بھیجا ہے۔'' اسے باہر جاتے دیکھ کر ماورا نے یاددہانی کرائی۔

''سوری..... میں نے یہ ساری تیاری چولہے میں جھونکنے کے لیے نہیں کی اور نہ ہی مجھے کرٹسی نبھانے کا کوئی شوق ہے۔ تم جانو اور تمہاری یہ بوا۔''

وہ ہاتھ ہلا کر کہتے ہوئے کچن سے باہر نکل گئی تھی اور پیچھے ماورا رہ گئی تھی۔ جسے مروت دکھانے کا شوق خدا جانے تھا یا نہیں لیکن وہ وریشہ کی طرح بہادر اور بے دھڑک بھی نہیں تھی، اسی لیے کھانا بنانے سے لے کر کھانا لگانے تک وہ بوا جی کے ساتھ لگی ہی رہی۔

☆☆☆

فارس چلا گیا تھا، تایا ابو کے پارٹنر کا بیٹا تھا وہ' تایا ابو نے بہت سا سامان بھیجا تھا اس کے ہاتھ، وریشہ نے فرمائش کر کے منگوایا تھا سب کچھ..... ایک کے بعد ایک چیز کھولتی اور دیکھتی، شور مچاتی۔ کچھ پسند آیا اور کچھ ناپسند۔

ایسے میں خاموش بیٹھی ماورا پہ بے طرح لاڈ آیا تھا دادی کو اور شاید ترس بھی۔

''ماورا! تم بھی اپنے لیے کچھ دیکھ لو۔'' انہوں نے کھوئی ہوئی سی لڑکی کو پکارا جو کبھی بھی اپنے جذبات کا اظہار کھل کر نہیں کرتی تھی۔

''یہ کیا دیکھے گی، الماری بھری ہوئی ہے اس کی پیکڈ آئٹمز سے۔ دو چار جوڑے آٹھ دس موزے، ایک پرفیوم اور ایک گھٹیا کوالٹی کا لوشن۔ نہ وہ ختم ہو نہ اس سے جان چھوٹے اور چند ایک باوا آدم کے زمانے کے مفلر۔ اس کے سوا ان محترمہ نے استعمال ہی کیا کرنا ہے۔ حد ہوئی تو کسی فرینڈ کی برتھ ڈے پر اٹھا کر گفٹ کردے گی کچھ نہ کچھ.....''

''آں..... آں..... کیا فضول بولے جارہی ہو۔'' دادی نے گھبرا کر اسے ٹوکا پھر ماورا کو دیکھا،

کہیں دل پر ہی نہ لے لے۔

"کیا فضول کہا میں نے، پوچھ لیں اس سے جو ایک لفظ بھی جھوٹ بولا ہو، کیوں بیا ڈ ناں، بولو...... بولو......" وہ ہنستی ہوئی اسے اکسا رہی تھی۔

"کچھ بھی جھوٹ نہیں، سو فیصد سچ کہا تم نے۔"

وہ سدا کی ڈرپوک، ناراض ہو کر وریشہ کی ناراضی سہ سکتی تھی بھلا۔ سو کھلے دل سے کہہ کر مسکراتی ہوئی اٹھ گئی، لیکن اندر جانے کیوں خاموشی بڑھ سی گئی تھی۔

اتنی خاموشی کہ رات گئے تک آنے والی ہر آواز اس کے اعصاب کو جھنجوڑتی رہی۔

باہر سے گزرنے والی اکا دکا گاڑیوں کی آواز......

گھر سے اٹھتی برتنوں کی ہلکی سی کھنک......

دروازوں کے کھلنے اور بند ہونے کی دھمک۔

اور وریشہ کے پل پل بدلنے والے چینلز کی موہوم سی آوازیں......

نہ اعصاب پُرسکون ہوئے، نہ نیند آئی۔ یہاں تک کہ بے خوابی سے آنکھیں کڑوی اور پپوٹے بھاری ہو گئے تھے۔

نیم تاریک کمرے میں روشنی کے ہولے ہولے سے جھماکے رنگ بدلتے تھے۔ کبھی سرخ، کبھی نارنجی، کبھی نیلا رنگ......

وریشہ کی انگلی تلے دبا بٹن ہر چینل بدل دیتا تھا اور رنگ بھی۔

"وریشہ کو آج کچھ بھی پسند نہیں آرہا دیکھنے کے لیے۔" اس نے بے زاری سے کروٹ بدلی۔

"تمہیں نیند نہیں آرہی، تو ایکٹنگ کیوں کررہی ہو سونے کی۔" اسے بار بار کروٹ بدلتے دیکھ کر وریشہ نے ٹوکا۔

"تمہیں کچھ پسند نہیں آرہا تو اسے بند کیوں نہیں کر دیتیں۔"

"لو...... کردیتی ہوں۔"

"ہائیں۔" ماورا نے بمشکل آنکھیں کھول کر دیکھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وریشہ نے اس کے کہنے پر ایل ای ڈی آف کردی تھی۔

"بڑی بات ہے، آج ہماری بھی سنی گئی۔" دل ہی دل میں ایک گونہ خوشی محسوس کرتے ہوئے اس نے کروٹ بدلی۔

کھڑکی اس کی نظروں کے سامنے تھی جس پر اس وقت بھاری پردہ گرا ہوا تھا۔ ماورا کو اچانک ہی آج صبح ہونے والا واقعہ یاد آیا تھا تو وہ بے اختیار ہی مسکرا دی۔ گردن موڑ کر وریشہ کو دیکھنے کی کوشش کی، پھر پکار اٹھی۔

"وریشہ......!"

"ہوں۔"

"آج جب فارس آیا تھا۔" اس نے جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑا۔

"ہوں......"

"تم گرنے والی تھیں، پھر ایک دم سے اس نے تمہیں تھام لیا۔ کتنی رومانٹک سچویشن لگ رہی تھی، تمہیں کیسا فیل ہوا؟" اپنی بات کے جواب میں اس نے چند لمحے انتظار کیا۔ دوسری طرف سے گہری سانسوں کی آواز آرہی تھی۔

وریشہ اتنی جلدی کبھی نہیں سوتی تھی، ماورا کو اچنبھا ہوا تو دوبارہ پکار بیٹھی۔

"وریشہ!"

"واٹس رانگ ود یو؟ سونے کیوں نہیں دے رہیں؟" وریشہ نے بری طرح جھڑکا تھا اسے۔

ماورا کو بے حد برا لگا تھا اس کا انداز، اندھیرے کمرے میں کچھ پل خود پر ضبط کرنے میں بیت گیا تھا۔

"یہ لڑکی ہے ہی بدتمیز! میں آئندہ اس سے کبھی بات نہیں کروں گی۔" اس نے دل ہی دل میں پکا فیصلہ کرتے ہوئے رخ موڑ لیا تھا۔

☆☆☆

اونچی چھت والے ڈائننگ ہال میں موم شمعیں جلا کر رات کا کھانا تب ہی کھایا جاتا تھا جب روما دادی اپنے کمرے میں پڑے پڑے گھبرا جاتیں یا پھر گئے وقتوں کی یادانہیں جی بھر کے ستاتی۔ تب وہ بوا جی سے کہہ کر اپنی پسند کی کئی ڈشز بنواتیں اور جب اونچی سی

مور پنکھ والی کرسی پر بیٹھ کر وہ ہر ڈش کو ذرا ذرا سا چکھتیں تو ماورا کو ان میں ملکہ وکٹوریہ کی سی جھلک دکھائی دیتی۔

آج بھی موم شمعیں روشن تھیں۔ میز پر ایک سے زیادہ سالن، چاولوں کی ڈش اور دو تین طرح کے سلاد دیکھ کر وریشہ نے آنکھیں مٹکائیں۔

"اوہو...... روما دادی کا موڈ آج پھر سے رومانٹک ہوگیا، یعنی دے جے نامہ شروع۔ دو گھنٹے تو کہیں نہیں گئے مارو! ڈو سم تھنگ یار! میں اتنا بور نہیں ہوسکتی۔"

ماورا کے کچھ کہنے یا کرنے سے قبل ہی دادی کی انٹری ہوچکی تھی۔

"گارڈ کو کھانا بھجوادیا؟" انہوں نے آتے ہی حسب عادت پوچھا۔

"بھجوادیا ہے۔" بوا جی نے پلیٹ ان کے سامنے رکھتے ہوئے آواز بلند کہا۔ پھر سرگوشی۔

("وہ کہاں کا مائی باپ ہے، جو سب سے پہلے اسے بھجواتی......")

"اس کی الیکٹرک کیتلی خراب ہوگئی ہے، آج پیغام بھجوایا ہے اس نے۔ گرم پانی کا فلاسک بھر کر دے آنا، سردی بہت ہے۔ رات میں کئی بار چائے پیتا ہے۔"

"مفت کی چائے ہے، کیوں نہیں پیے گا۔ گھر کے پچھواڑے پورا خاندان آباد ہے اس کا، مجال ہے کبھی وہاں سے کچھ منگوالے اپنے لیے۔" بوا جی کی نیچی آواز ......وریشہ کھی کھی کرکے ہنس دی، ماورا نے مسکراہٹ لبوں میں دبالی۔

دادی کے تاثرات میں البتہ کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی تھی۔

"خاصا ایکٹو رہتا ہے، میں نے رات میں کئی بار اٹھ کر دیکھا ہے۔"

"دادی! اس بار ڈیڈ آئیں۔ تو ان سے کہیں مجھے گاڑی لے کر دیں۔" وریشہ نے موضوع تبدیل کرنے کے لیے فوراً کیا۔

"سطوت حسین کا فون سن کر آرہی ہوں، سخت خفا ہو رہے تھے کہ فارس واپس کیوں چلا گیا؟ بتا رہے تھے کہ یہاں اس کا کوئی دوست، رشتے دار نہیں ہے اور اسے یہیں ہمارے ہاں قیام کرنا تھا۔ یہ اور بات کہ سطوت حسین مجھے فون کرکے بتانا بھول گئے، اب بتاؤ بھلا۔ مجھے کیا خبر تھی؟ نہ اس لڑکے نے تذکرہ کیا نہ میں نے اصرار کیا، سرسری طور پر کہا بھی لیکن......"

دادی کی بات طوالت اختیار کرگئی تھی۔

ماورا نے وریشہ کو دیکھا، وہ کھانے میں مگن نظر آرہی تھی۔ "گویا نو رسپانس" ماورا کو پتا تھا، کھانا ختم ہوتے ہی اسے کوئی بہت ہی ضروری کام یاد آجائے گا یا پھر پیٹ درد کی شکایت اور کچھ نہیں تو ماورا کے موبائل سے وریشہ کا نمبر ڈائل ہوگا اور وہ ایکسکیوزمی کہتی یہ جا وہ جا۔ لیکن حیرت انگیز طور پر وریشہ بیٹھی ہوئی تھی، کھانا ختم ہونے کے باوجود......

"تو اس میں اتنی پریشانی کی کیا بات ہے؟ آپ فون کرکے بلالیں اسے۔ فون نمبر تو ہوگا نا آپ کے پاس؟" وریشہ سرسری سے انداز میں کہہ رہی تھی۔

بڑی بات تھی، آج وہ روما دادی کی باتیں سن رہی تھی۔

"نہیں، نمبر نہیں ہے میرے پاس۔ سطوت حسین سے کہتی ہوں، اسے فون کرکے دوبارہ آنے کا کہیں......"

"ہوں، ٹھیک ہے۔ بوا! چاول ذرا کچے رہ گئے شاید، کھاتے ہی پیٹ میں درد ہونے لگا۔" وریشہ نے کرسی گھسیٹی تو بوا جل کر بولیں۔

"تو پھر جا کہاں رہی ہو بٹیا! بیٹھو ذرا، اجوائن کا قہوہ بنا کر لاتی ہوں۔"

"کمرے میں جارہی ہوں، وہیں لے آیئے گا۔ اب تو بیٹھا بھی نہیں جارہا۔"

وہ دائیں آنکھ دبا کر کہتی ہوئی وہاں سے اٹھی، بوا البتہ اپنی جگہ سے نہ ہلیں۔ انہیں معلوم تھا قہوہ لے بھی گئیں تو صبح کو جوں کا توں وہیں پڑا ملے گا جہاں رات کو وہ رکھیں گی۔ سو آرام سے بیٹھی اپنا ہی پکایا مزا لے لے کر کھاتی رہیں۔

"اس لڑکی پر میں نے بہت محنت کی لیکن پھر بھی اسے مینرز کو ناٹو کرنا نہیں آیا۔ اس معاملے میں انگریز قوم کا کوئی ثانی نہیں......ایٹی کیٹس میں۔" ماورا اپنی

پلیٹ میں موجود چاول گننے لگی تھی۔
"پتا نہیں...... بوا جی کے پکائے چاول کھا کر میرے پیٹ میں درد کیوں نہیں ہوتا۔" وہ بے چارگی سے سوچ رہی تھی۔

☆☆☆

تب ہی فارس چلا آیا تھا، ویسا ہی سنجیدہ و مدبر، جیسا وہ تھا۔
ماورا نے مسکرا کر اس کے سلام کا جواب دیا اور میز پر پڑی کتابیں، اٹھا کر الماری میں رکھنے لگی۔ وہ دادی کے برابر بیٹھا ان کا احوال دریافت کر رہا تھا، بہت ٹھہرے انداز میں، مدھم لہجے میں بولتا تھا وہ۔
"کہاں رہے اتنے دن؟ سطوت حسین مجھ پر خفا ہو رہے تھے کہ تمہیں جانے کیوں دیا؟ اس شہر میں تو غالباً تمہارا کوئی دوست، رشتے دار بھی نہیں ہے۔" دادی پوچھ رہی تھیں۔
"اُف...... وہی ہزار بار کا تذکرہ، کاش اس کا کوئی دوست، رشتے دار ہوتا یہاں۔" ماورا نے الماری بند کر کے دو کتابیں دادی کے بیڈ کی سائڈ ٹیبل پر رکھیں۔ یہ دونوں کتابیں آج کل ان کے زیر مطالعہ تھیں۔
"ایسے لوگوں کے لیے بڑے عالی شان ہوٹلز بنے ہوئے ہیں، اس لیے میں نے سوچا دوسروں کے لیے پرابلم بننے کے بجائے سیدھا وہیں چلا جاؤں۔"
وہ باہر نکلنے کے لیے دروازے کا ہینڈل گھما رہی تھی جب اس کے کانوں نے سنا...... ایک پل کے لیے تو بات سمجھ میں نہ آئی اور جب آئی تو وہ جھٹکے سے اس کی طرف پلٹی۔
وہ نہایت اطمینان سے دادی کی طرف رخ موڑے بات کر رہا تھا۔ ماورا کو پلٹتے دیکھا تو بے ساختہ ہی اس کی طرف متوجہ ہوا۔
ماورا نے بغور دیکھا، اس کے چہرے پر کسی طنز، کسی شکایت کا کوئی تاثر نہ تھا۔ وہ چند لمحوں کے لیے الجھی اور پھر فوراً باہر نکل آئی۔
"تو کیا اس نے وہ ساری باتیں سن لی تھیں؟" وہ کمرے سے باہر آ کر رکی نہیں، سیدھی چلتے ہوئے کچن تک آئی۔ بوا کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اور مہمان کو تواضع کے بغیر جانے دینا اس گھر کی ریت نہ تھی سو وہ خود سے الجھتی، کشمکش میں ڈوبی چائے کی ٹرالی تیار کرنے لگی۔
"شک کی گنجائش تو نہیں، من و عن وہی الفاظ تھے جو اس دن وریشہ نے کہے تھے۔" وہ عجیب سی پشیمانی میں گھری تھی (حساس لوگوں کا المیہ...... کچھ نہ کر کے بھی خود کو قصوروار سمجھنا، ایویں...... بس)
ملازم کو چائے سرو کرنے کا کہہ کر وہ لان میں اترتی سیڑھیوں پر جا بیٹھی۔
وریشہ آج گھر پر نہیں تھی، اپنی دوستوں کے ساتھ پکنک پر گئی ہوئی تھی۔ شام کو واپسی کا وعدہ تھا اور اب...... اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ شام اپنے آخری کنارے پر پہنچ چکی تھی، تیز ہوا کا جھونکا سا آیا تھا۔
نم آلود اور سرد ہوا، موسم کے تیور ٹھیک نہیں تھے۔
"وریشہ کو اب آ جانا چاہیے، موسم خطرناک ہے۔" اس نے فکرمندی سے سوچا اور سر پر رکھی ٹوپی کو کانوں تک مزید کھینچ لیا۔
تب ہی وہ تیز تیز قدم اٹھاتا اس کے قریب سے گزرا تھا۔ ماورا نے دانستہ نگاہ نہ اٹھائی، کچھ دیر قبل فراموش ہو چکی پشیمانی ایک بار پھر عود کر آئی تھی۔
وہ سیڑھیاں پھلانگ کر لان کی پتھریلی روش پر پاؤں رکھ چکا تھا۔ پھر ایک دم سے ٹھٹک گیا، یوں جیسے اس کی موجودگی کا احساس چند لمحوں بعد ہوا ہو لیکن نہیں، وہ اپنی جیبیں ٹٹول رہا تھا، پھر ایک دم سے پلٹا۔
اب چھپا نہیں جا سکتا تھا، سو رسمی سی مسکراہٹ چہرے پر سجائے اٹھ کھڑی ہوئی۔
"میں چابیاں وہیں کمرے میں بھول آیا ہوں۔" اس نے اپنے رکنے کی وجہ بتائی تھی۔
"موسم ٹھیک نہیں، آپ کچھ دیر رک جاتے۔" اگلے چند لمحوں میں چابیاں اس کی طرف بڑھاتے ہوئے اس نے بڑے خلوص سے کہا تھا۔
وہ جو سر اٹھائے آسمان کے بدلتے رنگوں کو دیکھ رہا تھا، اس کی بات پر نظروں کا زاویہ بدل کر چند

ثانیہ بڑی خاموشی سے اسے دیکھتا رہا لیکن صرف لب خاموش تھے، آنکھیں تو بہت کچھ کہہ رہی تھیں۔ اس نے شرمندگی میں گھر کر نظریں جھکا لیں۔

''آپ نے اس دن ہماری باتیں سن لی تھیں؟''

فارس نے ذرا سا مسکرا کر سر جھٹکا۔

''دانستہ نہیں، میں صرف فون کال سننے کے لیے باہر آیا تھا۔''

''اسی لیے آپ اتنے دنوں سے نہیں آئے؟ اور سطوت انکل نے کئی بار آپ کے آنے کا پوچھا تھا۔''

''نہیں، صرف یہ ہی وجہ نہیں تھی۔ میں کچھ مصروف بھی رہا۔''

''آئی ایم سوری فارس صاحب! لیکن وریشہ نے یہ سب مذاق میں کہا تھا۔'' اس کی بات پر فارس نے تعجب سے اسے دیکھا۔

''یہ سب وریشہ نے کہا تھا؟''

''جی...... میں نے تو نہیں کہا تھا۔''

''تو پھر ایکسکیوز آپ کی طرف سے کیوں؟'' اس کے قدرے حسابی کتابی انداز نے ماورا کو پریشان کر دیا تھا۔

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟'' اس نے حیرت سے کندھے اچکائے۔

''دوسروں کی غلطیاں اپنے کھاتے میں ڈالنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' وہ اس سے بڑھ کر حیران تھا۔

''پتا نہیں، میں کبھی ایسے حسابوں کتابوں میں نہیں پڑی، اتنی جمع تفریق مجھ سے نہیں ہوتی۔'' وہ قدرے کنفیوز نظر آئی۔

وہ لب بھینچے اسے دیکھتا رہا۔

ماورا نے بھی اسے دیکھا تھا اور پھر اس کے عقب میں کھڑے درختوں کو، جو تیز ہوا میں مست تھے اور اپنی شاخیں آسمان کی وسعتوں میں پھیلاؤ جھوم رہے تھے پھر وہ مسکرایا تھا۔ بڑی اداس لیکن پُرخلوص مسکراہٹ۔

''بے غرض ہو اور سادہ دل بھی۔'' وہ ہولے سے بڑبڑایا۔ پھر پلٹا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس سے دور ہوتا چلا گیا۔ سیاہ گھور بادل آسمان پر چھاتے چلے گئے اور تاریکی لحہ بہ لحہ گہری ہوتی چلی گئی۔

ماورا اسی زاویے میں وہاں کھڑی رہی تھی۔ سرد، تیز اور نم آلود ہوا میں بہت دیر تک...... یہاں تک کہ بارش کا پہلا قطرہ اس کی ناک پر گرا۔ تب اسے احساس ہوا۔ سردی بہت زیادہ تھی اور وہ بری طرح کپکپا رہی تھی۔

اسے لگا وہ کسی خواب سے جاگی ہے......

بارش کے قطرے ٹپاٹپ برسنے لگے تھے۔ وہ بھاگ کر اندر چلی آئی۔

☆☆☆

وریشہ آئی تو اس کے ساتھ اس کی دو۔ سہیلیاں بھی تھیں۔ ان تینوں کے آتے ہی گھر میں ہنگامہ سا مچ گیا تھا۔ ادھ سوئے ملازم دوبارہ جاگ گئے، کچن آباد ہو گیا۔

شاور، کپڑے، چائے، کھانا، کافی...... خاطر داری کا لمبا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ وہ دونوں لڑکیاں بہت باتونی تھیں (ظاہر ہے وریشہ کی فرینڈز تھیں تو......) ہنستیں تو ہنسے چلی جاتیں۔ بات بے بات ہاتھ مارتیں، ذرا ذرا سی دیر میں انہیں بھوک لگنے لگتی۔

ماورا نے کچھ دیر بادل نخواستہ ان کا ساتھ دیا پھر وہ گھر دیکھنے کے ارادے سے اٹھیں تو ماورا چپکے سے اپنے کمرے میں چلی آئی۔ وریشہ نے اس کے جانے کا خاص نوٹس نہ لیا اور نہ ہی ماورا کو توقع تھی سو آرام سے اپنی اسکیچ بک نکال کر کمبل میں آ چھپی۔

اسے ایک ادھورا اسکیچ مکمل کرنا تھا لیکن جب ہاتھ رواں ہوا تو وہ مزید اسکیچز بناتی چلی گئی۔ بغیر تھکے، بنا سر اٹھائے، وہ ایک ہی چہرہ تھا۔ انداز مختلف تھے۔ ایک خوب صورت مردانہ چہرہ جس کے اسکیچز وہ ہر ہر انداز سے بناتی تھی۔ کبھی ترچھا، کبھی سیدھا، کبھی مسکراتا، کبھی اداس، کبھی سوچ میں ڈوبا، کبھی سر اوپر اٹھائے، کبھی تھوڑی سینے سے لگائے، کبھی عمر کے دو سال آگے، کبھی عمر کے دو سال پیچھے...... وہ نم آنکھوں سے یہ اسکیچز بناتی تھی، یہاں تک کہ آنکھیں چھلک جاتیں اور وہ اسکیچ ادھورے چھوڑ کر

اسکیچ بک بند کر دیا کرتی۔
یہ ہی وجہ تھی کہ ان اسکیچز پر کہیں کہیں اس کے آنسوؤں کے دھبے صاف دکھائی دیتے تھے۔ آج کا اسکیچ بہت متاثر کن تھا، جیکٹ کے کالرز بناتے ہوئے وہ ذرا سا چونکی۔
''یہ جیکٹ؟ میں نے آج دیکھی ہے...... کہاں...... کس کی؟'' اور اگلے ہی پل ایک جھپاکے سے سب یاد آ گیا۔
دل نے ایک بیٹ مس کی تھی۔
''ایسا کیا یاد آ گیا؟'' اس نے پنسل اسکیچ بک پر گرا کے ایک دم ہی سینے پر ہاتھ رکھا۔ آنکھیں زور سے میچیں، کھولیں لیکن وہ منظر تھا کہ آنکھوں سے ہٹتا ہی نہ تھا۔ کچھ ہوا تھا۔ ایسا عجیب اور انوکھا، جو ماورا کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ اس نے اسکیچ بک بند کر کے الماری میں چھپائی اور کھڑکی سے آ لگی۔
رات بہت تاریک تھی، بارش بند ہو گئی تھی لیکن آسمان پر چاند، تاروں کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ اس نے فرصت سے اس منظر کو سوچا۔
وہ اس کے سامنے کھڑا تھا اور ماورا جیسے ابھی بھی اسے وہاں کھڑے دیکھ رہی تھی۔ اس کی سیاہ جیکٹ، گردن کے گرد لپٹا سرمئی مفلر، دراز قد، اس کی آنکھیں، اس کی مسکراہٹ اور اس کے عقب میں جھومتے، شور مچاتے درخت، دم بدم بڑھتی تاریکی، امڈ کر آتے سیاہ بادلوں کے دل کے دل...... اور اس کے ملبوس سے اٹھتی کلون کی ہلکی سی مہک جو ہوا کے ہر جھونکے کے ساتھ اس تک برابر پہنچ رہی تھی۔
کیا تھا اس شام کے آخری لمحات میں؟
ماورا کو لگا، اس کا وجود ریت بن کر ہولے ہولے بہہ رہا ہے۔ وہ گم صم تھی اور شاید اداس بھی۔
یہ جاتے موسم کی آخری بارش تھی اور آتے موسم کی پہلی انگڑائی۔
بارش کے ساتھ ساتھ ساری دھند بھی چھٹ گئی تھی۔ سورج بادشاہ چمکا تو اس کی کرنوں سے وادی کا کونا کونا چمک اٹھا تھا۔ سردی سے مردہ ہوتے سبزے نے ایک بار پھر سر اٹھانا شروع کر دیا۔ خودرو پودے پتھروں کے بیچوں بیچ نمو پانے لگے تھے۔ اس روز درختوں پر پرندوں کا شور ہر روز سے زیادہ تھا۔ وہ ہلکے پھلکے لباس میں اونچے نیچے راستوں پر قدم رکھتی الیاس کی طرف جا رہی تھی۔
الیاس ایک آرٹسٹ تھا۔ شہر کے مشہور بازار میں فٹ پاتھ پر اپنی دکان سجاتا تھا۔ دو اسٹول اور ایک میز، ہاتھ میں پنسل اور ارد گرد اسکیچز ہی اسکیچز...... دور دراز سے آنے والے سیاح، مقامی لوگ، طلبہ و طالبات، محبت اور محبوب، ہر کوئی اس سے اسکیچ بنواتا تھا۔ اس کا پنسل ورک کمال کا تھا، تصویر کو دیکھ کر لگتا تھا، ابھی بول دے گی۔
ماورا اس کے کام کی دیوانی تھی۔ اکثر ہی فٹ پاتھ کے کنارے رک کر اس کے چلتے ہاتھوں کو دیکھتی۔ رفتہ رفتہ شناسائی بڑھی تو الیاس کے گھر کا راستہ بھی دیکھ لیا تھا۔ وہ اس سے وقتاً فوقتاً کچھ نہ کچھ پوچھتی، سیکھتی رہتی تھی۔ آج کے دن وہ کام سے چھٹی کرتا تھا۔ اسے گھر میں بیمار ماں کے بہت سے کام نمٹانا ہوتے تھے۔
''یہ سب کیوں لائی ہیں آپ؟'' اسے لدے پھندے دیکھ کر الیاس نے عادتاً برا مانا۔ ''یہاں کون ہے یہ سب کھانے والا؟''
''میں ہوں، تم ہو اور امی بھی تو ہیں۔'' وہ شاپرز کھول کھول کر چیزیں ٹھکانے پر رکھنے لگی۔
پھل، جیم، ڈبل روٹی، انڈے اور ایسی دوسری کئی چیزیں۔
''یہ دیکھو، یہ تمہارے لیے۔'' اس نے چاکلیٹس اور کافی کا بند ڈبہ اس کے سامنے رکھا۔
''مجھے یہ سب اچھا نہیں لگتا۔'' وہ سیلف میڈ لڑکا ماتھے پر بل ڈالے بیٹھا تھا۔
''مجھے اچھا لگتا ہے، دکھاؤ...... آج کل نیا کیا بنا رہے ہو؟'' وہ اس کے کمرے میں چلی آئی۔
الیاس اسے اپنی نئی تھری ڈی کلیکشن دکھانے لگا تھا۔ دو تین گھنٹوں کے گزرنے کا پتا بھی نہیں چلا تھا۔

یہ اور بات کہ جب وہ شاداں وفرحاں سی واپس لوٹی تو گھر کے باہر کھڑی گاڑی کو دیکھ کر قدم خود بخود دست پڑ گئے۔

''یہ گاڑی؟''

''فارس صاحب کی ہے؟'' اس کے سوال پر گارڈ نے بتایا تھا۔

''کتنی دیر ہوگئی آئے ہوئے؟''

''یہی کوئی آدھا، پونا گھنٹہ......''

''آدھا، پونا گھنٹہ......'' ماورا نے کندھے جھٹکے اور طویل سانس لے کر گھر میں داخل ہوئی۔ وہی وقت تھا۔ جب وہ گھر واپسی کے ارادے سے اٹھی تھی اور الیاس گرما گرم چائے لے کر آ گیا۔

''اس سے بُری چائے تو شاید ہی کبھی مجھے پلا سکو الیاس؟'' چائے کی مٹھاس کڑواہٹ بن گئی تھی۔

لان خوب آباد تھا، دادی، وریشہ اور وہ...... فارس بھی۔

''ارے کہاں گم تھیں، بڑی دیر لگادی تم نے۔'' وریشہ نے اسے دیکھتے ہی ہاتھ ہلایا۔

''ہاں واقعی دیر تو ہوگئی۔ (کاش کچھ دیر پہلے آ گئی ہوتی)۔'' ماورا نے سبھاؤ سے کہتے ہوئے کن اکھیوں سے فارس کو دیکھا۔

وہ گردن ترچھی کیے لان میں اُتر آنے والی بلبلوں کو دیکھ رہا تھا۔

مختصر لیکن بھرپور سی نگاہ میں ماورا نے اس کے نقوش ازبر کیے اور پھر دادو کے برابر بیٹھ گئی۔

''ارے، تم سی آدم بےزار کو کون سی دوست بھا گئی جس کے ساتھ اتنا ٹائم اسپنڈ کر کے آ رہی ہو۔'' وریشہ نے حسب عادت اسے چھیڑا۔

''آپ کب آئے؟'' فارس سے نگاہ ملی تو ماورا نے سوال کیا۔ فارس سے قبل وریشہ بول اٹھی۔

''گھنٹہ بھر ہوگیا، ہر دو منٹ بعد ''میں جا رہا ہوں'' کی تھریٹ دے کر اتنا وقت گزار لیا۔''

''اوہوں......'' دادی نے گھورا۔ ماورا نے بھی شپٹا کر فارس کو دیکھا۔

وہ وریشہ کی بات سن کر ہنستے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ میز سے گاڑی کی چابی اٹھاتے ہوئے سن گلاسز لگائے۔

''لو بھئی، اب تو میں واقعی گیا۔''

''آئیے آئیے، آپ کو باہر کا راستہ دکھادوں۔'' وریشہ بھی ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''او مائے گاڈ، وریشہ...... وریشہ......!! یہ تم اتنی ال مینرڈ کب سے ہوگئیں۔'' دادی نے گھر کا مگر وریشہ نے کہاں سنا۔

قلقل کرتے پہاڑی جھرنے کی طرح ہنستی، قہقہے لگاتی وہ فارس کو گیٹ تک چھوڑنے جارہی تھی۔ ماورا نے ان دونوں کو جاتے دیکھا اور پھر ٹوکری میں سے سرخ سرخ اسٹابری اٹھا کر کھانے لگی۔

☆☆☆

اور پھر بہت سے دیگر رونما ہونے والے واقعات میں سے ایک واقعہ یہ بھی رونما ہوا کہ بہت عجلت میں سڑک پار کرتے ہوئے وریشہ گاڑی کے نیچے آتے آتے بچی تھی۔ وہ بھی یوں کہ اگر گاڑی کا ڈرائیور بریک لگانے میں ایک سیکنڈ کی بھی دیر کر دیتا تو وریشہ کا پتا کٹ چکا ہوتا۔

بریک کی زور دار چرچراہٹ، پر لوگ چاروں اطراف سے بھاگے آئے اور پھر مایوس ہو کر لوٹ گئے کہ جس تماشے کی توقع انہیں تھی، وہ وقوع پذیر نہ ہوا تھا۔ الٹا وہ ساحر گاڑی سے اترا اور گاڑی کے نیچے آنے سے بچ جانے والی میں زندگی کی نئی روح پھونک کر، سڑک کنارے کھڑی زرد ہوتی، لرزتی، کانپتی لڑکی کو کاندھوں سے تھام کر گاڑی میں بٹھا، یہ جا، وہ جا۔

اور اب وہ تینوں ایک ریستوران کے پرسکون ماحول میں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔

''اُف...... آج تو مرتے مرتے بچی۔'' بڑے سے بڑے واقعے کو چٹکیوں میں اڑانے والی وریشہ ہی ہوسکتی تھی۔ ماورا ابھی تک فق چہرہ لیے گم صم سی بیٹھی تھی۔

''کبھی گرتے گرتے اور کبھی مرتے مرتے...... میں ہر دفعہ بچانے نہیں آؤں گا۔'' فارس نے انگلی اٹھا کر تنبیہ کیا۔

''دیکھیں گے۔'' وریشہ نے کندھے اچکائے اور آئس کریم کھانے لگی۔
ماورا یوں ہی پیالے میں چمچ چلا رہی تھی۔
وہ بیت جانے والے واقعے سے بہت دیر تک متاثر رہتی۔ ہمیشہ سے ہی، صرف آج کی بات نہ تھی۔
''اگر کچھ ہو جاتا؟'' کچھ ہو جانے کا انجانا سا خوف اس کے ساتھ پل کر جوان ہوا تھا۔
''آپ کیا کرتی ہیں ماورا؟'' پچھلی کئی ملاقاتوں کے بعد آج وہ پہلی بار اس سے براہ راست مخاطب ہوا تھا۔
اپنے ہی خیالوں، خدشوں میں گھری ماورا نے سر اٹھا کر فارس کو دیکھا۔
''اس نے کیا کرنا ہے؟ کالج جاتی ہے، صرف اور صرف بواجی پر رعب جمانے کے لیے۔ وہ خاصی متاثر ہیں اس کی پڑھائی سے، حالانکہ یہ پڑھتی وڑھتی خاک نہیں۔'' وریشہ بیٹھی تھی اسے متعارف کرانے کے لیے۔
ماورا نے لب بھینچ لیے......
''ایسے کیا دیکھ رہے ہیں؟ سچ کہہ رہی ہوں۔ کلاس میں بھی بیٹھی تصویریں بناتی رہتی ہے۔ یقین نہ آئے تو اس کی فائل اٹھا کر دیکھ لیں۔ سارے اسائنمنٹ پیپرز اسکیچز سے بھرے ہوئے ہیں، کتابوں کے ہر صفحے پر کوئی نہ کوئی تصویر۔ دن میں ہی نہیں، راتوں میں بھی اٹھ اٹھ کر بناتی ہے۔''
ماورا کو دھندلا سا دکھائی دینے لگا تھا۔
''اس نے مجھے دکھائے نہیں اسکیچز، لیکن میں نے خود ہی دیکھ لیے۔ پتا نہیں کون ہے، لیکن ہے بہت پیارا۔''
مزید بیٹھے رہنا محال تھا، آنسو چھلک جاتے تو پھر سنبھالے نہ جاتے۔
''میں گھر جا رہی ہوں۔'' وہ بمشکل کہہ سکی۔
''بُری بات ہے وریشہ! تم نے......'' فارس کچھ کہہ رہا تھا، بھاری دروازے کو دھکیل کر باہر نکلتے ہوئے اس نے سنا مگر رکی نہیں۔ حلق میں پھندا سا پڑنے لگا تھا۔

وہ تیز تیز قدموں سے چلتی رہی، عقب میں گاڑی کا ہارن بجتا رہا۔ اس کا دل نہ چاہا گاڑی میں بیٹھنے کو۔
یہاں تک کہ گاڑی اس کے سامنے آ کر اس انداز سے رکی کہ اسے ٹھہر جانا پڑا مجبوراً۔
''ماورا! گاڑی میں بیٹھیں، پلیز۔'' وہ سامنے کھڑا تھا، لہجے میں اس قدر اصرار تھا کہ وہ بیٹھ گئی۔
وریشہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھی تھی۔
ماورا نے دیکھا نہیں لیکن وہ اندازہ کر سکتی تھی، وریشہ کا موڈ کیسا ہوگا۔
راستے بھر گاڑی میں خاموشی طاری رہی، فارس نے ایک آدھ بار ماحول تبدیل کرنے کی کوشش کی پھر وہ بھی چپ ہو رہا۔

☆☆☆

''اس قدر موڈ کیوں بنا لیا تھا تم نے؟ ایسی کون سی بات کہہ دی تھی میں نے؟''
ساری دوپہر سپاٹ چہرہ، سرد لہجہ رکھنے والی وریشہ اب تند لہجے میں اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔ وہ اپنا دھیان بٹانے کے لیے کانچ کے انتہائی نازک اور نفیس ڈیکوریشن پیسز سامنے رکھے ان کی صفائی کر رہی تھی۔ یہ اس کا اپنا شوق تھا، وہ انہیں خود ہی سجاتی، خود ہی سنوارتی تھی۔
''موڈ نہیں بنایا تھا، پریشان تھی میں۔'' جذبات میں ٹھہراؤ آ چکا تھا سو اس نے بڑی متانت سے جواب دیا۔
''جھوٹ مت بولو، پریشان ہوتیں تو یوں وہاں سے اٹھ کر نہ چلی جاتیں۔ اسی پریشانی کو ریلیز کرنے کے لیے فارس ہمیں آئس کریم کھلانے لے گیا تھا، لیکن تم ہم دونوں کی پروا کیے بغیر اٹھ کر چلتی بنیں۔''
وریشہ سخت غصے میں بول رہی تھی۔ ماورا نے چپ رہنا ہی مناسب سمجھا۔
''اور...... میں نے ایسی کون سی غلط بات کہہ دی تھی، نہیں بناتیں تم اسکیچز کسی لڑکے کے۔ الماری بھری ہوئی ہے تمہاری اور میں نے چوری چوری نہیں دیکھے تھے، تم خود الماری کھلی چھوڑ گئی تھیں اور فارس کے سامنے

تم نے یوں ری ایکٹ کیا کہ...... کیا سوچتا ہوگا وہ میرے بارے میں۔'' وہ انگلیاں چٹخا رہی تھی۔

ماورا نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ ''اور...... میرے بارے میں کیا سوچا ہوگا اس نے؟ کیسی لڑکی ہوں میں؟''

''تو تمہیں اس کی پروا کیوں ہونے لگی کہ تمہارے بارے میں کیا سوچا ہوگا اس نے؟'' وریشہ کے تلخ لہجے نے جیسے ٹھنڈا ٹھار پانی انڈیل دیا تھا اس پر۔

وہ کھلی آنکھوں سے بہت دیر تک وریشہ کو دیکھے گئی، یہاں تک کہ وہ خود ہی بک جھک کر اس کے سامنے سے ہٹ گئی۔ لیکن اس کا سوال جوں کا توں کھڑا تھا۔

''تمہیں کیوں پروا ہونے لگی کہ......''

''ہاں، مجھے کیوں پروا ہونے لگی؟'' وہ الجھن میں تھی۔ ابھی خود سے بھی ناواقف، بہت مدھم سی لو تھی، جو دل میں جلی تھی۔

ہلکی سی، میٹھی سی کسک تھی......

دل اسے دیکھنے کو مچلتا نہیں تھا، ہاں اسے دیکھنے کی چاہ ننھے منے خودرو پھولوں کی طرح دل میں سر اٹھاتی تھی۔

اس کی آواز کا زیر و بم، اس کا لہجہ، اس کا مسکرانا، اس کا چلنا، ٹھہرنا، بولنا سب کچھ تازہ رہتا تھا۔ اس کے جانے کے بعد بھی، اسے سوچنا اچھا لگتا تھا، کئی دن کی آس، امید، انتظار کے بعد اس کے قدموں کی آہٹ سننا، اسے اپنے سامنے کھڑا دیکھنا اسے نہال کرتا تھا۔

خود سے الجھتے رہنے کے بعد یہ سارے جواب اسے مل گئے تھے۔

''پروا تو ہے مجھے اس کی، محبت جو کرنے لگی ہوں۔''

رات گئے نم آنکھوں سے بے بسی کی انتہا کو چھوتے ہوئے اس نے اقرار کر بھی لیا مگر تب، جب وریشہ کو سوئے ہوئے کئی گھنٹے بیت گئے تھے۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یہ بات کہتی، اتنی جرأت، اتنا حوصلہ کہاں تھا اس میں۔ بہت کم ہمت لڑکی تھی، خود سے اقرار کے بعد رات بھر سو نہ پائی تھی۔

☆☆☆

ملگجا سا اجالا تھا اور چڑیوں کا بہت سا شور......

وہ دونوں پاؤں اوپر کیے جھولے پر بیٹھی تھی، آنکھیں بند کیے فطرت کے حسن کا ہر پہلو محسوس کر رہی تھی۔ صبح کی ہوا ٹھنڈی، خالص، پاکیزہ چڑیوں کا چہکنا، دور کسی پہاڑی پر کوئل کا کوکنا، سبز گھاس کی مہک اور ہلکی سی سرسراہٹ...... جیسے کوئی پاؤں دھرتا اور سبزے کو مسل کر پیچھے چھوڑ دیتا ہو۔

''ہیلو......!'' بھاری، مردانہ آواز۔

وہ بری طرح سٹپٹائی، آنکھیں کھولیں اور پھر گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ننگے پاؤں شبنمی آلود گھاس پر رکھے تو ٹھنڈک سے پورے بدن کو جھرجھری سی آ گئی، فارس مسکرا دیا۔

''ڈر گئیں؟''

''ہاں...... نہیں......'' دل بڑی زور سے دھڑک رہا تھا، خود کو سنبھالنے میں چند لمحے لگے تھے۔

''ہاں...... یا...... نہیں......'' وہ جاگنگ سوٹ میں تھا۔

ایک طویل سانس لے کر خود کو پرسکون کرتے ہوئے اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''آپ اتنا اچانک بولے تو......''

''میں تو جاگنگ کے لیے نکلا تھا، گیٹ کھلا دیکھا تو اندر چلا آیا۔'' ماورا نے گردن گھما کر دیکھا، گیٹ واقعی کھلا تھا۔

''آپ جاگنگ کے لیے اتنی دور آتے ہیں؟ اور یہاں تو کوئی جاگنگ ٹریک بھی نہیں۔'' اسے خاصی حیرانی ہوئی۔

''زمین جدھر کو بلاتی ہے، میں ادھر ہی بھاگا چلا جاتا ہوں۔ ویسے بھی میں صرف جاگنگ کے لیے اتنی دور نہیں آتا۔''

''تو پھر؟''

اس کے سوال پر وہ جواب دیے بغیر سر جھٹک کر مسکرا دیا تھا۔

''وریشہ تو سو رہی ہو گی ابھی؟''

''جی۔''

''اور دادو بھی۔''

''جی۔''

دل بجھ سا گیا تھا، بے دلی سے اس کے دونوں سوالوں کے جواب دیے تھے۔

''چلتا ہوں پھر؟'' وہ چند ثانیے کے لیے رکا، ماورا گھر کی تکونی چھت پر شور مچاتی ابابیلوں کو سنتی رہی یا گھاس پر گرے بے رنگ موتیوں کو اپنے پیروں سے مسلتی رہی۔

''وریشہ سو رہی ہے تو پھر کیا جواز رکنے کا؟'' اس نے منہ بسورتے ہوئے تب ہی سر اٹھایا جب وہ گیٹ پار کر چکا تھا۔

☆☆☆

بہت اداس سی شام تھی، وہ لان میں جھولے پہ آنکھیں بند کیے بیٹھی گویا پھر سے کسی کی آمد کی آس لگائے بیٹھی تھی لیکن ایسے خوش گوار واقعات ہر گھڑی رونما ہونے کے لیے نہیں ہوتے۔ وہ پل پل آنکھیں بند کرتی اور کھولتی رہی مگر جو نہ ہونا تھا، وہ نہ ہوا۔ یہاں تک کہ گلابی شام پہ سرمئی اندھیرا اترا اور سیاہی پوری وادی پر رات بن کر اتر آئی۔

وریشہ کسی سے فون پر بات کر رہی تھی، پہلے کھڑکی میں دکھائی دے رہی تھی پھر کوریڈور میں چکرانے لگی۔

''یہ لڑکی بہت خوش قسمت ہے۔'' اس نے بہت کوشش کی، آنکھوں میں آتی نمی کو روکنے کی، پر کہاں...... ان آنسوؤں پر بھی زور نہ چلا تھا اس کا بہے تو پھر بہتے چلے گئے۔

''وہ وریشہ کو دیکھنے آتا ہے، اس سے ملنے۔ ہاں وہ ایسی ہی ہے کہ اسے چاہا جائے۔

میں کون ہوتی ہوں، ایسی خواہش رکھنے والی۔ عام سی انتہائی عام سی لڑکی۔''

وہ وریشہ کو دیکھ رہی تھی اور جان بوجھ کر خود کو اذیت دے رہی تھی۔ جو نوکروں کی گود میں پل کر جوان ہو گئی۔ جسے ماں کی گود میسر آئی نہ باپ کی شفقت۔ جسے دکھ سہنے کا سلیقہ آتا ہے نہ خوشی کے اظہار کا۔ جس کی اپنی کوئی رائے، کوئی مرضی بھی تھی ہی نہیں۔ وریشہ جیسی ریفائنڈ پرسنلٹی کے سامنے، مجھ جیسی لڑکی کیسے دکھائی دے سکتی ہے۔'' وہ بہت تیزی سے جھولا جھول رہی تھی۔

''کاش میں بھی کسی انتہا کو چھونے والی لڑکی ہوتی، خوب صورتی کی انتہا کو چھوتی کوئی پری۔ ماورائی حسن کی مالک، جسے دیکھتے تو لوگ مبہوت ہو جاتے۔ چلو خوب صورتی نہیں تو بدصورت ہی سہی، میں چڑیل ہوتی یا ڈائن، جس سے لوگ امپریس ہوتے نہ ہوتے، خوف ضرور کھاتے۔''

وہ روتے روتے ہنس دی۔ عین اسی وقت اس نے وریشہ کو گاڑی میں بیٹھتے دیکھا۔ وہ کہیں جا رہی تھی۔

''پتا نہیں کہاں مصروف رہتی ہے، سارے دن میں کم ہی ملاقات ہوتی ہے، بات چیت بھی پہلے جیسی نہیں رہی۔'' وہ اٹھ کر اندر آ گئی۔

دل و دماغ پر عجب سی بے زاری سوار تھی، کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ نہ کھانا پینا، نہ کسی سے بات کرنا۔

''بوا کوئی تیسری بار اس سے کھانے کا پوچھنے آئی تھیں۔

''مجھے ابھی بھوک نہیں ہے، دل چاہا تو خود ہی لے لوں گی، آپ ریسٹ کریں۔'' اس نے پھر ٹال دیا۔

''ارے تم تو لے لو گی، اس مہارانی کا کیا کروں، وہ تو رات بارہ بجے بھی لوٹی تو پیٹ بھرنے کو میرا دروازہ ہی ٹھونکے گی۔ خدا جانے کہاں نکل گئی سر شام، ابھی تک نہیں لوٹی۔ اوپر سے ضد کر رہی ہے کہ گاڑی لے کر دیں۔ لو بھئی، گاڑی آ گئی تو سارے شہر میں اڑتی پھرے گی۔ نہ کوئی روکنے والا، نہ کوئی

ٹوکنے والا۔ کوئی میرے جیسا دو بول کہہ دے تو زمانے بھر کا برا...... ہاں بھئی......"

بوا بہت کچھ کہہ رہی تھیں۔ وہ اپنی ہی دھن میں اٹھی اور چلتے چلتے رومادادی کے پاس چلی آئی۔

وہ اپنی فزیوتھراپسٹ کو بھیج کر بڑے سکون سے اپنے بیڈ پر دراز تھیں۔ اس نے بھاری کشن گھسیٹا اور نیچے کارپٹ پر ہی بیٹھ گئی۔

"اونہوں......" دادی نے روکنے کی کوشش کی، انہیں مادرا کی یہ غریبانہ حرکتیں سخت ناپسند تھیں، جو بس کبھی کبھار ہی ظہور پذیر ہوتی تھیں۔ لیکن آج وہ بھی کچھ ڈھٹائی اختیار کیے ہوئے تھی۔

دادی نے چند باتیں کیں اور پھر ہوں، ہاں میں اس کا جواب سن کر چپ ہو گئیں۔

وہ بہت کم بولتی تھی، دل نہ ہوتا تو چند لفظ بھی منہ سے نکالنے بھاری لگتے۔ دادی مزاج آشنا تھیں، سو جلدی ہار مان گئیں۔

"دریشہ کہاں ہے؟"

"فارس کی طرف گئی ہے، ڈنر کے انوی ٹیشنز تھے۔ کہہ رہی تھی، فارس کے ساتھ ہی سب کو دے آئے گی۔"

مادرا نے بوجھل سی سانس لی اور گھٹنوں پر سر ٹکا دیا۔ بند آنکھوں سے سوچنے لگی۔

دریشہ اور فارس...... دونوں ساتھ ساتھ......

"کیسا لگتا ہوگا رات کے اولین پہر میں ان آنکھوں کو دیکھنا، جب نیند کا خمار پلکوں کو بوجھل کر دیتا تھا۔ کیسا تاثر دیتی ہوں گی وہ آنکھیں۔" اس نے حسرت سے سوچا اور شاید بول بھی دیا۔

"کیا ہوتا؟ اگر وہ مجھے بھی ساتھ لے جاتی، بس ایک نظر ہی دل کے خالی کشکول کو بھرنے کے لیے کافی ہوتی۔"

"کیا کہہ رہی ہو؟" دادی کی آواز نے چونکایا۔

"نہیں...... وہ...... میں......"

"نیند میں بول رہی ہو؟ جاؤ سو جاؤ۔" دادی نے سرسری نگاہ اس پر ڈالی۔ عینک ناک پر رکھی اور ضخیم کتاب کھول کر اس میں سر دے لیا۔

"نیند...... ہاں...... شاید آرہی ہے۔ چلتی ہوں، شب بخیر۔" دادی کا منہ چوم کر دعائیہ کلمات کہتی کمرے سے باہر نکل آئی۔

لیکن یہ اس کا وہم تھا، نیند نہیں آرہی تھی۔ بڑی کوشش کے باوجود، وہ کروٹیں بدل بدل کر تھک گئی، پھر کھڑکی میں آ بیٹھی۔

چاند اپنے جوبن پر تھا اور بہت قریب، دل چاہتا تھا ہاتھ بڑھا کر چھو لے، ہوا مدھم تھی مگر خوشبو دار۔ وہ چپ چاپ دم سادھے بیٹھی تھی، گھر سے باہر بل کھاتی دور تک جاتی سڑک بالکل خالی تھی پھر بہت دیر بعد اس پر گاڑی کی ہیڈ لائٹس چمکیں اور رفتہ رفتہ قریب ہوتی گئیں' یہاں تک کہ گیٹ کے باہر آرکیں۔

دریشہ گاڑی سے باہر آئی پھر وہ......

دونوں کے درمیان مختصر سی گفتگو کا تبادلہ ہوا۔

دریشہ گیٹ سے اندر آئی اور فارس گاڑی کی طرف مڑ گیا۔ گاڑی کا دروازہ کھول کر بیٹھنے سے ایک لمحہ قبل وہ رکا تھا۔

پھر پلٹا تھا......

گیٹ پر لگی لیمپ پوسٹس کی روشنی میں وہ با آسانی دیکھ سکتی تھی۔

اس نے سر اٹھایا اور وہاں دیکھا تھا، جہاں وہ بیٹھی تھی...... کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔

وہ ساکت و صامت تھی، بس ایک پل دیکھنے کے بعد اس نے نظریں ہٹائیں اور گاڑی کو آگے بڑھا لے گیا۔

"کیا اس نے مجھے دیکھا ہوگا؟ کیا اس اندھیرے میں، میں دکھائی دے رہی تھی؟" اس نے رکی ہوئی سانس خارج کی۔

تب ہی موبائل پر میسج ٹون آئی تھی، اس نے سائیڈ ٹیبل سے موبائل اٹھایا۔

کسی اجنبی نمبر سے میسج تھا، کمرے سے باہر

وریشہ کے قدموں کی چاپ ابھر رہی تھی۔ اس نے میسج ڈیلیٹ کر کے موبائل بند کیا اور تکیے پر سر رکھ کر سوتی بن گئی۔ اسے وریشہ سے اس وقت کوئی بات نہیں کرنا تھی۔

☆☆☆

اور بہت حیران کن بات یہ ہوئی تھی کہ ماورا نے اپنا کمرا الگ کر لیا تھا۔

''کوئی بات ہوئی ہے کیا؟'' کھانے کی میز پر دادی نے حیرت سے استفسار کیا تھا۔

''خیر یوں تو بہت اچھا ہوا، بڑا ہونے پر بچپنے کی عادات ویسے بھی چھوڑ دینا چاہئیں، میں تو بڑے عرصے سے تم لوگوں سے کہہ رہی تھی۔''

''ہماری عادات تو شروع سے ہی میچ نہیں کرتیں، پھر بھی میں اس کے ساتھ گزارہ کر ہی لیتی تھی۔ خیر، اب بھی اس کا اپنا فیصلہ ہے۔ میں نے کچھ نہیں کہا۔'' وریشہ نے ہاتھ جھاڑے۔

ماورا نے سر اٹھا کر اس کے تنے ہوئے نقوش دیکھے، جن میں اجنبیت روز بروز بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ بے معنی سا گریز تھا اس کے انداز میں۔ سمجھ میں نہ آنے والی سرد مہری، ایک ان دیکھی دیوار تھی جو دونوں کے بیچ حائل ہو رہی تھی۔

''وریشہ پہلے والی وریشہ نہیں رہی یا شاید اس کے لیے میری نگاہوں کا زاویہ بدل گیا ہے۔'' وہ عجیب سی پشیمانی میں گھری ہوئی تھی۔

''کیا کہتی ہو ماورا! کوئی پرابلم تو نہیں ہے ناں؟'' وریشہ کے جانے کے بعد دادی نے دوبارہ پوچھا تو وہ چونکی۔

''نہیں...... کوئی مسئلہ نہیں...... بس یوں ہی۔'' اس نے سرسری سا کہہ کر انہیں ٹالا۔

''سچ تو یہ ہے خود سے ڈرنے لگی ہوں، نیند میں ہی کچھ نہ کچھ بول دیتی ہوں۔ کبھی اس کا نام لے دیا تو؟ ابھی تو محبت کا بیج ہی بویا ہے۔ اسے سینچنے کا ہنر جانے آتا ہے یا نہیں، محبت کو نبھانا، برتنا، پرکھنا، کچھ بھی تو نہیں سیکھا۔ انجانے میں خود کو بے مول نہ کردوں، سیپ میں بند موتی کی طرح ہے میری محبت۔ سچے، خالص، کھرے جذبوں میں لپٹی، انتظار کروں گی، امتحان لوں گی۔ کسی اور کا نہیں اپنی محبت کا امتحان، کھری ہوگی تو وہ خود آئے گا مجھ تک۔

میں جانتی ہوں خاموش محبتیں کبھی بھی اثر پذیر نہیں ہوتیں، ان کے مقدر میں خود رو پودوں کی طرح سر اٹھانا اور پھر سے مٹی کا رزق بن جانا ہوتا ہے۔ ہاں کچھ محبتیں ہوتی ہیں جو دل کے صحیفے پر کسی معجزے کی طرح اترتی ہیں اور قبولیت کا شرف پا جاتی ہیں۔ میں بھی جاننا چاہتی ہوں، میری محبت کس قدر اثر انگیز ثابت ہوتی ہے۔''

دادی کھانا کھا کر جا چکی تھیں اور وہ تنہا بیٹھی دیر تلک موم شمعوں کے ساتھ ساتھ خود بھی پگھلتی رہی۔

☆☆☆

''خدا جانے دونوں لڑکیوں کی طبیعتوں میں اتنا تضاد کیوں ہے؟''

روما خاتون کی رائے پر بوا جی نے سب کام چھوڑ کر دیکھا، وریشہ سارے لان میں چہکتی پھر رہی تھی۔ بہت سے مہمانوں سے ملتی ملاتی، مصنوعی مسکراہٹ نہ تھی چہرے پر۔ سچ میں خوش تھی، ایسی محفلیں اسے شروع دن سے نہال رکھتی تھیں، ان میں جان تھی اس کی، اسی لیے حلقہ احباب بھی وسیع تھا۔

''وہ منیا بے چاری جانے کس کونے کھدرے میں چھپی ہوگی۔'' بوا جی نے تاسف سے ماورا کو سوچا، وہ بھاگتی تھی، رش سے، ہجوم سے۔ خار کھاتی تھی لوگوں کی بناوٹ بھری باتوں سے۔

ابھی بھی ماورا وہیں اسی لان کے ایک کونے میں کھڑی ان جگنوؤں کو کھوج رہی تھی جن سے وہ گوشہ ہر روز سجتا تھا۔ آج وہ کہیں نہ تھے اور اگر تھے بھی تو اتنی بہت سی روشنیوں میں ان کا ٹمٹمانا کیا معنی رکھتا تھا۔ وہ تھک کر بیٹھ گئی اور بڑی فرصت سے اس سارے ماحول کے ایک ایک منظر کو ترتیب سے دیکھتی چلی گئی۔

آج سالانہ ڈنر تھا۔

ہر سال موسم بہار کی آمد پر ایک بہت ہی زبردست قسم کے ڈنر کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ رومادادی کی فرینڈز، وریشہ کے دوست احباب، کاروباری شراکت دار، ان کے نت نئے فیشن، قیمتی سگار و پرفیومز کی مہک، نوجوان لڑکے، لڑکیوں کی اٹکھیلیاں اور باربی کیو کی خوشبو، جو اشتہا کو مزید بڑھاتی تھی کہ کھانے لگنے میں ابھی کچھ وقت تھا۔

''کتنا کہا تھا الیاس سے..... تھوڑی دیر کے لیے آجائے مگر یہ لڑکا بھی.....'' اس نے سر جھٹکا اور بوریت کی انتہا کو چھوتے ہوئے بمشکل خود کو جمائی لینے سے روکا اور پھر رسمی سی مسکراہٹ چہرے پر سجائے، اکا دکا لوگوں سے ہیلو، ہائے کرتی گھر کے اندرونی حصے میں چلی آئی۔

وریشہ فون کانوں سے لگائے اکیلی کھڑی تھی۔

''فارس کو انوائٹ نہیں کیا تھا؟'' تقریب کے رنگ اتنے مدھم تھے کہ ماورا کو پوچھنا پڑا۔

وریشہ فون بند کر چکی تھی۔

''اسے انوائٹ کرنے کی کیا ضرورت تھی، وہ تو گھر کا بندہ ہے۔'' وریشہ بھرپور طریقے سے آنکھ مارتے ہوئے مسکرائی تھی۔

''مام ڈیڈ کو لینے گیا ہے ایئرپورٹ، نکل آئے ہیں وہاں سے۔ بس کچھ ہی دیر میں پہنچ جائیں گے۔ یہ سارا انتظام اسی نے تو کروایا ہے، ورنہ مام، ڈیڈ کے آنے کے بعد ہوتا یہ ڈنر اور یہ تم کہاں جارہی ہو؟'' اسے سیڑھیاں چڑھتے دیکھ کر وریشہ نے پکارا۔

''بس ابھی آرہی ہوں۔'' وہ اپنے کمرے میں آگئی۔

کمرے میں اندھیرا تھا، لیکن اچھا لگ رہا تھا۔ ہائی ہیل سینڈلز سے پاؤں نکال کر اس نے کھڑکی کا پردہ ہٹا کر جگ مگ کرتے لان اور خوش باش چہروں کو دیکھا۔

''وہ بھی یہاں ہوتا، ان ہی چہروں کے درمیان تو اسے یوں دیکھنا اور دیکھتے رہنا کتنا اچھا لگتا۔'' لیکن اس کے آنے میں ابھی وقت تھا۔

وہ بستر پر دراز ہوگئی۔

باہر کے شور اور ہنگامے سے کہیں زیادہ پرسکون اور آرام دہ ماحول تھا۔ اس کی آنکھیں نیند کے خمار سے بوجھل سی ہونے لگی تھیں۔

''رومادادی کو شاید برا لگے میرا یوں چلے آنا، سطوت انکل اور آنٹی مہرین بھی برا مانیں گی، مجھے وہاں نہ پاکر، خیر کوئی بات نہیں، ابھی وقت ہے۔ ان کے آنے سے پہلے میں دوبارہ وہاں چلی جاؤں گی۔ اُف آج کتنی محنت سے نازیہ نے میرے بال کرل کیے تھے، لیٹنے سے خراب ہی نہ ہوجائیں۔ وریشہ زرد لباس میں بہت پیاری لگ رہی ہے آج، فارس...... پتا نہیں کس رنگ کا ڈریس پہنا ہوگا اس نے آج؟ کون سا رنگ پسند ہوگا اسے؟ کبھی مل بیٹھے تو پوچھوں گی۔ پتا نہیں آج اتنی نیند کیوں آرہی ہے؟ کھانا لگنے میں تو ابھی دیر......''

اسے نہیں پتا چلا، وہ کیا کیا سوچتے ہوئے اور کب سوگئی تھی۔

☆☆☆

نیم تاریک راہداری تھی۔

دونوں اطراف کے طاقچوں میں موی شمعیں روشن تھیں۔ ماورا سجی، سنوری، زرق برق لباس میں اپنے کمرے سے نکلی تو کسی سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔

''کہاں گم رہتی ہو؟ نظر کیوں نہیں آتیں؟'' وہ اس کے عین سامنے کھڑا پوچھ رہا تھا۔

اس قدر بے چینی اور بے تابی سے..... ماورا نے ازحد حیرت سے دیکھا۔

اس کی آنکھوں میں اداسی تھی اور شکوہ بھی۔

''جانتی ہو؟ میں صرف تمہیں دیکھنے آتا ہوں یہاں، تمہاری ایک جھلک دیکھنے کی آس، امید میں گھنٹوں بیٹھا رہتا ہوں میں اور تم مجھے دیکھتے ہی کھو جاتی ہو کہیں۔'' ایسا بے تاب لہجہ، درد بھرا...... ماورا تڑپ سی گئی تھی۔

''تمہیں دیکھنا میری زندگی، میری چاہت ہے

ماورا...... مجھ سے یوں دور مت بھاگو۔'' وہ اس کے قریب آ گیا تھا۔

موی شمعیں ہولے سے لرزی تھیں، بالکل ماورا کے نازک وجود کی طرح...... اس کا سایہ ماورا کے سائے پر حاوی ہو رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ فاصلہ تمام ہوتا، کوئی تیسرا سایہ ان کے بیچ میں آن کھڑا ہوا تھا۔

اتنا وحشت ناک کہ ماورا بری طرح خوف زدہ ہو کر ان دونوں سے دور ہٹ گئی اور عین اسی لمحے ماورا کی آنکھ کھل گئی تھی۔

کمرا تاریک تھا، ویسا ہی جیسے سونے سے قبل تھا لیکن اب کیفیت وہ نہ تھی۔ دھڑ دھڑاتے دل اور سرد ہوتے ہاتھ پاؤں کے ساتھ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔

''وریشہ......'' اس نے حسب عادت پکار کر تسلی کرنا چاہی لیکن کمرے میں خاموشی تھی۔ بہت زیادہ خاموشی اتنی کہ وہ اپنی سانسوں کی آواز بھی بآسانی سن سکتی تھی۔

گویا کمرے میں اس کے سوا کوئی نہ تھا۔ زبان خشک ہو کر تالو سے جا لگی تھی۔ وہ ہاتھوں سے دیواروں کو ٹٹولتی ہوئی کھڑکی تک آئی، پردہ ہٹا کر اس نے کھڑکی کے دونوں پٹ کھول دیے۔ سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی، ایسے میں سب سے زیادہ ضرورت تازہ ہوا اور آکسیجن کی تھی۔

وہ کھڑکی کی چوکھٹ پر ہاتھ رکھے باہر کو جھک گئی۔ ہوا میں ٹھنڈک تھی۔ وہ لمبے لمبے سانس کھینچ کر خود کو پرسکون کرنے لگی۔

لان ویران ہو چکا تھا، محفل سمٹ چکی تھی۔ سارا منظر تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔

''خاصی دیر سوئی رہی میں۔'' دل کی دھڑکن معمول کی رفتار پر آنے لگی تھی۔ وہ کھڑکی بند کر کے کمرے سے باہر آ گئی۔ وہ اس خواب کے اثر سے نکلنا چاہ رہی تھی جو کچھ لمحے قبل اس نے دیکھا تھا۔

لاؤنج کی طرف سے آوازیں آ رہی تھیں۔

گویا ابھی سب لوگ نہیں سوئے تھے، وہ بہت عجلت میں چلتی ہوئی لاؤنج میں داخل ہوئی۔ انکل اور آنٹی بالکل سامنے کے صوفے پر بیٹھے تھے۔

سطوت انکل نے اسے دیکھتے ہی بانہیں پھیلا دی تھیں۔

وریشہ، مہرین کے پہلو سے لگی بیٹھی تھی، ماورا بھی سطوت انکل کے بازوؤں میں جا سمائی۔

''اتنی نیند آ رہی تھی، ہمارا انتظار بھی نہیں کیا؟'' بڑا پیار بھرا شکوہ کر رہے تھے وہ۔

''میں خواب میں ڈر گئی تھی تایا ابو!'' پتا نہیں کیسے وہ بول گئی۔ بہت سہا ہوا انداز تھا۔

سطوت حسین چونکے، وہ عام طور پر انہیں تایا ابو نہیں کہتی تھی۔

''کیا دیکھا خواب میں ہمارے بیٹے نے؟'' انہوں نے نرمی سے اس کی پلکوں پر ٹھہرے پانی کے بے رنگ قطرے صاف کیے۔

''میں نے دیکھا کہ......'' اس نے پلکیں اٹھائیں اور پھر ساکت و صامت رہ گئی، جسے خواب میں دیکھا تھا، وہ سامنے بیٹھا تھا۔ ٹانگ پر ٹانگ رکھے، دونوں بازو سینے پر باندھے، وہ یک ٹک اسے دیکھے جا رہا تھا، بڑی گہری نگاہوں سے۔

☆☆☆

سب لوگ اپنے اپنے کمروں میں جا چکے تھے، وہ بھی اپنی بھوک مٹا کر چائے کا بڑا سا مگ لے کر نکلی تو ٹھٹک سی گئی۔

کوریڈور کے دوسرے سرے پر وہ کھڑا تھا۔

اسے دیکھ کر وہ آگے بڑھ آیا، طاق میں جلتی موی شمعیں ہولے سے لرزیں اور ماورا کا دل غیر معمولی رفتار سے دھڑکنے لگا۔

جو خواب دیکھا، وہ سچ ہونے والا ہے کیا؟

وہ کیا کہے گا؟ اور پھر...... کیا ہو گا؟

''ایکسکیوز می......'' اس نے پکارا۔

''نہیں، مجھے کچھ نہیں سننا۔'' وہ فوراً پلٹی۔ چائے چھلکی، ہاتھ پر گری لیکن اسے احساس تک نہ ہوا۔ بہت تیزی سے سیڑھیاں چڑھی لیکن ایک دم رک جانا پڑا۔ وریشہ عین سامنے کھڑی تھی، انتہائی

عجیب نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے۔
''کیا ہوا؟''
''کچھ نہیں...... وہ......'' ماورا نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ نچلی سیڑھی کے قریب کھڑا کہہ رہا تھا۔
''ایکسکیوزمی! مجھے کس کمرے میں جانا ہے؟ کوئی مجھے گائیڈ کرے گا؟'' لہجے میں ہلکی سی ناراضی تھی۔
''اوہ یس، وائے ناٹ۔'' دریشہ عجلت میں کہتی ہوئی سیڑھیاں اتری۔ ماورا کچھ کہے بغیر سست روی سے چلتی ہوئی اپنے کمرے میں آ گئی۔
مگ سائڈ ٹیبل پر رکھ کر وہ ایزی چیئر پر گر سی گئی تھی۔ آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ دائیں ہاتھ کی انگلیاں سرخ ہو گئی تھیں، درد تھا کہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

☆☆☆

ہم ان کے لیے اہم
واہ دل تیرے وہم

یہ گھر کے پیچھے کا راستہ تھا۔ سرسبز قدرتی گھاس سے اٹا، وہ ایک بڑے پتھر پر بیٹھی تھی اور لمبی ڈنڈیوں والے مہین کاسنی رنگ پھولوں کو ہوا سے ادھر اُدھر ڈولتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ جب کوئی مدھم لہجے میں بولا تھا۔
ایسا لہجہ جو سماعتوں میں دیر تک گونجتا اور سننے والوں کو اگلے کئی لمحوں تک مسحور رکھتا تھا۔
ماورا نے جیسے شکرانے کے طور پر ایک طویل سانس لیتے ہوئے صبح کے اولین لمحات کی اس فسوں خیزی کو اپنے اندر جذب کیا تھا۔
صبح اس راستے پر قدم دھرتے ایک خیال گزرا تھا کہ رات دیر سے سونے کے باعث وہ صبح سیر کے لیے نہیں نکلے گا پر ایک آس تھی کہ شاید نکل آئے اور اب...... ماورا نے گردن موڑ کر دیکھا۔
وہ اس سے کچھ فاصلے پر اس کے برابر بیٹھا تھا۔
''رات ڈر گئی تھیں مجھ سے؟'' اس نے جیسے پوچھا نہیں، بتایا ہو۔ نظر دور کہیں بھٹک رہی تھی۔

''اللہ...... اتنی خوب صورت آنکھیں......''
ماورا پلکیں جھپک نہ سکی۔
''ہاتھ بھی جلالیا، کیسا انسان سمجھتی ہو مجھے؟'' اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ فوری طور پر نظر نہ ہٹا سکی، پھر شرمندگی سے سر جھکالیا۔
''نہیں۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔''
''کبھی کبھی مجھے لگتا ہے، میں تمہیں اندر تک پڑھ سکتا ہوں بلکہ کبھی کبھی تو مجھے یہ بھی لگتا ہے کہ تم میرے اندر بستی ہو۔''
ماورا نے از حد تحیر سے اسے دیکھا۔
''میں تم میں اپنے آپ کو دیکھتا ہوں، بہت مماثلت ہے ہم میں۔ جانتی ہو؟'' اس نے ایک ہلکا سا پتھر اٹھا کر نشیب میں لڑھکایا اور دیر تک اسے دیکھتا رہا۔
''میں نے اپنی زندگی کے بیس سال اپنے ماں باپ کے بغیر گزارے۔ ان کے ساتھ جو گزرا، جو بچپن تھا۔ لڑکپن، جوانی...... پتھر کی طرح لڑھکتے اور اس معاشرے میں اپنی جگہ بناتے گزری۔ کئی سال میری نیندوں پر خوف کا پہرہ رہا، مسکراہٹ کے معنی کھو گئے، لاڈ، پیار، چونچلے، ضد...... یہ لفظ میری ڈکشنری سے جیسے حذف ہو گئے تھے۔ کون تھا میرا؟ جس سے یہ سب کہتا، کرتا...... جو تھے ان سے تعلق دنیا داری کا تھا، دل کا نہیں اور جن سے دل کا تعلق نہ ہو، میں ان پر اپنا آپ عیاں نہیں کرتا۔ بالکل تمہاری طرح۔''
بات کے اختتام پر وہ ہولے سے مسکرایا تھا۔
اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہہ پاتی...... فارس کا موبائل بجنے لگا تھا۔
لیکن بیل ایک تواتر سے بجتی رہی، دوبارہ...... سہ بارہ......
فارس نے جیسے بادل ناخواستہ فون اٹینڈ کیا...... دوسری طرف کی بات سن کر وہ ہنسا۔
''مارننگ واک ضروری ہے......میم......او کے آئم کمنگ۔''
''چلیے جناب......دریشہ ناشتے پر ویٹ کررہی

ہے“

ماورا کے لیے خاصی حیران کن خبر تھی علی الصباح ......وریشہ کا جاگنا......اور پھر ناشتہ......

خیر......ناقابل یقین واقعات......بھی اسی دنیا میں ظہور پذیر ہوتے ہیں“

وہ بغیر کچھ کہے اٹھ گئی تھی۔

☆☆☆

ناشتے کی میز بھرپور طریقے سے سجی ہوئی تھی۔

جس وقت وہ دونوں ہم قدم ڈائننگ ہال میں داخل ہوئے...... وریشہ چائے کے ساتھ لوازمات سیٹ کر رہی تھی۔

”آج اتنی جلدی اٹھ گئیں تم......“ ماورا نے خوشگوار حیرت سے کہا تو وریشہ بری طرح چونکی...... پھر پلٹی......

اس کے شاید گمان میں نہ تھا کہ ماورا بھی فارس کے ساتھ ہو سکتی ہے۔

”اور تم......اتنی جلدی اٹھ گئیں کہ واک بھی کر آئیں“ جوابی حیرت کا اظہار......

”ہوں......باقی سب لوگ؟“

”ابھی کچھ دیر میں کریں گے ناشتہ“

ماورا نے ڈائننگ چیئر گھسیٹی...... فارس ہاتھ دھونے جا چکا تھا۔

ناشتے کی میز کا جائزہ لیتے ہوئے ماورا ذرا سا چونکی پھر وریشہ کو دیکھا......

وہ اس کے مقابل بیٹھی اپنا موبائل چیک کر رہی تھی......اس کے چہرے کے تاثرات...... سرد اور ناگواری کے ساتھ ساتھ ناراضی سے بھی بھرپور تھے...... ماورا نے خاموش نگاہوں سے دوبارہ جائزہ لیا......

میز پر صرف دو افراد کے ناشتے کا اہتمام تھا۔

فارس کی واپسی ہوئی تو ماورا چپکے سے اٹھ کھڑی ہوئی......

”میں فریش ہو کر آتی ہوں“

☆☆☆

انکل، آنٹی، رد ما دادی کے کمرے میں تھے۔

وہ الیاس کی طرف سے واپس آئی تو بوا کے بتانے پر سیدھی ادھر چلی آئی۔

دروازہ بند تھا......

اس کا دل بری طرح دھڑکا۔

”دروازہ بند کیوں ہے......بوا؟“

”اللہ جانے کیا معاملہ ہے؟“ بوا نے کندھے اچکائے۔ وہ پریشان سی ہو کر کمرے میں آ بیٹھی۔

شام تک گھر کے ماحول میں تناؤ کی واضح کیفیت نظر آ رہی تھی۔ وریشہ اپنے کمرے میں بند تھی۔ اس نے مہرین آنٹی کو اس کے کمرے کے اطراف میں چکراتے دیکھا مگر پوچھنے کی ہمت نہ کر سکی۔

اگلی صبح دادو نے اسے بلا بھیجا۔

”تمہاری خالہ کا فون آ چکا ہے کئی بار......تمہیں دیکھنے کو ترس رہی ہے۔ کالج سے چھٹیاں ہیں...... میں تو کہتی ہوں......چند روز کے لیے ہو آؤ......“

”لیکن دادو! میرا بالکل بھی دل نہیں چاہ رہا......؟

”خون ہو تم اس کا...... پھر کہے گی ددھیال والے قبضہ جمائے بیٹھے ہیں۔ میں ڈرائیور سے کہتی ہوں......کل صبح تمہیں لے کر نکل جائے گا......تم اپنی پیکنگ کر لو، ہفتہ دس دن کے لیے۔“

دادو کا قطعی انداز......ماورا ہکا بکا رہ گئی تھی۔

”دادو کو ایسی باتوں کی پروا کب سے ہونے لگی......اور ہفتہ دس دن...... کیوں؟ اور خالہ کو میری یاد کیوں کر آنے لگی......سال میں ایک آدھ بار ہی خون جوش مارتا ہے ان کا...... اور کل صبح...... اتنی جلدی...... پیکنگ اور وہاں...... وہ جواد...... اوہ نو......آئی ہیٹ ہم......“ وہ روہانسی ہو کر تکیے میں منہ دے کر لیٹ گئی تھی۔

اگلی صبح سب کچھ بھول بھال دل میں ڈھیروں ناراضی اور افسردگی لیے وہ خالہ کے پاس دوسرے شہر جانے کے لیے روانہ ہو گئی تھی۔

☆☆☆

خالہ کے گھر میں جیسے چاند اتر آیا تھا، وہ بھی عید کا......

ان کا متوسط طبقے کا گھر تھا۔ افراد زیادہ......آمدن کم، اخراجات بے بہا، ایسی مخلوق جس کی چادر کبھی سر کو ڈھانپتی تھی تو کبھی پاؤں کو...... پوری نہ پڑتی تھی...... مہمان کے لیے کھانا بنتا......تو گھر والے منتظر رہتے، بچ کر کیا آتا ہے؟ اس کے نو عمر خالہ زاد بہن بھائی اس سے شرماتے اور کبھی چپکے سے اسے دیکھنے آتے تھے......اس کے لیے گھر کا نسبتاً صاف ستھرا اور کم سامان والا کمرا منتخب کیا گیا تھا۔

جواد خالہ کا سب سے بڑا بیٹا تھا...... کم تعلیم یافتہ، جواد کی پوری کوشش ہوتی تھی کہ وہ اپنے اچھے ڈیل ڈول، اور خوبصورتی سے ماورا کو پوری طرح متاثر کرلے۔ پہلے دو وقت کے پُرتکلف کھانے کے بعد خالہ کی مہمان نوازی دم توڑ گئی تھی......اور اس کے بعد تین وقت کے کھانے میں جو پکتا تھا، ماورا اسے کھانے کی عادی نہ تھی۔

سو تین چار دنوں میں ہی اسے اپنا آپ لاغر اور کمزور محسوس ہونے لگا تھا۔ اتنے شور، اور کسمپرسی میں رہنے کی عادت اس کی ماں کو تھی، اسے نہیں۔ جانے روما دادی نے اسے بھیجنے سے پہلے یہ بات کیوں نہ سوچی تھی۔

اور ابھی اسے یہاں رہنا تھا...... مزید...... کیونکہ ہفتہ، دس دن ہونے میں ابھی کافی دن باقی تھے۔

☆☆☆

رات بے حد گہری تھی......پچھلی کئی راتوں کی طرح گرم، جھلتی ہوئی، جب چاند، سورج کی طرح تمازت بھری چاندنی، اس چوکور، ماچس کی ڈبی جتنے صحن میں پھینکتا تھا۔ اور ماورا گود میں ہاتھ دھرے اپنی چارپائی پہ بیٹھی، اپنے اردگرد سوئی ہوئی مخلوق کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتی تھی۔ لمبے لمبے سانس، کھینچتے، خراٹے لیتے وجود، جن پر اسے بیک وقت رحم بھی آتا تھا اور غصہ بھی۔

"کس طرح سو لیتے ہیں یہ اتنے گرم، حبس زدہ ماحول میں......ایک ایک چارپائی پہ دو، دو بچے...... پسینے سے شرابور وجود......اور اگر میں بھی کسی ایسے ہی گھرانے میں رہتی......ان ہی کی طرح تو......؟"

"شاید میں عادی ہوچکی ہوتی...... ان ہی کی طرح......" وہ پہلے سوال تراشتی اور پھر ان کے جواب گھڑ لیتی......

"اور اگر ایسے ہی کسی گھر میں رہنا پڑ گیا...... ہمیشہ کے لیے......تو......؟" یہ وہ سوال تھا، جو کسی ڈنک کی طرح لگتا تھا اسے......

اسے خوف آتا تھا اپنی خالہ سے، جواد سے، ان کے محبت جتاتے رویوں...... اور کچھ کہتے سنتے ارادوں سے......

"نہیں...... یہ نہیں ہوگا مجھ سے...... ایسے کیسے؟"

بجلی آجاتی...... پنکھا اپنی گھر رگھرر کے ساتھ چلنا شروع کرتا......تو اسے یہ گرم ہوا بھی غنیمت لگتی اور بالآخر وہ سونے میں کامیاب ہو ہی جاتی......

☆☆☆

رات کا نجانے کون سا پہر تھا۔

جس وقت اس کی آنکھ کھلی، پنکھے کی گھر رگھرر خاموش ہوچکی تھی۔

پنکھا خاموش نہیں تھا...... یہ پوری کائنات کا سکوت تھا۔ اس کی قمیص پسینے سے بھیگ کر بدن کے ساتھ چپکی ہوئی تھی۔

زبان خشک، تڑختی ہوئی......اور سانسیں جیسے حلق کے آر پار ہو رہی تھیں......اسے ہوا چاہیے تھی۔ ٹھنڈی......تازہ ہوا......

وہ گھبرا کر چارپائی سے اتری تو...... کسی دوسرے کی چارپائی سے ٹکرائی......

"آئے ہائے کیا ہوگیا......؟ کون ہے......؟ ہائیں......ماورا، یہ تم ہو......؟" خالہ پکاریں......

"خالہ مجھے سانس نہیں آرہا" وہ تڑپی......

"جواد اٹھ......دروازہ کھول دے......ذرا باہر

کی تازہ ہوا لے لے......ان کے ہاں تو چوبیس گھنٹے چلتے ہیں اے سی......کہاں برداشت ہوگی یہ گرمی......ہمارا ہی حوصلہ ہے بھائی......برسہا برس سے یوں ہی جیے جاتے ہیں......" خالہ نے کروٹ بدلی۔"

جواد اسے سہارا دے کر ڈیوڑھی سے باہر نکل آیا تھا۔

باہر گلی سنسان اور تاریک تھی...... وہ سیمنٹ کے بنے تھڑے پر گرسی گئی۔ جواد اس کے برابر آبیٹھا۔

" ٹھیک ہونا ادھر...... موسم قدرے بہتر ہے...... ہوا چل رہی ہے۔" وہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے پوچھ رہا تھا۔ بہت ہمدردی سے، میٹھا سا لہجہ۔

ماورا لمبے لمبے سانس کھینچتی بمشکل 'ہاں' میں سر ہلا سکی تھی۔ نارمل ہونے کے لیے کچھ وقت درکار تھا۔

اور اسی وقت کی چند منحوس گھڑیوں میں اسے کچھ عجیب سا محسوس ہوا تھا۔ اس کے معطل ہوتے حواس یک لخت ہی چوکنا ہوئے تھے۔ اس نے گردن موڑ کر جواد کو دیکھنے کی کوشش کی جو اس قدر قریب بیٹھا تھا کہ وہ باآسانی اس کے سانس کی آواز سن سکتی تھی......اور اس کا ہاتھ...... ماورا کے شانے سے ہوتا ہوا اس کی پشت کو سہلا رہا تھا۔

وہ کپکپا کر پیچھے ہٹی......لیکن جواد نے اسے اپنے بازو کے حصار میں لے لیا تھا۔

"اونہوں......ادھر پاس بیٹھو ناں......"

"چھوڑو مجھے......"

"پاگل نہ بنو......کوئی اٹھ جائے گا......"

اور وہ پاگل بن گئی تھی...... پھر کوئی نہیں......ایک ساتھ کئی اٹھ کر بھاگے چلے آئے تھے...... جب اس نے اپنے ناخنوں سے جواد کے غلیظ بدن کو ادھیڑ کر رکھ دیا تھا۔

وہ ہوش میں نہیں تھی، وہ جنونی تھی......آپے سے باہر......سنبھالے نہ سنبھلتی تھی۔ نجانے کس طرح ہاتھ پاؤں جوڑ کر خالہ اسے سمجھا بجھا کر گھر کے اندر لے کر گئی تھیں...... جواد بقیہ رات گھر میں نظر نہیں آیا تھا اسے......

" آدھی رات کو ہول تو تمہیں اٹھ رہے تھے......اسے لے کر گھر سے باہر ہی نکل گئیں......پھر اتنا شور اور واویلا کس لیے؟" خالہ بپھری ہوئی تھیں۔

" میں اپنی گھٹن دور کرنے کے لیے باہر گئی تھی......آپ کے بیٹے کے لطف کا سامان بننے نہیں گئی تھی...... اور اپنے بیٹے کی غلاظت میرے سر تھوپنے کی کوشش مت کریں آپ......ورنہ میں کسی کا لحاظ نہیں کروں گی......"

وہ شروع دن سے کو ایجوکیشن میں پڑھی تھی......اسے خوب آتا تھا، کہاں، کس جگہ کس کا منہ توڑنا ہے۔

خالہ نے اسے دھاڑتے سنا تو منظر سے ہٹ گئیں۔ بقیہ رات آنکھوں میں کٹ گئی تھی۔

صبح کا اجالا پھیلا......تو وہ اپنا بیگ پیک کر چکی تھی۔

کمرا چھوڑنے سے قبل اس نے آخری بار دیوار پر ٹنگی اس تصویر کو دیکھا جو برس ہا برس سے وہیں ٹنگی تھی۔ اور اب اس قدر دھندلا گئی تھی کہ تصویر کے نقش ماند پڑنے لگے تھے۔

" مجھے آج کے بعد دوبارہ اس گھر میں کبھی نہیں آنا......زندگی بھر نہیں......" اس نے مصمم ارادے کے ساتھ وہ تصویر اتار کر اپنے بیگ میں ڈال لی تھی۔

☆☆☆

جس وقت وہ گھر میں داخل ہوئی......بوا کے سوا کوئی بھی اس کے استقبال کے لیے موجود نہ تھا۔ اور نہ ہی اسے کوئی ایسی خواہش یا امید تھی۔

" آئے ہائے......کیا حال ہو گیا میری بچی کا؟ چند دنوں میں ہی مرجھا کر رہ گئی......خالہ کھانے کو کچھ نہیں دیتی تھی کیا؟"

" میں نے آپ کو بہت مس کیا بوا......؟ اور آپ کے ہاتھ کے پکے ہوئے کھانوں کو اس سے بھی زیادہ......اس وقت میں سخت بھوکی ہوں......جلدی

سے کھانا میرے کمرے میں آئیں......'' اسے آج سے پہلے بوا پر اتنا پیار کبھی بھی نہ آیا تھا۔ نہادھوکر، کھاپی کر وہ سکون کی نیند سوئی تو پھر سرشام ہی جاگی تھی۔

☆☆☆

''وریشہ......! یہ تم ہو......؟'' کوئی حیرانی سی حیرانی تھی۔

اس کی بے یقینی کے جواب میں وریشہ ہنس دی تھی۔

لیکن وہ واقعی وریشہ نہیں تھی، آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے...... سفید رنگت ،اُجڑا بکھرا حلیہ...... وہ وریشہ ہو ہی نہیں سکتی تھی......

ماورا اس کے کمرے میں تھی...... اس کا ہاتھ تھامے بیٹھی تھی...... اس کی بے دم ہوتی آنکھوں میں وہ چمک کھوج رہی تھی جو وریشہ کے ہونے کا پتا دیتی تھی۔

''تم کیوں نہیں بتا رہیں...... کیا ہو گیا تمہیں؟ میں اتنے دن گھر سے دور تو نہیں رہی......''

''بیمار ہو گئی تھی یہ...... بی پی بے حد لو ہو گیا تھا...... ہمیں تو اس کی جان کے لالے پڑ گئے تھے۔ چار دن مسلسل ہاسپٹل میں رہی...... اب کہیں جا کر طبیعت سنبھلی ہے اس کی......'' یہ تائی امی تھیں جو اسے وضاحت دے رہی تھیں......

''یہ اتنی بیمار رہی اور آپ نے مجھے بتایا تک نہیں......؟'' وہ جانے کیوں بے یقین سی تھی۔

''تمہیں کیا پریشان کرتے...... اور ہم لوگ خود اتنے پریشان تھے کہ یہ خیال ہی نہیں آیا...... میرا خیال ہے، اب وریشہ کو ریسٹ کرنا چاہیے۔''

ماورا نے وریشہ کو دیکھا...... وہ گھونٹ گھونٹ جوس پیتی کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی...... گویا ماورا کے ٹھہرنے یا جانے کی اسے کوئی پروا نہیں تھی...... وہ بے دلی سے اٹھ کر باہر آ گئی تھی۔

☆☆☆

کچھ ہوا تھا...... کچھ بہت ہی انہونا...... انجانا...... اچھوتا...... کچھ ایسا جو سب کے چہروں پر لکھا تھا۔ مگر وہ پڑھ نہیں سکتی تھی۔ گھر کے ماحول میں پھیلا سناٹا بہت سی ان کہی سنا رہا تھا...... مگر کیا؟ کیا......! ٹکر ٹکر ایک ایک کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

روما دادی، سطوت انکل، تائی امی وریشہ، کوئی بھی اس سے آنکھیں نہیں ملا پا رہا تھا۔

بوا سے کچھ پوچھو...... تو ان کے لبوں پر مہر لگ جاتی تھی...... ایسی مہر جو کسی بھی گھرانے کے وفادار ملازم کے لبوں پر آپوں آپ لگ جاتی ہے جسے کسی راز کو چھپانا مقصود ہو۔

تھک ہار کر وہ بھی سمجھوتا کر بیٹھی...... یہ پہیلی کھلی تھی...... لیکن کئی روز بعد بالکل مختلف انداز سے......

☆☆☆

''تمہیں پتا ہے...... میری شادی ہو رہی ہے......''

بہت عرصے بعد وریشہ اپنے پہلے سے رنگوں میں نظر آئی تھی...... اور اس پر یہ اطلاع...... وہ سب بھول بھال کر چلا اٹھی......

''کیا؟ ریئلی......؟''

''اوہ یس''

''کب......؟'' ماورا اس کے قریب آ بیٹھی تھی۔

''کب نہیں، پوچھو، کس سے......؟''

وریشہ کے انداز میں کچھ ایسا تھا جو اسے چونکا گیا...... مگر وہ روانی میں پوچھ بیٹھی تھی۔

''کس سے......؟''

'' فارس ابن مراد سے ......'' وریشہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بتا رہی تھی...... بتا رہی تھی یا کچھ کھوج رہی تھی، اس کے چہرے پر، ماورا اپنے آپ میں ہوتی تو شاید جان لیتی۔

''تمہیں خوشی نہیں ہوئی......؟''

''خوشی......'' ماروا نے پرخیال نظروں سے اسے دیکھا۔ اسے یاد نہیں آ رہا تھا۔ خوشی کیا ہوتی ہے......؟

''بہرحال......تم تیاری کرلو، زیادہ دن نہیں ہیں تمہارے پاس......'' وریشہ کہہ کر اٹھ گئی تھی۔

وہ کائنات جو کچھ لحہ قبل تھم گئی تھی پھر سے متحرک ہوگئی۔ لیکن وہ دل اس پل جہاں ٹھہرا تھا، وہیں ٹھہرا رہا......دیر تلک......

☆☆☆

حساب عمر کا اتنا سا گوشوارہ ہے
تمہیں نکال کے دیکھا تو سب خسارہ ہے

رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ دونوں گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے وہ کھڑکی میں بیٹھی تھی، اداس، گم صم، آنکھیں خالی...... جیسے سارے پیارے سپنے کوئی نوچ کر لے گیا ہو......

'' اور میں بھی کتنی نادان تھی...... سب کچھ صاف دکھائی دے رہا تھا، بالکل واضح، فارس اور وریشہ، وریشہ اور فارس...... اس کے باوجود جانے کیوں دل میں ایک گمان سا تھا جیسے فارس کی آنکھیں کچھ کہتی ہیں...... جیسے کوئی تڑپ، کوئی لپک جو دل کو کھینچتی ہو اپنی طرف...... لیکن اتنی مبہم کہ گمان بس گمان ہی رہا۔

تو وریشہ سطوت حسین......! تم سا خوش قسمت کوئی شاید ہی زمانے میں ہوگا......تم نے ہمیشہ جو چاہا، پالیا......اور مادرا صبا! تمہیں بھی ہمیشہ کی طرح یہ ہاری ہوئی بازی چپ چاپ گلے سے لگانی ہوگی۔ جو انسان اپنے حق کے لیے آواز اٹھانے کا عادی نہ ہو اسے '' خسارہ '' برداشت کرنے کی عادت ہونی چاہیے...... اور یہ آخری خسارہ شاید میری ساری زندگی لے لے گا......''

وہ مرے مرے قدم اٹھاتی بیڈ تک آئی......

'' تم ایک بار اظہار تو کرتیں شاید من کی مراد...... بر آتی'' سینے کے ایک کونے میں پڑا بے چارہ دل آخری بار تڑپا تھا......لیکن مادرا نے کان نہیں دھرے۔

'' تم تو اب ساری عمر تڑپو گے تمہاری کون سنے......'' وہ تکیے میں منہ دیے سونے کی کوشش کرنے لگی تھی۔

☆☆☆

تیاری کے لیے دن واقعی کم تھے۔ اتنے کم کہ خود کو جوڑتے، بناتے، تعمیر کرتے کرتے ہی وہ دن آپہنچا......

وریشہ اور فارس ابن مراد کی شادی کا دن......

ہاں تو کیا ہوا؟ جوڑے تو آسمانوں پر بنتے ہیں......اس میں کسی کا کیا دوش......وہ دونوں خوش نصیب ہیں...... اللہ انہیں ہمیشہ سکھی، سلامت رکھے۔

وہ خود سے ڈرتی تھی، اپنی آہوں سے بھی ڈرتی تھی۔ جو رات گئے تک اس کے تکیے پر کانٹوں کی صورت اگ آتی تھیں۔

'' کبھی کبھی مجھے لگتا ہے۔ میں تمہیں اندر تک پڑھ سکتا ہوں...... بلکہ کبھی کبھی تو مجھے یہ بھی لگتا ہے کہ تم میرے اندر بستی ہو......''

یہ لفظ رات رات بھر اس کے کمرے میں ہیولوں کی صورت چکراتے پھرتے تھے۔ اس کی گردن کا پھندا بن جاتے تھے کبھی پاؤں کی بیڑیاں بن کر اسے زخماتے تھے......وہ ہر صبح اٹھ کر اپنے تکیے پر سجے کانٹوں کو جھاڑتی، گردن کا پھندا اتارتی اور پیروں کے زخموں کو سہلاتی، ہنستی مسکراتی ہر کام میں شرکت کرتی یہاں تک کہ شادی کا دن آیا اور پھر گزر گیا۔

وہ اس تقریب میں بھی اتنا ہی شریک ہوئی تھی، جتنا ہر تقریب میں۔ یہی وجہ تھی کہ کسی مووی، کسی تصویر میں وہ کہیں دکھائی ہی نہ دی تھی۔ وریشہ البتہ بہت پیاری لگ رہی تھی اور بہت خوش بھی......

''اور فارس......؟''اس نے سوچنے کی کوشش کی لیکن ذہن کے پردے پر کوئی شبیہ ابھری ہی نہ تھی......

کیونکہ اس سارے عرصے میں مادرا صبا نے فارس ابن مراد کو دیکھا ہی کب تھا۔

☆☆☆

اور اس کا خیال تھا، آزمائش بس وہی تھی جو آئی اور گزر گئی لیکن وہ نہیں جانتی تھی..... کہ یہ تو فقط آغاز تھا..... آزمائش ختم نہیں ہوئی تھی، آزمائش شروع ہوئی تھی۔

''اور کون تھا، جو اسے آزما رہا تھا؟''

دریشہ سطوت حسین..... وہ کس مان، گمان میں تھی.....؟ کیا بتانا سمجھانا، جتانا چاہتی تھی..... ماورا سمجھنے سے قاصر تھی.....

کسی دعوت پر جانے سے پہلے بے انتہا کی تیاری کے بعد وہ ماورا کو کیا دکھانے آتی تھی.....؟ کسی بھی شاپنگ کے بعد وہ دن رات کی پروا کیے بغیر ماورا کو فارس کے دیے گئے گفٹس دکھانے کیوں بھاگی آتی تھی..... بوا کو کہنے والے سب کاموں کا ذریعہ اور وسیلہ ماورا ہی کیوں بنتی ہے؟

''فارس کو فلاں فلاں ڈش پسند ہے، بوا سے کہہ کر بنوالینا.....''

''آج رات ہم ادھر ہی Stay (قیام) کریں گے، ماورا پلیز ذرا بیڈ روم سیٹ کروالینا بوا سے کہہ کر.....''

اور ان سب معاملات میں فارس کا چہرہ جذبات سے عاری کیوں ہوتا ہے؟ وہ دریشہ کی طرح بہت زیادہ خوش دکھائی کیوں نہیں دیتا.....اور دریشہ کے اس رویے پر گھر کے بقیہ افراد نظریں چرانے لگتے ہیں۔

ماورا کی سمجھ سے بالاتر باتیں وقوع پذیر ہونے لگیں تو وہ اپنے کمرے میں پناہ لینے لگی، وہاں سے نکلتی تو الیاس کی طرف جا نکلتی..... یا پھر رات گئے تک لان کے کسی کونے میں دبکی، جگنوؤں سے اپنے دل کی ساری باتیں کہتی..... جو جانے سنتے تھے یا نہیں۔ بس یہاں وہاں جلتے، بجھتے اڑے جاتے تھے.....

وہ بھی ایک بجھتی ہوئی شام تھی جب وہ باہر لان میں آ گئی، بوا سارے گھر میں چکراتی ضروری بتیاں جلا رہی تھیں.....تب ہی کوئی مانوس سی مہک ہولے سے اسے اپنے حصار میں لینے لگی۔ اس نے پلٹ کر قدرآور ہیولے کو دیکھا۔

''واک کریں.....؟'' اس نے پوچھا تھا۔

''ہوں.....'' ماورا انکار نہ کرسکی۔

بہت گہری خاموشی تھی اور دونوں کے درمیان..... ماورا کو لگتا تھا، ساری باتیں کھو چکی ہیں۔ کوئی سرا ہاتھ لگتا تو وہ کچھ کہتی.....

''ابھی بھی اسکیچز بناتی ہو.....؟''

بہت غیر متوقع سوال تھا۔

ماورا نے حیرت سے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

''کیا مطلب.....؟''

کچھ ایسی مشکل بات تو نہیں کی میں نے..... ملواؤ گی نہیں اس سے بھی.....؟

''آپ کیوں ملنا چاہتے ہیں اس سے.....؟''

''فارس.....فارس.....'' بیڈ روم کی کھلی کھڑکی سے دریشہ چلائی تھی۔

ماورا نے سر اٹھا کر دیکھا۔ دریشہ کا چہرہ..... اسے ایک پل میں کوئی بھولا بھٹکا خواب یاد آیا.....ایسا وحشت زدہ چہرہ صرف خواب میں دیکھا تھا اس نے.....

''دریشہ بلا رہی ہے آپ کو.....'' فارس دو قدم آگے چلا تھا اس سے۔

برآمدے کی سیڑھیوں تک آتے آتے گھر میں ایک ہنگامہ سا جاگ اٹھا تھا۔

''آپ لوگ سمجھا نہیں سکتے اسے۔ فارس کو اس وقت میرے ساتھ بیڈ روم میں ہونا چاہیے نا کہ اس کے ساتھ لان میں.....کون سا رومانس جھاڑ رہی ہے وہ میرے شوہر کے ساتھ رات گئے.....''

فارس کے صرف قدم سست پڑے تھے۔

اور وہ خود.....دل ایک دم سکڑ کر پھیلا.....تو بس سیاہ گھور رات آنکھوں میں اتری جس نے کچھ دیکھنے ہی نہ دیا..... پاؤں جہاں رکھا، وہاں شاید زمین نہیں تھی۔ گرتی تو پھر گرتی ہی چلی گئی۔ سہارا دینے والا وہاں کوئی نہ تھا۔

☆☆☆

''یہ جان بوجھ کر ایسا کرتی ہے، فارس کی توجہ حاصل کرنے کی کوشش ہے ساری..... آپ نے دیکھا نہیں، اسے بے ہوش ہوتا دیکھ کر اس کی جان نکلتی جارہی تھی.....'' بہت دور سے آواز آرہی تھی.....

''دشش.....'' اسے کراہتے دیکھ کر کسی نے وریشہ کو خاموش رہنے کا اشارہ دیا تھا..... آنکھوں پر بوجھ تھا۔ سر میں درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں..... بہت کوشش کے باوجود وہ آنکھیں نہ کھول سکی..... بہت گہری نیند تھی..... جو سننے سمجھنے کا موقع دیے بغیر اس کے حواسوں پر چھاتی چلی گئی تھی۔

''ماورا! تم شادی کیوں نہیں کرلیتیں.....''

سب لوگ اس کے کمرے میں جمع تھے۔ ماورا کے ہاتھ سے چائے چھلکتے چھلکتے بچی۔

''یہ تمہیں اتنی اچانک ماورا کی شادی کا خیال کیسے آگیا؟'' آنٹی نے حیرت سے پوچھا تھا۔

ماورا نے ہولے سے ماتھے کے زخم کو چھوا جو مندمل ہونے کے قریب تھا۔

''تو اب کوئی نیا زخم.....لیکن کیوں.....؟'' وہ منتظر نظروں سے وریشہ کو دیکھنے گئی۔

''بھئی'' اتنے خواہش مند ہیں اس کے..... کسی ایک کے پیچھے باقیوں کو انتظار کی سولی پر کیوں لٹکا رکھا ہے؟''

''کیوں بھئی، کوئی آپشن ہے تو بتاؤ ماورا.....'' تایا ابو بڑی محبت سے پوچھ رہے تھے۔

''ہم جاتے جاتے اس کے فرض سے بھی سبک دوش ہوجاتے ہیں..... کیوں اماں؟''

''ارے اس سے کیا پوچھتے ہیں ڈیڈ..... مجھ سے پوچھیں..... ایک تو وہ..... جواد اس کی خالہ کا بیٹا..... جان دیتا ہے اس پر.....پھر وہ الیاس.....سردی ہو یا گرمی، ماورا سر کے بل جانا پسند کرتی ہے اس کے پاس.....اور ہاں.....وہ بھی تو ہے..... ماورا بتاؤ ناں.....'' وریشہ چہک رہی تھی۔

سب کی نظریں ماورا پر تھیں.....اور ماورا چاہتے ہوئے بھی نگاہ نہ اٹھا پارہی تھی۔

''ایک کے تو ڈھیروں اسکیچز بنا رکھے ہیں اس نے..... بھئی، اسے بلواؤ ناں کسی دن چائے پر..... ہم بھی مل لیتے ہیں..... ڈیڈ آپ دیکھیں گے تو حیران رہ جائیں گے..... اس قدر ڈیشنگ پرسنیلٹی ہے اس کی..... ماورا دکھاؤ ناں..... کہاں ہیں وہ اسکیچز..... ایک منٹ..... میں دکھاتی ہوں.....'' وریشہ اٹھ گئی تھی۔

ماورا نے ایک بھی گھونٹ پیے بغیر چائے کا کپ سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔ ہر چیز دھندلی دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے زور سے آنکھوں کو رگڑا..... وریشہ فائل ڈھونڈ چکی تھی، اسکیچز بہت سے تھے۔

دادو.....سطوت انکل، آنٹی.....اسکیچز ہاتھوں میں لیے دم بخود بیٹھے تھے.....

''فارقلیط.....!'' دادو نے جیسے ہچکی بھری تھی۔

ماورا کی ٹھوڑی اس کے سینے سے جا لگی تھی.....

روما دادی ہولے ہولے لرز رہی تھیں۔ اس گھر میں، گھر کی دیواروں پر..... الماریوں کے نہاں خانوں میں کہیں بھی فارقلیط کی کوئی تصویر نہ تھی، وہ تصویر بنواتا ہی نہ تھا۔ اور اگر کبھی بنوائی، تو اسے سنبھال کر رکھنے والا کوئی نہ تھا۔ پھر..... ماورا نے کہاں دیکھا۔ اپنے باپ کو..... کیسے اس کے نقوش حفظ کیے.....اس کی انگلیوں نے یہ ہنر کہاں سے سیکھا کہ تخیل کو مجسم بنا ڈالا..... کمرہ بے حد گہری خاموشی کی زد میں تھا.....

ماورا دونوں ہاتھوں میں منہ چھپائے ہچکیوں سے رو رہی تھی۔

روما دادی نے آنسوؤں سے لبریز آنکھیں بند کیں تو پھر بہت سا پانی بہہ نکلا تھا۔

''میرا بچہ.....میرا فارقلیط.....'' وہ اسکیچز دیکھ رہی تھیں، چوم رہی تھیں۔ وریشہ دم بخود کھڑی تھی۔

کمرا چھوڑ کر جانے والوں میں سب سے پہلا فرد فارس ابن مراد تھا۔

☆☆☆

''بس وہ آخری رات تھی، جب سب لوگ مل کر بیٹھے...... پھر بکھرے تو بکھرتے ہی چلے گئے۔ انکل، آنٹی کے جانے کے چند روز بعد ہی سنا کہ وریشہ اور فارس بھی پرواز کر گئے......''

روما دادی اداس ہو کر اپنے کمرے کی ہو کر رہ گئیں...... بوا کو فراغت نے سست کر ڈالا......

اور خود وہ سارا سارا دن گھر کی لمبی لمبی راہداریوں میں بے مقصد گھومتی، رات گئے تک ٹی وی میں پناہ لیتی......اور کچھ نہ ملتا تو الماریاں کھول کر پرانی چیزیں، پرانی تصویریں یا پرانی یادیں کھوجنے لگتی......الماری کھول کر اس دن کو یاد کرتی جب پہلی بار اس نے فارس کو دیکھا...... یا پھر کاسنی پھولوں والے اس قطعے پر جا بیٹھتی اور سوچوں کے بے نام راستوں پر جا بھٹکتی......اور کبھی آئینہ دیکھتی تو ماتھے پر لگے اس داغ کو اپنی انگلیوں سے بارہا چھوتی جواب بھی کبھی کبھی دکھنے لگتا تھا۔

''پتا نہیں کون سے واہمے، کون سے خدشے تھے جو وریشہ کو مجھ سے بدل کر گئے۔

جانے کتنے دن اور مہینے گزر گئے، ایک روز کتابوں کی الماری سیٹ کرتے ہوئے دادو نے بتایا۔

''پتا ہے۔ وریشہ ماں بننے والی ہے......''

''رئیلی دادو......! یہ تو بہت خوشی کی بات ہے۔ میں آج ہی بات کرتی ہوں اس سے مبارک باد بھی دوں گی......'' اسے حقیقتاً خوشی ہوئی تھی......

پھر اس رات نہیں، اس کے بعد آنے والے کئی شب و روز میں اس نے وریشہ سے بات کرنا چاہی مگر وریشہ نے کال اٹینڈ نہیں کی۔ کبھی میسج ملا کہ مصروف ہے، بات نہیں کر سکتی......تھک، ہار کر اس نے رابطے کی کوشش ترک کر دی۔

رات کی کوئی گھڑی تھی...... جب اس کی آنکھ کھلی۔

موبائل دھیمے سروں میں بج رہا تھا۔ اور شاید بہت دیر سے بج رہا تھا...... اس نے نمبر پڑھے بغیر عجلت میں کال ریسیو کی......

دوسری طرف گہرا سکوت تھا، اتنا گہرا کہ وہ پریشان ہو اٹھی۔

کئی بار پکارنے کے بعد دوسری طرف سے جو آواز سنائی دی، اس کی نیند اڑا دینے کے لیے کافی تھی......

''وریشہ...... یہ تم ہو؟'' اس نے تصدیق کرنا چاہی۔

جواباً وریشہ ہنسی تھی......ہنسی جس میں آنسوؤں کی آمیزش تھی۔

''کیا ہوا وریشہ......! تم رو رہی ہو......؟''

''نہیں......بس مجھے گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ میرا دل چاہا کہ...... میں تم سے بات کروں......''

''ہاں ہاں، کیوں نہیں...... ہم بات کر لیتے ہیں......'' ماورا نے نیم تاریکی میں وقت کا اندازہ لگایا۔ وہاں غالباً رات کا آغاز تھا۔

''گھبراہٹ کیوں ہو رہی ہے؟ طبیعت ٹھیک ہے ناں......؟''

''ہوں......'' مختصر جواب۔

''فارس کہاں ہے......؟ تم اکیلی ہو اس وقت؟'' ماورا کو بے چینی سی ہونے لگی تھی......

''فارس سو رہے ہیں...... میں ٹیرس پر آئی تھی تم سے بات کرنے...... سارا شہر میرے سامنے ہے اس وقت...... بہت روشنیاں ہیں میرے اردگرد......لیکن ......میرے دل میں بہت اندھیرا ہے ماورا......''

ماورا نے پہلو بدلا......لیکن خاموش رہی......وہ اسے بات کرنے کا موقع دے رہی تھی۔

''ماورا......! تم ...... تم مجھے معاف کر دینا پلیز......'' وہ پھر سے رو رہی تھی......

''ایسا کیوں کہہ رہی ہو وریشہ......تم نے کیا کیا ہے؟''

''میں نے تمہارے ساتھ اچھا نہیں کیا......پلیز! مجھے دل سے معاف کر دینا۔'' وہ اب بلند آواز میں کھل کے رو رہی تھی۔

''مت کہو ایسے وریشہ! تم مجھے پریشان کر رہی

ہو...... تم میری جان ہو وریشہ! تم نے میرے ساتھ کبھی برا نہیں کیا۔'' اس کی اپنی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے۔

''میں پچھلے کئی دنوں سے تمہیں یاد کررہی تھی ماورا، تمہاری باتوں، تمہاری عادتوں کو...... بچپن سے لے کر سال بھر پہلے تک ...... ہم اکٹھے رہے۔ ہم نے ہر موسم کو...... ہر اچھی، بری گھڑی کو مل کر، بانٹ کر گزارا...... مجھے پتا تھا، تم میری بعض عادات کو سخت ناپسند کرتی تھیں، لیکن مجھے کچھ نہیں کہتی تھیں...... اور تمہیں یاد ہے، ایک بار۔''

وہ بہت پرانی باتیں دہرارہی تھی ...... جسے بڑی خاموشی سے سننے کے باوجود ماورا کو کسی غیر معمولی پن کا احساس ہوتا رہا......

وریشہ بولتی رہی تھی...... بے تکان...... لیکن وہ اتنا بولنے کے بعد خوش تھی، مطمئن اور پرسکون...... کال کے خاتمے تک وہ بالکل نارمل انداز میں باتیں کرنے لگی تھی۔ شاید کسی اداسی کا اثر تھا۔

''اسے یہاں سے گئے ہوئے بہت دن ہوگئے ہیں، دادو سے کہوں گی اسے کچھ دن کے لیے اپنے پاس بلالیں۔ اسے عادت نہیں ہے ہمارے بغیر رہنے کی......''

فون بند کرنے کے بعد اس نے بڑی وضاحت سے سوچا تھا۔

☆☆☆

صبح اس کی آنکھ خاصی دیر سے کھلی تھی...... نہادھو کر چائے بسکٹ کا ہلکا سا ناشتہ کرنے کے بعد وہ دادو کے کمرے میں آگئی تھی۔

''دادو......! وریشہ سے بات ہوئی آپ کی؟'' دادو کا احوال پوچھنے کے بعد اس نے سرسری سا پوچھا تھا۔

''نہیں...... آج کل میں تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ اس کی ڈلیوری ڈیٹ قریب ہے۔ میرا خیال ہے۔ سطوت کی طرف آجائے گی وہ......''

لاؤنج میں فون مسلسل بج رہا تھا۔

''بوا پتا نہیں کہاں چلی گئیں......'' اس نے بے دلی سے اٹھتے ہوئے سوچا۔ دادو کے کمرے سے باہر آئی تو بوا فون اٹھا چکی تھیں۔

دوسری جانب پتا نہیں کون تھا......؟ اور کیا کہہ رہا تھا......؟ ماورا نے بوا کے فق ہوتے چہرے کو دیکھا تو لپک کران کی طرف آئی......

''ارے نہیں...... ہائے...... میں مرگئی......'' حواس باختہ بوا جیسے گرجانے کو تھیں

''بوا...... بوا کیا ہوا؟''

''ہم لٹ گئے...... برباد ہوگئے...... وریشہ ہمیں چھوڑ کر چلی گئی...... بیگم صاحبہ! روما بیگم، دہائی ہے دہائی۔ ہماری منیا چل بسی...... ارے سنا کسی نے ...... قیامت کی گھڑی آگئی...... ہائے میری بچی......''

بوا تیورا کر گر گئیں۔ اور وہ اس قابل بھی نہیں تھی کہ چند بوندیں پانی کی ان کے حلق میں ٹپکا دیتی۔

☆☆☆

وہ انہونی ہوئی تھی کہ جس کے ہونے کا یقین دل کو کسی طور چین نہ لینے دیتا تھا۔ بوا بڑی فرصت میں بیٹھ کر آنے جانے والوں کے سامنے روتیں۔ وہ ضبط کرتے کرتے تھک جاتی تو پھر سے رونے بیٹھ جاتی...... اگر مرنے والا ان آنسوؤں کے بدلے واپس آسکتا تھا تو پیچھے رہ جانے والے اپنی آنکھوں سے قلزم بہادیتے۔

روما دادی دوسرے دن ہی ایمرجنسی میں ٹکٹ کٹوا کر فلائی کرگئی تھیں۔ وہ وریشہ کو دیکھے بغیر کبھی رخصت نہ ہونے دیتیں...... سطوت انکل نے بہت منع کیا۔ ان کی طبیعت خراب تھی۔

''یہاں رہی تو مرجاؤں گی سطوت! مجھے آنے دو...... میں اپنی بیٹی کو آخری بار جی بھر کے دیکھ تو لوں گی......'' وہ لاڈلی تھی دادو کی...... ان کا بس چلتا تو اپنی باقی کی سانسیں وریشہ کے نام لکھ دیتیں۔

خالہ کو پتا چلا تو دوڑی آئیں...... جواد بھی ان کے ساتھ تھا......

دو دن رہیں...... پچھلی ہر بات کو بھلائے اس

کے ساتھ لگی تسلی۔ دلاسا دیتی رہیں۔ جاتے جاتے بوا کے کانوں میں پھونک گئیں......

"روما خالہ سے کہنا...... ماورا کے لیے ادھر ادھر رشتے نہ ڈھونڈتی پھریں۔ میرے جواد سے جوڑ بنتا ہے اس کا...... ہمارا خون ہے تو سب سے پہلا حق بھی اس پر ہمارا ہی ہے......"

بوا ضبط کر کے سنتی رہیں، ان کے جانے کے بعد انہوں نے اپنا سر پیٹ لیا......

"ارے ہماری بیٹا کے پڑ سے پہ آئیں اور رشتہ ڈال کر چلتی بنیں...... کہاں گئے احساس، لحاظ، مروت...... ذرا شرم نہ آئی...... ارے ہم تو غم کے مارے اپنے دکھوں کو رو رہے ہیں اور انہیں جوڑ سنجوگ یاد آ رہے ہیں۔ یا الٰہی ایسا پتھر دل بھی نہ ہو کسی کا......"

ماورا نے گھٹنوں میں سر دیا اور چپ چاپ ان کی سب باتیں سنتی رہی۔

☆☆☆

برسات کا موسم شروع ہوگیا تھا۔ پہاڑی علاقوں کی بارش تھی۔ آناً فاناً سیاہ گھور بادل پہاڑوں کی چوٹیوں پر اترتے اور لمحوں میں ہر طرف جل تھل ہوجاتی۔ کبھی رات گئے اچانک زور کا شور ابھرتا، وہ کھڑکی کھولتی اور تا دیر برستی بارش کو آسمان سے زمین پر اترتا دیکھتی......

"کبھی یہ نظارہ ہم دونوں دیکھا کرتے تھے...... میں اور وریشہ......"

وریشہ کی یاد آتی اور دل جیسے ہر چیز سے اچاٹ ہوجاتا......

روما دادی واپس آ رہی تھیں۔

"موسم ٹھیک نہیں ہے...... تم نہیں آؤ گی۔ صرف ڈرائیور کو بھیج دو......" دادو کی سخت ہدایات کے سامنے اس کی کہاں چل سکتی تھی۔

جس وقت دادو نے قدم رکھا...... سیاہ گھور بادلوں نے دن میں رات کا سماں کر رکھا تھا۔ دادو کو آرام سے بٹھا کر وہ سیدھی ہوئی تو ٹھٹک گئی۔

دروازے کے بیچوں بیچ ایستادہ اس سائے کو دیکھ کر دل بے اختیار ڈوب کر ابھرا تھا۔ دادو کے ساتھ کوئی اور بھی تھا۔

"دادو نے بتایا کیوں نہیں......؟" اس نے مضطرب ہو کر دادو کو دیکھا۔

"آجاؤ فارس...... لاؤ اسے مجھے دے دو......"

دادو نے دونوں ہاتھ آگے بڑھائے۔ فارس داخل ہوا تو دونوں بازوؤں میں ایک ننھی جان کو بہت احتیاط سے سمیٹ رکھا تھا۔

"آؤ دیکھو...... وریشہ کا بیٹا......" دادو نے اسے پکارا تو وہ لڑکھڑا سی گئی۔ ننھا فرشتہ آنکھیں موندے بے سدھ سو رہا تھا......

وہ دونوں مٹھیاں بھینچے...... ہونٹ کاٹتی اسے دیکھتی رہی...... آنکھوں سے بے آواز آنسو ایک لکیر کی صورت بہتے رہے۔

"یہ اچھا نہیں ہوا دادو...... ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا...... یہ کیسے جیے گا...... بہت چھوٹا ہے یہ......"

"اللہ کوئی نہ کوئی سبب بنا دے گا۔ تم جاؤ فارس کے لیے روم سیٹ کرواؤ۔ بہت اپ سیٹ رہا ہے یہ...... چھوٹی آزمائش نہیں ہے اس کے لیے...... جاؤ، چاند کو آج رات میں اپنے پاس سلاؤں گی۔ ایک بھرپور نیند فارس کے لیے بے حد ضروری ہے۔"

حالات کسی حد تک معمول پر آتے جا رہے تھے۔ چاند کے لیے کل وقتی آیا کا بندوبست کرلیا گیا تھا۔ دادی اسے اپنے کمرے میں رکھتی تھیں...... فارس آتا تو اپنے بیڈ روم میں لے جاتا...... ماورا کا جب دل چاہتا اس سے کھیلنے لگتی...... اس دوران سطوت انکل اور مہرین آنٹی کی آمد نے جیسے ٹھہرے پانی میں ہلچل سی مچا دی تھی۔

ماورا چاند کو گود میں لیے بیٹھی تھی...... مہرین آنٹی وریشہ کی باتیں کر رہی تھیں......

"چاند کے لیے اس نے کوئی خاص شاپنگ نہیں کی تھی اماں...... اس کا بی ہیویئر بہت عجیب تھا...... پہلے بچے کی بار ماں بہت کانشس ہوتی ہے۔ نئے بچے کے لیے شاپنگ کرتی ہے۔ روم سیٹ کراتی

ہے......لیکن اسے تو آخری پل تک فارس کے سوا کچھ دکھائی ہی نہ دیتا تھا......"

ماورا نے کن انکھیوں سے فارس کو دیکھا......شیو بڑھی ہوئی تھی......بال بے ترتیب...... وہ خود پر توجہ نہیں دے رہا تھا، ماورا کو معلوم تھا۔

"فارس کے کپڑے، فارس کا کھانا، فارس کے لیے چائے، کافی...... آفس میں ہوتا تو دس بار فون کرتی تھی اس کو......"

"چاند کو دیکھا تھا وریشہ نے......؟" بس یونہی ماروا کو خیال آیا تو پوچھ بیٹھی۔

"ہاں۔ دیکھا تھا، اسے پیار بھی کیا تھا...... پھر اتنی اچانک طبیعت بگڑی کہ...... مجھے بلایا تھا ڈاکٹرز نے...... مجھ سے بات کرنا چاہتی تھی وہ......بس اپنی وصیت بتائی اور پھر میرے ہاتھوں سے اس کا ہاتھ چھوٹ گیا...... جانتی ہو......اپنی آخری سانسوں میں کیا کہا اس نے......؟"

ماورا نے سر اٹھا کر دیکھا......

مہرین آنٹی بڑی گہری نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھیں......

"اس نے کہا تھا...... میرا بیٹا ماورا کو دے دیں......فارس اور ماورا اسے مل کر پالیں گے......"

ماورا سن سی رہ گئی تھی......فارس ایک دم اٹھا اور کمرے سے باہر نکل گیا تھا......

☆☆☆

"میں وریشہ کی جگہ نہیں لے سکتی......آئم سوری آنٹی......" اس قطعی انداز میں کہا گیا تھا کہ مہرین آنٹی چپ کی چپ بیٹھی رہ گئی تھیں......

دادو نے اسے اٹھ کر جاتے دیکھا......

"مجھے لگتا ہے، وہ ساری رات نہیں سوئی...... ڈسٹرب ہے...... میں بات کرلوں گی اس سے......" دادو نے تسلی کرائی۔

سطوت انکل اور مہرین آنٹی چند روز کے لیے کوہاٹ گئے تو بوا اس کے سر ہو گئیں۔

"کون دے گا اس بچے کو پیار...... کچھ اس کا بھی خیال کرو...... مان جاؤ...... برائی کیا ہے اس میں؟"

"میں خیال کروں......اب بھی میں ہی خیال کروں بوا......؟ اور میرا خیال کون کرے گا......؟ میں جیتی جاگتی انسان نہیں ہوں کیا......میری اپنی کوئی مرضی، کوئی خواہش نہیں ہے کیا......ساری عمر، ساری زندگی وریشہ مجھ پر حاوی رہی...... مجھے کیا پسند ہے؟ مجھے کیا چاہیے......؟ مجھے کس وقت پڑھنا ہے؟ کس وقت شاپنگ کرنی ہے۔ یہ سب میں نہیں وریشہ طے کرتی تھی بوا...... میں کٹھ پتلی تھی وریشہ کے ہاتھ میں......ایک کھلونا تھی...... بڑی تھی وہ مجھ سے...... اتنا حق جتاتی تھی کہ میں اس کی فرماں بردار غلام ہو کر رہ گئی تھی......اس نے ہرایرے غیرے کا نام میرے نام کے ساتھ جوڑنے کی کوشش کی ...... فارس کے ساتھ گزرے ہوئے چند لمحوں کو کیچڑ بنا کر اس نے میرے کردار پر تھوپ دیا اور اب جاتے جاتے بھی وہ ہی فیصلہ سنا گئی کہ مجھے کس سے شادی کرنی ہے اور کس کا بچہ پالنا ہے۔"

پتا نہیں اور کتنا زہر اگلتی وہ کہ فارس ایک دم سے اس کے سامنے آگیا......

"کچھ مت کہو...... ماورا...... پلیز چپ رہو...... اگر ساری عمر نہیں بولیں تو اب بھی مت کہو......اب تو وہ جا چکی ہے...... تکلیف ہوگی اسے۔"

ماورا نے لب بھینچ لیے......اس کی آواز اس قدر بلند ہو گئی تھی......اسے اندازہ نہیں تھا۔

"تمہاری مرضی کے بغیر کچھ نہیں ہوگا۔ وہی ہوگا۔ جو تم چاہو گی۔ پریشان مت ہو......لیکن تمہیں ایک بار، صرف ایک بار میری بات سننا ہوگی۔"

☆☆☆

لیکن اس سے پہلے کہ فارس کوئی بات کرتا، سطوت انکل نے کوہاٹ سے واپس آتے ہی ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا تھا۔ چاند کی آیا ان کے سامنے کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھی۔

"یہ نیند کا سیرپ اس کے فیڈر میں ڈال کر اسے

دے رہی تھی...... نجانے کب سے یہ سلسلہ جاری ہے اور کب تک جاری رہنا تھا...... اگر آج میں نہ دیکھ لیتا تو...... آپ سب لوگوں کی ناک کے نیچے یہ عورت اتنا گھناؤنا کام کر رہی تھی...... جب میں یا آپ نہیں ہوں گے تب یہ کیا کرے گی ہمارے بچے کے ساتھ؟"

آیا کا حساب کتاب بے باق کر کے سطوت انکل اسے بازو سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے دادو کے کمرے میں لے گئے تھے۔

"ادھر بیٹھو ماورا...... دوٹوک بات کروں گا تم سے...... ہاں یا ناں میں جواب دو، ابھی اور اسی وقت......"

ماورا تھر تھر کانپتی ان کے سرخ ہوتے چہرے کو دیکھتی لرزتی رہی......

"میں آج شام تمہارا نکاح فارس سے کر رہا ہوں...... تمہیں منظور ہے یا نہیں؟"

رائے پوچھنے کا یہ کون سا طریقہ تھا......؟ وہ ششدر سی بیٹھی تھی۔

"وریشہ کہتی تھی تم الیاس کو پسند کرتی ہو، وہ تھرڈ کلاس فیملی کا لڑکا...... دیہاڑی دار مزدور...... تمہیں پسند ہو بھی تو بھی میں تمہاری شادی اس سے ہرگز، ہرگز نہ کرتا...... فارس کو اور اس کے بچے کو اس وقت ضرورت ہے تمہاری...... میں وریشہ کے بچے کے لیے کسی اور پر ٹرسٹ کر ہی نہیں کر سکتا...... یہ دیکھو۔ یہ میرے جڑے ہوئے ہاتھ...... مجھے سکون بخش دو...... تم چاند کو گود میں لو گی تو میں سمجھوں گا۔ چاند وریشہ کی گود میں ہے۔"

اور بس پھر باقی کیا رہ گیا تھا۔

ماورا صبا...... انکار کرتی تو کیسے...... اقرار کرتی تو کس طرح......

"جیسا آپ کو منظور......"

وہ اپنے قدموں پر چل کر نہیں، گھسٹ گھسٹ کر اپنے کمرے تک آئی تھی......

کمرے کا دروازہ بند ہوتے ہی سارا ضبط، حوصلہ ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا...... وہ پھوٹ پھوٹ کر یوں روئی جیسے سارے رشتوں نے آج ہی دم توڑا ہو۔

"کسی اور کا نہیں، سارا قصور آپ کا ہے......"

اس نے سارے اسکیچز پھاڑ کر الماری کے ایک کونے میں ڈال دیے تھے۔

"کس نے کہا تھا ایسی عورت سے شادی کرنے کو، جس کی زندگی سے ڈاکٹرز بھی مایوس ہو چکے تھے۔ شادی کر لی تھی تو مجھے کیوں پیدا کیا......؟ اپنے فیصلے کا بھگتان بھگتنے کے لیے خود کیوں نہیں زندہ رہے...... آپ کے حصے کی ساری سزائیں میرے کھاتے میں کیوں ڈالی گئیں...... آپ کے ایک غلط فیصلے نے میری ساری زندگی کو امتحان بنا ڈالا...... اس گھر میں مجھے کبھی وریشہ کی برابری نصیب نہیں ہوئی...... ہمیشہ کی بچی کھچی چیزوں کی طرح آج بچا کھچا رشتہ بھی میری جھولی میں ڈال دیا گیا ہے...... کیا آپ ہوتے تو یونہی ہوتا۔"

وہ روتی کرلاتی رہی......

اور سب کچھ ویسے ہی ہوا جیسے ہونا قرار پایا تھا۔

☆☆☆

چار، چھ لوگوں کی موجودگی میں نکاح ہوا......

اور وہ فارس کی گاڑی میں بیٹھ کر اس کے گھر تک آ گئی...... بوا چاند کو لیے گاڑی سے اتریں تو اس نے چاند کو ان کی گود سے لے لیا تھا......

"آپ ڈرائیور کے ساتھ واپس چلی جائیں بوا...... چاند کے لیے ایک ہی آیا کافی ہے......"

بوا ہکا بکا کھڑی اسے اندر جاتا دیکھتی رہیں پھر چپ چاپ واپس ہو لیں...... اس نے اپنا اور چاند کا سامان الگ کمرے میں رکھوایا تھا۔

"تم ریسٹ کر لو...... میں چاند کو اپنے روم میں لے جاتا ہوں......" فارس نے چاند کو لینا چاہا لیکن اس نے منع کر دیا۔

"جس کام کے لیے مجھے اس گھر میں بھیجا گیا ہے، وہ کرنے دیں...... چاند میری ذمہ داری ہے...... مجھے نبھانے دیں......"

"ایسے مت کہو...... ماورا...... تم غلط انداز سے سوچ رہی ہو......" فارس تڑپ کر رہ گیا تھا۔ وہ جواباً

کچھ نہیں بولی تھی۔

☆☆☆

آج تیسری رات تھی کہ اس نے پلک جھپک کر نہ دیکھی تھی ...... نیند نہ آنے پر رات کتنی اذیت ناک ہوتی ہے اسے آج سے پہلے کبھی اندازہ نہ ہوا تھا...... آنکھوں میں چبھن تھی یوں جیسے کسی نے مٹھیاں بھر بھر کر ریت آنکھوں میں انڈیل دی ہو......سر درد سے پھٹا جا رہا تھا...... چاند کو کاٹ میں سکون سے سوتا دیکھ کر وہ تھک ہار کر فارس کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔

وہ لاؤنج میں تھا......صوفے پر نیم دراز...... آنکھیں بند کیے جانے کن سوچوں میں گم...... ٹی وی بند آواز سے چل رہا تھا......

''فارس ......!اس کے پکارنے پر وہ چونکا، پھر فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا......

''خیریت؟ کیا ہوا......؟''

''میں دو راتوں سے نہیں سوئی...... مجھے لگ رہا ہے میرا دماغ پھٹ جائے گا......'' وہ دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھیں مسل رہی تھی۔

'' اونہوں...... یوں مت کرو...... آنکھیں خراب ہو جائیں گی...... یہاں بیٹھو......'' اسے صوفے پر بٹھا کر وہ پانچ منٹ میں واپس آ گیا تھا...... چائے بسکٹ اور ایک ننھی سی ٹیبلیٹ ...... ٹرے اس کے سامنے رکھی تھی......

'' یہ سکون آور گولی ہے...... تم اچھا محسوس کرو گی......'' چپ چاپ اس کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے اس نے ایک آدھ بسکٹ کے ساتھ چائے پی اور گولی بھی نگل لی......

''چاند ڈسٹرب کرے گا رات میں......تم اس روم میں آ جاؤ......''

''لیکن......'' وہ متردد تھی۔

''حلیمہ دیکھ لے گی اسے......میں بتا دیتا ہوں، وہ چاند کے پاس آ جائے گی......''

سوئے سوئے حواس کے ساتھ وہ کمرے میں داخل ہوئی...... یہ بیڈ روم فارس کا تھا اس کا اندازہ اسے چند لمحوں بعد ہوا تھا۔

وہ جانے کے ارادے سے پلٹی تھی......کہ فارس راہ میں حائل ہو گیا......اپنے عقب میں دروازہ بند کرتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ چکا تھا۔

''ادھر آ کر لیٹ جاؤ، ماورا......تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں...... تمہیں اس وقت سکون اور نیند چاہیے۔ میں جانتا ہوں......''

''میں......وریشہ کی جگہ نہیں لے سکتی......'' اس نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی...... لیکن گرفت مضبوط تھی۔

''تم وریشہ کی جگہ نہیں لے رہیں؟ وریشہ نے تمہاری جگہ لی تھی......''

وہ لڑکھڑا سی گئی......بہت زور کا چکر آیا تھا۔

''کیا مطلب ہوا اس بات کا......کیا کہا ہے اس نے ......؟'' تکیے پر سر گراتے ہوئے اس نے اپنے دماغ کو اس خمار سے آزاد کرانا چاہا جو لحہ بہ لحہ پھیلتا جا رہا تھا۔

''وریشہ نے میری جگہ کیسے لی تھی......؟ میں سمجھ نہیں پا رہی ...... کس طرح......؟'' وہ پوچھ رہی تھی۔ فارس کا بھاری ہاتھ اس کی پیشانی پر تھا۔

وہ منتظر رہی...... ابھی بولے گا۔ ابھی جواب دے گا۔ بند ہوتی پلکوں کے ساتھ اس نے دیکھا۔ وہ بیڈ کے قریب کرسی پر بیٹھا تھا۔

ابھی کچھ کہے گا...... کیسی گرہ ہے جو کھل نہیں رہی نجانے کس وقت اس کا ذہن مکمل تاریکی میں ڈوب گیا تھا۔ نیند میں بہت سے چہرے اپنے آس پاس دکھائی دیتے رہے۔ خوابوں کا عجیب بے ترتیب سلسلہ تھا جو دیر تک جاری رہا۔ ٹوٹے پھوٹے، ادھورے خواب......اور ان سب کے باوجود ایک مانوس سی خوشبو تھی جو سارا وقت اس کے آس پاس مہکتی رہی۔ اسے تھپکتی رہی...... یہاں تک کہ وہ گہری نیند سو گئی...... ایک ایسی پُرسکون اور گہری نیند، جس کی وہ خواہش مند تھی۔

☆☆☆

صبح اس کی آنکھ بہت دیر سے کھلی تھی۔

حلیمہ کھڑکیوں کے پردے ہٹائے، جوس لیے

اس کے سرہانے کھڑی تھی..... گویا ابھی بھی وہ نہ اٹھاتی تو نجانے کب تک سوئی رہتی.....

''فارس صاحب کا فون آیا تھا۔ انہوں نے کہا، آپ کو جگانے کے لیے۔ کسی اور چیز کی ضرورت ہے تو بتادیں.....''

''نہیں تم جاؤ.....'' حلیمہ باہر نکل گئی تھی.....

وہ بہ نظر غائر بیڈ روم کو دیکھنے لگی۔ کشادہ اور نفیس..... سائیڈ ٹیبل پر فارس کی تصویر تھی۔

''کتنے دن ہوگئے..... میں نے اسے دھیان سے دیکھا تک نہیں، حالانکہ اب وہ اتنے قریب ہے.....'' تصویر کو بغور دیکھتے ہوئے اس نے پاس رکھی ڈائری اٹھالی..... خاصی ضخیم ڈائری تھی۔

اس نے سرسری سے انداز میں ڈائری کھول کر نظر دوڑائی..... اور پھر چونک سی گئی..... تحریر یقیناً فارس کی تھی۔

''اور اس خوبصورت موسم میں وہ لڑکی میرے دل کو چھوگئی.....''

اس کے چہرے پر اداس سی مسکراہٹ پھیل گئی..... اسے یاد تھا جب پہلی بار وہ وریشہ سے ٹکرایا تھا..... اس نے چند صفحات مزید پلٹے۔

''اسے دیکھنے، اسے سننے کے لیے وجاہت ہاؤس جانا میرے لیے ایک انوکھا لیکن دل پسند تجربہ ہے۔''

اس نے بے دلی سے صفحات پلٹ دیے۔

''وہ صبح کے اجالے میں سورج کی اولین کرنوں کی طرح تروتازہ اور شبنم کے قطروں کی طرح پاکیزہ لگ رہی تھی۔ اس سے حسین چہرہ میں نے اپنی زندگی میں شاید ہی دیکھی۔''

''ہاں! یقیناً وریشہ کی خوبصورتی بے مثال تھی۔''

اس نے گہری سانس لیتے ہوئے ایک ساتھ کئی صفحات پلٹے.....

''محفل کتنی بے رنگ اور رات کس قدر اداس تھی..... میں اس کی ایک جھلک بھی نہ دیکھ پایا..... اور جب آخری پہر میں دیکھا تو دل پر قابو رکھنا مشکل ہوگیا۔ کاش میں اس کے سارے ڈر، خوف، واہمے سمیٹ سکتا۔''

خدا جانے کس محفل کا ذکر تھا..... وریشہ تو ہر محفل میں موجود ہوتی تھی۔

اس نے اگلا صفحہ دیکھا اور چونک گئی۔

''میں تم میں اپنے آپ کو دیکھتا ہوں..... بہت مماثلت ہے ہم میں۔''

''میں اس سے کہہ رہا تھا۔ اور وہ بہت پرسکون نظروں سے وادی میں کھلے پھولوں کو دیکھ رہی تھی.....''

ماورا الجھ سی گئی..... یہ باتیں..... بھولنے والی نہیں تھیں.....

''یہ تو مجھ سے کہا تھا فارس نے..... لیکن میرا یہاں کیا تذکرہ.....؟''

اس نے پلکیں جھپک جھپک کر اگلی تحریر پڑھی۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا۔ وریشہ کا مسئلہ کیا ہے۔''

اگلے کئی صفحات خالی تھے..... لیکن یوں جیسے ان پر بڑی بے دردی سے قلم گھسیٹا گیا ہو۔ صفحات پھٹنے کے قریب تھے۔

''وریشہ کہتی ہے، اس کی محبت کا محور کوئی اور ہے۔''

''میں نے اس سے براہ راست بات کرنے کا ارادہ کیا مگر وہ جا چکی تھی.....''

اور پھر صفحے کے بیچوں بیچ.....

''ماورا صبا! جسے میں نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کھودیا۔ I Have lost my love۔''

ماورا دم بخود بیٹھی تھی..... یہ کیسی کہانی تھی..... اس کے آغاز اور انجام میں اتنا تضاد کیوں.....؟ وہ پاگل ہونے کے قریب تھی.....

''تو کیا میں غلط تھی..... شروع سے لے کر آج تک..... وہ میری طرف آتا تھا اور میں نے اسے وریشہ کی طرف..... اوہ میرے خدا.....''

اس نے اپنی دونوں ہتھیلیوں سے اپنی آنکھیں رگڑیں..... اتنا پانی کہاں سے بہتا چلا آرہا تھا۔

''میں ماورا کے لیے جان دیتا..... لیکن اس سے قبل وریشہ میرے لیے زندگی داؤ پر لگا چکی تھی..... وہ لمحہ بہت عجیب تھا جب میں اس کے دم توڑتے وجود کو اپنے بازوؤں میں لے کر ڈاکٹر کی طرف بھاگا..... وہ سلیپنگ پلز لے

چکی تھی...... ڈاکٹر آس وزراس میں تھے......شاید زندہ رہے یا شاید مر جائے......زندگی جیسی قیمتی چیز سے یوں کھیلا جا سکتا ہے صرف اپنی محبت کو پانے کے لیے...... میں مجرم بنا کھڑا تھا، وریشہ سے جڑے رشتوں کو روتے کرلاتے دیکھ رہا تھا...... اور میری گردن کے گرد پھندا سخت ہوتا جارہا تھا۔ اگر وہ نہ رہی تو میں خود کو معاف کر پاؤں گا......؟

لیکن وہ زندہ رہی...... بہت جرأت مند تھی وہ۔ اپنی جان پر کھیل کر اس نے مجھے پالیا...... محبت کو معتبر کردیا......اور میں جو اظہار کی تمنا دل میں لیے پھرتا تھا......اسے دل میں ہی دفن کردیا......

''تم مجھے ملو یا نہ ملو فارس ابن مراد...... مادرا تمہاری نہیں ہوسکتی...... اس کی محبت کے اور بڑے دعوے دار ہیں......تم اس فہرست میں کہیں بھی نہیں آتے''۔

اس رات اسپتال کے ٹھنڈے یخ کمرے میں دو لوگ زندگی ہار رہے تھے جن میں سے ایک کو زندگی بخش دی گئی تھی اور وہ وریشہ سطوت حسین تھی۔''

اور اس سے آگے کے سب صفحات خالی تھے۔ خالی نہ ہوتے تب بھی شاید وہ پڑھ نہ پاتی۔ وہ روہی تھی...... پھوٹ پھوٹ کر......تو یہ وہ پہیلی...... جسے وہ بوجھ نہ سکی......اس کی سوچ کا ہر زاویہ، ہر انداز غلط تھا۔ کون سا احساس محرومی تھا، کم مائیگی کا کون سا جذبہ تھا کہ اس نے اپنے آپ کو کبھی اس قابل سمجھا ہی نہ تھا۔ کبھی فارس کی آنکھوں میں دیکھا ہی نہیں......اس کی باتوں کو، اس کے جذبے کو سمجھنے کی کوشش ہی نہ کی...... ہائے زندگی......یہ تو نے کیا کیا میرے ساتھ......

وہ روتے روتے تھک گئی...... یہاں تک کہ فارس نے آکر ڈائری اس کے ہاتھ سے لی۔ اور اس کو اپنے شانے سے لگالیا۔

''میں بہت مخلص رہا وریشہ کے ساتھ......اس سے جڑے تعلق کو میں نے پوری ایمان داری سے نبھایا...... یہ جانے بغیر کہ اس رشتے کی عمر کتنی ہوگی......میں جانتا ہوں......تم مجبوراً اس گھر میں آئی ہو...... کسی بھی خواہش اور چاہ کے بغیر......لیکن میں شاید خود غرض ہوگیا تھا۔ ایک بار پھر سے زندگی کی نوید ملی تو میں انکار نہیں کرسکا، لیکن فیصلہ آج بھی تمہارے ہاتھ میں ہے مادرا...... چاہو تو زندہ رکھو......چاہے تو ماردو......''

اور مادرا کو کہاں آتے تھے فیصلے کرنے...... ایسے لوگوں کے لیے فیصلے خود تقدیر کیا کرتی ہے۔ جو جلد یا بدیر درست ہی ثابت ہوتے ہیں۔

سوچپ چاپ اس کے کاندھے سے سر ٹکائے آنسو بہاتی رہی کہ زندگی تو اسی شخص سے عبارت تھی۔ جو اس کی قسمت میں لکھا جا چکا تھا۔

☆☆☆

''تو وریشہ سطوت حسین......اس رات فون پر مجھ سے معافی طلب کرنے کی وجوہات کچھ اور تھیں......جنہیں میں آج سمجھ پائی ہوں......تم نے جو چاہا، جیسے چاہا پالیا اور مجھے بھی مل گیا جو میری تقدیر میں تھا......بس اتنا شکر کرتی ہوں کہ میرا دل صاف، شفاف ہے اور اس میں پشیمانی یا پچھتاوے کا ایسا کوئی احساس نہیں جو میری آئندہ آنے والی زندگی پر اثر انداز ہو۔ ہاں ایک گناہ میں اپنے کھاتے میں ہمیشہ کے لیے لکھ رہی ہوں......صرف اور صرف تمہاری خاطر وریشہ فارس ابن مراد، کبھی یہ جان نہیں پائے گا کہ میری محبت کوئی اور نہیں وہ خود ہے۔ کیونکہ تم جانتی تھیں۔ میرے بنائے گئے اسکیچز میں سے کئی اسکیچز فارس ابن مراد کے تھے۔ جنہیں پھاڑ کر میری ڈائری میں دوبارہ کون سجا دیتا تھا۔ یہ میں جانتی تھی......لیکن میں نے تمہیں معاف کیا...... ہر زیادتی سے آزاد کیا...... اللہ کرے آئندہ کا ہر مرحلہ تمہارے لیے آسانیاں ہی آسانیاں لائے۔ تم باغ جنت کی بہاریں دیکھو......اور خدا مجھے بھی توفیق دے کہ میں اس اعتبار اور بھروسے پر پورا اُتر سکوں جو تم نے مرتے دم تک مجھ پر کیا......''

''چلیں......'' فارس کی آواز پر وہ چونکی۔

پھر مسکرا کر اس کے ساتھ ہولی۔ ان کے ولیمے کی سادہ مگر پُروقار تقریب میں چاند ان کے ساتھ ہر تصویر میں موجود تھا۔

شازیہ جمال طارق

شوخ و چنچل رشنا کے لیے جب مہناز پھپھو نے رشتہ مانگا تو نفیسہ بیگم لحہ بھر کے لیے شش و پنج میں مبتلا ہو گئیں۔ خوبرو شخصیت کا مالک اظہار محمود برسر روزگار اور سب سے بڑھ کر حد درجہ فرماں بردار تھا۔ بظاہر رشتے میں کوئی قباحت نہیں تھی لیکن......

''کیا ہوا بھابھی! کس سوچ میں پڑ گئیں؟ میں نے کوئی ایسی انہونی بات تو نہیں کر دی، میرا اظہار ماشاءاللہ لاکھوں میں ایک ہے۔ اور اپنی رشنا کے لیے تو میں نے شروع سے ہی سوچ رکھا تھا۔ ویسے بھی سیانے سچ کہہ گئے ہیں پھپھی بھتیجی ایک ہی ذات، بھتیجیوں پہ پہلا حق پھپھوں کا ہی ہوا کرتا ہے۔''

مہناز پھپھو دلائل دینے پر آتیں تو اچھے اچھوں کو قائل کر کے دم لیتیں۔ لیکن نفیسہ بیگم نے فی الفور کچھ بھی کہنے سے گریز کیا کیونکہ یہاں معاملہ ان کی عزیز از جان بیٹی کا تھا۔

''آپ درست کہہ رہی ہیں آپا! میں آپ کے بھائی سے بات کروں گی۔ پھر جو اللہ کو منظور۔''

انہوں نے نرمی سے بات سمیٹ دی۔ دوسرے لفظوں میں سوچنے کے لیے وقت مانگا۔ مہناز پھپھو کی پیشانی پر ناگواری سے بل پڑ گئے۔ پرسوچ ہنکارا بھرتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا اور جاتے جاتے کہہ گئیں۔

''دو دن بعد جواب لینے آؤں گی۔''

پھپھو کی آمد اور آمد کا مقصد جان کر رشنا مضطرب سی ہو گئی۔ میرب سب کو شام کی چائے سرو کر رہی تھی۔ وہ خاموشی سے اپنا کپ اٹھائے، پچھلے احاطے میں چلی آئی۔ اماں نے مشورے کے لیے فائقہ کو بھی بلا لیا تھا۔ ہر ماں کی طرح انہیں بھی اپنی شادی شدہ بیٹی کی فہم و فراست پر بہت بھروسا تھا۔ ابا بھی اس وقت وہیں موجود تھے۔ خاموشی سے چائے کی چسکیاں لیتے۔

ساری بات بتانے کے بعد اماں نے رائے طلب کرنے والے انداز میں شوہر اور بیٹی کا چہرہ دیکھا۔ ''تو اماں اس میں اتنا سوچ بچار کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اظہار جیسا رشتہ قسمت والوں کو ہی ملا کرتا ہے۔ اگر پھپھو بذات خود چل کر رشتہ مانگنے آئی ہیں تو یقیناً اظہار کی پسندیدگی بھی شامل ہوگی اس معاملے میں کیونکہ پھپھو کی اڑانیں تو بہت اونچی تھیں۔ خیر اگر وہ آ ہی گئی ہیں تو انکار کرنا کسی طور مناسب نہیں۔''

''پر بیٹا تمہاری پھپھو کا مزاج...... جانتی تو ہو انہیں کیسے چھوٹی چھوٹی باتوں پر آنکھیں ماتھے پر رکھ لیتی ہیں۔''

''وقت اور رشتے بدلنے پر مزاج بھی بدل جاتے ہیں اماں! ویسے بھی پھپھو ہماری اپنی ہیں ماریں گی بھی تو چھاؤں میں ہی ڈالیں گی۔''

''واہ! اگر اتنی ہی اپنی ہیں تو پھر ماریں گی ہی کیوں بھلا؟'' خالی کپ ٹرے میں رکھتی میرب نے ناک چڑھا کر تبصرہ کیا۔ فائقہ کے گھورنے پر مسکرا کر کندھے اچکاتی کچن کی جانب چل دی۔

''آپ بھی تو کچھ بولیے نا سعید صاحب! آپ کیا کہتے ہیں آپ وہ کل جواب لینے آئیں گی تو کیا

کہوں ان سے؟'' خاموشی سے گفتگو سنتے شوہر کو انہوں نے بیچ میں گھسیٹا تو وہ گہری سانس کھینچتے گویا ہوئے۔

''رشنا سے بات کریں اگر وہ اس رشتے پر دل سے راضی ہے تو ٹھیک ہے ورنہ اگر اسے ذرا سا بھی کوئی اعتراض ہے تو زور زبردستی ہرگز نہیں۔ نہ ہی آپس کی رشتہ داری کے دباؤ میں آنے کی ضرورت ہے۔ ہماری بیٹی باشعور ہے۔ اپنے لیے جو بھی فیصلہ کرے گی بہتر ہوگا۔'' وہ بات مکمل کر کے وہاں سے اٹھ گئے تھے۔ اور کچن کی جانب بڑھتے رشنا کے قدم تھمے تھے۔ آنکھوں میں بے ساختہ نمی پھیلی۔

''مجھے آپ کے مان پر بہت فخر ہے ابا!'' اگلے روز پھپھو کو ہاں کر دی گئی۔

☆☆☆

فائقہ کا اندازہ سو فیصد درست تھا۔ پھپو اظہار کے کہنے بلکہ مجبور کرنے پر رشتہ مانگنے آئی تھیں۔ اونچے گھرانے کی بہو لانا ان کا خواب تھا۔ جس کی تعبیر وہ یہاں وہاں ڈھونڈتی پھر رہی تھیں لیکن انہیں اپنے اس خواب سے دستبردار ہونا پڑا۔ بیٹے کی فرماں برداری آڑے آ گئی تھی۔

اظہار جتنا اچھا بیٹا تھا۔ اتنا ہی اچھا شوہر ثابت ہوا۔ مغرور نین نقوش کی حامل رشنا میں اس کی جان تھی۔ پھپو کو اپنے بیٹے کا بیوی کی طرف یوں ملتفت ہونا ایک آنکھ نہ بھایا۔ ایک ان کی نازوں پلی بیٹی تھی جس کا نک چڑھا میاں اسے جوتے کی نوک پر رکھتا۔ ٹرک بھر کر جہیز دیا تھا۔ سمدھیوں کی خاطر مدارت میں کوئی کمی نہ چھوڑتیں۔ داماد آتا تو منہ میں نوالے دینے کی بس کسر رہ جاتی۔ لیکن بیٹی تھی کہ اس کے چہرے پر کسی خوشی کی رمق تک نہ جھلکتی۔

اور ایک یہاں ان کی بھتیجی بلکہ بھتیجی کم بہو زیادہ جو برائے نام جہیز لا کر ڈھیر ساری بے نیازی اور خود اعتمادی لیے ٹھاٹ سے رہ رہی تھی۔ بے جواز مقابلہ بازی اکثر رشتوں کا حسن گہنا دیتی ہے۔

ان کے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے بے خبر

رشنا وہیں لاؤنج میں ان کے قریب صوفے پر بیٹھی چینل سرچنگ میں مصروف تھی۔

''السلام وعلیکم اماں!'' اظہار نے حسب معمول آتے ہی ماں کے سامنے قدرے جھکتے ہوئے ان کے ہاتھوں کا بوسہ لیا تھا۔

''وعلیکم السلام بیٹا! جیتے رہو سامان نہیں لائے؟'' وہ عموماً گھر آتے ہوئے شام کو پکانے کے لیے کھانے وغیرہ کا سامان لے آتا تھا۔ آج اسے خالی ہاتھ دیکھ کر انہوں نے استفسار کیا۔

''اماں شام کو کھانا باہر سے منگا لیں گے۔ آج گرمی بہت ہے نا کہاں آپ لوگوں سے چولہے کے سامنے کھڑا ہوا جائے گا۔'' رشنا کی طرف دیکھتے

ہوئے وہ مسکرایا۔
جواباً لب دباتی رشنا بھی مسکرادی۔ پھپو کے تاثرات بگڑ گئے۔ بیٹے کی فرماں برداری میں فرق نہیں آیا تھا۔ اس فرماں برداری کے دائرے میں اب کسی اور کے فرمان بھی جگہ بنانے لگے تھے۔

☆☆☆

آج فہمینہ آرہی تھی۔ پھپو نے اسے خوب دل لگا کر بریانی پکانے کا آرڈر دیا، یقیناً بریانی کی فرمائش اس نے اپنی آمد کی اطلاع کے ساتھ ہی کردی تھی۔
''چلو اچھا ہے فہمی آپا کی وجہ سے ہم بھی ہفتے میں ایک آدھ بار دعوت — اڑا لیتے ہیں۔'' اظہار سے چھوٹے اسرار کو کھانوں کی اشتہا انگیز مہک نے کچن میں جھانکنے پر مجبور کردیا تھا۔ پھپو نے گھور کر اسے دیکھا۔
''ایسے گھوریں تو مت، کون سا غلط کہہ رہا ہوں۔ ویسے ہم فہمی آپا کو بلابلا کر تھک جاتے ہیں وہ مختلف کاموں کا بہانہ بنا کر ٹال جاتی ہیں اور جب ان کے میاں کا کچھ اچھا کھانے کا دل چاہتا ہے تب بمع فرمائشی پروگرام آپا کو یہاں چلتا کردیتے ہیں۔''
بات سچ تھی مگر کڑوی بھی تھی۔ رشنا کی موجودگی میں پھپو کو کچھ زیادہ ہی کڑوی لگی۔
''افوہ ابھی تک چاول بھی نہیں بھگوئے تم نے۔ بہت ہی سست اور کاہل لڑکی ہو۔ خدا جانے تمہاری ماں نے کچھ سکھا کر بھیجا بھی ہے یا ہر چیز کے لیے مجھے ہی اپنا سر کھپانا پڑے گا۔ ایک میری فہمینہ ہے ہر کام میں ماہر، ہنر میں یکتا۔ لیکن ہک ہاہ...... چلو اب جلدی جلدی ہاتھ چلاؤ۔'' اسے خوب لتاڑنے اور ڈھیر ساری ہدایات دینے کے بعد پھپو کچن سے نکلیں تو اس نے سکھ کا سانس لیا۔ اسے فہمینہ اور اس کے شوہر کے شایان شان بہت کچھ بنانا تھا۔
فہمینہ نے جدید تراش خراش کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ کلائیوں میں چوڑیاں، کمر پر جھولتا پراندہ اور تیز رنگ کی لپ اسٹک، لیکن اس کے چہرے پر چھائی مردنی اس کی ساری تیاری پر پانی پھیر رہی تھی۔ حد درجہ بے زاری اس کے ایک ایک انداز سے جھلکتی کوفت کا یہ عالم تھا کہ آتے کے ساتھ ہی دونوں بچیوں کو یہاں وہاں پٹخا اور خود منہ پر دوپٹہ ڈال کر چارپائی پر لیٹ گئی۔
''ارے فہمینہ! سب ٹھیک تو ہے نا بیٹا!''
''خاک ٹھیک ہے اماں!'' دوپٹہ جھٹکتی وہ اٹھ بیٹھی اور یوں زار زار روئی کہ پھپو کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔
''آئے ہائے کچھ بتاؤ تو سہی آخر ہوا کیا ہے؟ کیوں میری جان نکالنے پر تلی ہو۔''
دونوں بچیاں بے چاری سہم کر کبھی ماں تو کبھی نانی کا چہرہ تکنے لگتیں۔ وقت کم تھا اور ہفتہ بھر میں ہونے والے سسرالی مظالم کی داستان طویل تر۔
اسے عماد کے آنے سے پہلے سب کچھ ماں کو گوش گزار کرنا تھا۔ اس کی ایک ایک دہائی پر پھپو کا ہاتھ کلیجے پر جا پڑتا۔ عماد کے آنے کا وقت ہو چلا تھا۔ فہمینہ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر کے ماں کے دل پر بوجھ لادتی منہ پر پانی کے چھپاکے مارنے واش بیسن کے آگے جا کھڑی ہوئی۔ چہرہ عجیب ہیئت کا ہو رہا تھا۔
جھرجھری لے کر اس نے چلو میں بھرا پانی شیشے پر پھینک کر اپنی شبیہ دھندلی کی اور جلدی جلدی چہرے پر چھپاکے مارنے لگی۔
عماد آ گیا تھا۔ رشنا ٹیبل پر کھانا لگانے لگی۔ گلابی کھلتا ہوا لان کا سوٹ پہنے وہ بہت تروتازہ لگ رہی تھی۔ اظہار کام کے سلسلے میں شہر سے باہر گیا ہوا تھا۔ اس کی غیر موجودگی میں رشنا کا لپ اسٹک لگانے کو بھی دل نہیں چاہا۔ لیکن سادگی میں بھی وہ بہت منفرد دکھتی۔ عماد کی آنکھوں میں ابھرتی ستائش پھپو اور فہمینہ کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں رہی تھی۔ فہمینہ نے ابرو چڑھائے جبکہ پھپو نے مصلحتاً مسکراتے ہوئے داماد کا خیر مقدم کیا۔
''جی السلام علیکم خالہ!'' اس نے بدمزہ سا ہو کر

نگاہوں کا زاویہ بدلا۔ رشنا ٹیبل پر سب کچھ لگا کر وہاں سے ہٹ گئی اور کچن میں آکر چھوٹے موٹے کام نپٹانے لگی۔

عماد نے جھنجھلا کر چمچہ پلیٹ میں پٹخا، اس کی پلیٹ میں بوٹیوں کے پہاڑ کی کھڑی کرتی پھپھو چونک گئیں۔

کیا ہوا عماد؟'' فہمینہ نے گھبرا کر پوچھا۔ عماد نے تیوریاں چڑھائیں۔ ''ابھی بھی پوچھ رہی ہو کیا ہو۔ بریانی میں مرچیں چکھی نہیں؟ جیسے مٹھی بھر زہر جھونک دیا ہو۔ پتا بھی ہے مجھے تیزابیت کا مسئلہ ہے۔ پر نہ جی یہاں پر احساس کس کو ہے میں بھی اول درجے کا الو کا پٹھا ہوں جو ہر دفعہ پچھلی عزت افزائی بھلا کر پھر سے منہ اٹھائے چلا آتا ہوں۔''

داماد جی کا موڈ بگڑ چکا تھا۔ پھپو کے دل کو پنکھے سے لگ گئے۔ دل ہی دل میں رشنا کو خوب کوسا۔

''یہ رشنا بھی نا کوئی کام ڈھنگ سے نہیں کرتی۔ آپ بریانی چھوڑیں یہ کباب ہیں نا۔''

فہمینہ نے کبابوں کی پلیٹ آگے کی۔

''رہنے دو بس یہی بریانی ہی زہر مار کر لیتا ہوں۔''

دونوں آستینیں اوپر چڑھائے بڑبڑاتے ہوئے بگڑے تیوروں کے ساتھ دیکھتے ہی دیکھتے بوٹیوں کا پہاڑ ہڑپ کر لیا۔ نخوت سے بریانی کی بچی کچھی پلیٹ پرے کھسکائی اور احسان کرنے والے انداز میں کبابوں پر بھی ہاتھ صاف کر لیا۔ تب ہی رشنا چائے کی ٹرے تھامے چلی آئی۔ پھپو اور فہمینہ دونوں نے بیک وقت اسے کھا جانے والی نگاہوں سے دیکھا تھا وہ خاموشی سے برتن سمیٹنے لگی۔

''کیا سارا کام رشنا بھابھی اکیلے ہی کریں گی؟ تم کیوں مہمانوں کی طرح اینٹھ کر بیٹھ جاتی ہو۔ اگر تھوڑا بہت ان کا ہاتھ بٹا لو گی تو چربی نہیں پگھل جائے گی تمہاری۔''

عماد جانے سے پہلے آخری کیل بھی ٹھونک گیا تھا۔ فہمینہ نے روہانسا ہو کر سخت شکایتی نگاہوں سے ماں کو دیکھا۔ اور ماں نے ان کے جانے کے بعد بیٹی کے بہائے ایک ایک آنسو کا حساب آٹھ آٹھ کر کے لیا تھا۔ بریانی میں مرچیں بہت مناسب مقدار میں تھیں۔ اور یہ بات پھپو خود بھی جانتی تھیں لیکن......

رشنا لب کچلتی خاموشی سے ان کی ڈانٹ سنتی رہی۔ غلطی اس کی نہیں تھی لیکن وہ جانتی تھی اندھے کے آگے لالٹین لہرانے کا کوئی فائدہ نہیں۔

☆☆☆

چاند نے ابھی اپنا نصف سفر ہی طے کیا تھا جب تھکے ہارے اظہار نے گھر میں قدم رکھا۔ رخ ماں کے کمرے کی طرف تھا۔ اسے سامنے پا کر وہ پھپھک پھپھک کر رو دیں اور دن بھر کی روداد سنانے لگیں۔ روداد کا مظلوم ترین کردار وہ اور فہمینہ تھیں اور رشنا کی دن بدن بڑھتی من مانیاں، جان بوجھ کر برتی جانے والی لاپروائیاں نا قابل جرم۔

اظہار کے جبڑے بھنچ گئے۔ ماں کو ڈھیروں تسلیاں دینے کے بعد وہ اٹھا۔ اس کے قدموں کی چاپ کروٹیں بدلتی رشنا نے اپنے دل پر پڑتی محسوس کی تھی۔ کمبل پرے ہٹاتی وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ دن بھر کا انتظار...... کچن میں سر کھپائی...... عماد کا رویہ پھپو کی ڈانٹ پھٹکار، ایک کے بعد ایک رنگ اس کے چہرے پر آ کے گزر رہا تھا اور آخر میں ڈھیر سارا سکون، اس کا سائبان گھر آ گیا تھا۔ وہ اس کے سینے میں منہ چھپا کر دن بھر کی مشقت بھول جانا چاہتی تھی۔

''اول روز سے تم جانتی ہو عماد بھائی مرچیں کم کھاتے ہیں پھر بھی کھانا پکانے میں تمہاری اس درجہ غفلت کو میں کیا سمجھوں رشنا؟''

رشنا کے قدم تھم گئے۔ ''نجانے کب عقل آ گئے گی تمہیں۔ تمہاری وجہ سے عماد بھائی نے فہمی آپا کو کیا کچھ نہیں سنایا ہوگا اور یہاں اسی ٹینشن میں اماں کو رات بھر نیند نہیں آئے گی۔ حد درجہ لاپرواہ ہو تم۔''

اور بت بنی کھڑی رشنا کی آنکھوں سے وہ آنسو

بہہ نکلے جنہیں دن بھر اس نے پلکوں کی باڑ پھلانگنے نہیں دی تھی۔

"اور پلیز لائٹ آف کردو مجھے نیند آرہی ہے۔"

☆☆☆

صبح معمول کی طرح روشن اور چمکیلی تھی۔ رات تمام تر داغوں کے ساتھ اپنا دامن سمیٹتی گم ہو چکی تھی۔ پھپو کا موڈ بحال ہو چکا تھا۔ اور یہ پہلی دفعہ نہیں تھا۔ ہر بار گرجنے برسنے کے بعد ان کا موڈ بحال ہی ہوتا۔ شاید وہ اپنے کیے پر اطمینان پا چکی ہوتیں۔ جیسے کوئی اچیومینٹس۔

ماں کو خوشگوار موڈ میں ناشتے سے لطف اندوز ہوتا دیکھ کر اظہار کے چہرے پر مسرت سے تاثرات سج گئے۔

"یار رشنا! گرما گرم مزے دار چائے تو پلادو۔"

رشنا نے خاموشی سے بھاپ اڑاتا مگ اس کے سامنے لا کر رکھ دیا۔

"تم ناشتہ نہیں کرو گی؟" اسے پلٹتے دیکھ کر اس نے پوچھا۔

"کر چکی ہوں" اظہار اس کی ناراضی بھانپ چکا تھا۔ شاید نوے فی صد مردوں کی طرح وہ بھی یہی سوچتا تھا کہ روٹھی بیوی کو منانے کا صحیح وقت رات کا ہی ہوتا ہے۔

وہ دانستہ چپ رہا۔ اور رشنا منتظر ہی رہی شاید وہ پھپو کے سامنے گزشتہ رات کے اپنے رویے کی معذرت کرے۔

"اگر مرد بھی اتنے اعلا ظرف ہونے لگیں تو......"

تلخی سے سر جھٹکتے وہ سنک میں پڑے برتن دھونے لگی۔

شام کو گھر آتے ہوئے اظہار اس کے پسندیدہ چاکلیٹ فلیور کی آئس کریم پیک کروا کے لے آیا تھا۔ رشنا کا اترا چہرہ اسے دن بھر ڈسٹرب کرتا رہا تھا۔ اس کی شروع سے عادت تھی شادی سے پہلے اکثر ماں کے لیے بھی یوں ہی آئس کریم پیک کروا کے لے آتا تھا۔

رشنا صاف ستھری سوچ کی حامل باشعور لڑکی تھی۔ کپ پکڑتے ہوئے وہ مسکرا دی وہ یہ نہیں سوچتی تھی جو چیز میرے لیے ہے وہ ساس کے لیے کیوں جبکہ پھپو یہی سوچتی تھیں جو چیز صرف میرے لیے ہوا کرتی تھی وہ اب اس کے لیے بھی کیوں؟

ان کے کپ میں آئس کریم پگھلتی جا رہی تھی۔ ان کی سوچوں کی طرح رشنا سوچ بھی نہیں سکتی تھی زندگی میں وہ کبھی اپنی پھپو کے ہاتھوں یوں سازشوں کا شکار ہو جائے گی۔ پھپو کو نہ جانے اپنی حیثیت کے کمزور پڑ جانے کا خدشہ تھا یا اکلوتی بیٹی کی ناآسودہ زندگی کا دکھ، کہ وہ اس سب کا بدلہ رشنا سے یوں لینے لگیں۔ آگے پیچھے وہ ایسے حالات پیدا کر دیتیں کہ قصور وار نہ ہوتے ہوئے بھی رشنا قصور وار گردانی جاتی۔

کبھی یوں ہوتا کہ ادھر اظہار گھر میں قدم رکھتا ادھر پھپو کپڑے جھٹک جھٹک کر تار پر پھیلا رہی ہوتیں۔ جبکہ رشنا اس وقت اپنے کمرے میں بیڈ پر نیم دراز میگزین کی ورق گردانی کرتی پائی جاتی۔ اس صورت حال پر اظہار کا سیخ پا ہونا لازمی تھا۔ وہ رشنا سے سخت کبیدہ خاطر ہوتا اور وہ چاہ کر بھی ٹھیک طرح سے وضاحت نہ کر پاتی کہ ابھی ابھی تو پھپو نے زبردستی کمرے میں تھوڑی دیر آرام کرنے کے لیے بھیجا ہے کہ صبح سے کاموں میں لگی ہوئی ہو تھوڑی دیر جا کر کمر سیدھی کر لو، باقی کپڑے بعد میں دھوئے جا سکتے ہیں۔ اظہار سخت شاکی نگاہ اس پر ڈالتا باہر نکل جاتا اور وہ سر ہاتھوں میں تھام کر رہ جاتی۔

اگلے روز پھپو ناسازی طبیعت کے باوجود خود چل کر اپنے لیے کچن میں کھانا گرم کر رہی تھیں۔ لاؤنج میں صوفے پر نیم دراز چینل سرچنگ کرتی رشنا پر اظہار بری طرح خفا ہوا۔ اس کی من چاہی بیوی اس کے دل سے اترنے لگی تھی۔ جو اس کی بیمار ماں کو کھانا تک گرم کر کے نہ دے سکے۔ رشنا بوکھلا کر ریموٹ پرے پھینکتی فوراً اٹھی تھی۔

"لیکن اظہار میں پانچ منٹ پہلے ہی تو پھپو سے پوچھ کر آئی ہوں کہ ان کا کچھ کھانے کو دل چاہ رہا ہے تو میں بنا کر کمرے میں لے آؤں لیکن انہوں نے......"

"بس کردو۔" اظہار درشتی سے اس کی بات کاٹتا باہر نکل گیا۔ پھپھو اور اسرار کو سامنے کھڑا دیکھ کر وہ لب کاٹ کر رہ گئی۔ ان کی نظروں میں واضح ناپسندیدگی تھی۔ حقیقت چاہے جو بھی ہو مجرم بالآخر وہ ہی ٹھہرتی۔

☆☆☆

"اماں آپ اندازہ نہیں کرسکتیں وہ کن کن طریقوں سے مجھے زچ کرتی ہیں۔ جیسے کوئی شر پسند راکھ میں دبی چنگاری کو چھیڑ کر بھڑکتا شعلہ دیکھ کر لطف اندوز ہوتا ہے بالکل ویسی ہی فطرت کی مالک ہیں وہ۔" رشنا ہر بار میکے والوں کو "سب اچھا ہے" کی رپورٹ دے دے کر تھک چکی تھی۔ اس بار میکے آئی تو جیسے ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے۔ ایک ایک کرکے وہ سب کچھ بتاتی چلی گئی۔

"اسی لیے میں اس رشتے کے حق میں نہیں تھی۔ مجھے پتا تھا آپا کبھی اپنی فطرت سے باز نہیں آئیں گی۔ ارے میں نے اپنی پھول سی بچی اس لیے تو ان کے حوالے نہیں کی کہ وہ یہ سلوک کرتی رہیں۔"

اماں کا تو بلڈ پریشر ایک دم شوٹ کرگیا تھا۔ ان کی بیٹی کیا کچھ نہیں سہتی رہی تھی۔ شک تو انہیں پہلے سے تھا۔ ان کی شوخ و چلبلی سی رشنا ایک دم بہت چپ چپ اور اداس رہنے لگی تھی۔ اس کی ساری شوخیاں سارے رنگ جیسے پھیکے پڑتے جارہے تھے۔

"بس کرو رشنا پلیز، اب رونا نہیں۔ چلو چل کر چائے کے ساتھ پکوڑے بناتے ہیں۔" میرب نے سامنے پھیلی کتابیں سمیٹ کر بددلی سے ایک طرف رکھ دیں۔

"چائے کو چھوڑو میں رشنا باجی کے لیے ان کا پسندیدہ قلفہ لے کر آتا ہوں۔" موبائل پر گیم کھیلتا گڈو موبائل جیب میں رکھتا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ سب اس کی دل جوئی کررہے تھے۔

رشنا کی آنکھیں پھر سے بھرنے لگیں۔ ابا بھی وہیں موجود تھے۔ ان سے تھوڑے فاصلے پر کرسی پر بیٹھے اخبار کی شہ سرخیوں پر نظریں دوڑا رہے تھے۔ وہ ہمیشہ سے بہت کم کسی معاملے میں بولتے اب بھی اخبار پر سے نظریں ہٹا کر بیٹی کا سرخ پڑتا چہرہ دیکھا اور گہری سوچ میں گم ہوگئے۔

☆☆☆

دکھ بانٹنے سے دکھ ختم نہیں ہوجاتا کم ضرور ہوجاتا ہے، ماں کی محبت، بھائی کی دلجوئی، بہن کا احساس......وہ بہت ہلکی پھلکی ہوکر گھر لوٹی تھی۔ لیکن زندگی ہمارے کسی احساس پر منجمد ہوکر رک نہیں جاتی۔ اسے بہرحال آگے بڑھنا ہوتا ہے۔ ہم خوش ہوں تب بھی ناخوش ہوں تب بھی۔

اگلے بہت سارے دن اس کے لیے آزمائش بن کر آئے تھے۔ فہمی آپا کی آمد ہر بار اس کے لیے کسی امتحان سے کم نہ ہوتی۔ پھپو حد سے بڑھیں تو اس نے بھی ضبط کا دامن چھوڑ دیا۔

وہ اب چپ نہیں رہتی تھی۔ اظہار سے اس کی تلخ کلامیاں بڑھنے لگی تھیں۔ ان دنوں اسے اپنے ماں بننے کی نوید ملی۔ لیکن وہ ڈھنگ سے اس خوشی کو محسوس بھی نہیں کرپارہی تھی۔ اظہار اس کا خیال رکھنے لگا تھا۔ لیکن ہر بار کچھ نہ کچھ ایسا ہوجاتا کہ ان کے درمیان پھر سے فاصلے بڑھ جاتے۔ میکے آتی تو پھر سے وہی رونا دھونا، سب کی دل جوئی گڈو اور میرب کے چہرے اتر جاتے۔ اماں پھپو کو برا بھلا کہتے نہ تھکتیں۔ نہ چاہتے ہوئے بھی ہر بار اس کے آنے پر گھر کا ماحول مکدر ہوجاتا۔ کبھی کبھی اسے خود میں اور فہمی آپا میں کوئی فرق نظر نہ آتا۔

☆☆☆

اور آج تو حد ہی ہوگئی۔

اظہار نے اس پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ وہ ماں کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رودی۔ اس کے دائیں رخسار پر ثبت انگلیوں کے واضح نشان ساری کہانی سنارہے تھے۔ اسرار کی نوکری لگ جانے کی خوشی

میں فہمی آپا کے سسرال والوں کو کھانے پر مدعو کیا گیا۔ رشنا کو گری گری طبیعت کے باوجود سب کام اچھے سے سنبھالتے دیکھ کر فہمی آپا کی ساس اور نندیں تعریف کیے بنا رہ سکیں۔

''ارے مہناز بہن! بہو تم نے لاکھوں میں ایک پائی ہے کیسی ہیرا صفت بچی ہے۔

مجال ہے جو اس کے چہرے پر کبھی بے زاری دیکھی ہو۔ ہر دم مسکراتی، ایسی عزت کرنے والی بہوویں کسی کسی کو نصیب ہوتی ہیں۔''

رشنا سادگی سے مسکرادی۔ فہمی آپا کا چہرہ سرخ پڑنے لگا تھا۔ انہیں یہ سراسر اپنی توہین لگی۔ پھپھو کو بھی بیٹی کے سسرال والوں کا یوں رشنا کی تعریفوں میں رطب اللسان ہونا ایک آنکھ نہ بھایا۔

مہمانوں کے رخصت ہونے کے بعد انہوں نے ہمیشہ کی طرح معمولی باتوں کو وجہ تنازعہ بناتے ہوئے مسکراتی ہوئی رشنا سے اپنی بیٹی کے اترے چہرے کا خوب حساب لیا۔ آج تو وہ اس کے ماں باپ کو بھی بخشنے کے موڈ میں نہیں تھیں اور یہیں رشنا کا صبر جواب دے گیا۔ اظہار کھانے میں شریک نہ ہوسکا تھا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی رشنا کو ماں کے ساتھ تلخ کلامی کرتا دیکھ کر اس کا فشار خون ایک دم بلند ہوا بغیر جھگڑے کا پس منظر جانے اس کا رشنا پر ہاتھ اٹھ گیا۔

''میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی اظہار کبھی مجھ پر ہاتھ اٹھائیں گے۔ اگر فہمی آپا اپنے گھر میں خوش نہیں ہیں تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ پھپھو ان کی محرومیوں کا بدلہ مجھ سے لیتی ہیں۔ آج تو وہ آپ کو اور ابا کو بہت برا بھلا کہہ رہی تھیں۔ مجھ سے برداشت نہیں ہوا لیکن اظہار......وہ ایسے نہیں تھے۔''

وہ ایک بار پھر سسک اٹھی۔ اماں کا بس نہیں چل رہا تھا۔ دونوں ہاتھوں سے نند کا گلا دبا آئیں۔ میرب افسردگی سے لب کاٹنے لگی تھی۔ گڈو خاموش اور ابا اٹھ کر اس کے قریب بیٹھ گئے تھے۔ بازو لمبا کر کے اسے اپنے گھیرے میں لیے۔ اس کا سر اپنے سینے سے لگاتے وہ بہت مدہم آواز میں گویا ہوئے۔

''جانتی ہو بیٹا! جس طرح ہم چیزوں کو مختلف کیٹگریز میں رکھتے ہیں۔ اعلا بیش قیمت، کم قیمت، معمولی، غیر معمولی...... بالکل اسی طرح انسانوں کی بھی کیٹگریز ہوتی ہیں۔ بدتر سے کم تر، کم ترین سے بدترین تک ہر قسم کے لوگوں سے ہمارا واسطہ پڑتا ہے۔ کچھ لوگ ہوتے ہیں تھرڈ کلاس چاہے یہ غیر ہوں ہمارے اپنے ہوں بہت امیر، بہت پڑھے لکھے ہونے کے باوجود یہ رہتے تھرڈ کلاس ہی ہیں۔ اپنی عامیانہ سوچ، طرز عمل اور باتوں سے دوسروں کو دکھ دینے والے، تمہارا واسطہ ان ہی تھرڈ کلاس لوگوں سے پڑا ہے۔''

ابا بہت نرم آواز میں بول رہے تھے ان کے سینے سے سر ٹکائے وہ سنتی رہی۔

''قصور ان کا نہیں ہے، وہ اپنی فطرت کے ہاتھوں مجبور ہیں۔ جیسے دریا پار کرواتے کچھوے کی پیٹھ پر سوار بچھو اپنی فطرت سے مجبور ڈنک مارنے سے باز نہیں آتا۔ سر جاتا ہے تو ہی عادتیں جاتی ہیں۔ ہماری زندگی کو مشکل وہ نہیں درحقیقت ہم خود مشکل بنا رہے ہوتے ہیں۔ تو بیٹا تم اگر ان کی باتیں اپنے دماغ میں فیڈ کروگی، انہیں دہراؤ گی تو وہی کچھ ہوگا جو تمہارے ساتھ ہو رہا ہے۔ اگر وہ ہمیں گالیاں دیتے ہیں برا بھلا کہتے ہیں تو کہتے رہیں۔ کسی کے برا کہنے سے ہم برے بن نہیں جاتے۔ ہم وہی ہیں جو درحقیقت ہم ہیں۔

ان کے ساتھ دو بدو مقابلہ کرنے کے لیے تمہیں اپنا مقام چھوڑ کر ان کے مقام تک آنا پڑے گا۔ تو سوچو کیا تمہیں یہ زیب دیتا ہے؟ تمہاری تربیت، تمہاری تعلیم، تمہارا شعور تمہیں اس بات کی اجازت دیتا ہے؟ نہیں نا تو بیٹا درگزر کرو۔ درگزر کرتی رہا کرو، اس سے زندگی سہل ہو جائے گی۔ تم سمجھ رہی ہو نا میری بات......''

انہوں نے نرمی سے اپنی ٹھوڑی اس کے سر سے ٹکرائی تو وہ سر اوپر اٹھا کر ان کا چہرہ دیکھنے لگی۔

''جی ابا! سمجھ گئی۔'' بہت روشن، بہت پرامید مسکراہٹ نے اس کے چہرے کا احاطہ کر لیا تھا۔ ☆

Medora
Perfumed Talc
خوشبو جو دل کو بھائے
تازگی جو ہر کوئی چاہے
Medora
Perfumed Talc
Pleasure
Cherish
Joy
Passion
Greetings
Dignity
Salute
خوشبو کی دنیا کے 8 شگفتہ احساس
MEDORA OF LONDON

مکمل ناول

''تمہارے شوہر صاحب کس قدر ڈھیٹ انسان ہیں۔ بھلے کہہ دو۔ آپ کا مطلوبہ بندہ کشمیر آزاد کروانے گیا ہوا ہے مگر یہ صاحب ان کی واپسی تک کال پہ کال کرتے رہیں گے۔''

ردا کی آواز سے کہیں زیادہ احسان جتاتی تو اس کے پاؤں کی دھپ دھپ تھی ...... پانی کے پائپ سے پودے دھوتی نمل نے اپنے عقب میں متفکر سا ہو کے جھانکا۔

''خدا خیر، ایسی کیا غلطی سرزد ہوگئی کہ چار دن میکے میں آئی ہوئی بیٹی کو شوہر کے مزاج جتائے جا رہے ہیں۔'' پھر ردا کے ہاتھ میں اپنا سیل فون دیکھ کے اس کی روح فنا ہوئی۔ نمل نے قیس کو چارجنگ پہ لگانے کا کہا تھا اور انہوں نے اپنے بیڈروم میں لگا دیا ہوگا۔

''سوری ردا!'' وہ لب پھیلا کے جبراً مسکرائی اور فون اس کے ہاتھ سے لیا۔

یوں تو ردا کا تمام دن آرام کرتے ہی گزرتا تھا

فرزانہ کھرل

لیکن شام سے قبل وہ پوری ہوئی نیند..... مزید پوری کرنی تھی۔ ایک تو نیند ٹوٹی دوسرا اس آثار قدیمہ کی سیڑھیاں اترنا کوئی آسان کام نہیں۔ وہ ناک بھوں چڑھاتی اب واپس جا رہی تھی۔ ادھر نمل کال ریسیو کرتے ہی شوہر پہ چڑھائی کر چکی تھی۔ ذرا فاصلے پہ دو زانوں بیٹھی عیرش نے خاصا بھاری گملا سرکاتے ہوئے اپنی بہن کو گھورا..... کہ ''تمیز سے بات کرو۔''

نمل شوہر سے بات کرتے ہوئے اسی کی جانب آ رہی تھی۔ عیرش کی چھٹی حس چوکنا ہوئی۔ وہ ہاتھ جھاڑتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''میں ذرا چائے بنالوں۔'' اتنا کہنے کے ساتھ وہ وہاں سے بھاگ لی۔

''موی تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔'' یہ بات نمل کے منہ میں ہی رہ گئی۔ اس نے دور جاتی بہن کو بے چارگی سے تکا پھر پیچھے سے زوردار آواز لگائی۔

''ایک کپ میرے لیے بھی بنانا۔'' عیرش سیڑھیوں پہ دو پل کو رکی اور ہال کمرے کی چوکھٹ پہ ہاتھ رکھ کے دہل سی گئی۔

''ہائے! اللہ نمل کی آواز کہاں سے کہاں تک گئی ہوگی۔'' اس کا منا سا دل کانپا۔ وہ بنا ادھر ادھر دیکھے ناک کی سیدھ میں چلی۔

''چائے بنا رہی ہو تو ایک کپ مجھے بھی دینا۔'' ردا ہال کمرے کے دروازے پہ ہی مل گئی۔

''جی!'' عیرش نے مصنوعی مسکراہٹ کا سہارا لیا اور وہ منہ بناتی آگے بڑھی۔

''عیرش! بچے بھی آتے ہوں گے۔ چائے ذرا زیادہ چڑھا دینا۔''

اف!'' اس نے سر پہ ہاتھ رکھے۔ ''مجال ہے جو اس گھر میں بندہ ایک کپ چائے بنا سکتا ہو۔''

جو صور نمل کی آواز نے پھونکا تھا یہ تمام نتیجہ اسی کا تھا لیکن چھوٹی ددیا کو محبت سے اچھا کہہ کر وہ کچن میں آئی تو ان کی کل وقتی ملازمہ بخت نے اس کا استقبال اک کڑک دار ہائے کے ساتھ کیا۔

''تمہاری انڈے دیتی مرغی تو نہیں مر گئی۔'' اس کی دردناک ہائے کو عیرش اور کیا کہتی۔ بخت ایک دم سیدھی ہوئی۔

''قسم سے باجی، صبح سے جوڑ جوڑ دکھ رہا ہے۔'' اس نے اپنے دانت منہ کے اندر رکھنے کی کافی کوشش کی تھی۔ باجی نے وجہ سمجھتے ہوئے اسے خونخواری سے گھورا۔

''ددیا کے کمرے سے مالشی تیل اٹھاؤ اور اسٹور کا رخ کرو۔'' اس نے چائے کا پانی چولہے پہ رکھتے ہوئے ملازمہ کو مفت مشورہ دیا۔

''باجی یہ امیروں کا درد نہیں ہے ہم غریب تو چائے کے ایک کپ سے ہی۔''

باجی کے تیور بھانپ کے وہ ہکلا کے خاموش ہوئی۔

''ہاں ہاں کیوں نہیں، جاؤ آس پڑوس سے بھی پوچھ آؤ، کسی کو چائے کی طلب تو نہیں ہو رہی۔'' اس نے کیبنٹ سے پتی نکال کے اسے کھٹاک سے بند کیا۔

''آس پڑوس کا تو پتا نہیں لیکن مجھے ایک کپ چاہیے۔'' اس کے تایا زاد رضا نے فریج سے پانی کی بوتل نکالتے ہوئے عیرش کے تمتماتے چہرے پہ ایک سنجیدہ نگاہ ڈالی، پچھلے کئی سالوں سے یہ لڑکی اسے عجب صورت حال سے دوچار کر رہی تھی۔

''دودھ ذرا کم ہے پھر نہ کہنا شیرہ بنا دیا ہے۔'' وہ تپی تپی سی نگاہ اس سے چرا کے مخاطب ہوئی۔

''تو ایک کپ الگ سے بنا دو۔'' رضا سے چھوٹا رامس ہوتا تو جھٹ سے کہہ دیتا لیکن وہ جواب دیے بنا ہی جانے لگا تھا۔

''بخت! تم ذرا قیس بھیا اور رامس کی خبر لے کر آؤ۔'' وہ جاتے جاتے ٹھٹکا۔ عیرش کے لبوں کو چھوتا یہ جملہ رضا کو ہمیشہ سے بھاتا تھا۔

ان دونوں بہنوں کو اس گھر میں آئے پندرہ برس ہو چکے تھے لیکن چند جملے ایسے تھے جن پہ یہاں کا

ماحول اور وقت بھی اثر انداز نہیں ہو سکا تھا...... رضا کے اندر اسے پلٹ کے دیکھنے کی خواہش شدید ہوئی اور وہ ہر بار کی طرح اس خواہش سے دست بردار ہوتا باہر چلا گیا...... کیا وہ اس کی خبر لینا چاہتی تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا اور اب وہ جاننے کا خواہاں بھی نہیں تھا۔

اس شخص کا پل بھر کو ٹھٹک کے رکنا۔ عیرش نے اسے دم سادھ کے دیکھا تھا۔ کھولتے پانی سے پتی مہکی کہ میری بھی خبر لو...... تو وہ گہرا سانس بھر کے دودھ کے برتن کی طرف متوجہ ہوئی' پتا نہیں یہ گھر کس کس کی کمائیوں پہ چل رہا ہے۔ اس نے ہمیشہ کی طرح سوچا تھا۔

☆☆☆

قیام پاکستان سے قبل کی تعمیر شدہ یہ کوٹھی اگرچہ قدیم تھی مگر خستہ حال کسی دور میں بھی نہیں رہی تھی، اس کے رہائشی حصے کو پھل دار درختوں نے چہار اطراف سے گھیر رکھا تھا۔ نسل در نسل اس کوٹھی کے تعلیم یافتہ مالکوں کا ذریعہ معاش بھی ہمیشہ زراعت رہا۔ پھر نئے دور کے تقاضوں کے پیش نظر زمینیں بکتے بکتے اب بمشکل گزارے لائق ہی رہ گئی تھیں۔

آج بھی کوٹھی پر مہیب ولا لکھا تھا۔ جب کہ مہیب کو اس دنیا سے رخصت ہوئے بھی پندرہ برس بیت چکے تھے اس سے بڑا صہیب اپنے آبائی گاؤں میں کچھ بچی کھچی زمینیں سنبھالتا تھا۔ اس گھر میں ہمیشہ رشتوں کی کھچڑی سے مروت کی ہی خوشبو پھوٹتی تھی سو گزارا سہل انداز سے ہو رہا تھا۔

عیرش کا ذہن اس بات میں الجھا ہوا تھا کہ آج کل گھر میں جو ہو رہا ہے اس کا انجام کیا ہوگا۔ وہ کافی دیر سے پچھلے لان کی کیاریاں سیٹ کر رہی تھی، دو گھڑی ستانے کے لیے۔ وہ ہال کمرے کی دیوار کے قریب آئی۔ مارچ کی ہوا بھی کیا جادو اثر تھی کہ جھولے سے کمر ٹکاتے ہی وہ اونگھنے لگی۔

''ہمارے شوہر صاحب کو تو چھوڑو اور جسے دیکھو، اس معاملے میں سر پیر گھسائے پھرتا ہے ایک آپ کا لاڈلا ہی مجھے بتانے کی زحمت نہیں کرتا، جب اس نے یہ مسئلہ حل ہی نہیں کرنا تو آپ سب نے اسے ملکی حالات میں کیوں بدل رکھا ہے۔''

سب کی الگ بولیاں الگ مشورے، ردا کا لب ولہجہ ہر طرح کے لحاظ سے عاری تھا۔

اس کی تیز آواز پہ عیرش کی اونگھ پل میں ٹوٹی تھی۔

''ارے میں کون سیا تمہارے کمرے میں جا کے دھرنا مار کے بیٹھنے والی تھی کہ بی بی اپنی ضد پہ مٹی ڈالو...... اتنا ہی کہا ہے نا کہ عورت کی بے جا ضد گھر توڑ دیتی ہے۔ آگے تم جانو یا تمہارا قیس۔'' ددیا کی آواز ردا سے ذرا اونچی ہی تھی۔

''مجھے بھی تو وہ گھر دکھایئے آپ جس کے ٹوٹنے کا وہم پال کے بیٹھی ہیں۔''

''اف۔'' عیرش نے دانتوں تلے زبان دبائی۔

''گھر ٹوٹنے سے مراد ساتھ کا چھوٹ جانا ہوتا ہے۔ ردا کو اتنا پتا ہونا چاہیے۔''

عیرش بیلوں سے ڈھکی کھڑکی کی جانب آئی اور پیشانی جالی سے ٹکا کے اندر جھانکا۔ ردا کو اس بات پہ

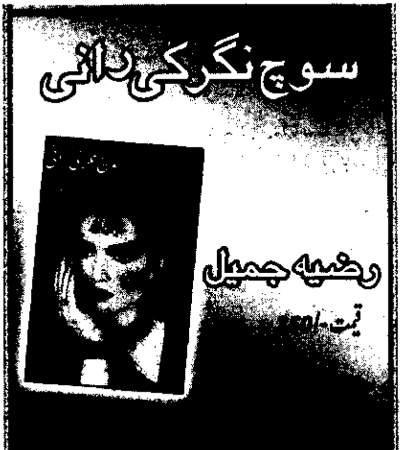

سانس کے ضبط ٹوٹنے کا خدشہ تھا یا اس نے قیس کو اندر آتے دیکھ لیا تھا کہ اب وہ سیڑھیاں پھلانگ رہی تھی۔ قیس کے ساتھ رضا بھی تھا جس کے چہرے پہ ناگواری دیکھی جاسکتی تھی کہ اب روزانہ گھر آنے پہ ایسے ہی تماشوں کا سامنا ہوتا تھا۔ دو دن پہلے ہی عیرش نے رضا کو تائی سے کہتے سنا تھا۔

''کہ پرائے گھر کا لحاظ کرتے ہوئے ردا کو اپنے معاملات بیڈروم کی حدود تک رکھنے چاہئیں۔''

''آج عیرش کہیں گئی ہوئی ہے''۔ ددیا نے موضوع بدلا اور رضا کو دیکھ کے مسکرائیں۔

''میں نہیں جانتا۔'' وہ اپنے مخصوص انداز کے ساتھ گویا ہوا۔

''تو تم سے پوچھا کس نے ہے۔ میں تو تمہارے ساتھ کھڑی بخت سے پوچھ رہی ہوں۔'' رضا خجل ہوا۔ باہر کھڑی عیرش خوش ہوئی۔

''باجی تو آج صبح سے پیڑ پودوں کو ٹیکے لگا رہی ہیں۔'' بخت نے جواب دانتوں کی نمائش کے ساتھ دیا۔

''اس نمائش کو بھی ٹیکوں کی ضرورت ہے۔'' وہ مسکراہٹ دباتے ہوئے بولا۔

''ایسے ہی اچھے لگتے ہو۔'' عیرش کو ماننا پڑا۔

''اس گھر کے سارے باسی ہی نرالے ہیں بھئی۔'' ددیا نے ایک ادھی سی آہ بھرنے کے ساتھ نگاہیں موند لی تھیں۔ عیرش کا دل قہقہہ لگانے کو چاہا۔

''اس گھر کے اصل مکین تائی' رضا اور رامس...... ماشاءاللہ تینوں پرفیکٹ...... باقی سب کو تو یہاں قسمت ـــــ ہانک کے لائی تھی۔ عیرش کی سوچ حقیقت سے دوچار ہوئی کہ محبت اپنی جگہ مگر سچ بھی کوئی حیثیت رکھتا ہے۔

☆☆☆

''موسیٰ مجھ پہ بگڑ رہا تھا کہ عیرش کو مجھ سے بات کرنا چاہیے تھی۔''

نمل کے ڈھیلے لہجے کے شکوے نے اسے تھوڑا سا شرمندہ کیا وہ دونوں اپنے کمرے میں تھیں ''تمہیں یاد ہوگا اپیا! ماما، پاپا کی ڈیتھ کے بعد جب ہم دونوں کو خالہ یہاں چھوڑنے آئی تھیں تو انہوں نے چند رسمی باتوں کے بعد تائی اور ددیا کو جتا دیا تھا کہ اب یہ دونوں بھلے دودھیال میں رہیں گی مگر ان کی زندگی سے متعلق ہر فیصلہ خالہ کے اختیار میں ہوگا۔ تب انہوں نے یہ بھی بتایا تھا کہ نمل اور موسیٰ کا رشتہ وہ طے کر چکی ہیں تو اس وقت انہوں نے یہ کیوں نہیں کہا تھا کہ عیرش بھی اپنے ماموں زاد سے منسوب ہے۔'' وہ نمل کی آنکھوں میں دیکھ کے بولی۔ اس کے لہجے کی کاٹ نمل کی سمجھ سے باہر تھی۔

''تو اس میں برا کیا ہے عیری! ہم دونوں دبئی میں ایک ساتھ رہیں گے۔'' نمل نے اس کا ہاتھ تھاما۔

''جب ہماری منزل وہی تھی تو سالوں پہلے ہمیں یہاں کیوں چھوڑا گیا۔ ماموں اور خالہ کو اس وقت ہمیں بوجھ کی طرح پھینکنے کے بجائے ـــــ پناہ میں لینا چاہیے تھا۔ جب خالہ ہمارا سامان باندھ رہی تھیں تو موسیٰ نے ہماری اسکولنگ کا جواز دے کر ہمیں روکنے کی بھرپور کوشش کی تھی تو خالہ نے موسیٰ کو جھڑک دیا تھا کہ بڑوں کی بات میں دخل مت دو......ان کا مقصد ہمیں وہاں سے بھگانا تھا۔

انہوں نے نانا کے بنگلے سے مما کے حصے کی رقم ہمارے اکاؤنٹ میں ڈال کے لوگوں کی واہ واہ سمیٹ لی تھی لیکن سوچو نمل! نانا کے کاروبار کا ماہانہ منافع لاکھوں میں ہوگا اور جس میں سے ہر ماہ ہمیں پچاس ہزار کی زکواۃ دی جاتی ہے۔'' اس نے ساکت کھڑی نمل پہ تیز نظر ڈالی جس نے وہ سب بند کانوں سے سنا تھا۔

''اب تم کیا چاہتی ہو عیرش!'' نمل نے پوچھا تو لہجے میں ہلکی سی لرزش تھی کہ عیرش کا انکار نمل کی زندگی کو مشکل میں ڈال سکتا تھا۔ ''میں ان سے اپنا حق وصول کرنا چاہتی ہوں۔'' وہ بہن کا ہاتھ جھٹک کے بستر کی طرف چلی آئی......

''ماں باپ کو تو خدا نے لے لیا تھا لیکن ان کی

زندگیوں میں باقی کی مشکلات کا سبب ان کی خالہ اور ماموں ہی تھے ''دوسری صورت میں بھی تو وہ سب کچھ ہمارا ہی ہے جیسے میں خالہ کی بہو بن کر عیش کر رہی ہوں تم بھی ماموں کی بہو۔''

''بس کرو نمل!'' عیرش نے اس کو درشتی سے ٹوکا'' مجھے یہ عیش بہو کی صورت نہیں چاہیے۔ میں پچھلے پندرہ سالوں کا حساب کتاب بھی چاہتی ہوں۔'' وہ چبا کے بولی تھی۔

اسے وہ دن یاد آ رہا تھا جب چودہ سالہ نمل اور بارہ سالہ عیرش بنا والدین کے اس گھر میں آئی تھیں تو کس قدر محتاط اور سہمی ہوئی تھیں گو یہاں اجنبی کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ یہاں عید کے عید تو آتی تھیں تب ماں باپ کے رشتے کا تفاخر ان کے ساتھ ہوتا تھا۔ ان چند روزہ مہمانوں کے ناز نخرے سو طرح سے اٹھائے جاتے تھے لیکن اب وہ یتیم ہو کر آ رہی تھیں اور نہیں جانتی تھیں کہ اس گھر میں ان کے لیے کتنی گنجائش ہوگی اور اس نئی صورت حال کے ساتھ ان کا استقبال کس طرح ہوگا۔

☆☆☆

''تمہارا باپ ایک کنگلا انسان جو جاب کے سلسلے میں چند دن باپ کے دوست کے گھر کیا ٹکا، اس کی نازوں پلی بیٹی ہی پٹالی، دوسری طرف پاپا بھی صہیب کی باتوں کے جال میں آ گئے تھے ورنہ کہاں ہم — حیدرآباد کے نواب ......اور کہاں صہیب کا خاندان۔'' خالہ ساڑھی کا پلو کندھے پہ ٹکا کے نخوت سے بولیں تو عیرش نے انہیں تحیر سے دیکھا۔

''ہمارے لاکھ منع کرنے کے باوجود ابا مرحوم نے اپنا دبئی کا بزنس صہیب کے سپرد کر دیا تھا۔ اس نے خود بھی خوب کھایا اور اپنے کنگلے خاندان کی بھی قسمت بدل دی۔''

''ہمارے پاپا اور ان کا خاندان ہرگز بھی کنگلا نہیں تھا دادا کی شان دار کوٹھی میں دنیا کی ہر نعمت تھی۔'' عیرش خالہ کو جواب دینا چاہتی تھی مگر جملے حلق میں پھنس گئے اور وہ اپنے آنسو پیتی رہ گئی۔

'' صہیب نے کون سا آبائی گھر سے حصہ وصول کر لیا تھا۔ تم دونوں اب بھی حصے دار ہو۔ جبکہ اک زمانے سے وہاں مفت خورے بھی عیش کر رہے ہیں۔'' خالہ کا اشارہ چھوٹی ددیا کی طرف تھا۔ ''جنہیں تمہاری دادی میکے سے جہیز میں لائی تھیں جو شادی کے بعد بمعہ شوہر کے وہیں آ بسیں کہ دل کہیں اور لگ کے نہ دیا...... خالہ کا خالص حیدرآبادی لب و لہجہ عیرش کو ناگوار گزر رہا تھا۔

''دیکھو تو ذرا تم لوگوں کی چھوٹی ددیا آج بھی بہن کے گھر پہ قبضہ جما کے بیٹھی ہے۔'' خالہ کا غصہ سمجھ سے باہر تھا۔

''اور خبردار جو اپنی ددیا کے اس آوارہ بیٹے قیس سے کوئی ماموں، چاچو جیسا کوئی رشتہ گانٹھا تو......خواہ مخواہ وارث بن بیٹھے گا۔''

عیرش نے آنسو پونچھتے ہوئے دل ہی دل میں خالہ کی باتوں کی نفی کی تھی کہ میں تو ایسا ہی کروں گی۔

خالہ کی نصیحتیں دادا کے گھر کے سامنے ہی ختم ہوئی تھیں۔ اندر گھر مہمانوں سے بھرا پڑا تھا۔ چھوٹی ددیا یتیمی کا دور بھگت چکی تھیں۔ سو ان دونوں کو ساتھ لپٹائے تادیر سسکتی رہیں۔ تائی کا حال بھی بہت برا تھا۔

''ارے دیکھو تو، خون سفید ہو گیا۔ غزالہ بھرے پرے گھر سے بچیوں کو اٹھا کے یہاں پھینک گئی۔ ان لونڈوں میں بچیاں کیا خاک سہولت سے رہیں گی۔'' ان بزرگ خاتون نے کسی حد تک سچ کہا تھا کیونکہ خالہ کی تینوں بیٹیوں کے ساتھ ان کی خوب بنتی تھی۔

نمل اور عیرش نے ان تینوں لونڈوں کو سہم کے دیکھا تھا پھر وقتاً وقتاً اس طرح کے تبصروں پہ لڑکوں نے جیسے خود کو کوئی ہوّا سمجھ لیا تھا کہ ان دونوں سے سامنا ہوتے ہی وہ راستہ بدل لیتے......تو وہ اپنی جگہ چور سی ہو جاتیں۔

رضا اور رامس تو ان کے تایا زاد تھے۔ خاندان والوں کا اصل ٹارگٹ تو قیس اسلام تھا جو نہایت نرم خو اور سلجھی ہوئی شخصیت کا حامل تھا۔

☆☆☆

ان کی وہ عمر حق جتانے والی ہوتی تو وہ کیا گھر چھوڑ کے آتیں؟ ان کے ہاتھوں میں خالہ اور ماموں کا گریبان ہوتا اور نہ ہی ان کی تربیت ایسی ہوئی تھی کہ یہاں وہ سب کو آنکھیں دکھا کے شیر کی خالہ اور پھوپھی بن جاتیں۔ وہ خالہ کی تمام نصیحتیں گاڑی میں چھوڑ ـــــ آئی تھیں۔ فی الحال انہیں رہنمائی درکار تھی۔ ددیا اور تائی نے ان پہ بے حساب محبت نچھاور کی۔ ان کی تعلیم و تربیت کا آغاز نازنخروں کے ساتھ کیا کہ ان کے سر پہ تایا کا سایہ موجود تھا۔ ددیا اور تائی اپنی اولادوں سے بھی احتیاط کریں۔

رضا ذرا نخریلا تھا۔

"نمل وغیرہ کے سامنے مجھ سے لپٹ کے بات منوانے کی عادت اب چھوڑ دو۔ وہ دونوں احساس محرومی کا شکار ہوتی ہوں گی۔" ماں کی اس بات پہ رضا طیش کھا کر رہ جاتا۔ گھر کا کھلا ڈلا مردانہ ماحول لڑکیوں کی آمد کے ساتھ اب زنان خانے میں بدل چکا تھا۔

"خبردار جو آئندہ یوں بنیان میں باہر آئے تو۔" ماں دھکیلتی ہوئی کمرے میں لے آتیں۔

"میں تو موٹر پمپ چلانے نکلا تھا۔" رضا آنکھیں دکھاتی ماں سے الجھتا تو ہال میں بیٹھی لڑکیاں سہم جاتیں۔

کبھی کالج سے آنے کے بعد وہ اپنی پرانی روٹین میں صوفے پہ لڑھک جاتا۔

"اب یوں پرانی روٹین میں بے تکے پن سے مت لیٹا کرو۔ شرٹ دیکھو پیٹ نظر آ رہا ہے۔"

اماں فوراً نازل ہوتیں وہ جھنجلا جاتا۔

"کیا مصیبت ہے یار! زندگی اجیرن ہو گئی۔ بھئی انہیں مشین میں ڈال کے لڑکے بنا ڈالو یا پھر ہمیں لڑکیاں۔" رضا کی تجویز پہ باقی دونوں لڑکے ہنس ہنس کے دہرے ہوتے۔ ددیا کانوں کو ہاتھ لگا کے استغفار پڑھتیں۔ ماحول کی تبدیلی کا زیادہ اثر رضا نے لیا تھا۔

"ایسا کریں مجھے ہاسٹل بھیج دیں،" اس دن اسے گنگناتے ہوئے دیکھ کر ماں نے ڈانٹا تو اس کا ضبط تڑخ گیا۔ اس کی آواز اتنی اونچی تھی کہ سب نے سنی۔ وہ پیر پٹختا ہوا گھر سے ہی نکل گیا تھا۔

اس صورت حال پہ ددیا اور تائی سر جوڑ کے بیٹھیں پھر مسئلے کا حل یوں نکالا کہ لڑکیوں سے بیزار رضا کا بیڈروم اوپر کی منزل پہ سیٹ کر دیا گیا بھلے اب وہ اوپر نیکر بنیان میں پھرتا۔ گو کچھ عرصے بعد گھر کے ماحول میں پہلے سی بے تکلفی اور چہل پہل در آئی تھی مگر رضا باقیوں کی طرح ان سے کبھی گھل مل نہ سکا۔ اس نے ہمیشہ خود کو ان سے ایک مناسب فاصلے پر رکھا اور پھر عیرش کے ماہ سال رضا حبیب سے سامنا کرنے سے کتراتے ہوئے ہی گزرے۔

نمل کی تعلیم مکمل ہونے کے بعد خالہ اسے رخصت کروا لے گئی تھیں۔ عیرش کا ہوٹل کلچر میں ایم فل بھی اب مکمل ہو چکا تھا۔ ایک سال قبل فیس میاں بھی شادی شدہ افراد کی لسٹ میں آ چکے تھے۔

رضا جاب کے لحاظ سے نہایت سیٹ تھا مگر وہ اپنے حال میں اب تک اپ سیٹ تھا۔ سردیوں کی بھیگتی شاموں اور گرمیوں کے جھلساتے دنوں میں کسی کی آہٹیں اپنے دل میں محسوس کرتا۔ جانے وہ کیا چاہتا تھا۔ وہ اپنی خبر جان بوجھ کے نہیں لے پا رہا تھا وہ یہ جملہ اس چڑچڑی لڑکی کے لبوں سے کیوں سننا چاہتا تھا کہ۔

"کوئی رضا کی خبر لے کر آؤ۔"

وہ ایک بار کہتی تو ......اور کیا ایسا ممکن تھا کہ جواب پیغام بر کے ہاتھ آتا۔ پھر وہ اپنی خبر مقابل آ کے دیتا۔

وہ دونوں اپنے بیچ کے روشن محسوسات کا سوئچ اکثر بند ہی رکھتے تھے جو کبھی کھل جاتا تو رضا کی جگمگاتی نگاہیں عیرش کے ہر انداز میں آشنائی کی شمعیں روشن کر دیتی تھیں۔

☆☆☆

اس نے چکور کا پنجرہ برآمدے میں رکھا اور بیوی سے راہ فرار اختیار کیے فیس کو ڈھونڈنے نکلی۔

"لگے ہاتھوں شربت بھی بناتی لے جاؤں۔ جانے وہ کس قدر سگریٹیں پھونک چکے ہوں گے۔"

وہ اسی غرض سے کچن میں آئی۔ بخت کی ماں بھنڈیاں کاٹ رہی تھی۔

"ساری عمر عفت بیگم (چھوٹی ددیا) نے آس پڑوس کے طعنوں پہ دھیان دیا نہ کبھی برادری کی باتوں پہ کان دھرے بلکہ اچھے نصیبوں سے مفت کی روٹیاں کھائیں۔"

عیرش نے بخت کی ماں کو ناپسندیدگی سے دیکھا اور جگ میں چینی گھولنے لگی۔

"بھئی پرائے گھر میں رہنا بڑا دل گردے کا کام ہوتا ہے۔" بخت کی ماں نے کیسی دل جلانے والی بات کی تھی۔ عیرش نے گوشت بھونتی تائی کو چور نظروں سے دیکھا کہ بخت کی ماں چھوٹی ددیا کے خلاف بول رہی تھی۔

"اب بہو نے ناک میں دم کر رکھا ہے تو ممکن ہے۔ کسی صندوق سے عفت بیگم اپنے گھر کی چابیاں ڈھونڈ نکالیں۔" عیرش کا ہاتھ کانپا۔

بھلے ددیا کی عمر بہن کے گھر گزری لیکن وہ ان پہ بوجھ تو نہیں تھیں۔ ان دونوں بہنوں سمیت گھر کی کتنی ذمہ داریاں انہوں نے اس بڑھاپے میں بھی اٹھا رکھی تھیں۔ بخت کی ماں جانتی تھی کہ دونوں بہنوں میں لگائی بجھائی اور چغلی جیسی عادت نہیں سو انہیں دیکھ کے موضوع بدلنے کی زحمت اس سمیت کوئی بھی نہیں کرتا تھا۔ کاش وہ چغل خور ہوتی اور اسے دیکھ کے موضوع بدل لیا جاتا۔ کسی پیارے کے خلاف غلط سلط سننا بھی تو تکلیف دہ کام تھا۔

"ارے نہیں آپا! اماں نے کئی بار جانے کی کوشش کی تو ہر بار حبیب آڑے آ جاتا تھا۔ ایک ہی آنگن میں پل بڑھ کے جوان ہوئے خالہ بھانجوں میں محبت بھی تو بہت تھی۔"

تائی کی حمایتی آواز نے عیرش کے دل کو ہاتھ میں پکڑی برف سے بڑھ کے ٹھنڈا ٹھار کیا کہ تائی، ددیا سمیت کسی سے پرخاش نہیں رکھتی تھیں۔

"یہ تو آپ کا بڑا پن ہے واصفہ! کہ پرائی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھاتے زندگی گزار دی ورنہ خالہ کو اس گھر میں زبردستی بسانے والے بھانجے کی بھی اب چوتھی برسی آنے والی ہے۔"

یہ بخت کی ماں جیسی عورتیں ہی لوگوں کے صبر و تحمل میں دراڑیں ڈالنے کی ہر ممکن کوشش کرتی ہیں نہ کچھ لینا نہ دینا۔ کڑوی باتیں، میٹھی زبان، ان کی زبانوں پہ شیطان شہد ٹپکاتا ہے۔ وہ جگ اٹھا کے جلتی کڑھتی باہر آئی۔ اب اس کا رخ قیس کے ٹھکانے کی طرف تھا۔ اگرچہ آج قیس بھیا اس آدم بیزار کے ہاں ڈیرہ لگائے تھے۔ عیرش اتنی خبر تو رکھتی تھی کہ وہ گاؤں گیا ہوا تھا۔

کمرے میں ملگجا اندھیرا تھا۔ اس نے جگ سائیڈ ٹیبل پہ رکھا اور دھواں اڑاتے قیس کو دیکھا...... اس کے دل کو کچھ ہوا...... جو ردا کو پانے کے لیے بے چین پھرتا تھا تو اسے پا کے بے سکون ہو چکا تھا۔ کیا اس کی پریشانی کی وجہ صرف ردا کی ضد تھی۔ وہ کارپٹ پہ اس کے قریب ہی بیٹھ گئی۔ اس کے ذہن میں برسوں بعد بھی قیس بھیا کا لہجہ تازہ تھا۔

"ارے بھئی ہم کہاں کے نامحرم ٹھہرے۔ یہ وہی بچیاں ہیں جنہیں ہم کندھوں پہ سوار کر کے شاخیں جھلاتے رہے ہیں۔ نیت کی پاکیزگی ہی اصل رشتہ ہے اور یہ چڑیاں تو میری بچیاں ہیں۔"

قیس کی اس بات پہ رضا نے جو ٹکڑا لگایا تھا عیرش کو وہ بھی یاد تھا۔

"کاش یہ پھر سے اڑ جائیں۔" عیرش کو اس کے ہاتھ کا لہرانا بھی یاد تھا۔

"بیویوں کی باتوں پہ اتنا سیریس نہیں ہوا جاتا۔ انہیں بکنے جھکنے کی عادت ہوتی ہے۔" قیس کے ہاتھ سے سگریٹ چھین کے وہ بیڈ سائیڈ پہ آ ئی۔

"جدائی کے دنوں میں آپ کا ایک کمرہ جس کے لیے مثل جہان تھا، اب وصال کے ہوتے ہی کیسی شیرنی بن چکی ہے۔"

اس نے گلاس میں شربت ڈالا، قیس کا ہلکا سا

قہقہہ سننے لائق تھا اس کی بات کی تائید کرتا ہوا۔
''کسی دن پکڑ کے ایک لگائیں اور دہاڑ کے کہیں کہ بس ...... تاعمر اسی ایک کمرے میں رکھوں گا مگر چھوڑوں گا نہیں۔'' اس نے جانے کس ہیرو کی نقل اتاری تھی۔
تب ہی کوئی ہلکا سا کھنکھارا...... اس نے گلاس میں شربت ڈالا اور پلٹ کے دیکھا۔ وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے گیلے بال سلجھا رہا تھا، گویا وہ واش روم میں تھا۔ یہ کب واپس آیا؟ یعنی وہ خبر نہیں رکھتی تھی۔ وہ اس کے بیڈ روم میں منہ اٹھا کے چلی آئی ان کا ایک دوسرے کو سلام جواب کرنا بھی قابل دید ہوتا تھا کہ لو وصول کرو (احسان جتا کے) ہاں کرلیا (اب کہو) تم کون ہم کون۔
قیس کی طرف بڑھا شربت کا گلاس رضا نے ایک شکریے کے ساتھ اس کے ہاتھ سے لیا وہ کلس کے رہ گئی۔
''یہ بیرسٹر ہاشم سے تمہیں کیا کام ہے؟'' وہ پلٹ کے قیس سے مخاطب ہوا۔ قیس نے بے ساختہ عیرش کو دیکھا جس کا رنگ اڑ چکا تھا۔ قیس جو پہلے ہی رضا سے مشورہ کرنا چاہتا تھا۔ اس نے عیرش کی آنکھوں کا اشارہ نظر انداز کیا۔
''میں نے اس سے ایک پراپرٹی کیس ڈسکس کرنا تھا۔''
''اف!'' عیرش گھبرائی۔ وہ یہ کام چپ چپاتے سرانجام دینا چاہتی تھی۔
''کیسی پراپرٹی؟'' اب رضا کی مکمل توجہ قیس پر تھی کہ عیرش کی حواس باختگی اسے اک نئی کہانی سنا رہی تھی۔
''کم از کم میری تو نہیں ہے۔'' قیس ہنسا۔
''دراصل عیرش اپنے نانا کے بزنس میں سے اپنا مکمل حصہ چاہتی ہے۔''
عیرش کا دل ڈوبا۔ وہ دروازے کی جانب بڑھی۔
''کیا کوئی ایسی بات ہوگی جو قیس صاحب۔ رضا سے شیئر نہ کرتے ہوں۔'' اس نے جالی کا دروازہ کھولا۔
اس کی پشت پہ گڑی رضا کی نگاہوں میں بے یقینی تھی، تاسف تھا۔ کیا عیرش اس قدر نادان بھی ہو سکتی ہے مگر اس کے قدموں کی مضبوطی اس کے فیصلے کی پختگی کا اعلان کر رہی تھی۔ رضا کی طویل آہ میں تفکر کی آمیزش تھی۔

☆☆☆

''اماں میں نے واشنگ مشین لگوائی ہے، ذرا دھیان رکھیے گا۔ میں ذرا مارکیٹ تک جا رہی ہوں۔''
تائی نے ددیا کے سامنے سے دھاگے کا گولا اٹھا کے اپنے بیگ میں ڈالا۔ ددیا ان کے دوپٹے پہ کروشیے سے بیل بنا رہی تھیں تو انہوں نے تائی سے مزید دھاگے کا کہا تھا۔
''عیرش! تمہیں کچھ چاہیے۔''
تائی نے حسب معمول پوچھا اور ایسے میں ددیا نظر جھکا کے آس پاس کی چیزوں کو خواہ مخواہ کھنگالنے لگی تھیں۔ عیرش نے ہمیشہ کی طرح انکار کیا اور ددیا کے صندوقچے میں جھانکا جسے وہ کبھی کبھار ہی کھولتی تھیں۔ تایا زندہ تھے تو مارکیٹ جانے سے قبل تائی ددیا سے بھی یوں ہی پوچھ لیا کرتی تھیں تب بھی وہ کون سا انہیں لسٹ تھما دیتی تھیں کہ سر ہمیشہ انکار کی صورت ہی ہلتا تھا کیا تھا۔ جو تائی اب بھی ان سے پوچھ لیا کریں۔
''یہ دیکھو سچے موتی، کچھ دن قبل ٹرنک سے نکالے تھے، انہیں اپنی قمیص پہ ٹانک لینا۔''
''اللہ!'' عیرش کی آنکھیں خیرہ ہوئیں۔ ''اس قدر خوب صورت۔''
ددیا اسے اپنی لاجواب چیزوں سے نوازتی رہتی تھیں۔ ددیا نے صندوقچہ بند کرتے ہوئے پاؤں نیچے لٹکائے۔
''آپ رہنے دیں، کپڑے، میں دھلوالوں گی۔ کل بھی بخت سے کچن صاف کرواتے ہوئے دیر تک کھڑے رہنے سے آپ کے پاؤں سوج گئے

تھے۔'' وہ آہستگی سے گویا ہوئی۔

''ارے نہیں بچی! اس عمر میں چلنا پھرنا ہی صحت ہے۔ بیٹھے رہنے سے بندہ جڑ جاتا ہے۔''

ہمیشہ کی طرح بات سہولت سے سنبھالتے ہوئے وہ صحن کی جانب چل دیں۔ عیرش سب سمجھتی تھی کہ روز مرہ کے کاموں کی نگرانی ددیا کے ذمے لگا کر انہیں مالکانہ احساس نہیں دلایا جاتا تھا بلکہ تائی یہ سب اپنی سہولت کے لیے کیا کرتی تھیں۔

''ارے اماں فارغ بیٹھی ہیں۔ سبزی ہی کاٹ لیں۔''

''اخبار ہی پڑھنا ہے تو وہاں بیٹھ کے پڑھ لیجیے۔ ساتھ ہی اسٹور کی صفائی بھی کروا لیجیے گا۔''

''ذرا یہ میلے غلاف تو اتار دیجیے۔'' ان کے سامنے تکیوں کا ڈھیر لگ جاتا۔

''ٹی وی دیکھتے ہوئے یہ کپڑے بھی تہ کر دیجیے گا۔''

اس قدر شیریں لہجہ۔ تائی کس قدر اچھی تھیں جنہوں نے خندہ پیشانی سے مفت خوروں کا بوجھ اٹھا رکھا تھا۔ وہ دونوں بہنیں تو زمین اور گھر میں حصہ دار تھیں اور واثق امید تھی کہ اپنا حصہ بھی نہیں لیں گی سو اپنی مرضی سے سوتی جاگتی تھیں۔ اپنا جو خرچ کرتی تھیں۔ قیس اور ددیا بھی اپنا خرچ خود اٹھاتے تھے مگر وہ مہیب ولا میں کسی چیز میں حصہ دار نہیں تھے سو اپنی مرضی سے آرام کا وقت کہاں سے ڈھونڈ لاتے۔ سچ ہے کسی کے گھر میں رہنا کوئی آسان کام نہیں ہے اور چھوٹی ددیا یہ مشکل کام تب سے کر رہی تھیں جب ان کی عمر صرف دو سال تھی۔

''اپنے نیلسن منڈیلا نے عراق جنگ شروع کرنے پر صدر بش سے بھلا کیا کہا تھا؟'' کافی سوچ بچار کے بعد بھی ددیا کے ذہن میں وہ جملے نہیں آئے تو کچھ فاصلے پہ بک ریک کی جھاڑ پونچھ کرتی عیرش سے پوچھا...... جبکہ پاس بیٹھا رامس تو لفظ اپنے نیلسن منڈیلا پہ ہی لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔

اس وقت لاؤنج میں بخت کی ماں اور ددیا میں سیاسی گفتگو ہو رہی تھی جو اس قدر پر لطف ہوتی کہ اگر آن لائن نشر ہو جاتی تو کوئی بھی مائی کا لال اور لالی (مونث) ہر کسی کا غم بھول جاتے۔

''چھوڑیں بھی ددیا! وہ اس قدر مشکل بات ماسی کی سمجھ میں کہاں آئے گی۔''

عیرش نے بخت کی ماں پہ غصہ تو نکالا ہی تھا بلکہ ایسے کم عقل ہونے کا بھی احساس دلایا۔ کتنی چالاک تھی، جس کے پاس بیٹھتی اس کی ہو جاتی۔

عیرش کی بات پہ اس نے اچھا خاصا منہ بگاڑا۔

''آج ان سے آپ شہلا اعجاز کا کالم، ''سچ بچا کے'' ڈسکس کر لیں۔''

''اوئی ماں!'' بخت کی ماں سٹپٹائی۔ یہ عیرش نے اسے کیا جتلایا تھا۔ ہنسی دباتی عیرش اخبار اٹھا کے ان کے پاس چلی آئی...... اور رامس کو اپنے دانت اندر رکھنے کا اشارہ کیا۔

''وہ لکھتی ہیں کہ بہت سے پلان جو کسی بھی مقصد کے لیے بنائے جاتے ہیں۔ مٹی کی مانند ڈھے جاتے ہیں پھر ہم حیران رہ جاتے ہیں کہ ایسا کیسے ہوا...... ایسا تو ممکن ہی نہیں تھا۔ اپنے قیس کے ساتھ بھی یہی مسئلہ ہوا نا۔ خوابوں کا محل مسمار ہوا۔'' رامس نے بات کر کے ایک ساتھ کئی آہیں بھریں۔

''لو قیس تو وہیں کا وہیں بیٹھا ہے۔ خواب تو در اکے ٹوٹے ہیں۔'' سوئی میں دھاگا ڈالتے ہوئے تائی اچانک اماں کے پاس سرک آئیں۔ کافی ساری قمیصوں پہ بٹن جو ٹنکوانے تھے۔ ''اور یہ سارا فساد رضا کا پھیلایا ہوا ہے۔''

انہوں نے قمیصوں کا ڈھیر پلنگ پہ پھینکا۔ عیرش نے تائی کو تحمل حواس سے دیکھا۔

''اس کالم میں رضا کہاں سے آ گیا؟''

''رضا کیوں نہیں آ سکتا۔ عورتیں تو اپنی سیاسی بات چیت میں مودی اور ڈونلڈ ٹرمپ کو کونڈے میں کوٹ لیتی ہیں اور سیاسی ڈھانچے کو بنا کفن کے نذر قبر کر دیتی ہیں۔'' رامس اپنے قہقہے کی گردن دبوچ کر بولا۔

''اب میٹرک تک تعلیم حکومت کی ذمہ داری

ہے، اس میں ہمارے رضا کا کیا قصور۔" ددیا جو کسی اور کالم کی لائنیں پڑھ چکی تھیں، تائی کو بالا ہی بالا سمجھایا۔

"تو اور کیا، یہ رضا کی نہیں حکومت کی ناقص پالیساں ہیں یہ بخت کی ماں کو بھی تو اپنی سیاسی سوجھ بوجھ کا مظاہرہ فرمانا ہی تھا۔

"اب بدقسمتی سے پاکستانی حکومت کی داخلی پالیساں کمزور تو خارجی تو بالکل ہی ناکام۔" ددیا کا لہجہ مایوس کن تھا۔

"مطلب کہ داخلی سے مراد گھر اور خارجی پھر ڈیرہ ہی ہوا۔" بخت کی ماں نے کیسا مطلب نکالا تھا کہ عیرش کے لیے ہنسی روکنا محال ہوا۔

"رضا نے اچھا بھلا اوپر کی منزل کا بیڈروم چھوڑ کے کارنر والے اسٹور پہ مستری مزدور لگائے تھے۔ اب اس نے تو وہ پلان اپنی پرائیوسی کو زندہ رکھنے کے لیے ہی کیا تھا (جو ردا کی شراکت سے آخری دم پر تھی) مگر ردا کے دل میں تو یہی خیال بیٹھا نا کہ رضا اسٹوری پہ ان کی شراکت برداشت نہیں کر سکا۔ بس اسی دن سے کڑی نے الگ گھر کی رٹ لگا رکھی ہے۔ ہم حیران ہیں کہ ردا کو یہ خیال سوجھا ہی کیونکر......"

"اُف!" عیرش کے کھلے منہ میں من بھر لڈو سما سکتا تھا۔" تائی نے بات کا سرا کہاں سے پکڑ کے کہاں جوڑ دیا تھا۔

"اسے کہتے ہیں اظہار خیال۔" اس نے اخبار تہ کر کے عیرش کے سر پہ مارا۔

"خیر، وہ ایسا غلط بھی نہیں۔ اب ہر کوئی تو پرائے گھر میں رہنا پسند نہیں کرتا۔"

بخت کی ماں اٹھتے اٹھتے بھی تیر چھوڑ گئی تھی عیرش نے ددیا کا رنگ اڑتے دیکھا تھا۔

☆☆☆

آج وہ اندر باہر کے سارے پودوں کو برش سے صاف کر رہی تھی۔ باہر کا کام نپٹا کے وہ ڈرائنگ روم میں آئی تو رضا وہاں موجود تھا۔ آج وہ وکیل سے ملنے گئی تھی اور وہ یقیناً اس بات سے باخبر تھا۔ عیرش اس کی موجودگی نظر انداز کرتی، اپنا کام کرنے لگی، وہ اس کی نگاہوں کی زد میں تھی۔ وہ اس ارتکاز پر چڑ سی گئی کسی کو گھورنے کا بھی کوئی طریقہ ہوتا ہے۔

"میں تمہیں کافی عقل مند سمجھتا تھا۔" وہ خوب صورت لب و لہجے کا مالک تھا، وہ قائل ہوئی۔

"تو میں کون سا مجنوں بنی پھرتی ہوں۔" اس نے فوری اور سرسری جواب دیا۔

"عقل مند کا الٹ بے وقوفی بھی ہو سکتا ہے۔" وہ ہنوز سنجیدہ تھا۔" کیس کرنا آسان ہوتا ہے، اس کی پیروی مشکل اور شیطان کی آنت جیسی ہوتی ہے۔ اپنے ذہن سے یہ خناس نکال دو تو بہتر ہوگا۔" رضا اس کے لاپرواہ انداز سے چڑ کے گویا ہوا۔

"جسے آپ خناس کہہ رہے ہیں، وہ میرا حق ہے۔" وہ کام چھوڑ کے کھڑی ہوئی۔

"جن پہ کیس کرنے جا رہی ہو، تمہاری بہن اس گھر کی بہو ہے۔" وہ بھی نشست چھوڑ کے اس کے مقابل آیا۔" جو تمہارے ذہن میں چل رہا ہے۔ ابھی باقی نہیں جانتے ورنہ۔"

اس کے چہرے پہ پھیلا اطمینان دیکھ کے رضا کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ فی الوقت وہ کچھ بھی سمجھنے کے موڈ میں نہیں تھی۔ اس کا ہر انداز جتا رہا تھا کہ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ رضا نے اس لڑکی کو نگاہ کا انداز بدل کے دیکھا تو آنکھ میں اک تعلق سا چھبا۔

چلو ہم مان جائیں کہ دلوں کے صحن آنگن میں
کوئی پیپل پرانا ہے
کہ جس کی سبز شاخوں پہ
ہمارے دھیان کا پنچھی تمہارے گیت گاتا ہے

یہ رضا نگاہ کا کون سا نجل کھول رہا تھا۔ دل جھجک کے دھڑکا۔ اس سے پہلے کہ لاتعلقی کا سچ ثابت ہوتی وہ ہمیشہ کی طرح اس خوش آواز کے پہلو سے کترا کے گزر گئی۔

دھڑکنوں میں اک شور سا ٹوٹ کے اس شخص کا لب و لہجہ چرانے لگا تھا جسے سننے کو زمانے چاہیے تھے اور زمانے بھی کم تھے۔

☆☆☆

"یہ بیڈروم سیٹ کیے مجھے سال ہو چکا ہوگا اور آپ کو یہ خیال اب سوجھ رہا ہے کہ ردا میرے اس عمل سے ہرٹ ہوئی تھی۔ حد کرتی ہیں اماں۔" وہ ماں کی بحث سے زچ ہوتا جھنجھلا کے بولا۔

"ہاں جیسے ماں تو تمہیں جانتی ہی نہیں جل ککڑے!"

اب وہ بیٹے کو کیا بتاتیں کہ ایک کالم کے چند جملوں نے میری آنکھیں کھول دیں۔

"یاد کرو کمل اور عیرش کی آمد پر تمہارا ری ایکشن کیا تھا۔ آزادی پرست انسان۔"

ساتھ ہی بیٹے پر گہری نظر ڈالی کہ تمہیں اندر تک جانتی ہوں۔ ماضی کے ذکر پہ وہ بے ساختہ مسکرایا۔

"ذرا انصاف سے سوچیے۔ ہماری تمام روٹین کا کباڑا ہو گیا تھا۔ لبوں سے گیت تک چھن گئے اور وہ محترمہ عیرش آج بھی پیپل کے پتوں پہ لکھی دل کی کہانیاں بانگ دہل گاتی پھرتی ہیں تو گھر میں کسی کو سنائی نہیں دیتا اور نہ ہی کوئی ان بی بی کو گھر میں موجود لونڈوں کا احساس دلاتا ہے۔"

اور اس کے کمرے کی کھڑکی کے پاس گملوں کو کھاد دیتی عیرش جی جان سے مسکرائی۔ ایک تو اس کا شعبہ ہی پیڑ پتے تھا دوسرا ان پرانے درختوں کی چھایا زندگی کی تپش پہ جیسے ہاتھ رکھ دیتی تھی۔ اوپر سے ان کے تبصرے۔

"ہم تینوں بے چارے خود کو مصطفیٰ قریشی سمجھنے لگے تھے جو انہیں سرخ گھوڑوں پہ بگٹٹ اڑا لے جاتے۔"

وہ سر جھٹک کے ہنسا تو اس بات پہ تائی امی کا بھی قہقہہ چھوٹ گیا۔ وہ تہ شدہ شرٹس اٹھانے کو جھکا تو ماں نے کان سے پکڑ کے پاس بٹھالیا۔ رضا کی نگاہ کھڑکی کے پار گئی۔ وہ اپنا سامان اٹھائے اب کسی اور سمت جا رہی تھی۔

وہ اس کی موجودگی سے باخبر تھا تب ہی گفتگو میں سرخ گھوڑوں کا ذکر چھیڑا تھا۔ وہ تو خوابوں اور گلابوں کے تذکرے بھی چھیڑنا چاہتا تھا۔

"جب اس بیڈروم میں کوئی آجائے گی تو پھر کون سے کونے میں پناہ ڈھونڈو گے؟" ماں کی بات پہ وہ مبہم سا مسکرایا۔ نگاہ نے کھڑکی کے پار کسی کو ڈھونڈا۔

"آپ چھوٹی ددیا کی طرح بعد میں پچھتائیں گی جس طرح اب ردا کہتی ہے کہ شوہر اور ساس کے علاوہ باقیوں کی خدمتیں کس حساب سے کروں، کل کو آپ کی بہو کا بھی یہی خیال ہوگا۔"

تائی امی نے بیٹے کی بات پہ بے چین ہو کے پہلو بدلا۔

"تو کیا قیس گھر لینے کا ارادہ نہیں رکھتا؟" رضا نے ماں کو جھٹکا کھا کے دیکھا۔ ایک بے یقین اور حیران کن تاثر کے ساتھ۔

"کیوں اماں! ایک مدت گزار کے بھی ددیا اور قیس اس گھر کو اپنا نہیں کہہ سکتے؟"

"اماں سے محبت اور رفاقت اپنی جگہ..... مگر یہ سچ ہے کہ خاندان اور حلقۂ احباب انہیں ہماری فیملی کا حصہ تصور نہیں کرتے۔" واصفہ تائی کی آواز نہایت دھیمی تھی۔

"اور آپ؟" بیٹے کا سوال مشکل تو لہجہ عجیب تر تھا۔ ماں نے نگاہ جھکائی تو اسے جواب مل گیا۔ وجود پہ اک بھاری بوجھ گرا۔

"اب اماں اس عمر میں کہاں جائیں گی مگر قیس....." وہ جملہ کیسے مکمل کرتیں کہ مناسب الفاظ ذہن سے مٹ گئے تھے۔

وہ ماں کے پاس سے چپکے سے اٹھ گیا۔ واصفہ تائی کا دل اتھاہ میں اترا۔ وہ نادم بھی تھیں لیکن یہ بھی سچ تھا۔ برسوں کی سنگت اپنی جگہ لیکن محبت پہ حقیقت غالب آجاتی تھی۔

☆☆☆

پہلے کچھ گرد و غبار اڑا، اس کے بعد ہلکی سی کن من اور اب خوش گوار ہوا کا راج تھا۔ عیرش نے پائپ لگا کر پیڑ پودے دھونے کے بعد لکڑی کا بھاری جھولا بھی دھو دیا تو بخت شیڈ کے نیچے سے صوفہ گھسیٹ لائی کہ ددیا اسی طرف آرہی تھیں۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہال کمرے

میں قیس، ردا اور ددیا کے بیچ گھمسان کا رن پڑا تھا۔

کھڑکی سے ملحق گھنی بیل دھوتے ہوئے عیرش نے جالی سے ماتھا ٹیک کے اندر جھانکا۔ ردا اپنا کچھ سامان لیے سیڑھیاں اتر رہی تھی۔ عیرش دل مسوس کے رہ گئی۔

بعد میں دونوں میاں بیوی گھر سے آگے پیچھے ہی نکلے تھے۔

کافی دیر سے نمل جانے کن دیس کے پرندوں کو تاڑ رہی تھی اور اب ددیا بھی اس کے اس مشغلے میں اس کا ساتھ دے رہی تھیں۔ چند منٹوں بعد قیس بھی چکور کا پنجرہ اٹھائے ادھر ہی چلا آیا۔

''بیوی کو ٹیکسی یا رکشہ کروا کے دے آئے ہو خیر سے؟'' ددیا نے بیٹے کو طنز کا خنجر چبھویا لیکن قیس ماں کی بات نظر انداز کر کے عیرش کی طرف مڑا۔

''ہر وقت پائپ لگا کے زمانے بھر کو دھوتی چمکاتی ہو ان دڑبوں کا حال دیکھو۔'' وہ غم جاناں پہ مٹی ڈالتا اپنا پرانا سامان کاٹھ کباڑ سے اٹھالایا۔ عیرش نے خالی پنجرہ اٹھایا اور درخت کے ایک موٹے تنے سے لٹکا دیا۔

''جن پرندوں سے اس کے دھیان کے پر باندھ کے آپ اڑایا کرتے تھے۔ وہ آپ کو مل گئی پنجرے خالی ہو گئے۔ اب انہیں چمکانا یا بھول جانا ایک ہی جیسا ہے۔'' وہ تنک کے گویا ہوئی۔

ایک ہاتھ میں فائل اور دوسرے میں چائے کا کپ تھامے رضا نے عیرش کو بہت دھیان سے سنا تھا۔ اس کا رخ ڈرائنگ روم کی طرف تھا۔

''کیا محبت کے جہان میں موسم وصال کی یہی وقعت ہے قیس صاحب! درگاہوں پہ اڑتے پرندوں کے پر نوچ کے کتاب میں رکھ لینا۔ محبت کا ایک یہ بھی رخ ہے۔ اس پر میں سے پھوٹتی درگاہ کی خوشبو، محبت جیسی ہوتی ہے قیس صاحب!''

رضا کے قدم سست پڑے۔

''محبت اور عشق کا بھوت سر پہ سوار کر لو، پھر اسی لڑکی سے شادی کر کے زندگی حسین کر لو...... پھر زندگی کو آسان بنانے کے لیے ایک دوسرے کی زندگیوں سے نکل جاؤ...... یہ عجیب محبت ہے، ہونہہ......!''

اس نے کندھے جھٹک کے ایک نخوت زدہ ہنکارا بھرا۔ ''بیگ ہاتھوں سے چھین کے ایک لگاتے کہ خبر دار جو گھر سے باہر قدم رکھا......''

رضا نے اپنی مسکراہٹ نہایت قرینے سے سمیٹی۔ اسے آج کل عیرش پہ غصہ بھی تھا جو اپنی ضد پہ اڑی ہوئی تھی۔

''اب کہاں سے خریدوں گھر...... کیا کوڑیوں کے مول بک رہے ہیں؟'' قیس جل بھن کے بولا۔

''کہتے رہے، گھر بھی بنا لوں گا۔ محبت کے ساتھ دو چار جھوٹ بول دیتے، بیوی خوش ہو جاتی۔ اب منہ پھاڑ کے انکار کر دو گے تو پھر یہی ہوتا ہے جو آج ہوا ہے۔'' اس کی آواز ڈرائنگ روم تک آ رہی تھی۔

ددیا نے عیرش کو سراہتی نگاہوں سے دیکھا۔

''یہ تمام گر دوسروں پہ آزمانا آسان ہوتا ہے!'' نمل نے کافی صبر کرنے کے بعد قیس کے دل کی بات کی تھی۔ ''اپنی باری پہ یہ ٹوٹکے اثر نہیں دکھاتے۔'' نمل اس سے خفا تھی۔

عیرش نے ایک خوب صورت قہقہہ لگایا۔ اندر ڈرائنگ روم میں فائل پہ جھکے شخص نے اک ذرا گردن موڑ کے کھڑکی کا پردہ سرکایا تھا۔ قیس نے پنجرے کا دروازہ کھول کے پھر سے اڑا دیا۔

''میری بلا سے ہر چیز اڑ جائے۔'' وہ کسی ملال کی اتھاہ میں اتر کے بولا۔

''اسے اسیری چاہیے ہو گی تو آ جائے گا۔'' یہ آواز عیرش کی تھی۔ اس نے آسمان کو دور تک دیکھا۔

''اور اگر نہ آیا؟'' نمل زیادہ خوش فہم نہیں تھی۔

''محبت اک خوشنما پرندہ ہے جس کے اندر رہائی کی خواہش نہیں ابھرتی جسے ہمیشہ اسیری چاہیے۔'' عیرش نے چکور کے پنجرے پہ پانی کی دھار ڈالی۔

قیس نے اسے معنی خیزی سے دیکھا۔

''عیرش آج کل کون سی کتابیں پڑھ رہی

ہے۔'' ددیا اس کی باتوں پہ حیران تھیں۔ اندر رضا کے سامنے لیپ ٹاپ کھلا پڑا تھا۔ وہ باہر آ کے اس لڑکی کو دیکھنا چاہتا تھا جو اپنی کتابوں میں خوش نما پرندے پر رکھ کے بہت مسرور تھی۔

☆☆☆

''لو جی ...... بہو گھر چھوڑ کے چلی گئی مگر عفت بیگم نے اپنا ٹھکانہ نہ بدلا۔ بیٹا سالوں سے یونیورسٹی میں پڑھا رہا ہے، ہزاروں کماتا ہوگا۔ کیا گھر کا کرایہ افورڈ نہیں کر سکتا۔ پرائے پلنگ توڑنے کی لت بڑی بری ہوتی ہے۔''

آس پڑوس سے دو چار عورتیں تائی کا حال پوچھنے آئی ہوئی تھیں جو ہفتے بھر سے بخار میں مبتلا تھیں۔

عیرش کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ لوگوں کو ددیا سے کیا خار ہے۔ سب کو ددیا کا وہاں رہنا نظر آتا تھا جو ذمہ داریاں ان ماں بیٹے نے اٹھا رکھی تھیں کسی کو وہ کیوں نہیں نظر آتی تھیں۔

گھر کے مسائل، بلوں کی ادائیگی، آئے دن کی مرمت۔ یہ سب قیس کے ذمہ تھا، تائی کئی دنوں سے بخار کے باعث منہ سر لپیٹ کے پڑی تھیں اور نزلہ زکام ہونے کے باوجود ددیا کچن میں بیٹھی کڑھی بنوا رہی تھیں..... اور وہ دونوں کون سا مفت کا کھاتے تھے۔ کچن کے ماہانہ اخراجات میں جتنے پیسے رضا دیتا تھا۔ اتنے ہی قیس بھی دیتا تھا۔ باقی سب کے کمروں میں اے سی لگے ہوئے تھے اور ددیا کے کمرے کی کھڑکی کے ساتھ ایئر کولر کی گھر رگھر رسنتے گرمیاں گزر جاتی تھیں۔

آج کل موسم بدل رہا تھا تو نزلے زکام نے سب ہی کو لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ کچھ دیر ماں کے پاس چھینکوں پہ چھینکیں مارتا رضا اب اپنے کمرے میں جا چکا تھا۔

''عیرش! رضا کو یاد سے جوشاندہ دے آنا ورنہ صبح آفس میں بھی چھینکیں ہی مارتا رہے گا۔'' ددیا کے پاؤں دباتی عیرش تائی کی آواز پہ باہر آئی تھی۔

''انہیں بھی اب یاد آیا ہے جب بخت بھی چلی گئی۔'' جوشاندہ بنا کے اس نے رامس کے کمرے میں جھانکا جو بالکل خالی پڑا تھا۔ کچھ منٹوں بعد منہ بسورتی عیرش اس کے کمرے پہ دستک دے رہی تھی۔

''آ جائیں!'' آج رضا کی آواز خاصی بھاری ہو رہی تھی۔ وہ لیپ ٹاپ پہ کام کر رہا تھا۔

''شکریہ!'' اس کے ہاتھ سے کپ لے کر اس نے یوں کہا جیسے آرڈر دینے پر کچھ پیش کیا جائے تو ویٹرز کو کہا جاتا ہے۔ عیرش نے اس کی سرخ آنکھوں میں گھورا اور پلٹ کے جانے لگی۔

''منع کرنے کے باوجود آپ کل وکیل سے مل آئی ہیں۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''آپ معاملہ سمجھنے کی کوشش بھی تو کریں۔'' لہجے میں اک ضد سی در آئی تھی۔

وہ گھوم کے سیدھا ہوا اور اسے دیکھا۔

''اگر تمہیں پیسہ چاہیئے ... تو اپنے حصے کی زمین سیل کر سکتی ہو۔ میرے دوست کی فیکٹری میں میرے کچھ شیئرز ہیں میں، انہیں بیچ کے وہ رقم اس گھر کے حصے کی صورت میں دے سکتا ہوں۔ بس تم یہ ضد چھوڑ دو۔'' وہ بے حد سنجیدگی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''میں پہلے بھی کہہ چکی ہوں۔ یہ ضد نہیں ہے اور بات پیسوں کی بھی نہیں، نا انصافی کی ہے، اوپر سے ان کی دیدہ دلیری، اب مجھے بھی دبئی بلانے کے پکے پلان بنائے جا رہے ہیں۔''

وہ یہ سب بتانا نہیں چاہتی تھی مگر رضا نے مجبور کر دیا تھا۔ وہ حیران ہوا۔ وہ ایسی کوئی خبر نہیں رکھتا تھا اس نے عیرش کو توجہ سے دیکھا پھر ذرا لہجہ بدل کے بولا۔

''تو کیا تم نہیں جانا چاہتیں۔'' اس کے چہرے پہ جمی ان نگاہوں کا تاثر حظ اٹھاتا ہوا۔ وہ کیا سننا چاہتا تھا کہ ہاں میرے لیے یہ گھر چھوڑنا سوہان روح ہے۔ اس کے چہرے پہ مسکراہٹ آئی۔

''میں جانا چاہتی ہوں۔ میں وہاں اپنے پاپا کا آفس سنبھالنا چاہتی ہوں۔''

ایسا کہتے ہوئے اس کا لہجہ چمکا تھا اور یہ سب

ہنستے ہوئے اس شخص کے حواس برف ہوئے تھے۔ اس کے چہرے کا رنگ لمحوں میں پھیکا پڑا۔ وہ اسے دیکھتا رہ گیا جو کتابوں میں خوشنما پرندے کے پر رکھ کے بہت مسرور تھی۔

☆☆☆

ددیا نے لوہے کے ٹرنک کا تالا کھولا تو وہ ان کے پاس کھسک آئی۔

''انہیں اپنے بیگ میں رکھ لو کل جیولر کے پاس جائیں گے۔'' وہ نہایت آہستگی سے گویا ہوئیں۔

''اب ان کے پاس چند انگوٹھیاں ہی بچی تھیں یا پھر چاندی کی جھانجھر۔''

''اب کیا ضرورت پڑ گئی؟'' عیرش نے انگوٹھیوں کو مٹھی میں دبوچ کے پوچھا۔

''لو ضرورت کیوں نہیں، شب برات سر پہ ہے۔ دینا دلانا ہوتا ہے۔'' وہ کچھ سوچتے ہوئے مسکرائیں۔

''اس کام کے لیے قیس سے پیسے لے لیں۔'' عیرش نے ذرا سی مٹھی کھولی، انگوٹھیوں کو پھر سے دیکھا۔ جو بہت دیدہ زیب تھیں۔ زیورات بیچنا ان دونوں کا خفیہ مشن تھا۔

''اس قدر مہنگائی ہے۔ تنخواہ سے سب کہاں پورا پڑتا ہے۔ ویسے بھی قیس نے پچھلے ماہ سے کمیٹی ڈالی ہے اب اس کے بال بچوں کے پاس تو اپنا گھر ہونا چاہیے نا۔ اس کی تو جیسے تیسے گزر گئی۔''

عیرش کی بند مٹھی کانپی کہ آج ددیا نے پہلی بار گھر سے متعلق بات کی تھی۔ اس کی انگلیوں کی درز سے انگوٹھیوں کے ننھے یاقوت لشکارا مارتے تھے اور اپنے گھر کا ذکر کرتے ہی ان کی آنکھوں کی چمک نے یاقوتوں کی روشنی کو مات دی تھی۔ اپنے گھر کا احساس کیا ہوتا ہے عیرش کو ابھی تک یاد تھا۔

ددیا نے ہاتھ دوبارہ ٹرنک میں گھسایا۔

''اس میں تمہارے لیے بھی بہت کچھ ہے۔''

مگر عیرش کا ذہن پہلی بات میں اٹکا تھا۔

''اسلام دادا کا گھر کیا انہوں نے خود بیچا تھا؟'' عیرش کی آواز اتنی بھی مدھم نہیں تھی مگر ان سنی کر دی گئی تھی۔

''خدا خوشی کا وقت خیر سے لے آئے۔ نمل کے بچے کے لیے بھی سو چیزیں بنانا ہوں گی۔ یہ چالیس تولے کی جھانجھر تب بیچوں گی۔'' عیرش کا دل خوش گواری سے دھڑکا...... تو اسی وجہ سے نمل آج کل ددیا کی ہتھیلی کا چھالا بنی ہوئی تھی۔ عیرش کا بس نہیں چل رہا تھا کہ سوتی بہن کا منہ چوم لے۔

''عورت کے دکھ سکھ میں یہ قیمتی چیزیں ہی کام آتی ہیں اور یہ بھولی نمل۔'' ددیا ہنسیں۔''اس نے سارا زیور ساس کے سپرد کر دیا میں تو سن کے دنگ رہ گئی۔ پھر خوب جھاڑا کہ اگلی بار آؤ تو ساتھ لے کر آنا۔ اسے ہاتھ کان اور گلے میں کچھ نہ کچھ پہنے رکھنا چاہیے۔ سہاگنوں کے لیے اچھا ہوتا ہے نمل میں یہ بات تو ہے کہ بات سمجھ لیتی ہے۔''

ددیا نے اسے کن اکھیوں سے دیکھا۔ اس نے منہ پھلایا۔ پھر ہنس دی۔

وہ کہاں اچھی تھی، وہ کسی کی کہاں سنتی تھی۔ اسے رضا کے ماتھے کے بل یاد آئے کہ ان آنکھوں کا بے نیاز تاثر اب ذہن نشین ہو چکا تھا۔ اس بندے کے ہر طرح کے رویوں کے باوجود اور خود اس سے کترانے کے باوجود جانے کب اس پہ رضا کی محبت کسی خیال کی طرح مسلط ہو گئی تھی۔

''بہن چار دنوں کے لیے آئی ہے، اسے بھی وقت دیا کرو، مگر کہاں، یہ تم نے کیسا علم سیکھا ہے کہ سارا دن کھاد اور اسپرے لیے اگواڑے پچھواڑے اڑی، اڑی پھرتی ہو۔''

وہ ددیا کو بتا نہیں پائی کہ اس کے سسرال والوں نے بہن کو یہاں کس مقصد کے لیے بھیجا ہے۔ ددیا ٹرنک کی چابی بھی اسی کے پاس رکھتی تھیں۔ خود جہاں رکھتیں، مہینوں ذہن دوڑانا پڑتا تھا۔

''کل بازار چلیں گے...... شب برات کے قریب تو رش بڑھ جاتا ہے۔''

آپ کو اسلام دادا سے محبت تھی؟'' ٹرنک کی تہ میں پڑا آف وائیٹ کرتا جس پہ ددیا کی نگاہ بھٹک جاتی تھی۔ پھسل جاتی تھی۔

''ہوا کے جھونکے سے کون محبت کرتا ہے۔'' وہ بڑبڑائیں۔

''تو پھر یہ کرتا ابھی تک کیوں رکھا ہے......؟''
عیرش کوئی بھید کھولنا چاہتی تھی۔ ددیا نے ٹرنک کا کنڈا تھاما، وہ اسے بند کرنا چاہتی تھیں۔

''ایسے ہی میرے تہ شدہ کپڑوں کے بیچ کہیں رہ گیا تھا...... تو ٹرنک میں رکھ دیا۔ اس میں زرد نگوں والی بالیاں بھی ہیں۔ وہ میں نے رضا کی دلہن کے لیے رکھی ہوئی ہیں۔'' عیرش کی ہتھیلیاں بھیگیں۔

''بتا رہی ہوں...... سانس کا کیا اعتبار۔''

''لو...... ایویں...... رضا کی دلہن کو ہم کیوں دیں گے۔'' عیرش نے منہ بگاڑا۔ ''تائی کے پاس کیا کچھ نہیں، ویسے بھی اس آدم بیزار سے شادی کون کرے گی۔'' اس نے ٹرنک کا ڈھکنا سہولت سے بند کیا۔

''رضا کو کون انکار کرے گا۔'' ددیا نے اسے بغور دیکھا۔ ''اس کی ماں کا خاندان لڑکیوں سے بھرا پڑا ہے۔'' اس نے کنڈے میں تالا پھنسایا۔ وہ رضا نامہ چھیڑنا نہیں چاہتی تھی کہ یہ ذکر اس کے گرد اک کیسری ہالہ بُن دیتا تھا۔ وہ اب بہت دور تک سفر کرنا چاہتی تھی۔ زندگی سے چھن جانے والی ہر چیز اسے دوبارہ چاہیے تھی۔

☆☆☆

''مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس گھر کی خواتین یکسانیت کا شکار ہو کے بور ہو رہی تھیں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ان کی بوریت موسیٰ ہی بھگا سکتا ہے۔ جس کی آمد کے بعد بٹوؤں کی زپیں اور کچن کے کیبنٹ کھول دیے جاتے ہیں۔''

موسیٰ کو سامنے پا کر سب ہی کے چہرے کھل اٹھے تھے۔ باغ و بہار طبیعت کا مالک موسیٰ دیسی کھانوں کا بے حد شوقین تھا مگر موسیٰ کو اچانک سامنے دیکھ کے عیرش کے ہوش اڑ گئے تھے۔

''اس قدر خوشی کی نیوز سن کر دوڑا آیا ہے۔'' اس نے دل کو کافی تسلیاں بھی دی تھیں پھر بھی بے چینی اس کے چہرے سے مترشح تھی۔ حالانکہ وہ موسیٰ کی چہیتی تھی اور اس کی آمد پہ اسے پر لگ جاتے تھے۔

رضا نے عیرش کو بغور دیکھا اور کئی ثانیے دیکھتا رہا جیسے جتا رہا ہو کہ اب کہو...... کیا وہ سب آسان ہے؟ اس کا جتانا محسوس کرتے ہی وہ وہاں سے اٹھ گئی تھی۔ نجومی کی اولاد نہ ہو تو......

تائی اپنے بٹوے کی زپ کھولتے ہوئے نہایت احتیاط سے بڑبڑائی تھیں کہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔

''لو...... جی رامیں صاحب کا غلط شوشا کہ خاتون خانہ بور ہو رہی تھیں......'' بخت نے کیبنٹ سے نیا ٹی سیٹ نکالتے ہوئے اپنا سر پھوڑنا چاہا تھا کہ اب تو دن برتن دھوتے ہی تمام ہونا تھا۔ اس کی جھنجھلاہٹ پہ کسٹرڈ بناتی عیرش مسکرا دی حالانکہ دل بے حد بوجھل تھا۔ موسیٰ کی آمد پہ ددیا کو بھی پر لگ جاتے تھے۔

''تم اندر جا کر بیٹھو میں یہ سب کروالوں گی۔'' ددیا نے عیرش کو الجھا ہوا سا دیکھا تو اپنی مرضی کا مطلب نکالا...... پلاؤ کا مسالا بھونتی تائی نے بھی عیرش کی سستی بھانپ لی تھی۔

''موسیٰ بھی تمہارا پوچھ رہا تھا۔ تمہیں ان کے پاس جانا چاہیے۔''

کچن کاؤنٹر پہ سودا سلف رکھتے رضا نے ماں کی بات پہ تائیدی سر ہلایا اور خوب ہلایا کہ اونٹ پہاڑ تلے ایسے آتا ہو گا جبکہ نگاہ کسٹرڈ ڈیکوریٹ کرتی عیرش پہ ہی تھی جو رضا کے خوش گوار موڈ پہ کڑھ رہی تھی۔ تائی کی نظر کاؤنٹر پہ پڑی تو دو چار سالم دیسی مرغ ایک ساتھ دیکھ کے ان کے پسینے چھوٹ گئے۔

''موسیٰ کوئی مہینہ بھر تو نہیں رہے گا۔'' تائی کو نئے خدشات نے گھیرا تو نہ چاہتے ہوئے بھی بات منہ سے نکل ہی گئی۔ ان بے تحاشا خرچوں کا سوچتے ہی

ان کا بی پی شوٹ کر چکا تھا۔
''یہ سودا مہنگے بھر کا تو نہیں۔'' ددیا کی زبان بھی بے ساختہ ہی پھسلی تھی۔
''خیر چاہ تو میرے ہاتھوں میں ہی آتا ہے نا۔ جس طرح کھینچ تان کے ایک مہینہ نکلتا ہے۔ یہ میں ہی جانتی ہوں۔'' تائی جھک جھک کرنے والی عورت نہیں تھیں اب بھی جواب سرد مہری اور متانت سے دیا۔

عیرش کے دل کو کچھ ہوا کہ ددیا کا چھپاتا وجود اچانک جامد ہوا تھا۔ میوہ جات کی جانب بڑھتا رضا کا ہاتھ بھی ٹھٹکا......
''معاف کیجیے گا اماں! لیکن ایک مخصوص بجٹ کے ساتھ بھرا پرا گھر چلانا کوئی آسان بات نہیں۔'' بخت کی ماں کا بات کرنے کا انداز ایسا تھا...... کہ کبھی گھر چلایا ہو تو...... تو پوچھتی۔
اس کی بات رضا کو انتہائی ناگوار گزری تھی۔ اس نے ماں پہ اک شکایتی سی نگاہ ڈالی کہ کام والی کو یہ جرات کیونکر ہوئی۔ مالکوں کے معاملات میں بولنے والی یہ کون ہوتی ہے۔ لیکن ماں نظر چرا گئی تھیں۔
وہ بخت کی ماں سے بات کرتے کرتے سنبھلا کہ وہ موسیٰ کی موجودگی میں بدمزگی نہیں پھیلانا چاہتا تھا...... رضا کا خراب موڈ بھانپتے ہوئے عیرش نے سوچا تھا کہ میوہ جات چرانے والی بلا ٹل چکی ہے۔ رضا نے اسے غافل جان کے مٹھی بھرلی تو وہ ششدر رہ گئی۔ لیکن ڈنر میں جب میٹھا سرو کیا گیا تو رضا کے سامنے ڈیکوریشن سے فارغ ڈونگا آیا۔ اس نے مسکراہٹ دبا کے اس چڑچڑی لڑکی کو گھورا۔
''آپ اپنے حصے کا کھا چکے ہیں۔'' وہ ہمیشہ کی طرح تنک کے بولی تو وہ بھی ہمیشہ کی طرح ہی اس بے رونق کسٹرڈ کو گھورتا رہ گیا۔

☆☆☆

''موسیٰ کی بات الگ تھی۔ تم دونوں شروع سے ہی ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے لیکن کوئی میری پراپرٹی کی بنا پر اور پراپرٹی کے ساتھ مجھے بھی ہتھیانا چاہے۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔''
ابھی کل ہی تو اس نے قطعی لہجے میں بہن کو اپنا فیصلہ سنایا تھا اور نمل بس خالی نگاہوں سے اسے دیکھتی ہی رہ گئی تھی۔ آج موسیٰ کی اچانک آمد اسی سلسلے کی ایک کڑی ہی تھی۔ عیرش خطرے کی بو سونگھ رہی تھی۔ تاہم وہ مطمئن تھی کہ موسیٰ اس کی بات سمجھ جائے گا۔ وہ اس سے بھائیوں جیسی محبت کرتا تھا۔ وہ نمل سے بے حد محبت کرتا تھا۔ وہ ان دونوں کے لیے ماں اور ماموں کے مقابل آ سکتا تھا۔ دو دن بعد موسیٰ اور نمل کی واپسی تھی۔ اگلے دن موسیٰ انہیں شاپنگ کروانا چاہتا تھا۔ اسے اپنے چند عزیزوں سے بھی ملنا تھا۔ وہ اس وقت ہال کمرے کی عقبی کھڑکی کے ساتھ لگ کے کھڑی تھی۔ وہ سب کو دیکھ رہی تھی۔
شکر ہے رضا کا رخ دوسری جانب تھا۔
تھوڑی دیر بعد موسیٰ نے بنا تمہید باندھے ان سب کے سامنے ماموں کی خواہش رکھ دی تھی کہ وہ عیرش کو اپنی بہو بنانا چاہتے ہیں۔''
ہال کمرے میں اک گمبھیر سکوت چھا گیا تھا۔

☆☆☆

رضا نے چند گہرے سانس لیے اور صوفے کی پشت سے ٹیک لگائی۔ اس نے کون سا کہیں باغ لگایا ہوا تھا۔ جسے موسیٰ کے ایک جملے نے اجاڑ دیا تھا...... اسے اپنی بے قراری بلاوجہ کی ہی محسوس ہوئی۔
''ہم کہاں کے فیصلے کرنے والے ہوئے۔''
اس مختصر سکوت کو چھوٹی ددیا کی آواز نے درہم برہم کیا۔ ''آپ کی والدہ نے بچیاں ہمارے سپرد کرتے وقت ہی ہمیں ہماری اوقات جتا دی تھی۔ پھر بھی مقام شکر ہے کہ بارات لانے سے قبل ہمیں بتا دیتی ہیں۔''
ددیا کے خائف اور گلہ آمیز لہجے نے موسیٰ کو شرمندہ کیا۔ ددیا کے لہجے نے عیرش کے دل پہ آریاں چلائیں۔ انہیں پالنے پوسنے والی۔ ان کے دکھ سکھ پہ نیندیں وارنے والی یوں ہاتھ جھاڑ کے بولی تھیں۔ ماں باپ کے بعد خالہ نے تو انہیں اپنے ساتھ ایک ماہ بمشکل رکھا تھا وہ بھی امتحانات کی وجہ

سے۔ اب کس حساب سے وارث بن کے حق جتانے چلے آتے تھے۔

''پلیز ددیا! ایسا تو مت کہیں، آپ کی رضا مندی کے بنا، بارات لانے کی مجال کون کرسکتا ہے اور آپ لوگ بھی تو کچھ کہیں نا۔''

وہ رخ موڑ کے تائی، رضا اور قیس سے مخاطب ہوا، تو رضا نے بند آنکھیں جبراً ہی کھولی تھیں۔

''فراز کے لیے دبئی میں لڑکیوں کی کمی تھوڑی ہے، کہ بے وقوف عیرش جسے حال دل سنانے کے لیے پھول پتے ہی ملتے ہیں۔ جو کچن میں کھڑے کھڑے خود کو ملکہ پکھراج تصور کرتی ہے۔ ایسی بے سری لڑکی کا دبئی میں کیا کام۔'' وہ یہ سب کہنا چاہتا تھا۔ اور جو کانچ کی بوتلوں سے صندل اڑا کر ان میں میری آہٹوں کی دھول بھرتی ہے۔

جالی سے ماتھا ٹکائے گھنی بیل کے نیچے کھڑی لڑکی نے اسے بے آواز اکسایا کہ یہ بھی تو کہو ...... چکور کا پنجرہ اٹھائے قیس کے آگے پیچھے پھرتی وہ نادان لڑکی وہ اس گھر کے بنا کہاں رہ پائے گی۔

وہ یہ بھی نہ کہہ سکا بس موسیٰ کا چہرہ دیکھتا رہ گیا۔

''اگر واقعی میں ہمیں بیٹی والوں کا رتبہ دیا جا چکا ہے تو پھر رسم و رواج کے مطابق سوچنے کی مہلت بھی دی جائے۔'' ددیا نے شیریں لہجے میں ایسی مناسب بات کی تھی کہ ہر ایک خوش ہوا۔

تو کیا وہ عیرش کی عادتوں سے واقف نہیں تھا۔ اگر وہ پلٹ کر اس کھڑکی کو گھور لیتا...... تو اس لڑکی نے وہی کھڑے کھڑے مٹی ہو جانا تھا۔ اس کی بے قراری کی مانند اب چہرے پہ اتری مسکراہٹ بھی بلاوجہ ہی تھی۔

☆☆☆

''یہ پیپل کے نیچے کیا وقوع پذیر ہوا ہے ماشاء اللہ آوے کا آوا ہی یہاں جمع ہے۔'' رامس نے ہو بہو ددیا کا انداز اپناتے ہوئے بات کی تو باقی سب کے ساتھ ددیا بھی ہنس دی تھیں۔

وہ دونوں بھائی ایک ساتھ ہی گھر آئے تھے۔

اس کا ارادہ کمرے کی طرف ہی جانے کا تھا مگر نثار چاچا کو دیکھا تو ادھر ہی چلا آیا۔ جو گاؤں سے اچاری آم لے کر آئے تھے تو اس جمگھٹے کی وجہ وہ کھٹے اور کچے آم ہی تھے کہ نثار چاچا پہ نثار ہوا جا رہا تھا جو آموں کو کٹ کٹ کرتے ایک صاف کپڑے پہ اچھال دیتا تھا۔ ذرا جو کچی پھانک کسی کے سامنے گرتی تو فوری اچک لی جاتی۔ آج ردا بھی وہیں موجود تھی جسے کل ددیا عیرش اور ہاشم سمجھا بجھا کر گھر واپس لے آئے تھے۔ ددیا دہائیاں دے رہی تھیں۔

''آئے ہائے سب اپنے ہاتھ قابو میں رکھو۔''

''لو جی...... یہاں تو دل ہی مشکل سے قابو میں ہے۔'' عیرش نے رضا پہ ترچھی نگاہ ڈالی جو اس تمام کارروائی سے محظوظ ہو رہا تھا۔ دور اور قریب کے راستوں پہ چلتا بھی وہ جان لیتا تھا کہ وہ کن نگاہوں کی زد میں ہے۔

''رضا میاں! سنائیں حال کیسا ہے؟'' نثار چاچا نے اسے محبت سے دیکھا۔

''جی بہت اچھا حال ہے۔''

''یوں سمجھیں ہمارے خراب حالوں پہ خاموش ہونے والے مایوس پھر رہے ہیں۔''

حال تو رضا ہی نے بتایا مگر اگلا ٹکڑا قیس نے لگایا تھا کہ اس کی معنی خیزی پہ رضا جھینپ سا گیا۔ وہ کالے نمک کی ڈبیا گھٹنے کے نیچے رکھ کے دو زانو بیٹھی تھی۔ اسے کچے آم کھاتا دیکھ کے رضا کے دانت کھٹے ہو رہے تھے۔

''ان آموں کو دھو دھا کے ہی بوری بند کیا تھا نا۔'' بخت کی ماں مسالہ جات لیے سر پہ کھڑی اب سہہ بارہ پوچھ رہی تھی۔ نثار میاں کا ہاتھ لحہ بھر کو رکا۔

''بوری اٹھانے سے پہلے سر بھی اچھے شیمپو سے دھویا تھا۔'' نثار میاں بھی چڑ کے بولے۔ ان دونوں کی تکرار پہ ددیا کا دھیان بٹنے کی دیر تھی۔ عیرش کو کیریاں اڑانے کا موقع مل گیا۔

''انہیں کھانے کے بعد پھر بیمار ہو کے بستر پہ ایک ماہ گزارنا اچھا لگتا ہے۔'' وہ اس کے قریب سے

گزری تو وہ دھیمی آواز سے بولا۔ وہ دونوں ایک ہی روش پر تھے۔

''میری غیر حاضری سے آپ کا وہ ایک ماہ تو سکون سے گزرتا ہوگا۔'' وہ نگاہ ملا کے گویا ہوئی۔

''وہ پرانی بات تھی، اب ایسا نہیں ہوتا۔'' اس کے لہجے میں کوئی پارہ چمکا تھا۔ وہ چند الفاظ سنبھال کے رکھنے جیسے تھے۔ وہ حیران ہوئی۔

چلو ہم مان جائیں کہ تمہاری آنکھ کا موسم جسے سرسبز رکھتا ہے اسی پیپل کے پتے پہ، محبت لفظ لکھا ہے، وہ ساتھ ساتھ بالکل سیدھ میں چل رہے تھے۔

''شاید میرا حافظہ اچھا ہے کہ پرانی باتیں اچھی طرح یاد رہتی ہیں۔'' وہ تیز چلتی دو قدم آگے ہوئی پھر کچھ اور دور...... رضا نے اپنی رفتار نہیں بدلی تھی۔

آج ہوا قدرے تیز تھی، مگر پتوں کی کھن کھن کے ساتھ چند مزید آہٹیں بھی قریب سے ابھر رہی تھیں، اس نے پلٹ کے دیکھا اور گنگ رہ گئی۔ قیس کے ساتھ وکیل کا اسسٹنٹ ڈرائنگ روم کی جانب بڑھ رہا تھا۔ اس نے سٹپٹا کے رضا کو دیکھا جس کی آنکھوں میں غبار سا بھر گیا تھا۔

''مان لیا کہ تمہارا حافظہ اچھا ہے۔ تمہیں ماضی میں گھومنا اچھا لگتا ہے۔'' اس کی پیشانی نے شکنوں کا جال بن رکھا تھا۔ عیرش نے چپکے سے نگاہ موڑی اور ہاتھوں سے لباس درست کیا۔ اب وہ پیچھے اور لمبے ڈگ بھرتا رضا، بہت آگے جا چکا تھا۔

☆☆☆

''غضب خدا کا بوری آموں سے بھری...... اور مرتبان دیکھو۔ گردن سے بھی نیچے۔'' ددیا کا صدمہ کم ہی نہیں ہو رہا تھا۔

''گردن سے اوپر کیسے جاتا، دن دھاڑے چوری ہوگئی اور آپ بجنت کی ماں سے لڑتی رہ گئیں۔''

رامس نے دادی کو بھڑکا کے اپنا بدلہ لیا کہ عیرش نے بجائے پکوڑے یا کباب بنانے کے رامس کے دوستوں کو آج چائے کے ساتھ صرف بسکٹوں پہ ٹرخا دیا تھا۔

''اب چور اندر نمک مرچ لگا کے مال ہڑپ کر رہے ہیں بلکہ مال تو ہضم بھی ہو چکا۔'' اس نے ہاتھ جھاڑ کے لہرائے۔

''اے ہے پیچھے ہٹو...... میں نے خود دیکھا تھا لڑکیاں ہاتھ جھاڑ کے اٹھی تھیں۔''

''آپ نے ثابت کر دیا کہ پولیس کی ہمدردیاں چوروں کے ساتھ ہوتی ہیں ذرا سوچیں۔ جو عیرش صاحبہ تین فٹی جگ میں شربت بنا لے گئی تھیں تو کیا نثار چاچا کو اس سے نہلانا تھا۔''

کچن میں چائے بناتی عیرش نے دانت کچکچائے اور دروازے میں آئی کہ رامس کو زبان بند رکھنے کا اشارہ کرنا چاہیے۔ اس کمینے نے کباب ہی بنوانے تھے۔ اس نے رضا کو ہال کمرے میں آتے دیکھا۔ کل سے اس کا موڈ خراب تھا...... ورنہ وہ آتے ہی اس سے چائے کا ضرور کہتا۔

''ہر وقت فضول کے ڈرامے نہ کرتے رہا کرو۔'' ''تمہاری جاب کا کیا ہوا؟'' اس نے آتے ہی رامس کی کلاس لی۔ مگر اس کا دھیان عیرش کی طرف تھا جو اسے اشاروں سے سمجھا رہی تھی کہ کباب بنا دوں گی مگر زبان بند رکھو، دوسری صورت میں ددیا نے وہ کچے آم پاتال سے بھی نکلوا لینے تھے۔ وہ رضا کے چہرہ موڑنے پہ رکی جس نے اچٹتی نظر ڈال کے رخ بدل لیا تھا۔

''اس ملک کی باگ ڈور تو کسی کے ہاتھ میں ہے نہیں، ہر کوئی کرسی کی فکر میں ہے، جاب کہاں سے ملے گی؟ ہر طرف اندھیر مچا ہے اندھیر اور میرا ذہن تو ابھی تک قلابازی کھا رہا ہے کہ لڑکیوں نے کیسا ہاتھ دکھایا ہے۔'' وہ رامس کی حمایت میں کافی بول چکیں تو انہیں اپنا مسئلہ یاد آیا۔

''چھوڑیں ددیا! اچار بھی تو انہوں نے ہی کھانا تھا۔'' رشوت کا اشارہ ملتے ہی اس نے بیان بدل لیا۔ ''دل کو قلابازیوں سے روکیں، اب اس عمر میں چک وک پڑ گئی تو۔'' رامس کی کایا پلٹی۔ ددیا کی سمجھ میں تو نہیں آیا مگر رضا سمجھ چکا تھا۔

''تم سے کہا تھا میرے دوست ساجد سے ملو۔''
اسے اب واقعی رامس کی جاب کی فکر ستانے لگی تھی تب ہی عیرش نے وہاں آ کر ان دونوں کے سامنے چائے رکھی۔ وہ حیران ہوئی جب رضا وہاں سے اٹھ کے چل دیا۔

''میں اماں کی طرف جارہا ہوں۔ رات کو انہیں لیتا بھی آؤں گا۔''

وہ ددیا سے مخاطب ہوا۔ تائی آج صبح سے اپنی بہن کے گھر تھیں۔

''پہلے چائے تو پی لیں پھر اکٹھا نکلتے ہیں۔'' رامس نے مشورہ دیا۔

رضا یوں کھڑا رہا جیسے سنا ہی نہیں یعنی بہت سنجیدگی سے ناراض تھا۔ عیرش کمرے میں جانے کے بجائے واپس کچن میں آئی کہ تائی لوگوں نے اگرچہ ڈنر کے بعد ہی آنا تھا لیکن ردا دوپہر کا بچا سالن نہیں کھاتی تھی۔ اس نے فریزر سے گوشت کا پیکٹ نکالا۔

''باجی! دوپہر کے کریلے گوشت سے کام چل جائے گا۔'' بخت کا ارادہ ابھی ٹی وی دیکھنے کا تھا۔

''ہمارا کام تو چل جائے گا مگر ردا کا رینگے گا بھی نہیں۔'' وہ مسکرائی۔

بخت جاتے جاتے رکی۔

''تو آپ کیوں وخت میں پڑرہی ہیں اگر تازہ کھانے کی شوقین ہے تو اپنے لیے خود بنائے۔''

عیرش نے منہ بگاڑتی بخت کو ہلکا سا گھورا۔

''یہاں سے تھک کر جاتی ہو پھر کنیز کے کام کیوں کرتی ہو؟'' (وہ اس کی ماں تھی)

''ہائے...... وہ تو صبور کی ماں ہے جی!''

''تو ردا...... ددیا کی بہو ہے۔'' بخت سے بات کرتے ہوئے بھی پیاز کاٹتے ہوئے بھی اس کا ذہن رضا میں ہی اٹکا ہوا تھا۔ بخت کافی ذہین تھی۔ تھوڑی سی سوچ بچار کے بعد اس نے ہاں...... کو کافی لمبا کھینچا تھا۔

☆☆☆

یہ اگلی شام کا ذکر ہے، وہ دونوں بازار سے تھک ہار کے آئی تھیں۔ ددیا نے کیا کچھ نہیں خریدا تھا، ابھی وہ پانی پینے کے بعد قیمتیں ہی ڈسکس کررہی تھیں کہ تائی اون کی گولوں کے ڈھیر سمیت چلی آئیں۔

عیرش نے ان گولوں پہ ایک ناگوار نظر ڈالی...... تائی جب بھی بہن کے گھر سے ہو کے آتیں تو پانچ چھ دوپٹے تو ضرور ہی اٹھا لاتیں۔

''آج کل بازار میں کیا نہیں مل رہا۔'' عیرش نے ایک دوبار انہیں جتایا بھی تھا۔

''ارے بھئی، آپا کو اماں کے ہاتھ کا کروشیہ بہت پسند ہے۔''

بعد میں ددیا نے اسے گھر کا۔ ''فارغ ہی تو ہوتی ہوں۔''

''جتنا آپ فارغ ہوتی ہیں۔ سب جانتی ہوں۔'' وہ تپ کے بولی تھی۔ تائی آج کل ان سے تکیوں کے غلاف سلوا رہی تھیں۔

''بازاری غلافوں کا ناپ کہاں فٹ آتا ہے۔'' عیرش کے دل میں پنکھے چلے۔

''تو ٹیلر سے سلوائیں، نا کس قدر اچھی پائپنگ کرتے ہیں۔'' اس نے ہمیشہ کی طرح فوری مشورہ دیا۔

''تو پائپنگ بھی لے آئی ہوں۔'' اب اس جواب پہ عیرش ہکا بکا ان کا منہ تکتی رہ گئی۔

اب اون کے پھولے گولے دیکھ کے اس کا دل جیسے بجھ سا گیا تھا۔ ابھی دو دن قبل ہی تو ددیا تکیوں کی سلائی سے فارغ ہوئی تھیں۔

وہاں اب شاپنگ دیکھی جارہی تھی۔ تائی کے سوٹ کے ساتھ وہ بخت کی ماں کے لیے بھی ایک سوٹ لائی تھیں۔ عیرش منع کرتی ہی رہ گئی۔ وہ انہیں اس عورت کا دوغلا پن کبھی بھی کھل کے نہیں بتا سکی تھی...... مگر اشاروں کنایوں میں اس کی مخالفت ضرور کرتی تھی۔

''لوگ کہاں جھوٹ بولتے ہیں دراصل ہماری حقیقت قابل رحم ہوتی ہے۔ لوگ جس کی وضاحت کرتے ہیں۔ گر بخت کی ماں مجھے ملکہ تصور کرلے تو

میں اپنے لیے محل ڈھونڈنے لگوں گی۔ بھلے سو سال تاج پہن کے بیٹھی رہوں گی۔ تو عفت اسلام اور تو اور تم بھی کہو گی بڑی آئیں ملکہ عالیہ۔''

ددیا نے اپنا ہی مذاق اڑایا تھا۔ مگر عیرش مسکرا بھی نہیں سکی تھی۔

''ہماری زندگی کسی شعر کی مانند ہوتی ہے اور لوگ بہت اچھے نثر نگار ہیں عیرش! جو زیر، زبر، پیش تقدیر کے ہاتھوں رہ جاتے ہیں وہ زمانہ لگا دیتا ہے۔ جو ہوں، وہی تو کہتی ہے بخت کی ماں۔'' جب ددیا نے سوٹ دکھایا تو تائی کا چہرہ پھیکا پڑا تھا۔

''اس قدر اچھی لان بخت کی ماں کہاں پہنتی ہے۔''

''تحفہ کسی کی اوقات جتانے کے لیے نہیں، اپنی محبت میں دیا جاتا ہے۔''

ددیا کی اس شان دار بات پہ پتا نہیں تائی کے چہرے پہ کیا گزرا ہوگا کہ اس کا رخ تو باہر کی طرف تھا۔ وہ لان کے مشرقی حصے میں چلی آئی۔ وہ لکڑی کے جھولے پہ بیٹھا کسی سے فون پہ بات کر رہا تھا۔ وہ وہاں چہل قدمی کی غرض سے نہیں آئی تھی کہ پاؤں تو پہلے ہی دکھ رہے تھے۔ وہ اسے دیکھ کے اپنی جگہ سے کھڑا ہوا۔ عیرش کے دل کو دھکا سا لگا۔ وہ یوں اچانک اجنبی بن چکا تھا۔

''میں نے کچھ پیپرز پہ سائن کیے تھے۔ ابھی تو کیس فائل ہوا ہے۔ ابھی تیار ہوگا اس تمام عرصے میں ممکن ہے مجھے آپ کا تعاون بھی درکار ہو۔ آپ ابھی سے۔''

وہ خاموش ہوئی۔ جانے وہ کیا کہنا چاہتی تھی وہ اس قدر حیرت میں مبتلا تھا کہ اسے دیکھے ہی گیا۔

''اس کے بعد تم جو لطیفے انہیں سناؤ گی وہ انجوائے کرتے ہوئے تمہارا شکریہ ادا کریں گے۔ ابھی تو کیس فائل ہوا ہے۔'' رضا نے اس کی نقل اتاری تو اسے شدید غصہ آیا۔

''وہ ہمیں مٹانے کے لیے ہم سے دست بردار ہوئے تھے اور اب اپنے مفاد کی خاطر ہمیں ڈھونڈ نکالا ہے تو یہ کہاں لکھا ہے کہ ظالم ہی جیتے، غاصب ہی جیتے۔'' اگرچہ وہ کڑے ضبط کے ساتھ گویا ہوئی تھی لیکن اس کی آواز ـــــ رندھ گئی۔

یہاں ظالم ہی جیتتا ـــــ ہے۔ غاصب ہی جیت جاتا ہے، مظلوم قلم میں سمندر بھر کے لکھتا رہے کوئی بھی ہنس پڑے گا، بھلے قلم سارا سمندر پی جائے اور ظالم کے ایک نکتے کو پورا ہجوم بڑھ کے دیکھتا ہے کیونکہ وہ طاقتور ہوتا ہے۔'' وہ شخص اسے اپنے لہجے کے نرم پھندے میں لانے کی کوشش کر رہا تھا۔

اس نے رضا پہ تیز نظر ڈالی..... ''طاقتور کا چونکنا اور ٹھٹکنا بھی کمزور کی جیت ہوتی ہے..... جیت تو قسمت کی بات ہے لیکن میں انہیں چونکاؤں گی اور ڈراؤں گی ضرور۔''

وہ رضا کی آنکھوں میں دیکھ کے بولی۔

''اور نمل ......اس کا کیا ہوگا؟'' اس کی آواز میں تمسخر تھا۔ وہ آگے بڑھتے ہوئے رکی۔

''مجھے موسیٰ کا نہیں، نانا کی پراپرٹی میں سے اپنی ماں کا حصہ چاہیے۔''

اس میں نمل بھی حصے دار ہوگی۔'' وہ فوری بولا۔

''آدھا حصہ اس کو دے دوں گی۔''

''واہ کیا فراخدلی تھی، جیسے ہاتھ بڑھا کے کسی درخت سے کوئی پھل توڑ لینا تھا۔ یہ نمل کا، یہ میرا، یہ لڑکی کس قدر خوش فہم ہے۔'' رضا کا دل قہقہہ لگانے کو چاہا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ کوئی مناسب موقع دیکھ کے اب ددیا کو اس کی حماقت سے آگاہ کرنا ضروری ہو چکا تھا۔

☆☆☆

وہ مناسب وقت اسے اگلے دن ہی میسر آ گیا۔

''کل تمہارے ساتھ وہ پینٹ کوٹ والا کون تھا اور اس کی موجودگی میں عیرش ڈرائنگ روم میں کیا کرنے گئی تھی؟'' فیس کو دیکھتے ہی ددیا کو وہ بات یاد آ گئی تھی۔ اب صورت حال یوں تھی کہ ددیا کی نگاہیں بیٹے پر۔ بیٹے کی نگاہ عیرش ..... پر اور عیرش اس نے رضا کو دیکھا۔ وہ اسے نگاہ سے کیا اشارہ کرتی۔

''ددیا آپ مجھے ایک قصہ سنایا کرتی تھیں جس میں ایک فقیر کو ایک شہزادی سے محبت ہو جاتی ہے جبکہ وہ شہزادی جانتی ہی نہیں کہ اس کے باغ میں وہ فقیر اس کی ایک جھلک دیکھنے کو آتا ہے......اور پھر......'' وہ جیسے سانس لینے کو رکی۔ رضا نے اسے یوں دیکھا جیسے کوئی عقلمند سودائی کو دیکھتا ہوگا۔

''ہائیں!'' ددیا خود حیران ''اس قصے سے اس لمبے تڑنگے آدمی کا کیا تعلق''

''بس ہے نا۔ آپ سنیے تو۔'' لیکن عیرش کے بولنے سے قبل ہی رضا نے انہیں ساری رام کہانی کہہ سنائی۔ اب وہاں مکمل سکوت تھا۔ کافی دیر حیران ہونے کے بعد ددیا نے فیس کے ہاتھوں پہ اپنی موٹی تسبیح کھینچ کے ماری۔

''وہ تو بچی ہے مگر تیرے منہ میں ابھی کتنے دانت اگنے باقی ہیں۔ توبہ......توبہ اس لڑکی کی دیدہ دلیری تو دیکھو۔'' انہوں نے رضا کو گھورتی عیرش کے کندھے پہ بھی ایک دھموکا جڑا۔ ''تیرا خیال ہے کہ ادھر تو نوٹس بھیجے گی ادھر وہ خوف خدا سے تھر تھر کانپنے لگیں گے۔ دنیا میں اندھیر مچا ہے۔'' ددیا نے تفکر آمیز سانس بھرا۔ ''غاصب، حق حقوق کی اس جنگ میں دنیا جیت کے آخرت ہار دیتے ہیں......اور انہیں اس بات کی پرواہ تک نہیں ہوتی، اس کام میں پڑنے سے پہلے تمہیں ہزار بار سوچنا چاہیے تھا جس کا نتیجہ صفر ہے عیرش!'' ددیا بالکل گم صم ہو گئی تھیں۔ جس کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ ہر طرح کا نتیجہ بھگت سکتی ہے۔

☆☆☆

''موسیٰ کو آپ نے بتایا ہے؟'' وہ تلملاتی ہوئی اس کے سامنے آئی، جو کہیں جانے کے لیے بالکل تیار تھا اس نے کوئی بھی جواب دیے بنا خاصے اہتمام سے خود پہ پرفیوم چھڑکا......جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں تھی۔ وہ اس کی بے نیازی پہ مٹھیاں بھینچ کے رہ گئی۔

''میں نے آپ سے کچھ پوچھا ہے؟'' مختصر وقفے کے بعد وہ دوبارہ گویا ہوئی تو وہ آہستگی سے پلٹ کے اس کے سامنے آیا۔

''تمہارا کیا خیال تھا کہ وہ کیس فائل میں ہی پڑا رہے گا، وکیل کو تم نے لاکھوں روپے کس کام کے دیے ہیں؟'' وہ سنجیدگی سے کہہ کر اس کے قریب سے گزرا۔

''موسیٰ سے کہہ دیجیے گا۔ میں کسی طور اب پیچھے نہیں ہٹوں گی۔'' ضد ہٹ دھرمی اور تباہی اس کے لہجے میں کچھ ایسا ہی تھا، وہ دو قدم پیچھے ہو کے اس کے روبرو ہوا۔

''تم غلط کر رہی ہو۔'' اس کا لہجہ شکن آلود تھا۔

''اور پلیز......ایسے مت کرو۔'' عیرش کے چہرے پہ دنیا مٹا دینے جیسا تاثر پا کے وہ ایک دم ہی ملتجی ہوا۔

''ہر کوئی اپنی جگہ چھوڑ دے گا۔''

رضا کے لہجے کی حدت پہ......وہ چونکی پھر کسی جادو کے زیر اثر ہی مسکرائی۔

''جگہ چھوڑ دینے سے یا کچھ بھی چھوڑ دینے سے کسی کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

رضا ششدر رہا۔ وہ کسی قدیم دکھ کے ساتھ جی رہی تھی۔

''فرق پڑتا ہے عیرش! صرف انہیں فرق پڑتا ہے'' وہ لفظ چبا کے بولا۔ ''جو آپ کو زندگی سمجھتے ہیں اور آپ ان پہ پاؤں رکھ کے آگے بڑھ جاتے ہیں ''جیسے کمل جیسے موسیٰ اور......''

رضا نے ان ہلکی سیاہ آنکھوں میں جھانکا......عیرش کا دل رفتار سے عاری ہوا......اور اس نے نگاہ پھیر کے سانس کی آمد و رفت بحال کی۔ پیتل کے تھال سے ریشمی رومال اڑ چکا تھا اور پیپل کے پتوں پہ تحریر داستان بہت قدیم تھی۔ ایک فقیر کو ایک شہزادی سے محبت ہو جاتی ہے اور وہ داستان ادھوری چھوڑ کے تیزی سے پلٹ آئی تھی۔ جالی کا بھاری دروازہ زور سے بج کے اب اس شخص کی طرح بالکل ساکن تھا۔

☆☆☆

کچھ لوگ خوف زدہ ہوتے ہیں تو منہ سے کوئی آواز تک نہیں نکالتے۔ ڈر کے مارے سہم جاتے ہیں۔ کچھ لوگ خوف زدہ ہو کے چیخنا شروع کر دیتے ہیں۔

عیرش کی خالہ اور ماموں کا شمار اس دوسری قسم میں کیا جاسکتا تھا، عیرش ایک کے بعد ایک کال ریسیو کرتی۔ کبھی مسکرا دیتی۔ کبھی خاموش ہو جاتی تو کبھی جتنا سنتی اس سے زیادہ سناتی۔

''عیرش! تمہیں کیا ہو گیا ہے ہم تو آج بھی تم دونوں سمیت خود کو پانچ بہنیں تصور کرتی ہیں۔ اس کی خالہ زاد) اونہہ پانچ بہنیں، وہ تلخ ہنکارا ابھرتی،

ممانی اور ماموں زاد بہنوں کے شیریں لہجے، عیرش ان آوازوں کو انجوائے کرتی۔ اگر کوئی خاموش تھا تو موسیٰ اور نمل...... اور یہ بات اس کو بے چین کرتی۔

وہ جھنجلا جاتی پھر نمل کو فون کرتی۔

''ہاں سناؤ عیری کیسی ہو، کوئی کام تھا؟'' نمل کا اجنبی، الجھا، وہ پریشان ہو جاتی۔

''کیا مصیبت ہے ددیا! میں نے کون سا کسی کی ریاست پر دھاوا بولا ہے، اپنا حق ہی تو مانگا ہے۔

''تمہیں پریوں والی مووی یاد ہے عیرش، جہاں ایک پری کو ایک خوبرو شہزادہ قید کر لیتا ہے۔'' خالہ کی بیٹیاں ماضی کی باتیں کرتیں۔

''اف ...... شہزادہ ...... قید اور نمل'' وہ بدحواس ہو جاتی۔ ''مجھے کچھ یاد نہیں۔ مجھے اس فقیر کا قصہ یاد ہے۔

اس شہزادی کو ایک نجومی نے بتایا تھا کہ چالیس دن کسی فقیر کو پانی پلانے سے تمہاری مراد برآئے گی۔ اب روز شہزادی سونے کی قیمتی صراحی میں پانی بھر کے فقیر کو پلاتی۔''

ددیا اس پر دم کر کے پھونکتیں۔ ''میری بچی پہ کسی نے جادو کر دیا ہے۔'' وہ قصہ ادھورا چھوڑ کے اٹھ جاتی۔

''عیرش سنو تو، اس کے بعد پھر آگے کیا ہوا؟'' ردا آوازیں دیتی رہ جاتی۔ وہ کچن میں آ کے راہداری سے گزرتے رضا کو دیکھتی۔ اور تائی اس چھٹانک بھر کی لڑکی کو گھورتیں۔

''غضب خدا کا۔ اتنا بڑا قدم اٹھالیا۔ اگر انہوں نے نمل کو بھیج دیا تو۔'' تائی کو اک نئی فکر گھیر لیتی۔

ان دنوں قیس کی حالت قابل رحم تھی۔ ماں اسے دیکھتے ہی چپ کا روزہ رکھ لیتیں۔ رضا سے بات کرتا تو جواب ہوں یا ہاں میں ملتا۔ بس ایک عیرش ہی تھی جو ہر کام میں پیش پیش، سب کو خوش رکھنے کی کوشش کرتی ہوئی خود اندر سے بہت ناخوش تھی۔

''میری سیدھی سادی بھانجی جو ڈھنگ سے پونی تک نہیں باندھ پاتی اسے میرے مقابل لانے والے آپ سب ہیں۔'' اس نے سر جھٹکا اور اس کی خالہ کی ہو بہو نقل اتاری۔ ہال کمرے کی کھڑکی کے ساتھ چپکی عیرش جالی سے ماتھا ٹکائے جیسے سوچ چکی تھی۔

''خالہ کی نظر میں بھانجی کی عمر پاکستان آنے کے بعد رک چکی ہے۔ انہیں کیا خبر، پونی تو کیا اب ان کی بھانجی صاحبہ گھوڑے اور ہاتھی بھی باندھ لیتی ہیں۔'' رضا کے غصے کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ جانے وہ چھروں کے کاٹنے سے یا رضا کی اس بات سے حواسوں میں لوٹی تھی۔

''صہیب کی بچیوں کو یوں رہنا چاہیے۔ ووں رہنا چاہیے، اپنی نرمی کا نتیجہ دیکھ لیا نا۔'' اب اس نے بیچاری ددیا پر چڑھائی کر دی تھی۔

''اتنی جرأت ہے تو آ کر مجھ سے بات کرے۔'' وہ تلملائی۔ ''تف ہے اس بندے پر ت کے ساتھ بھی ط کے ساتھ بھی۔'' اس نے دانت پیس کر اپنی چند بکھری لٹوں کو کانوں کے پیچھے اور دوبارہ جالی سے پیشانی لگائی۔

''مجھے اسی بات کا ڈر تھا کہ سارا الزام ہمارے سر آئے گا۔ لٹیرا اور لالچی ہمیں ہی سمجھا جائے گا۔'' وہ کس تن فن سے بول رہا تھا جیسے جلتے توے پر بیٹھا ہو۔ آج وہاں عیرش کی خالہ آئی تھیں اور تمام گھر والوں کو وہ کچھ سنا گئیں جو بیان سے باہر تھا۔

''آپ لوگوں پر تو پھر بھی ہاتھ ہولا تھا۔ رگڑا تو میرے شوہر کو گیا ہے۔'' ردا کے الفاظ نے عیرش کو تکلیف سے دوچار کیا کہ خالہ نے قیس کو کنگلا، بھک منگا اور جانے کیسے کیسے القابات سے نوازا تھا۔

''ددیا آپ اپنی چہیتی سے کہہ دیجیے گا کہ یہ تماشا

اس گھر میں دوبارہ نہیں لگنا چاہیے ورنہ۔'' رضا نے انگلی اٹھا کے دوٹوک الفاظ سے تنبیہ کی۔ عیرش نے جھٹکا کھایا۔

''ذرا جو بزرگوں سے بات کرنے کی تمیز ہو۔ ہمت ہے تو میرا سامنا کرے۔'' اس نے پیر پٹخ کے رضا کو گھورا۔

''عیرش کیا سمجھتی ہے کہ پائپ لگا کر جیسے وہ پیڑ پودوں سے گرد دھو دیتی ہے تو بے عزتی کا احساس بھی کسی پانی سے دھل جاتا ہوگا۔'' وہ اپنی جگہ سے اچانک کھڑا ہوا۔ وہ بدک کے پیچھے ہوئی۔

''بھئی میں نے تو صاف صاف کہہ دیا تھا کہ آپ کی بھانجی کے کرتوتوں کی ہمیں تب خبر ہوئی جب پانی پلوں کے نیچے سے گزر چکا تھا۔'' تائی بھی بیٹے کے ساتھ ہی اٹھی تھیں۔

''تو کیا کرو گے۔'' ددیا جو کب سے گونگے کا گڑ کھا کے بیٹھی تھیں۔ اب جیسے مرچیں چبا کے بولیں۔

''اسے گھر سے نکال دو گے۔''

وہ جم سا گیا۔ پھر کھڑکی پر سرسری تیرتی ہوئی سی نظر ڈالی۔ ''جو بھی ہوگا وہ بعد کی بات ہے۔''

اس نے قیس کو بغور دیکھا جس نے صاف نگاہ چرائی تھی۔

وہ عیرش کا ساتھ کسی صورت نہیں چھوڑ سکتا تھا۔

اگلے چند دن رضا کے لیے پریشان کن تھے کہ عیرش نے کیس واپس لینے سے انکار کر دیا تھا۔ اس نے سنا کہ قیس بھی آج کل کرائے کا گھر ڈھونڈ رہا ہے۔

☆☆☆

اس نے کئی منٹ انتظار کیا مگر وہ کچن میں نہیں آیا تھا۔ اس بندے کی ناراضگی اسے ڈسٹرب کر رہی تھی ورنہ تو سب ٹھیک تھا۔ آج اس کی بات مکمل سے ہوئی تھی۔ موسیٰ کا رویہ اس کے ساتھ ٹھیک تھا۔

''دیکھا آپ کے خدشات بے کار کے تھے۔'' اس نے ددیا کو خوش ہو کے بتایا تھا جنہوں نے خاموش آنکھوں کے ساتھ عیرش کی سب ٹھیک ہے جیسی خوش فہمی کو برقرار رہنے دیا تھا ورنہ ددیا کو رضا کی زبانی علم ہو چکا تھا کہ موسیٰ پر ماں کا دباؤ بڑھتا جا رہا ہے۔ موسیٰ رضا سے رابطے میں رہتا تھا۔

وہ چائے لے کر آئی تو رضا کے سوا وہاں سب ہی موجود تھے۔ قیس گھر کا ایڈوانس دے چکا تھا۔

''بھئی ردا کی خواہش تو بنا کسی فقیر کو پانی پلائے پوری ہو گئی۔'' ردا کسی دھیان سے نکلی۔ اس نے خواب یاد دلایا۔

''عیرش پھر آگے کیا ہوا تھا۔'' ردا ابھی تک تجسس میں تھی۔

''پھر جب چالیس دن ختم ہوئے تو اکتالیسویں دن اس باغ میں سے گھوڑے پر سوار شہزادے کا گزر ہوا۔ جو شہزادی کے خواب میں آتا تھا۔

''میں ابھی آئی۔'' وہ سونے کی صراحی اس فقیر کے پاس چھوڑ کے خود شہزادے کے ساتھ چلی جاتی ہے۔ اور وہ فقیر خالی صراحی ہاتھ میں لیے شہزادی کے انتظار میں بیٹھے بیٹھے زندگی تمام کر دیتا ہے۔''

رامس اور ردا کے چہروں پر پھیلی اداسی دیکھ کر وہ مسکرائی۔

''ہر قصے کا اینڈ پپی کہاں ہوتا ہے۔'' اس نے بے نیازی سے کندھے اچکائے۔

''اگر شہزادی کے علم میں ہوتا کہ وہ فقیر اسے چاہتا ہے تو وہ پھر کیا کرتی۔'' رامس نے عجیب سوال داغا تھا۔

اس نے تب بھی انتظار ہی کرنا تھا۔'' جواب ردا نے دے کر عیرش کو مشکل سے نکال لیا تھا۔ جو نہیں جانتی تھی کہ وہ جس کا انتظار کچن میں کرتی رہی تھی وہ تھکا ہوا شخص آج برسوں بعد ہال کمرے کے کونے میں پڑے صوفے پر آ کے چپکے سے لیٹ گیا تھا اور اب قدیم قصوں کے کرداروں میں خود کو ڈھالتی اس لڑکی کو بے دھیانی میں ہی سوچے جا رہا تھا جو بے حد نادان تھی۔

☆☆☆

علی الصباح ہال کمرے میں سے باتوں کی آوازیں آرہی تھیں۔اور یہ خلاف معمول تھا کہ دادیا اس وقت تلاوت کیا کرتی تھیں۔اس نے تجسس کے مارے وہاں جھانکا اور منجمد ہوئی۔اس کے سامنے نمل تھی۔جس نے آہٹ پر مڑ کر دیکھا تھا۔وہ عیرش کو وہیں جماد کھ کے پھیکا سا مسکرائی۔

موسیٰ نمل کو کیسے چھوڑ سکتا ہے؟ کوئی بے یقینی سی بے یقینی تھی۔وہ نمل سے محبت کرتا تھا۔اب بھی اسے چاہتا ہوگا وہ اس کے بچے کی ماں بننے والی ہے۔اس کے اندر ایک ساتھ کئی اعتبار ٹوٹے۔

نمل نے ہی آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگایا۔ عیرش نے اسے بغور دیکھا۔جس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔

''آپ کو بڑی بی بی بلا رہی ہیں۔'' بخت وہاں اچانک نازل ہوئی' اس کا ارادہ فی الحال کچن میں جانے کا نہیں تھا لیکن وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے ساتھ ہولی۔ وہاں تائی نے چولہے پر سالن چڑھا رکھے تھے۔

''خیر تو ہے۔'' اس نے آتے کے ساتھ پوچھا۔

''خیر کہاں ہے۔منشی بابا رات سے کارڈیالوجی سینٹر میں ہیں۔ وہاں ان کے بھائی بہنوئی بھی ہوں گے تو رضا نے صبح فون کیا تھا کہ دوپہر سے قبل کھانا بھجوا دیجیے گا۔'' تائی کے انداز میں ایک واضح بیزاری تھی لہجہ بھی کلفت زدہ تھا۔

''آٹا بخت گوندھے گی پلاؤ تم بنادو۔''

وہ پریشان سے زیادہ حیران ہوئی۔کیا تائی نہیں جانتیں کہ میری بہن کو گھر سے نکال دیا گیا ہے اس وقت میرے دل پر کیا بیت رہی ہے۔انہیں احساس ہونا چاہیے لیکن انہیں پلاؤ کی پڑی ہوئی ہے۔وہ کاموں سے بالکل بھی نہیں گھبراتی تھی ،لیکن آج تائی کا رویہ اس کی سمجھ سے باہر تھا۔قصور ان کا بھی نہیں تھا۔

''تمہاری ہمت ہے واصفہ! خواہ مخواہ کا ٹبر پال کے بیٹھی ہو۔''

تائی کے تحمل اور برداشت کو لوگوں کی ایسی ہی باتوں نے کمزور کر دیا تھا وہ انہیں کوئی بھی جواب دیے بنا خاموشی سے واپس ہولی تھی۔

☆☆☆

''میرا گھر تمہاری وجہ سے خراب ہوا ہے عیری! میں تمہیں کبھی معاف نہیں کر سکتی۔'' اس وقت ہال کمرے میں موجود تمام گھر والے نمل سے کچھ ایسے ہی جملوں کی توقع کر رہے تھے لیکن جو کچھ اس نے کہا۔وہ ناقابل یقین تھا۔

''تم حق بجانب ہو عیری، اور اب میں تمہارے ساتھ ہوں۔''

نمل کی اس بات نے سب کو حواس باختہ سا کر دیا تھا کہ بات عیرش کو شہ دلانے جیسی تھی۔اس وقت وہاں رضا اور چھوٹی دادیا کے ہوش اڑ چکے تھے۔

''لیکن یہ بھی سچ ہے کہ تم یہ کیس ہار جاؤ گی۔'' نمل کی اس بات پر عیری کا دل انتہائی مدہم رفتار سے دھڑکا۔اس نے بہن کو بے یقینی سے دیکھا۔

''مگر کیوں؟''

''ان کے پاس بے تحاشا پیسہ ہے وہ وکیل، جج، ہر چیز خرید لیں گے پھر یہ کیس بمعہ نقلی اور جھوٹے ثبوتوں کے کچھ اس طرح تیار ہوگا جس سے ثابت ہوگا کہ ہم دونوں اپنا حصہ وصول کر چکی ہیں۔''

نمل کی آواز مایوس کن تھی جن نے عیرش کو بے بسی کی اتھاہ میں گرایا۔

''پاپا کے دوست انکل ضمیر نے ہی مجھے یہ حقیقت بتائی ہے اور وہ اب ہم سے ملنے پاکستان بھی آئیں گے۔'' اس نے ساکت بیٹھی بہن کے سرد ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا جیسے دلاسا دیا ہو۔

''جب موسیٰ اس سارے معاملے سے باہر اور خاموش تھا تو تمہیں گھر چھوڑ کر کے نہیں آنا چاہیے تھا۔''

رضا نے چند بے سکون سے سانس لیتے ہوئے گفتگو میں مداخلت کی کہ عیرش کی پریشان حالی سے وہ ڈسٹرب ہو رہا تھا۔

کچھ دیر پہلے اس کی موسیٰ سے بات ہوئی تو اس نے بتایا تھا کہ نمل اپنی مرضی سے گئی ہے۔نمل کا لہجہ

ایک بیاں خواں کا سا تھا خشک۔

''لیکن موسیٰ تو کہہ رہا ہے کہ۔''

''جو وہ فرما رہا ہے وہ سچ ہے۔ اور میری بہن جھوٹی۔'' وہ رضا کی بات کاٹ کے ایک دم چیخی تھی۔ کہ وہاں ہر کوئی ساکن رہ گیا۔ وہ اس کیس پر لاکھوں لگا چکی تھی جس کیس کا وجود اب مٹنے والا تھا۔ اس پر موسیٰ کی خاموش ناراضی، نمل کی واپسی۔

دوپہر کو تائی نے بھی اسے بہت کچھ سنایا تھا کہ وہ کھانا لیے بنا ہی کچن سے آ گئی تھی۔ بھوک' غصہ بے بسی، بے چارگی ان تمام کیفیات میں گھری اس لڑکی کا ضبط دھجیوں میں اڑا۔

''موسیٰ کی طرف داری تو ہو گی کہ اس کے پاس سب کچھ ہے۔ اور ہم دونوں، ہمارا کیا ہے۔'' وہ جانے کس سے مخاطب تھی۔'' ہمارے ساتھ کوئی کیوں کھڑا ہو گا۔'' اس نے گرم چائے کو ہاتھ مار کے گرایا کیا وہ اپنے حواسوں میں تھی؟ قیس نے اسے تھامنا چاہا تھا مگر ددیا نے اشارے سے منع کر دیا۔

وہ اسے چیخنے دینا چاہتی تھیں۔ رونے دینا چاہتی تھیں۔ وہ عیرش میں خود کو دیکھ رہی تھیں۔ ضبط کو بھی ٹوٹنا چاہیے۔ خاموشی آنکھ کے پانی کی مانند ہوتی ہے، بہہ جائے تو وجود ہلکا ہو جاتا ہے'' وہ میرا بھائی ہونے کا دعوے دار تھا۔ وہ نمل سے محبت کا دعوے دار تھا۔ مگر یہ سچ نہیں ہے'' وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے چلائی۔

''یہ سب جھوٹ ہے محبت اب کہاں ہے۔''

اس نے راہ میں پڑی تپائی کو ٹھوکر ماری۔

''عیرش میری بچی۔'' تائی لپک کے آئیں۔ جو بھی تھا وہ ان کے ہاتھوں پلی بڑھی تھی۔

''محبت فقیر کے انتظار کے ساتھ ہی مرجاتی ہے۔'' اس نے تائی کے ہاتھ جھٹکے رضا کے منجمد وجود پر نگاہ ڈالی۔

☆☆☆

''جو ہونا تھا ہو چکا اب مجھے کسی انجام کی پرواہ نہیں۔''

اس نے یہ کہتے ہوئے لاپروائی سے کندھے اچکائے اور سوئی میں دھاگا ڈالا۔ اس وقت وہ ددیا کے کرتے کی ترپائی کر رہی تھی۔ یعنی نمل گھر چھوڑ کے آ گئی بات ختم، اس کی بات کے معنی بھانپ کے، ددیا کا دل اپنا ماتھا پیٹنے کو چاہا تھا۔ نمل کون سا اکیلی جان تھی بھلے وہ اکیلی بھی ہوتی۔ تو رشتوں میں بگاڑ آنے پر معاملہ صرف گھر چھوڑنے پر ہی نہیں رک جاتا۔ ایسے میں عورت کانچ کا پل ناپتی رہتی ہے۔ انہوں نے ایک تلخ آہ بھری۔ اور عیرش کو ناقدانہ نگاہوں سے گھورا۔

''افوہ ددیا! مجھے گھورنا آسان کام نہیں۔'' وہ جز بز ہوتے ہوئے بھنا کے بولی تھی۔

''بالکل بجا فرمایا، تمہیں گھورنا اور دیوار کو گھورنا ایک ہی بات ہے۔'' قیس نے اس کی بات کو قہقہہ لگاتے ہوئے انجوائے کیا۔

''ایسی جی دار لڑکی کو اب دیوار وور ہی گھورتے ہیں۔ قیس چائے دیکھ کے ویسے ہی باغ و بہار ہو جاتا تھا۔ آج کل بیوی کے ہاتھ کی بنی چائے پی کر خوب ترنگ میں جاتا تھا۔ وہ قیس کی بات پر گزشتہ روز کا تصور کر کے قدرے جھینپ کے ذرا سا شرمندہ ہوئی۔

ان سب کا خیال تھا اپنی اس کارروائی کی بدولت عیرش اب دو چار دن تو کمرہ نشین ہی رہے گی۔ لیکن سب کے خیالات کی نفی کرتے ہوئے اس نے اپنی صبح کا آغاز معمول سے ہی کیا تھا۔ موسیٰ کی وجہ سے اس کے دل پر یوں کاری ضرب پڑی تھی کہ محبت سے اعتبار ہی اٹھ گیا تھا۔ کل اس کے دماغ نے کام کرنا چھوڑا تھا یا پھر کام کر دکھایا تھا، اسے اب قطعاً پرواہ نہیں تھی۔

اس تمام قصے میں غلط چیز رضا کے اوپر چائے کا گرنا تھا۔ جس پر وہ رات کو نیند غالب آنے تک کچھ بے چین سی رہی تھی۔ صبح کچن میں وہ نہایت محتاط سی ہو کر گئی تھی لیکن تائی کا خوش گوار موڈ دیکھ کے رات والی بے چینی بھی رفو چکر ہوئی۔

''آج میری ضمیر انکل سے کافی دیر بات ہوتی

رہی ہے۔ وہ فہد کے ساتھ جلد ہی پاکستان آئیں گے ان کے تعلقات بہت اوپر تک ہیں۔ وہ اس مسئلے کا حل نکال لیں گے۔'' قیس کے بیٹھتے ہی وہ اپنی کرسی قریب گھسیٹ لائی۔ اور یہ سب بتاتے ہوئے خاصی پرجوش تھی۔

اس کی گفتگو سن کے ددیا کو ٹھنڈے پسینے آنے لگے تھے۔

''ان شاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔'' قیس نے اس کی تمام باتوں پر بھرپور ردعمل دیا۔

''تم جو بھی فیصلہ کروگی، مجھے ہمیشہ اپنے ساتھ پاؤ گی۔''

ددیا نے اپنے ناسمجھ بیٹے کو حیرت کا جھٹکا کھا کے دیکھا۔ اور ناگواری سے وہاں سے اٹھ گئیں۔

وہ کسی چیز سے الجھ کے لڑکھڑائیں تو بیٹے نے فوری بڑھ کے سنبھالا۔

''شدید چکر آرہے ہیں اگر فرصت میں ہو تو کمرے تک چھوڑ آؤ۔'' تو تمہاری خبر تو لیتی ہوں دل غصے سے بھرا تھا۔

''اب ایسی بھی بات نہیں۔'' لفظ فرصت پر وہ خجل سا ہوا۔

ایک تو گھر کے سلسلے میں ردا اور وہ آج کل چھوٹی موٹی شاپنگ کررہے تھے پھر اس کیس کی الجھنوں میں گھر کے اب وہ ماں کے پاس کم ہی ٹکتا تھا۔

☆☆☆

''میں تو انہیں دیکھ کے حیران ہی رہ گئی۔ ضمیر انکل بالکل پہلے کی طرح ہی اسمارٹ اور ڈیشنگ لگ رہے تھے۔'' کمرے میں آتے ہی وہ اپنا پسندیدہ موضوع چھیڑ چکی تھی۔

ددیا نے اس پر کڑوی نگاہ ڈالی اور اپنے سامنے کھلے جہازی سائز اٹیچی کیس پر دوبارہ جھک گئیں۔ وہ اگرچہ تھکی ہوئی تھی لیکن انکل نامہ سنانے کے لیے اسے دیواروں کی نہیں انسانوں کی ضرورت تھی۔

''ددیا آپ نے ان کی گاڑی دیکھی۔'' اس کے لہجے کا اشتیاق محسوس کرکے ددیا کا دل ٹھٹکا۔

''کل ہم نے جو تولیے خریدے تھے۔ ذرا الماری سے نکال دو۔''

عیرش دوپہر سے محسوس کررہی تھی کہ ضمیر انکل اور ان کے بیٹے کا گھر میں آنا کسی نے بھی اچھا محسوس نہیں کیا تھا خصوصاً ددیا کا رویہ سمجھ سے باہر تھا۔ وہ الماری سے تولیے نکال کر لائی تو پلنگ کی پائنتی پر ہی ٹک گئی۔ دوسرے پلنگ پر سوئی نمل ہلکے خراٹے لے رہی تھی۔ عیرش بدمزہ ہوئی کہ وہ تو اس سے گپیں لگانے آئی تھی۔

''نمل کا سامان اٹیچی سے نکال کر ٹرنک میں کیوں رکھ رہی ہیں؟'' وہ ددیا کے جانب متوجہ ہوئی تو چونکی۔ پھر لکڑی کی ٹیبل پر پڑے نئے نکور ٹرنک کو گھورا۔

''سارا سامان تھوڑی رکھ رہی ہوں کچھ قیمتی اشیاء ہیں جو الگ سے رکھنا ضروری ہیں۔''

ددیا نے اسے کن اکھیوں سے دیکھا جو ایک دم پریشان ہوچکی تھی۔ یعنی کہ لوہا گرم ہوچکا تھا۔

''آج جب ٹرنک خرید کر لائی تو بجیا کی یاد آگئی۔ کبھی میرا ٹرنک بھی بالکل نیا نکور ہوتا تھا۔ اب میری طرح بوڑھا ہوچکا ہے۔'' انہوں نے اک طویل آہ بھری پھر ٹرنک کے پیندے پر اک تولیہ پھیلایا۔ اٹیچی سے دو گرم شالیں اٹھا کر ٹرنک میں رکھیں۔

''دادی عمر میں آپ سے بہت بڑی تھیں کیا؟'' عیرش کا لہجہ گم صم سا تھا۔

سالوں کا تو پتا نہیں، ہم اور ہمارے ماں باپ کہاں حساب کتاب رکھتے تھے۔ لیکن ہماری اماں کی وفات کے بعد جب ابا نے دوسری شادی کی تو بجیا کوئی پندرہ کے لگ بھگ ہوں گی میں ان سے کافی چھوٹی تھی۔

اپنے بیاہ کے بعد ابا نے بجیا کو بھی جلد ہی بیاہ دیا تھا۔ ہماری سوتیلی ماں کے تیور دیکھتے ہوئے شادی کے چند ماہ بعد بجیا مجھے اپنے ساتھ لے کر آگئی

تھیں۔''

''کچھ ان سلے ریشمی کپڑے جو نمل سلوانے کے لیے لائی ہوگی۔ انہیں ٹرنک میں رکھنے کی کیا ضرورت ہے؟'' عیرش نے ددیا کے ہاتھ سے ان شوخ رنگ کے کپڑوں کو چھین لینا چاہا تھا۔ ددیا کا ٹرنک اور ان سلے کپڑے دیکھ کر اس کی رنگت متغیر ہوئی۔

''بجیا کے سسرال میں پیسے کی فراوانی تھی۔ گھر میں نوکر چاکر سب کچھ تھا پھر خیر سے خدا نے آگے پیچھے دو بیٹوں سے نواز دیا تو گھر کی رونق کا الگ ہی سماں تھا۔ میں اپنے بھانجوں کی سنگت میں کھیل کود کے بڑی ہوئی۔ بہنوئی صاحب نے مجھے ہمیشہ بیٹی ہی سمجھا۔ جب میں میٹرک کرچکی تو انہوں نے اپنی طرف سے میرے لیے ایک بہترین گھر کا انتخاب کیا۔ میرا شوہر جانے کس لحاظ سے اچھا تھا۔ شاید بھی میں جان ہی لیتی کہ ایک دن دل کا دورہ پڑنے سے بہنوئی صاحب ملک عدم سدھار گئے۔ ان کے بعد میرے سسرال والوں کو سوائے بجیا کا دکھ بانٹنے کے اور کوئی کام ہی نہیں تھا۔

حبیب اور صہیب کی تعلیم مکمل ہونے والی تھی۔ انہیں اپنی پڑھائی سے فرصت ملتی تو ہی گھر کے مسائل پر توجہ دیتے۔ انہیں ماں کی خواہش پر بڑا افسر بننا تھا۔ اس صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میرے شوہر نے غیر محسوس انداز میں گھر کی کافی ذمہ داریاں اپنے سر لے لی تھیں تو زمینوں وغیرہ کے معاملات میں بجیا بھی جیسے بے فکر ہوچکی تھیں دیکھو ذرا، اس لڑکی کو دیکھو، زیور کپڑوں میں گھسایا ہوا ہے۔''

ددیا نے یہ کہتے کے ساتھ ہی سوئی ہوئی نمل پر ایک میٹھی سی نگاہ ڈالی۔

''اچھا کیا آپ نے یاد دلا دیا۔ نمل کئی دنوں سے مجھے زیور کسی بینک لاکر میں رکھوانے کا کہہ رہی تھی۔''

عیرش نے اپنی بات سرعت سے مکمل کی کہ دھیان تو ددیا کے ماضی میں بھٹک رہا تھا۔ ددیا نے اسے بغور دیکھا اور ایک گمبھیر سی آہ بھری۔ جیسے اسے کچھ جتانا مقصود ہو۔

''پھر آئے دن کہے گی یہ نکلوالاؤ، وہ نکلوالاؤ۔''

وہ زیورات کے ڈبے ٹرنک کے کونے میں سیٹ کرنے لگیں۔ ''یہ عورت کے کڑے دنوں کا ساتھی ہوتا ہے۔''

اس پہاڑ جیسی بات نے عیرش کا دل مسلا۔

''وہ آئے دن زیور کیوں نکلوائے گی ہمارے اکاؤنٹ میں اچھی خاصی رقم موجود ہے پھر ماہانہ پچاس ہزار بھی تو۔''

''وہ اب کس حساب سے ملیں گے؟'' ددیا نے اس کی بات تیزی سے کاٹی۔ ''تمام شواہد اور ثبوت یہ ہی کہتے ہیں کہ تم دونوں اپنا حصہ وصول کرچکی ہو۔''

ددیا کی تلخ سی مسکراہٹ نے اسے حیرت کے کسی جہاں میں دھکیلا تھا۔ جہاں حقیقتیں منہ پھاڑ کے ہنس رہی تھیں۔

''ہاں تو میں بتا رہی تھی کہ اسلام کو (ددیا کا شوہر) جانے کس چیز کی جلدی تھی۔ وہ زمینوں کے حساب کتاب میں ڈنڈی مارنے لگا۔ ٹھیکے داروں سے وصول کی جانے والی رقم کا چوتھا حصہ بجیا کو ملتا۔ ''یہ بھی بڑی مشکل سے نکلوالایا ہوں۔'' تکرار کرو تو آگے سے رونا روتے ہیں فصلیں اچھی نہیں ہورہیں مکمل وصولی اگلے سال ہی ہوگی اور پر تفکر سی بجیا اس کی سنائی کہانی پر بس سر ہلا دیتیں۔

ہوشیار شخص کاغذات پر بجیا کے سائن لے کر کچھ زمین بھی فروخت کرچکا تھا قبل اس کے کہ یہ سلسلہ چلتا رہتا۔ بجیا کے چند خیر خواہوں نے انہیں اسلام کی دھوکا ہی سے باخبر کردیا۔ بس اسی دن سے اسلام اور بجیا میں ٹھن گئی۔ بجیا نے سیدھی اور ٹیڑھی انگلیوں سے بھی گھی نکالنا چاہا۔ ٹھیکے داری کی رقم نہ سہی لیکن ہماری فروخت شدہ زمین ہمیں واپس چاہیے۔ اب وہ ادائیگی کرتا تو زمین واپس ملتی۔ لیکن وہ بدنیت انسان ایسا کیوں کرتا۔ نتیجتاً بجیا نے اسلام پر کیس کردیا تھا۔''

وہاں یک لخت خاموشی چھا گئی۔

''یہ تمہاری دادی نے تمہاری ماں کو بری میں دیا تھا۔''

ددیا نے یاقوت سے جڑا سیٹ اس کے سامنے رکھا۔

عیرش نے اسے عجب کیفیت میں چھوا۔
''یہ ہماری اماں کا تھا۔'' وہ ہلکی سرگوشی میں بولیں، عیرش کی گرفت مضبوط ہوئی۔ ''یہ ہمارا خاندانی سیٹ ہے۔ اسے تم نمل سے خرید لینا عیرش!'' وہ ایک ضرب نما سرگوشی تھی۔ عیرش کا وجود نیلو نیل ہوا۔
لیکن نمل اسے کیوں بیچے گی۔ کئی لمحوں بعد وہ جرح کے انداز میں گویا ہوئی۔
دریا نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ پھیکا سا مسکرائیں ''بہت سال پہلے جب میری شادی کی تاریخ رکھی گئی تو بابا نے میری ماں کا تمام زیور میرے سپرد کردیا تھا شاید اپنی غفلت کا ازالہ کیا تھا۔ کئی سال پہلے یہ میرا تھا۔''
وہ آواز کسی گہرے کنویں سے ابھری تھی۔
''پھر...... پھر میں...... نے...... ای...... اسے بجیا کو بیچ دیا۔'' اب لب و لہجے نے عیرش کے وجود میں برف بو دی تھی۔
''ارے دیکھو تو ذرا۔ یہ موئی کی شرٹ ہے۔ کہیں نمل کے کپڑوں میں ہی تہ شدہ رہ گئی۔''
عیرش کو ان کے ٹرنک میں تہ شدہ کرتا یاد آیا۔ وہ وہاں سے اب بھاگ جانا چاہتی تھی۔ نمل کے ٹرنک میں موئی کی تہ شدہ شرٹ کہانی کا اگلا باب کھول رہی تھی۔
''جو ہونا تھا ہو چکا مٹی ڈالو۔ تمہاری بہن کا گھر ٹوٹ جائے گا۔ بجیا کو اپنوں پرایوں نے سمجھایا اس بچے کا سوچو جو ابھی اس دنیا میں آنے والا ہے۔''
''اللہ نے بہت نواز رکھا ہے بہن اور اس کا بچہ پال سکتی ہوں'' بجیا کندھے اکڑا کے جواب دیتیں۔'' وہ رکیں۔ اب ان کے ہاتھ میں نمل کے کنگن تھے۔
''نمل کو انہیں پہنے رکھنا چاہیے تھا۔ اس کی کلائیوں میں بہت جچتے ہیں''۔ پھر بات کا سلسلہ جوڑا۔ ''وہ بے ایمان تھا۔ دھوکے باز تھا لیکن میرے بچے کا باپ تھا۔ میری زندگی میں آنے والا پہلا مرد تھا۔ میں اسے چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ میں اپنے ہاتھوں میں کنگن پہنے رکھنا چاہتی تھی لیکن جدائی کے واہموں میں وہ مجھے بوجھ لگتے تھے۔ بجیا انہیں کبھی باتھ روم سے اٹھاتیں تو کبھی تکیے کے نیچے سے، پھر ٹرنک میں رکھا یہ ضروری تھا عیرش'' دریا نے ٹرنک کا کنڈا اٹھایا۔
عیرش کے وجود پر چھت گری تھی۔ ٹرنک کے بند ہوتے ہی اک داستان نے ختم ہو جانا تھا۔ عیرش نے حرکت کی اور ان کا ہاتھ کنڈے سے ہٹایا' پھر کیا ہوا؟'' وہ جیسے نیند میں گویا ہوئی۔ دریا نے اپنے ہاتھ کو دیکھا۔ پھر اسے دیکھا۔
''بجیا کو پیچھے ہٹنا کسی صورت گوارہ نہیں تھا۔ حالانکہ وہ شخص اب معافی مانگ رہا تھا۔ اپنے کرتوتوں کو شیطان کا بہکاوا کہہ رہا تھا تو بجیا کو بھی کیس ختم کردینا چاہیے تھا۔ اسلام کے گھر والوں نے بھی مفاہمت کی کافی کوشش کی۔ لیکن ادھر سے بجیا کا غصہ ختم نہ ہوا۔ اسلام نے ان کا اعتبار جو توڑا تھا۔ پھر یہ رشتہ کیوں کر قائم رہتا۔''
دریا کا بے رنگ لہجہ، وہ ان کا آنسوؤں سے بھیگا چہرہ دیکھتی رہ گئی۔ دریا نے عیرش کا ہاتھ پرے کرتے ہوئے ٹرنک بند کردیا۔ اب وہ اسے تالا لگا رہی تھیں۔
''تمہاری وہ قصے سننے کی عادت ابھی تک بھی نہیں گئی'' نمل نیند میں بڑبڑائی۔'' چاہے تمام رات سنتی رہو مگر یہ لائٹ بند کردو یار!''
عیرش نے تالے کو برستی آنکھوں کے ساتھ دیکھا۔
''وقت بدل جاتا ہے، پیارے بچھڑ جاتے ہیں تو ان کے دعوے بھی ان کے ساتھ مٹی میں مل جاتے ہیں۔ اس کے بعد ٹرنک کا تالا کھلتا اور بند ہوتا رہتا ہے کہ انسانی ضرورتیں جانے والوں کے ساتھ کہاں ختم ہوتی ہیں۔ جیتی جانوں کو پھر اپنا بوجھ خود اٹھانا پڑتا ہے۔ بہت کچھ سہنا پڑتا ہے۔''
☆☆☆
وہ اندر آیا تو چہرے پر برہمی تھی۔ وہ زیر لب مسکرائی اور اہتمام سے نگاہ اٹھا کے اس نے بل کو دیکھا۔

پھر نگاہ بے نیازی سے جھکا بھی لی۔ وہ میز پر پالک پھیلائے اس کے پتے چن رہی تھی۔

وہ کرسی گھسیٹ کے اس کے قریب لے آیا۔ رضا کا یہ عمل غیر متوقع تھا۔ اس کے لباس سے اٹھتی خوشبو پر وہ چونک کے سیدھی ہوئی۔ اپنی کرسی پیچھے کھسکانا چاہی۔ آگے ٹیبل پیچھے دیوار، وہ سلگ کے رہ گئی۔ وہ اسے دیکھ رہا تھا یا گھور رہا تھا وہ اندازہ لگائے بنا پتوں کو چنتی جا رہی تھی۔

''مجھے گھورنا اتنا آسان نہیں۔'' کتنی دیر بعد اس نے چھری میز پر پٹخ کے کہا۔ وہ شخص ہمیشہ کی طرح چہرے کے تاثرات کے برعکس نگاہ کے الگ تاثر کے ساتھ اسے تک رہا تھا۔

''بہت خوب...... اب تمہیں گھورنے کی جرأت کون کر سکتا ہے۔ ایک کپ اور دو چار گلاس توڑ کے تم سمجھتی ہو کہ اب تمہیں ڈاکو رانی یا پھولن دیوی تسلیم کر لیا جائے۔ تو یہ تمہاری خام خیالی ہے۔'' اس نے اپنی مخصوص ڈھیٹ مسکراہٹ کے ساتھ اسے غصہ دلایا۔ اور کامیاب بھی ہوا۔

عیرش نے ایک ذرا ابرو چڑھا کے اسے دیکھا۔ ''پہلی بات کہ میں نے کیس ختم کر دیا تھا دوسری بات یہ کہ میرے پیچھے ہٹتے ہی آپ کے موئی صاحب کی یادداشت واپس لوٹ آئی۔ اس نے اپنی بچھڑی بیوی کے لیے ایک لمبا سفر طے کیا۔ اب ایک ہفتے سے بیوی کو جھوٹی محبت کا یقین دلا کر بدھو بنا رہا ہوگا۔'' وہ موئی سے اس قدر متنفر ہو چکی تھی کہ ملنا تو کجا وہ اس کے سامنے بھی نہیں آئی تھی۔

''اب آپ سب کو مجھ سے کیا مسئلہ ہے۔ وہ جان چھڑانے والے انداز میں بولی۔

''مسئلہ ہے عیرش!'' وہ خفگی کے ساتھ گویا ہوا۔ ''تم اپنے انکل ضمیر صاحب اور ان کے بیٹے کے ساتھ بھلے لنچ کرو یا ڈنر مجھے کچھ اعتراض نہیں۔ مگر ان کو اتنی شہ دینے کی کیا ضرورت تھی کہ نوبت رشتہ داریاں گانٹھنے تک آ گئی۔''

اس نے جلتے سلگتے رضا کو دیکھا تو دل پر پھوار سی پڑی۔

''شہ دینے کی کوئی بات ہی نہیں۔ پاپا کی زندگی میں ہمارا ان سے فیملی تعلق تھا۔ ہم سب نے دبئی میں اچھا وقت گزارا تھا۔'' اس نے گردن سیدھی کی اور اترا کے جتایا کہ اب کہو۔

رضا اسے گھورتا رہا۔ ''اگر وہ اچھا وقت انہیں پندرہ سال بعد یاد آ ہی گیا ہے تو اب واپس جا کے انہیں ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے یہاں رشتے داری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' سنجیدگی پر غصہ غالب تھا کہ رضا نے بات دائیں بائیں دیکھ کے کی تھی۔

''یہ کس نے کہا ہے کہ سوال پیدا نہیں ہوتا۔'' وہ مسکراتے ہوئے اس کی کشادہ آنکھوں میں جھانک کے گویا ہوئی۔

''یہ میں کہہ رہا ہوں۔'' وہ لفظ چباتا، سلگ کے گویا ہوا۔

''یہ میری زندگی ہے۔ فیصلہ بھی میرا ہوگا رضا حبیب!'' وہ ان ایک دم تن فن سے کھڑی ہوئی۔

''یہاں کوئی لوٹ مار نہیں مچی کہ عیرش صہیب کسی کا بھی ہاتھ تھام کے کہیں بھی چل پڑیں۔ اس گھر کی راہداریوں کے سوا، اسے ہر راستہ بند ملے گا۔'' وہ لہجہ حدت آمیز تھا۔

اللہ کیا دھونس تھی۔'' عیرش کا دل قہقہہ لگانے کو چاہا۔ اس نے رضا کو ٹھہرے ہوئے مضبوط قدموں کے ساتھ جاتے دیکھا۔ گویا فیصلہ ہو چکا اس کی چال میں جیت تھی۔

''یہ تمہاری بھول ہے کہ اب محبت راہداریوں کی دھول میں دھول بن چکی ہے۔ رضا حبیب! پیپل کے وہ پتے جن پر لفظ محبت لکھا تھا۔ نمل کی واپسی کے بعد ہی جھڑ گئے تھے۔ عیرش صہیب کے لیے اب ہر راستہ کھلا سمجھو۔''

ان جملوں نے دہلیز پر کھڑے اس شخص کو اک بے پایاں ہجوم کی طرح گھیرا۔ وہ کس قدر سیدھی اور اٹل کھڑی ہو گی وہ پلٹ کے دیکھے بنا بھی دیکھ سکتا تھا۔

یہ کیسا اظہار کیا تھا اس شخص نے ہر موسم میں گھر کی

راہداریاں ناچتی اس لڑکی کو اس وقت روکنا چاہا تھا۔ جب وہ ان راستوں پر کھڑی کسی اور کی راہ دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

''کیا یہ سب عیرش نے کہا؟'' ددیا نے پوری آنکھیں کھول کے اسے دیکھا۔ رامس اور قیس کا بھی حال ددیا سے مختلف نہیں تھا۔

''کیا ہے یار؟'' وہ ذرا جھینپ کے بولی اور باری باری سب کو دیکھا۔ تائی جو آج کل اپنی چھوٹی ساس سے کروشیہ سیکھ رہی تھیں۔ اب دھاگا گود میں رکھے عیرش کو تکے جا رہی تھیں۔ وہاں ہر ایک الگ تاثر کے ساتھ بس حیران تھا۔ کافی وقت خاموشی کی نذر ہوا۔

''آپ سب تو یوں بیٹھے ہیں جیسے عیرش کی شادی کرنے کا ارادہ ہی نہیں تھا۔'' ردا کی آواز نے گہرے سکوت میں پتھر پھینکا۔ پہلے تو اس کی خالہ یا ماموں کی جانب سے کسی کمٹ منٹ کا مسئلہ تھا جب وہ بھی نہیں رہا۔ تو اب اس کی شادی کہیں تو ہونی ہے نا۔ پھر اس قدر اچھے رشتے پر غور کرنے میں کیا حرج ہے۔''

ردا نے بات کے اختتام پر اس جز بز ہوتے مجمع کو قائل کرتی نظروں سے دیکھا کہ کیا میں نے غلط کہا ہے۔ تو سب کا انداز آئیں بائیں شائیں جیسا ہی تھا۔

''ہم سب اب تک اسی کمٹ منٹ کی بدولت ہی خاموش تھے۔ اور اب گھر میں لڑکوں کے ہوتے ہمیں ان اچھے یا برے رشتوں پر غور کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔'' تائی کی نہایت شانت سے کی گئی بات نے ددیا کے سینے میں ایک ٹھنڈا ٹھار شاور کھول دیا تھا۔

''تو اور کیا۔'' بخت کی ماں نے بھی اس بات کی بھرپور تائید کی۔

تائی اپنے بیٹے کو گہرائی تک جانتی تھیں کہ رضا کا شادی سے پہلوتہی کا سبب یہ لڑکی ہی تھی۔ تائی کے پروپوزل نے عیرش کے اندر اک شور سا برپا کیا۔ اس کے برعکس اس نے انتہائی سکون سے رامس کو گھورا۔ جو اسے چڑانے کو دانت نکال رہا تھا۔

''اس نکمے سے کون شادی کرے گا۔'' عیرش نے اسے کشن کھینچ کے مارا۔

''آج کل پاکستان میں ہر طرف سڑکوں پر کام ہو رہا ہے۔ محنت مزدوری کر لوں گا تم ہاں تو کرو۔'' وہ بھی شرارت پر اتر آیا۔

''اتنے میں تو بخت بھی گزارا نہیں کر سکتی۔'' وہ ہنسی اور محنت مزدوری کرنے والے پر تباہ کن نظر ڈالی۔

''اس گھر میں ایک برسر روزگار بندہ بھی ہے۔'' قیس ایک مسکراہٹ کے ساتھ معنی خیزی سے گویا ہوا۔ اس برسر روزگار کے لیے دل عجب مستانہ انداز سے دھڑکا تھا۔ عیرش نے بکھرے حواسوں کو سمیٹ کے چکور کے مالک قیس صاحب کو نگاہوں سے جتایا کہ میں بھی اڑنا چاہتی ہوں مگر قیس کی نگاہوں کے تمام رنگ رضا کے ہی حمایتی تھے۔

عیرش نے اپنی گلہ آمیز نگاہ چپکے سے پھیر لی۔ ددیا اور تائی اسے آس بھری نگاہوں سے تک رہی تھیں۔

''پہلا حق رشتہ داروں کا ہی ہوتا ہے بیٹا!'' اسے تذبذب میں پا کر بخت کی ماں نے فیصلہ رضا کے حق میں کروانا چاہا۔

''اگر میں کیس واپس نہ لیتی تو اسلام کی طرح موسیٰ بھی نمل کو چھوڑ دیتا۔'' وہ اپنے ہم زاد سے مخاطب ہوئی۔

''چلو محبت کی بگھی سے اترو۔'' دل میں ٹیس سی اٹھی۔ موسیٰ کو بس رشتے عزیز تھے بیوی کا کیا تھا، دوسری مل سکتی تھی۔ بچے کا کیا تھا، قیس بھی تو پرائے دوارے پل بڑھ گیا تھا۔

چلو دور دیس سے آئے اس گھڑ سوار کے پیچھے بیٹھ جاؤ، پیتل کے تھال تھامے ان کنیزوں کی طرف پلٹ کے مت دیکھنا۔ ریشمی رومال اڑ بھی سکتا ہے۔ اس نے اپنی ہم زاد کو کھینچ کے گھوڑے پر بٹھایا پیپل کے پتوں پر گمٹی محبت کی باس طلسمی محلات کو مبارک ہو۔ وہ جھرجھری لے کر چونکی اور ہلکا سا کھنکھار کے گویا ہوئی۔

''تائی امی باقی تو سب ٹھیک ہے آپ سب جو بھی فیصلہ کریں۔ لیکن۔'' وہ سانس لینے کو رکی تھی یا

سانس جوڑنے کو رکی تھی۔ ہال کمرے میں آتا رضا بھی ٹھہر گیا تھا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ ان آہٹوں کی خوشبو نہ پاتی۔ وہاں ہر ایک سانس روک کے بیٹھا تھا۔ لیکن کے بعد اک گلزار بھی تھا۔ لیکن کے بعد اک الاؤ بھی تھا۔

''ہر لڑکی کی طرح میں بھی ایک سپر لگژری گھر کی خواہش رکھتی ہوں۔''

ساکت کھڑے اس شخص کے وجود کو ایک آنچ نے چھوا تھا۔ اس نے ہر ایک سے نگاہ چرا کے میز پر پڑے میگزین کو دیکھا۔

''اس قدیم گھر میں مجھے کشش محسوس نہیں ہوتی۔ میں یکسانیت کو پسند نہیں کرتی۔ میں اب تبدیلی چاہتی ہو ددیا!''

اس کے الفاظ خشک تھے مگر آنکھ میں اک ذرا نمی تھی۔ گھوڑا سرپٹ دوڑ رہا تھا مگر محبت کی باس ان کے تعاقب میں تھی۔ اب وہاں سب کی نگاہ رضا پر تھی جو دبے پاؤں ہی لوٹ گیا تھا۔

ساکن بیٹھی تائی کو کروشیے کی نوک چبھی، جہاں سارے گھر الٹ پلٹ ہو چکے تھے۔ وہاں رامس اور ردا ہی پرسکون تھے کہ عیرش کی باتیں حقیقت سے قریب تھیں۔

چکور کا مالک ابھی تک حیران تھا کہ چاندنی راتوں سے محبت کرنے والی وہ لڑکی ان مادی خواہشوں کے اندھیروں میں کیونکر بھٹکنے لگی تھی۔ لفظ لیکن سے آگے جو بھی عیرش نے کہا تھا چھوٹی ددیا نے جیسے سنا ہی نہیں تھا۔

ان کے دل و دماغ میں لیکن سے پہلے کا ادا کردہ جملہ، ''آپ جو بھی فیصلہ کریں۔'' کسی نیون سائن کی طرح جل بجھ رہا تھا۔

☆☆☆

ان آہٹوں کو پہچان کے عیرش کا دل تیزی سے دھڑکا۔ وہ فی الوقت اس شخص کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ اس سے کچھ فاصلے پر ٹھہر گیا۔ مگر اس کے وجود سے پھیلنے والی خوشبو کو شاید ٹھہرنا نہیں آتا تھا۔

''پیچھے مت دیکھنا پتھر کے ہو جاؤ گے یہ ضرب المثل عام بھی اور وہ لڑکی۔ ان ہری بیلوں کو، کبوتروں کے خالی ڈربوں کو، پرانے درختوں سے لپٹی امر بیل کو اور سامنے چمکتے چاند کو دیکھتے بھی ہوئے بھی پتھر کی ہو چکی تھی۔

''موسیٰ نے نمل کو گھر چھوڑنے کا نہیں کہا تھا پھر بھی تم اس کی شکل دیکھنے کی روادار نہیں ہو۔ جب وہ پاکستان نمل کو لینے آچکا تھا تو تمہارا کیس واپس لینے کی خبر اس نے تب سنی تھی۔'' عیرش کو کسی بے چینی نے گھیرا۔

''میں موسیٰ کی طرف داری اس کے اسٹیٹس یا اس کی دولت کی بنا پر نہیں کرتا تھا۔ اس کیس کے سلسلے میں تمہارا ساتھ، صرف نمل کی وجہ سے نہ دیا۔ موسیٰ جس قدر بھی مضبوط تھا لیکن ماں باپ کی ضد، اسے فیصلے کی کسی سولی پر لٹکا سکتی تھی۔ اور میں یہ کبھی بھی کسی طور پر نہیں چاہتا تھا عیری! کہ آنے والے کسی وقت میں نمل کو بڑی ددیا کے نام سے پکارا جاتا۔''

وہ گھوم کے اس کے سامنے آیا۔ ان ہلکی سیاہ آنکھوں کا اضطراب واضح تھا۔ عیرش نے نگاہ جھکائی۔

وہ اسے تادیر دیکھتے رہنا چاہتا تھا۔ جو ددیا سے دیومالائی قصے سنتے سنتے خود کو ان ہی قدیم داستانوں کا حصہ سمجھتی تھی کوہ قاف باغوں کی طلسمی راہداریوں میں آوارہ پھرتی یہ شہزادی جادوئی پتوں پر محبت نامے لکھ کر انہیں شہزادوں کی نذر کرنا چاہتی تھی۔ جو راستے میں کسی جادوگرنی کے ہاتھ لگنے کی صورت غائب ہو جاتے تھے ہر بار شہزادی جب بیدار ہوتی تو وہ محبت نامے اپنے تکیے کے نیچے پاتی۔ کیا کبھی یہ شہزادوں تک پہنچ پائیں گے؟ وہ ہر بار مایوس ہوتی۔

عیرش مشکل ترین لمحوں کی زد میں تھی۔ وہ سوچتی تھی یہ آدم بیزار سابندہ کیا کسی کا ہو سکتا ہے اس لفظ کسی میں خود کو نہ پا کر روح بیابان سی ہو جاتی تھی۔ اسے الٹے قدموں چلے جانا چاہیے۔ وہ یہ سوچ سکتی تھی مگر اپنی محبت کو کسی سوئے ہوئے محل کے سپرد کرنے والی وہ لڑکی اب کسی کے سامنے پتھر کی ہو چکی تھی۔

رضا آج بھی اس جامد خاموشی کے لمحوں میں ددیا کے پرانے گیت اس لڑکی کی آواز میں سن رہا تھا۔

پیپل کے پتوا یہ سن او جانیاں...... ہم نے لکھی

ہیں دل کی کہانیاں......
پھر وہ کیسے مان لیتا کہ وہ لڑکی ایک لگژری گھر کی خواہش مند ہے۔ وہ اب تک بے یقین تھا۔ سونے کی صراحی چھوڑ کے اس شہزادی کا کسی مسافر کے ساتھ اپنی محبت میں جانا ہی اس داستان کی خوب صورتی ہے۔
وہ ہنسا اور ان اعصاب شکن لمحوں کو اپنی ہنسی میں اڑا دیا۔ اس نے رضا کا چہرہ دیکھا وہ کیا کہہ رہا تھا۔ اس نے نگاہ ملائی۔
''کیسی محبت؟'' وہ پیشانی کی ایک نمایاں سلوٹ کے ساتھ بولی۔
''تم جانتی ہو عیرش...... کہ محبت...... رضا حبیب کی کھڑکیوں سے لپٹی بیلوں میں بھی سانس لیتی ہے یہ ہاتھ ان بیلوں کے مسیحا جو ہیں۔''
اس نے عیرش کا ہاتھ بس لمحہ بھر کو چھوا۔ عیرش نگاہ ہٹا نہیں پائی۔
''ضروری نہیں کہ وہ جادوئی پتے ہر بار جادوگرنی کے ہاتھ لگ جائیں اکثر شہزادوں تک بھی پہنچ جاتے ہوں گے۔'' وہ سرگوشی عیرش کے بے حد قریب سے ابھری تھی۔ وہ کندھے کو چھوتا آگے بڑھ گیا۔
عیرش نے جانے والے کو گہرے سانس بھر کے دیکھا۔ وہ آج بھی کانچ کی شیشیوں سے صندل اڑا کے ان میں اس کے قدموں کی دھول بھرنا چاہتی تھی۔ آنکھ کی سطح بھیگی۔ اب اس کے لیے اپنے فیصلے سے پھرنا۔ ناممکن تھا۔ شاید ضمیر انکل کو ددیا نے جواب ہاں میں دے دیا تھا۔ اس نے ایک مایوس کن سانس لیا داستان کی خوب صورتی اب ختم ہو چکی تھی۔

☆☆☆

'' تم یا کوئی بھی اور، یہ سوچ بھی کیسے سکتا ہے کہ عیرش میرے کنٹرول سے باہر ہے۔ وہ ہمارے خاندان کا اٹوٹ حصہ ہے۔ ہم اس کے ورثا میں سے ہیں۔ نہ تو ہمیں اس کے فیصلوں سے اختلاف ہے نہ ہی اسے ہمارے فیصلوں پر اعتراض ہے۔''
کیا یہ کڑک آواز ددیا کی ہی ہے۔ اس نے کتاب جھولے پر رکھی۔ اور بے یقینی سے چلتی بیلوں سے ڈھکی ہال کمرے کی کھڑکی طرف آئی اور ماتھا ٹکا کے اندر کا منظر دیکھا۔
''حد کرتی ہیں بی۔ میں نے تو صرف اتنا کہا تھا کہ اس طرح آناً فاناً نکاح پر لڑکی رضامند بھی ہو گی کہ نہیں جواب میں آپ کی آواز تو آدھے محلے میں سنائی دی ہو گی۔''
بخت کی ماں نے حسب عادت کان چھوئے۔ ادھر لفظ نکاح پر اندر جھانکتی لڑکی کا دل حلق سے باہر آنے والا تھا۔
''کیوں نہیں، میں تو چاہتی ہوں کہ میری آواز پورا محلہ سن لے۔ میری عیرش جیسی فرماں بردار، سعادت مند، اللہ میاں کی گائے پورے محلے میں ایک بھی ہو تو ڈھونڈ کے لاؤ۔''
عیرش نے سر پر ہاتھ پھیرا۔ شکر ہے سینگوں سے خالی تھا۔
''میری بچی کے منہ میں تو زبان ہی نہیں۔'' اس نے فوری زبان کو چھوا۔ صد شکر منہ کے اندر ہی تھی۔
'' صابر شاکر، زندگی کی تمام ڈوریاں میرے ہاتھوں میں تھما رکھی ہیں اور مجھ بڑھیا کا مان توڑ ہی نہیں سکتی......اور، اور......
ددیا خاموش ہوئیں......اب کوئی جملہ ذہن میں نہیں آ رہا تھا۔
''ارے بہو! کوئی اس طرح کے چند جملے تم ہی بتا دو۔''
''ہیں۔'' عیرش نے آنکھیں پٹپٹائیں۔ ''کیا میں ان تمام خوبیوں کی مالک ہوں یہ ایک بریکنگ نیوز تھی۔''
''چند جملے کیوں اماں! عیرش جیسی لڑکی کی تعریف میں تو زمین آسمان کے قلابے بھی کم ہیں۔ فی الحال تو یہ ہی کہوں گی کہ آپ کی عیرش نہایت تابعدار ہے نکاح کے ساتھ بھلے رخصتی کر دیں آپ کے کسی حکم سے انکار کر ہی نہیں سکتی۔''
ردا کی اس بات پر راس نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا تھا اور عیرش کا دل ردا کا سر پھوڑنے کو

چاہا تھا۔ اندر سب کو اچانک مجھ میں وہ خوبیاں نظر آرہی ہیں جو مجھ میں سرے سے ہیں ہی نہیں۔ وہ اب پریشان ہو چکی تھی۔ یہ ددیا اور ان کی بہو بازار سے بھنگ پی کے تو نہیں آئیں۔

اس کی نگاہ رامس پر پڑی جو قیس کے پاؤں دباتے ہوئے شادی کے گیت گنگنا رہا تھا۔ اسے قیس سے ہمدردی ہوئی کہ ددیا کے ساتھ شاپنگ کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔

''اب بس کریں اماں! بچی پر اتنا بوجھ ہی کافی ہے۔'' تائی نے خوب ہنس چکنے کے بعد کہا۔ اور شاپنگ بیگ کی طرف متوجہ ہوئیں۔

''جن محترمہ کی خوبیوں پر یہاں کتابیں لکھی جارہی ہیں۔ ذرا ان سے بات تو کر کے دیکھیں۔ فرماں برداریوں اور تابعداریوں کے دعوے اس ہال کمرے میں منہ چھپاتے پھریں گے۔ بالکل ددیا ہی طرح۔'' وہ اس ادا سے مسکرایا تھا کہ عیرش نے اس کا بھی سر پھاڑنا چاہا

''خدانخواستہ میں کاہے کو منہ چھپاؤں گی۔'' ددیا نے اسے تیوری چڑھا کے گھورا۔ جو عین کھڑکی کے رخ بیٹھا تھا بس جالی کو گھورنے کی دیر تھی۔

''اس لگژری گھر کے خواب دیکھنے والی کو ذرا بلائیں تو، بھلے ضمیر انکل کے گن گاتی نہیں تھکتی۔ مگر وہ دیکھیے گا وہ اس نکاح وکاح سے صاف انکار کر دے گی۔'' رضا نے کرسی سے ٹیک لگا کے ددیا کو چیلنج کیا۔

عیرش کا سکتہ ٹوٹا۔ یہ کس قدر ریلکس ہے۔ میرے بچھڑ جانے کا کوئی دکھ ہی نہیں۔ اس نے چھوٹی انگلی سے آنکھ کا کونا صاف کیا۔

اور رضا کا سنجیدہ چہرہ حسرت کے ساتھ دیکھا۔ وہ ددیا کے دعوؤں کو ہال کمرے میں منہ چھپاتے نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔

☆☆☆

اندر آکر اس نے تائی کے سامنے پھیلے کام دار جوڑوں پر سنجیدہ سی نگاہ ڈالی۔ وہاں بیٹھتے ہی ددیا کی بات نے اس کے ہوش اڑا دیے تھے۔

''کل شام تمہارا نکاح ہوگا اور یہ تمہارے سسرال والوں کی خواہش ہے۔'' اس سے یہ بات کرتے ہوتے ددیا کی نگاہ فرفر چلتے پنکھے پر تھی۔

عیرش نے بھی اپنے دھڑکتے دل کو بمشکل کنٹرول کیا ورنہ ضمیر انکل کی اس خواہش پر دل۔ حلق پھاڑ کے رونے کو چاہ رہا تھا۔ اس نے کافی دیر بعد ذرا کی ذرا، رضا کو دیکھا۔ تو کیا اب رضا حبیب کی کھڑکیوں سے لپٹی بیلوں پر محبت مردہ ہو چکی ہے؟ اندر دل نے واہی تباہی مچا رکھی تھی۔

''ایسا ہے تو ایسا ہی سہی۔'' اس نے گردن اکڑائی۔ اسے رضا کی پیش گوئی کو جھٹلانا تھا۔ سو نگاہ جھکا کے سعادت مندی سے کہا۔

''جیسے آپ کی مرضی۔'' ساتھ ہی سر جھکایا، آنکھوں کی نمی کہیں بھانڈا ہی نا پھوڑ دے کہ وہ سنگدل اسی پر نگاہ مرکوز کیے بیٹھا تھا۔

''اب شام کو ردا کے ساتھ جا کے ہاتھ منہ صاف کروا آنا۔'' ددیا کی اس بات پر ایک مشترکہ قہقہہ پڑا تھا۔ اس کا دل جلا۔

کل میرا فیصلہ سن کے ایسے ہی سب نے منہ لٹکا رکھے تھے اور آج خوشی کا یہ عالم! عیرش کی سمجھ سے باہر تھا۔

☆☆☆

''تم ہمیشہ سے میرے اس گھر سے دفع ہونے کے خواہش مند رہے ہو۔ تو سنو۔ اب خوش ہو جاؤ۔'' وہ کسی کام سے ددیا کے کمرے میں آیا تو وہ سامنے کھڑی تھی۔ لانبے گیلے بال اس کے شانوں پر پریشان تھے اس کی آنکھوں کی لالی اور بوجھل پن بتا رہا تھا کہ وہ تمام رات جاگتی رہی تھی، رضا کے دل کو کچھ ہوا۔ چند لمحوں بعد وہ جیسے حواسوں میں آکے مسکرایا۔

''وہ ایک پرانی بات تھی۔ اس کے بعد تو میں تم سے۔'' وہ چار قدم قریب ہوا۔

''اب تم یہاں سے جاؤ رضا!'' وہ اس کا جملہ مکمل ہونے سے قبل ہی گلابی چہرے کے ساتھ سلگ کے گویا ہوئی۔

''تم ہاتھ منہ صاف کروا کر کے واقعی پیاری لگ

رہی ہو۔ ورنہ تو پھول پتوں میں وقت گزرتے ہوئے تمہارا حلیہ کسی گرد آلود بھانڈ کی طرح ہی ہوتا تھا۔" وہ اپنی جگہ جم کے بولا۔ وہ غصے سے پلٹنے لگی تو وہ سرعت سے مقابل آیا۔

"کل تم نے کچن میں بخت سے کہا ...... جاؤ...... رضا کی خبر لے آؤ۔ یہ الفاظ سن کے چائے کی طلب مٹ گئی تھی اور میں کل سے اپنی خبر دینے کو بے تاب ہوں عیری!" وہ تھوڑی دیر ساکت کھڑا اسے چمکتی آنکھوں سے دیکھتا رہا۔

"گیٹ سے ذرا دور گھوڑا باندھ کے آیا ہوں۔ تم سونے کی صراحی پھینک کے میرے ساتھ چلو۔" اس کی آواز مدہم اور فسوں خیز تھی۔

"تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے۔" وہ بھی سرعت سے پیچھے ہٹی تھی۔ "اب خبر لینے اور دینے کا وقت گزر چکا ہے رضا حبیب!" وہ دروازے کی جانب لپکی۔

"اف...... یہ رضا......" اور باہر جاتے ہوئے اپنے کمرے کے اندر اور باہر تک کسی نادیدہ شیشے کے ٹکڑے ---- اسے پاؤں میں بری طرح چبھے تھے۔

☆☆☆

"اب تک نمل کیوں نہیں پہنچی۔" دلہن بنی عیرش نے کوئی چوتھی بار پوچھا تو مصروف ترین ددیا کچھ دیر کو اس کے پاس ٹکیں۔ قریب کے تمام رشتے دار وہاں موجود تھے گھر میں شادی والی چہل پہل تھی۔ تو ددیا کے بے حد اصرار پر اس نے مکمل اہتمام تو نہیں لیکن کچھ کچھ دلہنوں کا سا اہتمام کیا تھا۔ اس پر ددیا کی طعنہ بازی کہ "سب کچھ تمہاری مرضی سے ہو رہا ہے پھر یہ جھنجلاہٹ اور بے زاری کیوں؟"

"تمہاری خوشی کون ہے اور تمہاری ضد کون ہے یہ میرے سوا کون جان سکتا ہے۔" ددیا نے اس کا سونا، سونا روپ جی بھر کے دیکھا۔ "فہد سے رشتہ تو محض خالہ کو نیچا دکھانے کے لیے اور موسیٰ کے برابر آنے کے لیے جوڑا جا رہا تھا۔ یہ تمہاری خوشی تو نہیں ہے نا۔" عیرش نے فوری رخ موڑا۔

"یقین نہیں آئے گا لیکن تمہاری خالہ تمہاری پراپرٹی اس شرط پر دینے کو تیار ہوئی ہے کہ تمہیں شادی اس کی مرضی سے اس کے انتخاب سے کرنی ہوگی۔ مگر موسیٰ اور نمل ایسا نہیں چاہتے۔ یہ فہد کا پروپوزل اور تمہارا اقرار، تمہارے ننھیال والے یہ قصہ سن کے باؤلے ہوئے جا رہے ہیں اور پاکستان آ کر جانے کس کس کے گلے پڑنا چاہتے ہیں۔ اس لیے ہم نے نمل کو بلایا ہی نہیں۔"

اف ددیا نے یہ کیسا بم پھوڑا تھا۔

"یعنی میری سگی بہن اس موقع پر موجود ہی نہیں ہوگی۔" آنکھوں سے آنسوؤں کا ریلا پھوٹا۔

ددیا نے دلاسے تسلی کے بجائے نگاہ جھکا لی۔

"ایک ہفتے بعد وہ تمہارے ولیمے پر آئیں گے۔" وہ رونا بھول گئی کہ لفظ ولیمہ حلق میں اٹکا تھا۔ وہ ضد اور ہٹ دھرمی میں کیا کچھ کھو رہی تھی۔

"نکاح خواں اور گواہان نکاح پڑھانے آ رہے ہیں اماں!" قیس نے اطلاع دینے کے بعد ایک دو چیزیں راستے سے ہٹائیں۔ عیرش کا ٹھنڈا وجود سن ہوا۔

کیا اس کے پاس رامس کھڑا تھا؟ اس نے جھکی نگاہ کا زاویہ بدلا۔ وہ کتنے سالوں سے ہی گھڑی پہنتا تھا۔ دوپہر کے بعد وہ اسے دوبارہ نظر نہیں آیا تھا۔ کیا اس کا گواہ بننا ضروری تھا۔ نگاہ گھڑی پر جم چکی تھی۔ اور ساتھ کھڑا شخص ہمیشہ جان لیتا تھا کہ وہ کن نگاہوں کی زد میں ہے۔ ماں ہوتی تو دل کا حال جان کر کسی ایرے غیرے کے حوالے نہ کرتی۔ آنسو لڑیوں کی صورت بہنا چاہتے تھے۔ وہ نکاح خواں کی آواز پر سیدھی ہوئی۔

"میں داستان کی خوبصورتی برقرار رکھنا چاہتی ہو تم گھوڑا یا بگھی جو بھی میسر ہے لے کر آؤ۔" وہ پہلو کے ساتھ کھڑے شخص سے بے آواز مخاطب ہوئی۔

"عیرش! تمہارا دھیان کدھر ہے" ددیا کان میں گھسی۔

"سکہ رائج الوقت بمعہ شرعی حق مہر کے......" وہ گھڑی جان گسل تھی اور وہ فرشتے کی طرح اب بھی کندھے سے جڑ کے کھڑا تھا۔

"رضا حبیب ولد حبیب اللہ کیا تمہیں قبول

ہے۔" وجود سے باہر دھڑکا۔ یہ کیسا مذاق تھا جھٹ سے چہرہ اونچا کر کے ددیا کو دیکھا۔

"ماں ہوں دل کا حال جانتی ہوں۔" ددیا کی مسکراہٹ وجود میں روح پھونکنے جیسی تھی مولوی نے وہ جملہ دوبارہ دہرایا۔

"اب کہہ بھی چکو کہ قبول ہے۔" ددیا کی نرمی رخصت ہوئی تو اس نے جھٹ سے سر اثبات میں ہلایا۔

"ارے بیٹھو میاں!" وہ رضا سے مخاطب ہوئیں۔

"آپ نے مجھ سے کہا ہے ددیا؟"

رامس جھٹ سے آگے بڑھا۔ وہاں مولوی سمیت سب ہی ہنس دیے رونا تو صرف دلہن کو آ رہا تھا سب نے اسے کس خوبصورتی سے بے وقوف بنایا تھا۔

"نکاح ہو رہا ہے لڈو نہیں بٹ رہے کہ لینے آ پہنچو۔" ددیا کا دھوکا خاصا زوردار تھا۔

"یہ رضا...... یہ اس قدر بے ایمان ہے۔"

وہ اس کے پہلو میں بیٹھا تو غصے کا ایک ریلا تھا جو سونامی سے کہیں بڑا تھا۔ پچھلے دو دن اس نے جس اذیت میں گزارے تھے وہی جانتی تھی۔

"کہا تھا نا۔ یہاں کوئی لوٹ مار نہیں مچی کہ عیرش صہیب کسی کا بھی ہاتھ تھامے اور چل دے۔" اس کے لبوں سے چپکی مسکراہٹ...... عیرش نے نگاہ موڑ لی۔

"دلہن کم شیرنی زیادہ لگ رہی ہو۔" ردا نے ہنستے ہوئے اس کا گھونگھٹ گرایا۔ "رضا کو تو یہاں بیٹھے بیٹھے ہی چبا جاؤ گی۔"

رضا کا ہلکا قہقہہ شاندار تھا۔ نکاح ہو چکا تھا۔ ہر طرف سے مبارک سلامت اور دعا کی آوازیں تھیں۔ اب وہ باری باری سب سے گلے مل رہا تھا۔

"مجھے نہیں گھونگھٹ اوڑھنا۔" اس نے دوپٹا پیچھے سرکایا اور کھڑی ہو گئی، ہائے اس کو ہال کمرے کی کھڑکی سے چھپ کے جھانکنا مار گیا وہ سب اس کی خوبیاں کہاں بیان کر رہے تھے۔ وہ تو اسے ہر صورت ددیا کا حکم ماننے پر اکسا رہے تھے۔ جانتے تھے کہ وہ کہیں کھڑکیوں کے پاس ہی ہوگی۔

"ارے ارے رکو عیرش! کہاں بھاگی جا رہی ہو۔" ددیا نے اس کی کلائی تھام لی۔

اور وہ اپنی سہیلی اپنی غم خوار ماں جیسی ددیا کو بے بسی سے دیکھتی رہ گئی۔

اگلے لمحے منظر بدلا۔ دلہن کا رونا دھونا ددیا کی منت سماجت، وہاں دولہا کی ماں اپنا سر پکڑ کے بیٹھی تھی۔

"لو جی...... آپ کو اپنا گھر بار مبارک ہو۔" ردا نے اسے صوفے پر بٹھایا۔ وہ ددیا کی ہزار منت سماجت کے بعد رخصتی کے لیے تیار ہوئی تھی۔ "یہ سب اس نے بھی میرے ہی حکم پر کیا ہے اب رضا سے جھگڑا مت کرنا۔"

ددیا نے رخصت کرتے وقت التجا کی تھی۔ ددیا نے سو طرح سے یقین دلایا تھا مگر وہ ماننے کو تیار نہیں تھی۔

"اس ایک کمرے کو کوئی کیسے گھر کہہ سکتا ہے۔" وہ بلند آواز کے ساتھ بولی۔ کہ رضا اندر آ رہا تھا۔

"بیوی کے لیے شوہر کا ایک کمرہ بھی پورا جہان ہوتا ہے عیرش رضا۔" ردا ہونٹ پھیلا کے مسکرائی۔

عیرش نے اسے پہلو بدل کے دیکھا کہ اسی ادا کردہ جملہ دہرایا گیا تھا۔

"ارے یہ بخت بس ایک بیگ ہی لے کر آئی ہے۔" ردا کی نگاہ کبھی پر دھرے سامان کی طرف گئی۔

"کیونکہ یہ کمرہ ہے گھر نہیں یہاں ٹرک بھر سامان لانے کی حماقت کون کر سکتا ہے۔" وہ طنزیہ انداز میں ہنسی۔ رضا نے پلٹ کے دیکھا، اس کی دلہن زبان کے ہتھیار تیز کیے بیٹھی تھی۔

"مجھے قیس نے سمجھا دیا تھا کہ بیویوں کی بات پر سیریس نہیں ہوا جاتا انہیں بکنے جھکنے کی عادت ہوتی ہے۔" وہ بات کر کے وارڈروب کی جانب بڑھا۔

"ہائیں۔" وہ دھک سے رہ گئی۔ قیس نے کب؟ یہ تو خود اس نے اسی کمرے میں کھڑے کہا تھا۔

"اور جہاں تک گھر کی بات ہے تو میں انکاری تو نہیں۔ محبت کے ساتھ کہتا رہوں گا۔ بنا لوں گا۔ اب منہ پھاڑ کے انکار کر دوں تو یہ ایک کمرہ تمہیں عذاب میں مبتلا کر سکتا ہے۔" وہ اسے دیکھ کے مسکرایا۔ جو منہ کھول کے بیٹھی تھی۔

آخر مجھے دوسروں کے معاملات میں بولنے کی

ضرورت ہی کیا تھی۔ وہ ہمیشہ بعد میں پچھتاتی تھی۔

''باقی سامان صبح لے آؤں گی۔'' وہاں خراب صورت حال بھانپتے ہوئے ردا کھسکنا چاہتی تھی۔

''پلیز باقی سامان اس کے کمرے میں ہی رہنے دینا کون سا سات سمندر پار آئی ہے۔'' رضا نے باآواز بلند کہا کہ ردا دروازہ بند کر کے جا چکی تھی۔

وہ صوفے سے تنتاتی ہوئی اٹھی۔

''جہاں میرے سامان کی گنجائش نہیں وہاں میں بھی نہیں رہ سکتی۔'' وہ اپنے بیگ پر جھپٹی وہ وارڈ روب بند کرتا لپک کے اس کی طرف آیا۔ بیگ ہاتھوں سے چھینا۔

''ایک لگاؤں گا۔ خبردار جو کمرے سے باہر جانے کا سوچا بھی تو۔'' وہ واقعی غصے میں تھا۔

اف اس کو ایک دھکا لگا۔

ہائے یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے مجھے اس قدر فضول گوئی کی عادت کیوں تھی یا اللہ۔

''یہ ساری باتیں ردا کے لیے تھیں۔ مجھے مت سنائیں۔'' وہ کندھے اکڑا کے اور بھنا کے گویا ہوئی۔

''ردا کے لیے ہی کیوں؟ اب تمہارے فرمان ہر بیوی پر لاگو ہوں گے۔'' وہ بھی ماتھے پر بل ڈال کے روبرو آیا۔ اور اسے توجہ سے دیکھا۔

''گزشتہ رات جدائی کے صدمے میں آنسو بہاتے گزاری ہے تم نے۔ اب میری دلہن بنتے ہی کیسے شیرنی بن چکی ہو۔'' رضا نے ہنستے ہوئے کہا۔

''کون سی دلہن؟'' وہ ناک منہ اور تیوریاں چڑھائے بولی۔ ''میں اس آناً فاناً کے نکاح کو شادی نہیں مانتی۔'' وہ لہجے میں بے زاری سمیٹ کے بولی

وہ ٹھٹک کے چونکا اور ایک دم سنجیدہ ہوا۔

''تمہیں آناً فاناً نکاح پر دکھ ہے یا مجھ سے نکاح پر دکھ ہے؟'' وہ ہلکی آواز میں سرد مہری سے گویا ہوا۔

''میں پہلے والا نکاح بھی ددیا کے حکم پر کر رہی تھی اور تم سے بھی ان ہی کے کہنے پر ہی۔ مطلب بس ایسے ہی سر ہل گیا۔''

وہ ذرا دھیمی پڑی۔ واہ کیا شاہانہ ملال تھا۔

''جب ایسے ہی سر ہلا دیا تھا تو مجھ پر تپنے کے بجائے اپنا سر پھوڑو۔''

وہ بھی انوکھے مزاج کے حامل تھا۔ اپنا سوٹ اٹھا کے واش روم میں گھس گیا۔ جب واپس آیا تو وہ وہیں کھڑی تھی۔

''جانتا ہوں کہ ضد اور ہٹ دھرمی میں تمہارا کوئی ثانی نہیں۔ دوسروں کو نیچا دکھانے کے لیے اور خود کو اونچا دکھانے کے لیے مجھ سے جدا ہونا بھی گوارا تھا۔'' رضا نے اس کا سامان اٹھایا وہ تیزی سے آگے بڑھی۔

''میرے سامان کو ہاتھ لگانے کی ضرورت نہیں۔'' بیگ اس سے چھیننا چاہا۔ رضا نے اسے تیز نظروں سے گھورا۔

''تمہارے سامان کو بھی ہاتھ لگاؤں گا اور......''

اس نے بیگ دوبارہ بیڈ پر رکھا۔ پھر اس کا سرخ چہرہ غور سے دیکھا۔ ''اور تمہیں بھی۔'' وہ مدہم مگر سخت آواز میں بولا۔

''منہ دھو رکھو۔'' اس نے رخ بدل لیا۔

''ابھی دھو کے آیا ہوں یار۔'' وہ گھوم کے دوبارہ سامنے آیا۔ تو نہ غصے میں تھا نہ ہی سنجیدہ۔

''کبھی قیس اور ردا کے جھگڑے تمہیں محبت سے متنفر کرتے تھے تو پرندوں کے پر اس محبت سے بہتر لگتے تھے جو ساری زندگی چپ چاپ کسی کتاب میں گزار دیتے ہیں۔ کبھی کمل اور موسیٰ کی لاتعلقی پر تم محبت کو جھٹلانے لگتی تھیں کہ وہ سونے کی صراحی میں محفوظ رہ کر بس سانس لیتی رہے۔ اپنی اس خیالی داستان میں سے تم نے مجھے نکال دیا تھا عیرش، یقین کرو نکاح کے بعد میں ابھی رخصتی نہیں چاہتا تھا۔ ابھی مجھے رضا کی دلہن کے لیے ایک بہت بڑا گھر بنانا تھا بالکل ویسا جس میں کبھی وہ اپنے مما پاپا کے ساتھ رہتی تھی۔ میں اسے زندگی کی وہ ہر آسائش دے کر اپنانا چاہتا تھا جس کی وہ عادی تھی۔''

وہ خاموش رہا اور اسے دیکھا جو ڈبڈبائی نگاہوں کے ساتھ فرش کو تک رہی تھی۔

''یہ ددیا کا حکم تھا جو میں نہیں ٹال سکا کہ انہوں

نے ہمیں ماں باپ سے بھی بڑھ کے چاہا۔ میں انہیں انکار نہیں کر سکا عیرش!" اس نے عیرش کا ہاتھ تھامنے کی جسارت کی۔ جو اس نے فوری چھڑا لیا۔

"ددیا ایک قصہ سناتی تھیں۔ اس شہزادی کو دیو اڑا لے جاتا تھا اور سمندر کے دوسرے کنارے پر ایک پھول میں قید کر دیتا تھا۔ وہ شہزادے کا انتظار کرتی تھی' وہ کشتیوں کا انتظار کرتی تھی۔ محبت اس انتظار میں تھی اور محبت اس کشتی پر سوار تھی' وہ اس کی بات کاٹ کے ہنسا۔ "تم یہی کہنا چاہتی ہو۔" اب اس نے ہاتھ نہیں پکڑا۔ شانوں پر بکھرے بالوں کو نرمی سے اپنی مٹھی میں لیا اور مسکرایا۔

"محبت پرندوں کے پروں میں ہے۔ سونے کی صراحی میں ہے۔ کہیں پیپل کے پتوں میں چھپی ہے۔ کہیں پیتل کے تھال میں رکھی ہے۔ اور تو اور دیے کی لو تک میں ٹمٹماتی ہے۔"

اس نے ایک طویل سانس لیا۔

"بس ایک وہاں نہیں ہے جہاں اسے ہونا چاہیے۔"

اس قدر سحر انگیز لہجہ۔ وہ مانتی تھی وہ بلا کا خوش آواز تھا۔

"محبت ایک دھڑکتے ہوئے دل میں بھی ہوتی ہے۔ ایک سانس لیتے وجود میں بھی ہوتی ہے۔"

اس نے فسوں خیز سی سرگوشی کی۔ عیرش نے اسے گھورنا چاہا پھر جھینپ کے نگاہ جھکالی۔ آج اسے بھی گھورنا اتنا آسان کام نہیں تھا۔

"تم وہ ساری کہانیاں جو ددیا سے سنتی آئی ہو۔ سنبل، املتاس، اور پیپل کے پتوں پر لکھتی رہیں اور میں وہ ساری کہانیاں جو اپنے دل سے سنتا رہا۔ وہ اپنے دل پر ہی لکھتا رہا۔ یہ محبت نہیں ہے کیا؟" اس نے اپنی پہنچ سے دور ہوتی اس لڑکی سے تائید چاہی تھی۔

وہ آنکھوں میں شرارت لیے نفی میں سر ہلاتی کھڑکی کے قریب آئی۔ رضا اپنے پہلوؤں پر ہاتھ دھر کے اسے دیکھتا رہ گیا۔ جو پھر سے کسی داستان کا حصہ بن چکی تھی۔ اس نے کندھے اچکا کے نگاہ ملائی اور کھڑکی کھول دی۔

"دیکھو۔ محبت رضا حبیب کی کھڑکیوں سے لپٹی بیلوں میں سانس لیتی ہے۔"

وہ الگ مزاج کی تھی وہ محبت کو اشعاروں اور داستانوں میں تلاشتی تھی اسے ہجر عزیز تھے وہ انتظار کی شیدائی تھی اور اس قدر پاگل کہ سمندر کے دوسرے کنارے کسی پھول میں قید ہو کے اک رضا نامی شخص کی کشتیوں کا انتظار کرنا چاہتی تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ دوسرا کنارہ کوئی پا سکا ہے۔

وہ اپنے ماں باپ سے بچھڑی۔ اس نے رشتوں کی بدصورتی کو محسوس کیا۔

اس نے محسوس کیا کہ کسی کے گھر میں رہ کر زندگی کرد شیے کی نوک بن جاتی ہے جس پر دوسروں کی مرضی کا دھاگا چڑھتا اور اترتا ہے۔

اس نے ددیا کے پاؤں کی تھکن میں زندگی کی حقیقت کو دیکھا تو خود کو پیڑ پتوں میں گم کر لیا۔ وہ اپنے محل نما گھر سے نکلی تو ددیا کی داستانوں کی شہزادی بن گئی۔ جو محل کی کھڑکیوں سے لگ کر جنگل میں جانے والے راستوں کے بھید پانا چاہتی تھی۔

رضا نے آگے بڑھ کے کھڑکی کے پٹ بند کیے۔ "ہوا نے پیتل کے تھال پر سے ریشمی رومال اڑا دیا ہے پیپل کے پتے اڑ چکے ہیں عیرش آؤ اب میں تمہیں دل کی کہانیاں سناؤں۔" وہ اس کا ہاتھ نرمی سے تھام کے چلا۔

وہ ہونٹ گول مول کر کے اک ذرا رازداری سے مسکرائی۔ وہ جادوئی پتے آج بھی جادوگرنی کے ہاتھ لگ چکے ہیں۔ رضا نے چند مشکل سانس لیے اور اس کے چہرے سے بال ہٹائے۔

"شہزادے آج پھر ناامید بیٹھے ہوں گے۔"

وہ جھینپ کے ہنس دی۔

اب گنگ کھڑے رضا کو یہ کام کرنا تھا کہ اپنی اس مشکل ترین بیوی کو بس بستر سے تکیہ اٹھا کے دکھانا تھا۔ کہ دیکھو عیرش! پتے یہاں نہیں ہیں وہ شہزادوں کے ہاتھ لگ چکے ہیں۔ اگر اس لڑکی کے لیے زندگی داستانوں میں خوب صورت تھی تو وہ بھی کسی داستان کا حصہ بن جانا چاہتا تھا۔

☆

کاشفہ حسین

ہم کہاں جا رہے ہیں

امی نے کن اکھیوں سے اس کی طرف دیکھا، موڈ برہم لگ رہا تھا۔ چہرے سے تھکن مترشح تھی۔ اس نے گاڑی کی چابی اٹھا کر بیڈ سائیڈ پر پھینکی اور خود بھی بیڈ پر گر گئی۔

''کیا ہوا؟'' امی نے پوچھا، ''تھک گئی ہو؟''

''جی'' اس نے مختصر ترین جواب دیا۔ ''تائی امی نے فون کیا تھا، بازار جانے کے لیے، تین گھنٹے خوار کیا اور گھر پہنچے تو پتا ہے کیا ہوا؟

امی کے چہرے پر مسکراہٹ در آئی جسے انہوں نے بدقت چھپایا، وہ ویسے ہی بہت حساس تھی۔

''ہادی اے سی چلا کر آرام فرما رہا تھا اور مومنہ اس نواب کے لیے چائے بنا رہی تھی۔ تائی امی کے ساتھ تین گھنٹے میں خوار ہوئی، بازار میں پارکنگ کہاں تھی، گاڑی چلا چلا کر میری ٹانگیں ٹوٹ گئیں اور ان کا نواب بیٹا آرام فرما رہا تھا۔'' وہ جلی بھنی بولے چلی گئی، امی سے بھی رہا نہ گیا۔

''جب تم نے نئی نئی گاڑی چلانا سیکھی میں نے کتنا سمجھایا تھا۔ ہر وقت میں آجاتی ہوں تائی امی، ''میں لے جاؤں گی تائی امی'' اب جب عادتیں خراب کردیں تو شکوہ کیسا؟''

''ہاں ہاں آپ کو تو ہر بات میں میری ہی غلطی نظر آتی ہے،'' ہانیہ نے بستر سے اٹھ کر پاؤں پٹختے ہوئے کہا۔ ''اب میں روٹی نہیں ڈالوں گی۔''

''کیسے نہیں ڈالو گی۔'' امی کو بھی غصہ آگیا، ''تمہارا تو باپ بھی ڈالے گا۔'' انہوں نے جلال میں آتے ہوئے کہا۔ لیکن وہ بھی ہانیہ تھی کہاں ان کے رعب میں آتی۔

''ابا ہی سے ڈالو لیں امی، میں جا رہی ہوں سونے۔'' اس سے پہلے کہ امی کی چپل اس کا مزاج پوچھتی وہ کمرے سے بھاگ گئی۔ بکتے جھکتے عصمت بیگم نے خود ہی روٹی ڈالی۔ اسپتال سے تو جلدی آگئی تھیں مگر سو کام پڑے تھے دیکھنے کے لیے، عورت کتنی ہی بڑی طرم خان کیوں نہ ہو جائے، باہر کتنے ہی اس کے نام کے ڈنکے بج جائیں، گھر کے

ہے ہیں؟ (خواتین) hum kha ja rhe he

کاموں سے خلاصی ممکن نہیں، فریج سے پرانے سالن نکالتے ہوئے انہوں نے ساتھ ہی چائے چڑھائی۔

''ابھی وقار صاحب چائے کے لیے آواز لگائیں گے۔ وہ سوچ رہی تھیں تب ہی کمرے سے آواز آئی۔''

''ارے بھئی آج چائے نہیں ملے گی کیا؟'' مسکراہٹ ان کے لبوں کو چھوگئی۔

''ابھی حاضر ہوتی ہے کنیز!'' وہ بھی کہاں چھیڑنے سے باز آنے والی تھیں۔ اتنی دیر میں وقار صاحب بھی کمرے سے نکل کر کچن میں پہنچ گئے۔

''ملکہ عالیہ کنیز کیسے بن گئیں؟'' ان کے چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ تھی۔ آخری کام والی لڑکی فون پر لگی رہتی تھی۔ گزارا تھا۔ ایک دن بندے کو گھر ہی بلالیا۔ عصمت بیگم نوکری کے سلسلے میں سارا دن باہر ہوتی تھیں۔ جوان بیٹی گھر میں تھی۔ انہوں نے کھڑے کھڑے نکال دیا۔ اب تو خیر عادت سی ہوگئی تھی۔ چار دن کوئی اچھی مل جائے تو صحیح ورنہ کوئی

بری! زندگی گزر گئی۔ انہوں نے ٹھنڈی آہ بھری اور سوچا، پھر کہنے لگیں۔

"اب تو ہم ہی ہم ہیں سرکار عالی وقار، بیگم بھی، ماسی بھی، ڈرائیور بھی، مالی بھی۔"

چائے خوش گوار ماحول میں پی لی گئی۔ ہانیہ اپنی ضد کی پکی تھی جب تک نیند پوری نہ ہوئی کمرے سے نکلی نہیں۔ پھر اس کا موڈ بڑا خوش گوار تھا۔ ہاتھ میں چپس کا تھیلا لیے وہ عصمت بیگم کے ساتھ ساتھ گھوم رہی تھی۔ عصمت بیگم نے باریک ادرک کاٹی، گرین ٹی چڑھائی، کچن سمیٹا، صبح کے کپڑے استری کرتے کرتے انہوں نے اس کی ساری لن ترانیاں سنیں۔ ٹیوشن کے قصے، کالج کے مسئلے، ساتھ میں چپس کی کچر کچر۔

"ساری دنیا کو تمہاری ماں سکھاتی ہے کہ یہ چیزیں صحت کی بربادی ہیں اور اپنے گھر کا حال دیکھو۔"

عصمت بیگم نے اسے جھاڑنے کی کوشش کی۔ ایک ہی بیٹی تھی وہ بھی سرپھری، انہوں نے ٹھنڈی آہ بھری۔

"میں تو کہتی ہوں آپ بھی زیادہ دل نہ جلایا کریں۔ دواؤں کی کمپنیوں سے جو نمائندے آتے ہیں بھر بھر کر ان کی دوائیں مریضوں کو دیا کریں پھر ورلڈ ٹور لگائیں۔ نئی گاڑیاں نکلوائیں، عیش کریں اماں عیش۔"

جب وہ اپنی جون میں ہوتی تو ایسی ہی باتیں کرتی۔ عصمت بیگم نے اسے ایک دھموکا جڑا اور ساتھ ہی آرڈر جاری کیا۔

"گرین ٹی کپ میں نکالو اور اپنے بابا کو نیچے دے آؤ اور میرا کپ ادھر ہی لے آنا۔ وہ سوچ رہی تھیں۔" کافی کپڑے جمع ہو گئے ہیں ساتھ ہی ایک لوڈ مشین کا چلالوں۔"

اگلا پورا ہفتہ انہیں بات کرنے کی بھی فرصت نہ ملی، کام والی ملی نہیں، گھر اور باہر کی ذمہ داریاں نبھاتے نبھاتے وہ گھن چکر بنی ہوئی تھیں۔ ہانیہ کو عادت تھی، وہ اے لیول کے پیپر دے کر فارغ ہوئی تھی۔ ماں کو اس نے مصروف ہی دیکھا تھا۔ ابا ٹھنڈے آدمی تھے۔ سیدھی سادی نوکری پر جاتے، واپس آتے۔ ہانیہ کو ضرور ٹائم دیتے ورنہ دوستوں میں چلے جاتے، امی کو بڑی خواہش تھی وہ ایک آدھ پارٹ ٹائم نوکری اور کر لیتے لیکن ابا کہتے۔ "میں اپنی زندگی کو مشین نہیں بنا سکتا۔"

امی عالی دماغ خاتون تھیں، ایک زمانے میں دو دو اسپتالوں میں بھی نوکری کی مگر پھر تھک گئیں۔ انہیں اس بات کا بڑا قلق تھا کہ ابا نے ان کا بھی ساتھ نہ دیا۔ ہانیہ سوچتی اگر ابا بھی ان کا ساتھ دیتے تو شاید وہ بالکل ہی اکیلی پڑ جاتی۔ امی کا سارا خاندان ہی اعلیٰ تعلیم یافتہ بلکہ ڈگری یافتہ لوگوں سے بھرا پڑا تھا۔ بڑی بڑی ڈگریاں، بڑی بڑی نوکریاں تاکہ اس سے بنا سکیں بڑے گھر اور گاڑیاں اور ہانیہ کو اس تصور سے ہی نفرت تھی۔

"کیا فائدہ ایسے علم کا! جو صرف دنیا کمانے کا ذریعہ بنے اور جتنے بڑے گھر ہوتے ہیں۔ اتنے ہی دل تنگ ہوجاتے ہیں انسانوں کے۔"

وہ بڑے حساس دل کی مالک تھی اور چیزوں کو بڑی گہرائی میں جا کر دیکھتی تھی۔ اسی لیے جب اگلی بار تائی امی کا فون آیا۔ "آجاؤ ہانیہ، تمہاری پھپھو کی طرف چلتے ہیں۔" تو وہ پوری طرح تیار تھی۔

"تائی امی میرا بھی بڑا دل تھا پھپھو کی طرف جانے کا، پلیز ہادی سے کہیں، پہلے آپ کو بٹھائے پھر مجھے بھی پک کرے۔"

تائی امی سیدھی سی خاتون تھیں فوراً مان گئیں۔

"صحیح کہہ رہی ہو، چھٹی کا دن ہے آخر یہ ناکارہ کب تک سوئے گا۔" اور وہ دو دن تک خوشی خوشی عصمت بیگم کے سر پر گاتی رہی۔

"کیسا مزاج ٹھکانے لگایا ہادی صاحب کا۔"

آخر کو ای کا ہونے والا داماد بھی تھا اور ہانیہ کو دوسری عصمت بیگم بننے سے خوف آتا تھا۔ شوق کی بات الگ تھی مگر ماں کی زندگی سے اور کچھ سیکھا ہو یا نہ سیکھا ہو۔ یہ ضروری سمجھ لیا تھا کہ اللہ کی عطا کردہ فطری تقسیم پر راضی ہوجانا ہی سمجھ داری ہے۔ بالآخر رات کو کپڑے استری کرتے عصمت بیگم نے اس سے پوچھ ہی ڈالا۔

"تو تمہیں یہ خیال کیسے آیا کہ یہ ہادی کی ذمہ داری ہے؟ کہاں تو تم گاڑی لے کر اڑی اڑی پھرتی تھیں۔ بس کوئی موقع مل جائے ڈرائیو کر کے جانے کا۔" وہ مسکرائی پھر کہنے لگی۔

"غالباً ارسطو سے کسی نے پوچھا تم نے عقل مندی کس سے سیکھی تو اس نے جواب دیا بے وقوفوں سے بس امی یہ جو عورتوں کے لیے نعرہ لگایا ہے ناں! "ہم سب کچھ کرسکتی ہیں۔" ایک تصویر ہے جس میں اس کے چھ ہاتھ ہیں۔ بچے بھی سنبھالے، کمپیوٹر بھی چلائے، جھاڑو پوچا بھی کرے تو اس سے مجھے عقل آگئی، جس کا کام اسی کو ساجھے۔ اگر میں بھاگ بھاگ کر ہر ذمہ داری اپنے سر لیتی رہی تو ہادی صاحب کا وہی حال ہوجائے گا جو آپ کے صاحب کا ہے۔" اس نے شرارت سے کہا۔

امی نے ٹھنڈی آہ بھری۔

وہ مسکرائی، امی کا ہاتھ تھاما، استری کا سوئچ آف کیا اور ان کو کرسی پر بٹھایا۔

"تھوڑی دیر بیٹھ بھی جایا کریں۔" اس نے محبت سے ان کا ہاتھ دبایا اور عصمت بیگم کے پیروں میں بیٹھ کر، سر ان کی گود میں رکھ دیا۔ گہری سانس اندر اتاری تو سکون ہی سکون پھیل گیا۔ اس کا دل چاہا کائنات یہیں تھم جائے اور اس لمحے کا طلسم کبھی نہ بکھرے مگر وائے رے قسمت اس کی ماں کوئی عام عورت تو تھی نہیں، فون بجا، پریشر ککر کی سیٹی بجنا شروع ہوگئی۔ عصمت بیگم ہڑبڑا کر اٹھ گئیں جیسے انسان گہری نیند سے جاگ جائے۔

"ارے ہٹو! تم بھی کیا چونچلے لے کر بیٹھ گئیں۔" پھر وہ جو اٹھ کر بھاگیں تو پورا ہفتہ نہ مل سکیں۔ اتوار کے دن جب ان کا ایک پیر کچن میں دوسرا کمرے میں تھا۔ پورے ہفتے کے سالن بنانا، کچھ رول سموسے آئے گئے کی خاطر مدارت کے کے لیے پھر پورے ہفتے کی لانڈری، ایسے میں گھنٹی بجی اور ہادی صاحب فروٹ لے کر حاضر ہوگئے۔ انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

"یہ کس سلسلے میں بیٹے؟" ہادی نے جھینپ کر کہا۔

"گھر کے لیے لینے گیا تھا تو یہاں بھی لے آیا۔"

ہانیہ ٹھنڈے ٹھار آم کے جوس کے ساتھ، گھر کے بنے رول سموسے لے کر پندرہ منٹ میں حاضر ہوگئی سلیقے سے اوڑھا ہوا دوپٹا، جھکی جھکی نظریں، عصمت بیگم کے کلیجے میں ٹھنڈ پڑگئی۔

اپنے ابا کو بلاؤ، ہادی آیا ہے۔ انہوں نے ہانیہ سے کہا، ہادی رول سموسوں سے انصاف کرنے لگا اسے بچپن سے اپنی چچی کے ہاتھ کا ذائقہ پسند تھا۔

سارا گھر پھیلا پڑا تھا۔ عصمت بیگم کا دل برا

ہو رہا تھا۔ رہ رہ کر ہول اٹھ رہے تھے، وہ گھڑی کے ساتھ چلنے والی عورت تھیں۔ دل تو کہہ رہا تھا۔ سب چھوڑیں اور پاؤں پسار کر بیٹھ جائیں۔ ہادی کے چٹکلے، ہانیہ کے تجزیے، وقار صاحب کی لن ترانیاں ڈاکٹر ہونے کی وجہ سے ان کی شفٹ بھی بدلتی رہتی تھی۔

''بس یہ رول بنانا ضرور سیکھ لینا۔'' اس نے پلیٹ سے آخری رول بھی اٹھاتے ہوئے کہا۔

''آپ باہر کے کام کرلیں پھر گھر کے کاموں کے لیے بندی حاضر ہے۔'' ہانیہ نے سر تسلیم خم کرکے کہا۔ ''ایک بار باہر نکل جاؤں پھر گھر کا کام مجھ سے نہیں ہوتا بھئی!' ہانیہ نے باتوں باتوں میں جتایا۔

''چچی امی کو دیکھو گھر، باہر سب کتنے بہترین طریقے سے بیلنس کیا ہوا ہے۔'' وہ کہہ رہا تھا۔ پھر اس نے عصمت بیگم کو مخاطب کیا۔ ''آپ کتنی کمزور ہوتی جارہی ہیں کم از کم پارٹ ٹائم کردیں اپنی جاب کو۔'' پھر اس نے ہانیہ کو مخاطب کیا۔'' پارٹ ٹائم جاب تو آرام سے کرسکتی ہیں خواتین۔''

''گھر خود ایک فل ٹائم جاب ہے، عورت کے لیے تو پارٹ ٹائم بھی ڈیڑھ ڈیوٹی کی طرح ہوجاتی ہے۔ اور پھر ایک بار کیریئر کی ریس میں داخل ہوجاؤ تو واپسی کے دروازے بند ہوتے چلے جاتے ہیں۔'' وہ کہہ رہی تھی، عصمت بیگم خاموشی سے سنتی گئیں۔

''لیکن اگر خدانخواستہ کچھ ہو تو عورت کے پاس ڈگری تو ہونی چاہیے؟'' اب وہ اپنی کنفیوژن دور کرنا چاہ رہا تھا۔

اب وقار صاحب کود پڑے گفتگو میں۔ '' اسلام کے لحاظ سے دیکھو تو رشتہ داروں کی ایک طویل لسٹ ہے جو ایک کے بعد ایک عورت کے ولی مقرر ہوتے ہیں۔ سرمایہ دار ملکوں میں پورا سیٹ اپ ہے جو عورت کے کام کرنے کو سپورٹ کرتا ہے اور ایسا ماحول بناتا ہے۔ جہاں وہ یکسوئی سے کام کرے، رہ گئے ہم؟ انہوں نے ٹھنڈی آہ بھری۔ ''تو بھائی ہم ہیں چوں چوں کا مربہ، عقیدہ اسلام کا لے کر بیٹھے ہیں۔ زندگی سرمایہ دارانہ نظام کے تحت چلانی پڑتی ہے۔ تو ہمارے نہ مرد یکسو ہوپاتے ہیں نہ عورت۔'' اور ذرا گہرائی سے دیکھو، وہ پھر گویا ہوئے۔ ''ڈگری دو چار سال کام نہ کرو تو خود بھی بے کار سی ہوجاتی ہے۔ ایک کاغذ کا پرزہ جو بتاتا ہے آپ اس کام کے ماہر ہو اور پھر اگر آپ کام ہی نہ کرو تو وہ مہارت ضائع ہوجاتی ہے۔ ہر فیلڈ میں تبدیلیاں بھی تو آتی رہتی ہیں۔'' وقار صاحب نے سمجھانے کی کوشش کی۔

''ایک اور بات ہے۔'' عصمت بیگم نے اضافہ کیا۔ ''ایک کام جو زندگی میں آپ کو کرنا ہی کرنا ہے۔ اس کی تیاری کیوں نہیں؟ ''خدانخواستہ کے لیے پوری زندگی لگادیں؟''

ہادی نے نہ سمجھنے والے انداز میں ان کی طرف دیکھا۔ ''میری ایک دوست انجینئر ہے۔'' وہ گویا ہوئیں۔

''ہمارے زمانے میں دو ہی چیزیں زیادہ فیشن میں تھیں۔ ڈاکٹر یا انجینئر۔'' وہ خود ہی اپنی بات پر ہنسیں۔ ''تو میری وہ دوست اپنی چھوٹی بچی کو دودھ خوب پکا کر، کاڑھ کر پلاتی تھی تاکہ چار اونس کے دو اونس کرکے اسے پلائے۔ بچی دو اونس ہی پیتی تھی۔ اسے کتنے عرصے بعد پتا چلا زیادہ پکانے سے دودھ کی غذائیت ضائع ہوجاتی ہے۔ تو میرے بیٹے، بچوں کی تربیت، شوہر کی اطاعت، اپنے رب کی پہچان اور اس کے احکامات کی سمجھ اور گھر، ایک مسلمان عورت کے پاس تو کرنے کا کام بہت ہے کجا کہ غیر ضروری ذمہ داریاں اپنے سر لے لے۔ ترجیحات کا تعین بہت ضروری ہے۔

''یہ کہہ کر عصمت بیگم نے گھٹنوں پر ہاتھ رکھا اور کھڑی ہوگئیں۔ چولہے پر سالن رکھے تھے۔ مشین میں کپڑے انتظار کررہے تھے۔ سبزیاں صاف کرکے فرائی کرنی تھیں۔ سلاد تیار کرکے، گرم روٹی ڈال کر کھانا لگانا تھا اور پھر پورے ہفتے کی استری انہوں نے ٹھنڈی آہ بھری، ''شاید آنے والی نسلیں کچھ سیکھ لیں۔'' انہوں نے سوچا اور کچن کی راہ لے لی۔

نعیمہ ناز

شکستہ ہائے وفا

عاطف کو اس کی پھوپھی زاد، آرزو بڑے پراسرار انداز میں اپنے گھر لاتی ہے جہاں عاطف کے والد شہید احمد کی حالت قابل رحم اور عبرت ناک تھی۔ گھریلو حالات بھی دگرگوں تھے۔

عاطف کی پھوپھی عظمیٰ اپنے ماضی کو یاد کرتی ہیں۔

ثمینہ بیگم کی اپنی نند حمیرا سے کبھی نہیں بنی تھی۔ مگر حمیرا کے دونوں بچے ثمینہ بیگم کے بچوں سے محبت کرتے ہیں اور حمیرا ان کی شادی کی خواہاں تھی۔ ثمینہ اپنے بیٹے شہید کی شادی اپنی بھتیجی سے جبکہ ان کے شوہر اپنی بھانجی مہر بانو سے کرنا چاہتے ہیں۔

ثمینہ اپنے مرتے ہوئے بھائی کی خواہش پر شہید کا نکاح عفت سے کروا دیتی ہیں۔ یہ خبر حمیرا اور بچوں پر بجلی بن کے

مکمل ناول

کرتی ہے۔ عظمیٰ کی شادی پھوپھی کے گھر ہو جاتی ہے جبکہ مہر بانو کا رشتہ امیر کبیر اور حسین معیز سے ہو جاتا ہے۔ مہر بانو کی بدمزاجی، بدلحاظی کی وجہ سے روز گھر میں جھگڑے ہوتے ہیں۔ وہ ناراض ہو کر میکے آ جاتی ہے۔
شہید احمد کے دل میں مہر بانو کی محبت کا احساس عفت کو بے چین رکھتا ہے۔ وہ مزاجاً اپنی ساس کی طرح لڑاکا اور شکی ہے۔
عاطف کو پھوپھی کے حالات رنجیدہ کر دیتے ہیں، وہ ماں کے علم میں لائے بغیر روز والد کی خدمت کرنے جاتا ہے اور آرزو کے لیے نوکری کا بندوبست کرتا ہے۔

دوسری قسط

مہر بانو کا مزاج اگر آسمان پہ رہتا تھا تو حمیرا کا سوا نیزے پہ۔ مہر بانو کو سمجھانے کے بجائے وہ الٹا اسے شہہ دے رہی تھیں۔ میاں دبو اور زن مرید قسم کے تھے۔ ان کی مجال نہیں تھی کہ بیوی کے آگے یا ان کی مخالفت میں کچھ بول سکتے۔ انہیں بیوی اور بیٹی سے اختلاف تو تھا مگر بیٹی سے پیار بھی تھا۔ اس کا گھر اور زندگی بسائی ہوئی دیکھنا چاہتے تھے، اسی لیے اکیلے میں اسے بٹھا کر پیار سے سمجھانے کی کوشش کی مگر مہر بانو کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا، اسے تو شوہر کی یہ لاپروائی اور بے نیازی بری طرح کھل رہی تھی کہ وہ اب تک یعنی ایک ہفتہ گزرنے پر بھی نہ اسے منانے آیا نہ واپس لے جانے، رہ رہ کر غصہ آ رہا تھا۔ معیز عالم پر اس شادی پر اور اپنی زندگی پر۔
اس سے اچھا تو شہید تھا، کیسے میرے آگے پیچھے پھرتا تھا، ناز نخرے اٹھاتا تھا، یہ کم بخت عفت بیچ میں نہ آتی تو آج میں یوں جل جل کے نہ مر رہی ہوتی بلکہ شہید احمد میرے آگے پیچھے پھر رہا ہوتا، مجھے سر آنکھوں پہ بٹھا رہا ہوتا۔ مہر بانو کے دل سے آہیں نکل رہی تھیں اپنے لیے اور بددعائیں نکل رہی تھیں ان لوگوں کے لیے جن کی وجہ سے اس کی خوشیاں اس سے روٹھنے لگی تھیں، دور جا رہی تھیں۔ ان لوگوں میں اس کی ساس بھی شامل تھیں، معیز عالم بھی اور عفت بھی۔ اس کے روٹھ کر میکے آنے کا معاملہ اب کسی سے ڈھکا چھپا نہیں تھا۔ بات باہر نکل چکی تھی اور پھیل رہی تھی تب ہی تو ثمینہ اپنی نند کے گھر آئی تھیں، ہمدردی کی آڑ میں، زخموں پر نمک چھڑکنے اور جلتی پر تیل ڈالنے۔
"معیز عالم لینے نہیں آئے ابھی تک مہر بانو کو؟"
چائے کے گھونٹ لیتی ثمینہ بیگم نے انجان بن کر سوال کیا۔
"آ جائیں گے، خود ہی چھوڑا ہے دو تین ہفتوں کے لیے، طبیعت خراب ہو گئی تھی تو انہوں نے آرام کے لیے یہاں بھیج دیا۔ سسرال میں آرام بھلا کہاں ملتا ہے۔ چاہے نوکر چاکر ہوں پھر بھی ذمہ داری، ذمہ داری ہے۔" حمیرا باتوں کے طوطا مینا بنانے میں ماہر تھیں۔ گھر کی اندر کی بات چھپانا بھی چاہتی تھیں۔ سو لمبی چوڑی تقریر جھاڑنے لگیں، مگر ان کے سیر کے مقابلے میں مہر بانو سوا سیر تھیں۔ نند کا چہرہ بغور دیکھا اور بڑے اطمینان سے گویا ہوئیں۔
"پورے خاندان میں اور محلے بھر میں خبر پھیلی ہوئی ہے کہ مہر بانو سسرال سے ناراض ہو کر میکے آ کر بیٹھ گئی ہے اور وہاں سے کوئی یہاں پھٹکنے کا نام نہیں لے رہا۔" وہ گھونٹ گھونٹ چائے پیتے ہوئے زخموں پہ نمک چھڑک رہی تھیں اور حمیرا خون کے گھونٹ پیتے ہوئے ان کی تردید کر رہی تھیں۔
"کل ہی میری بات ہوئی تھی فون پہ، انہیں تو بس مہر بانو کی فکر ہے۔ کہہ رہے تھے کہ آپ جب کہیں میں لینے آ جاؤں۔ میں نے کہا کہ میاں، شادی کے بعد اب تو ذرا رکنے آئی ہے ہماری بیٹی تو رہنے دو، کچھ دن اور۔"
حمیرا بیگم کی زبان فراٹے سے جھوٹ اگل رہی تھی۔ ایک لمحے کو تو ثمینہ جیسی گھاگ عورت بھی شک

میں پڑ گئی کہ جو بات محلے اور خاندان میں پھیلی ہے وہ سچ ہے یا حمیرا بیگم کا کہا درست ہے؟ مگر اگلے ہی لمحے مہربانو کی اتری ہوئی صورت نے ان پہ سب کچھ واضح کر دیا تھا گو کہ مہربانو اچھے لباس، زیور اور میک اپ میں تھی مگر میک اپ کی تہوں سے پریشانی چھلک کر باہر آ رہی تھی۔ جسے ان کی جہاں دیدہ نظروں نے بھانپ لیا تھا۔

"چلو، تم کہہ رہی ہو تو پھر ٹھیک ہی کہہ رہی ہو گی، ویسے بھی بھئی' بیٹیاں تو اپنے گھروں میں ہی اچھی لگتی ہیں، میکے میں تو بس مہمان سمان ہوتی ہیں۔" ثمینہ بیگم تو بول بال کر چل دیں، اگلے دن عظمیٰ گھر آ کر ماں پہ خوب غصہ ہوئی۔

"آپ کو کیا ضرورت تھی میرے گھر آ کر یہ سب فضول باتیں کرنے کی۔ مہر، ایک ہفتہ رکے میکے میں یا چار ہفتے، آپ کو کیا۔ آپ کے جانے کے بعد دونوں ماں بیٹی میرے پیچھے پڑ گئیں کہ میں نے ہی آپ کو بتایا ہوگا، ارسلان کو بھی بھڑکا دیا، وہ بھی مجھ پہ غصہ کر رہے تھے کہ میں سسرال کی ساری رپورٹیں میکے میں دیتی ہوں۔" بولتے بولتے عظمیٰ روہانسی ہو گئی پھر دوبارہ بولنے لگی۔

"اپنے کام سے کام رکھیں آپ، کیا ضرورت ہے کسی کے معاملات میں بولنے کی، ہر کوئی اپنا اچھا برا خوب سمجھتا ہے، یہ تو سوچ لیتیں کہ وہ بیٹی کا سسرال بھی ہے۔"

"اچھا بس، اتنی باتیں سنانے کی ضرورت نہیں ہے اور سسرال والوں سے اتنا دبنے کی اور انہیں سر پہ چڑھانے کی — ضرورت بھی نہیں ہے۔ اس میں تو کوئی شک نہیں ہے کہ وہ میکے میں بیٹھی ہوئی ہے، میں نے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔" ثمینہ بیگم بیٹی کی خفگی پر ناراض ہونے لگیں۔

★ ★ ★

مہربانو اب شدت سے معیز کا انتظار کر رہی تھی مگر وہاں بالکل خاموشی تھی۔ فون کرنے کا سوچا مگر انا آڑے آ رہی تھی۔ حمیرا نے بھی بیٹی کی کمر ٹھونکی۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے فون کر کے بلانے کی، ایک بار مرد کے آگے عورت جھک جائے تو ساری عمر جھکا کے رکھتا ہے۔ بڑے بدذات ہوتے ہیں یہ مرد کم بخت، خصوصاً جب وہ شوہر ہو۔" حمیرا اپنے فرمودات بیٹی کے کانوں میں اُنڈیل دیتیں۔ یہ سوچے بغیر کہ ہر مرد ان کے شوہر کی طرح نہیں ہوتا۔ ان کے شوہر فطرتاً دبّو کمزور اور جی حضور قسم کے تھے، حمیرا دوسروں کو دباؤ میں رکھنے والی دبنگ قسم کی عورت، سو اپنے شوہر کی ناک میں نکیل ڈال رکھی تھی' جہاں چاہے گھما لیتیں، معیز عالم ایک مختلف انسان تھے' وہ اپنے سسر سے بالکل الگ تھے اور مہربانو، اپنی ماں جیسی بننا چاہ رہی تھی، شوہر کو اپنے اشاروں اور مرضی پہ نچانے والی۔

معیز عالم اپنے گھر اور گھر کی عزت کے حوالے سے بہت حساس تھے۔ ان کے رشتے داروں میں بھی چہ میگوئیاں ہونے لگی تھیں۔ ایک آدھ دن میکے میں رہنے والی بیوی کو ایک ماہ سے زائد ہو جائے میکے میں رہتے ہوئے تو دوسرے لوگوں کو تشویش تو ہو گی ہی، ان کی فیملی کے متعلق ہونے والی سرگوشیاں ان کے کانوں تک بھی پہنچ رہی تھیں۔ یوں تو مہربانو کو لینے وہ بھی جا سکتے تھے کہ بات ختم ہو جاتی' وہ گھر آ جاتی مگر وہ سوچ رہے تھے کہ اگر ایک بار اپنی انا اور خودداری کو بالائے طاق رکھ کر اسے لینے چلے گئے تو اس کی خود سری مزید بڑھ جائے گی۔

اور سچ تو یہ تھا کہ مہربانو سے جو نکاح کا بندھن قدرت نے باندھا تھا اس کی وجہ سے ان کے دل میں بیوی کا ایک مقام تھا، خیال تھا مگر مہربانو نے کوئی ایسی خاص کوشش اور جتن نہیں کیے کہ ان کے دل میں موجود مقام کو اپنے لیے خاص بنا سکتی یا اپنے رویے زبان اور سلوک سے شوہر کے دل میں محبت کی جوت جگاتی۔ مہربانو نے بس یہ سوچ لیا تھا کہ اس کا خوب صورت چہرہ محبت کو خود بخود اس کے قدموں میں ڈال دے گا مگر دلوں میں گھر کرنے کے لیے صورت کی نہیں سیرت کی خوب صورتی ضروری ہوتی ہے، زبان اور حسن سلوک کی مٹھاس دوسروں کو گرویدہ بنا لیتی ہے۔

مہر بانو کی تلخ زبان اور رویے نے معیز عالم اور ان کی ماں کو سخت مایوس کیا تھا۔ انہیں نہیں لگتا تھا کہ مہر بانو میں کوئی تبدیلی آ سکتی ہے۔ وہ اپنے اصل رنگ ڈھنگ کے ساتھ ان کے سامنے آ گئی تھی۔ یہ رنگ ڈھنگ ان دونوں کے لیے قابل قبول نہیں تھے۔ پھر بھی وہ یک طرفہ فیصلے کر کے کسی پہ ظلم نہیں کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے ایک معتبر ذریعے سے مہر بانو کو پیغام بھجوایا کہ وہ اسے لینے کے لیے گاڑی بھیجیں گے، وہ بیٹھ کر آ جائے، مہر بانو اس پر راضی نہیں تھی، اس کی زخمی انا کو تسکین تب ہی ملتی جب معیز عالم خود اسے لینے آتے، ماں سے مشورہ کر کے اس نے پیغام لانے والے کے ذریعے کہلوایا کہ معیز عالم خود لینے آئیں اور واپس جانے کے لیے اس کے کچھ مطالبات اور شرائط ہیں وہ تسلیم کریں تو وہ واپس آئے گی۔

معیز عالم کو بیوی کی ہٹ دھرمی پہ غصہ آیا اور ان کی والدہ کو افسوس ہوا۔ مگر دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں کہ جن کے لیے تقدیر نے بدقسمتی نہیں لکھی ہوتی بلکہ اپنی شامت اعمال سے وہ اپنی بدبختی کو خود دعوت دیتے ہیں۔ مہر بانو بھی ان ہی میں سے ایک تھی۔ وہ اپنی بدنصیبی کو خود آوازیں دے کر بلا رہی تھی۔

جس دن اسے پتا چلا کہ اس کے وجود میں ایک اور زندگی پرورش پا رہی ہے اس کا مزاج اور ساتویں آسمان پر پہنچ گیا۔ اس نے معیز عالم کو خود فون کیا۔

''کیسی ہو؟'' وہ کچھ حیران اور کچھ بے یقین سے تھے۔

''ٹھیک ہوں، ایک خوش خبری ہے آپ کے لیے۔'' مہر بانو نے چند لمحوں کا ڈرامائی وقفہ دیا۔

''آپ باپ بننے والے ہیں۔''

معیز عالم نے ہمیشہ کی طرح اپنے جذبات کا کھل کر اظہار نہیں کیا۔ کہا تو فقط اتنا کہ ''یہ تو بہت اچھی خبر ہے۔ امی سن کر بہت خوش ہوں گی۔ گھر آ جاؤ مہر، بہت تماشا ہو گیا ہے ہمارا۔''

''آؤں گی مگر ایک شرط پہ۔''

''پھر وہی شرط؟'' معیز زچ ہو گئے، ''تم ابھی تک بچی بنی ہوئی ہو۔ تمہیں سمجھانے والا کوئی نہیں؟ زندگی اس طرح گزاری جاتی ہے، شرطوں پر؟''

''میں بچی نہیں ہوں، سب عقل ہے مجھے۔'' مہر بانو کو غصہ آ رہا تھا۔ معیز کا ردعمل اس کی توقع کے برخلاف تھا۔ وہ تو سوچ رہی تھی کہ خوشخبری سنتے ہی معیز خوشی سے پاگل دیوانہ ہو جائے گا۔ جو کہے گی مان لے گا مگر وہ تو اب بھی ماش کا آٹا بنا اینٹھ رہا تھا۔

''مجھے الگ رہنا ہے۔'' مہر بانو نے توپ کا گولہ داغ دیا۔

''کس سے الگ؟ مجھ سے الگ تو تم رہ ہی رہو۔''

''آپ کے ساتھ رہنا ہے مگر آپ کی ماں سے الگ۔''

''میری ماں تمہاری کچھ نہیں لگتیں؟ تم بات کس طرح کر رہی ہو؟'' معیز عالم کو ٹھیک ٹھاک غصہ آ گیا۔ اس کی شرط پر بھی، اس کے الفاظ پر بھی اور اس کے لہجے پر بھی۔

سیدھی سی بات ہے کہ وہ مجھے پسند نہیں کرتیں، میں کب تک ان کی زبان برداشت کروں۔''

''زبان سنبھال کر بات کرو، تم میری ماں کے متعلق بات کر رہی ہو۔'' معیز غرائے۔ وہ ان بیٹوں میں سے تھے جو اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اپنی ماں کو مرکز محبت بناتے ہیں۔ ان کے ادب و احترام میں کوئی کسر، کوئی کمی نہیں چھوڑتے، وہ اپنی ماں کے متعلق اس طرح کی باتیں کیسے برداشت کر سکتے تھے۔

''میں اپنی بات کر رہی ہوں، مجھے الگ رکھیں گے یا نہیں؟'' مہر بانو کو دبنا نہیں آتا تھا۔

''اگر تمہاری یہی ضد ہے تو پھر دیکھو' میں تمہیں ایسا الگ رکھتا ہوں کہ ساری زندگی یاد کرو گی۔''

☆☆☆

صاف رنگت' دبلا پتلا سراپا، کندھوں سے ذرا نیچے تراشیدہ بال' مستعد اور پھرتیلی سی خاتون تھیں جن کا نام ثاقبہ خان زادہ تھا۔ ایک مختصر اور ہلکے پھلکے

انٹرویو کے بعد انہوں نے اپنی ساس سے بھی ملوایا تھا۔ گوری چٹی، بھاری بھرکم سی خاتون تھیں۔ بہت زیادہ عمر رسیدہ تو نہیں تھیں مگر مختلف بیماریوں نے وقت سے پہلے ہی بوڑھا کر دیا تھا۔ بلند فشار خون کی مریضہ تھیں۔ دو تین مختلف آپریشن بھی ہو چکے تھے۔ ان کی دیکھ بھال، خوراک اور دوائیوں کا خیال رکھنا تھا۔ بلکہ چوبیس گھنٹے ان کے ساتھ ہی رہنا تھا۔ گھر میں ملازم تھے، صاحب خانہ ملک سے باہر اور بیگم صاحبہ ملازمت پیشہ تھیں۔ بیگم ثاقبہ نے آرزو کو رکھنے کا عندیہ دے دیا تھا۔ ساتھ میں اس کی امی اور ماموں کو رہنے کی بھی اجازت تھی۔ تنخواہ معقول تھی۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ فی الحال ان کے رہنے کا ٹھکانہ ہو گیا تھا جہاں انہیں کرایہ دینے، بجلی، گیس کے بل اور پانی بھرنے کی فکر نہیں تھی۔ عاطف مطمئن تھا، عظمیٰ پھپھو بھی، مگر آرزو شاید ناخوش تھی یا پھر یہ شاید اس کے چہرے کا مستقل حصہ بن گیا تھا۔

واپسی پر عاطف معمول سے زیادہ تیز ڈرائیو کر رہا تھا۔ انہیں اورنگی ٹاؤن پہنچا کر اسے واپس ماڈل کالونی اپنے گھر آنا تھا۔ چھ بجے کا وقت دیا تھا ماں نے، اس وقت چھ بجنے میں پانچ منٹ تھے۔ انہیں پہنچانے میں اور گھر واپسی میں آدھ، پون گھنٹہ تو لازمی لگنا تھا۔

''کھانا کھا کر چلے جانا۔'' گھر پہنچ کر عظمیٰ پھپھو گاڑی سے اترتے ہوئے کہنے لگیں۔

''گھر پہ مہمان میرا انتظار کر رہے ہیں، بس ابھی تھوڑی دیر میں امی کا فون آنے والا ہے۔'' عاطف نے معذرت کی۔

''کیسے مہمان؟''

''کوئی لڑکی دیکھی ہے میرے لیے، ان ہی لوگوں کو بلایا ہے۔''

''اچھا۔'' عظمیٰ پھپھو کا چہرہ نہ جانے کیوں تاریک سا ہو گیا۔

''ٹھیک ہے پھر تم جاؤ، اللہ خوش رکھے تمہیں۔'' انہوں نے ایک گہری سانس لی۔

''میں کل آؤں گا، اپنا سامان ریڈی رکھیے گا، شفٹنگ کروا دوں گا۔ ٹھیک ہے' خدا حافظ۔''

''خدا حافظ۔'' وہ کھڑکی چھوڑ کر گاڑی سے پیچھے ہٹ گئیں۔

عاطف نے واپسی پہ گاڑی کی رفتار اور بھی تیز کر رکھی تھی۔ موبائل بج رہا تھا۔ اس نے گاڑی ایک طرف روک کر امی کی کال سنی۔ حسب توقع وہ غصہ کر رہی تھیں۔

''کہاں ہو تم، تمہارے چھ نہیں بجے ابھی تک؟''

''ٹریفک میں پھنسا ہوا ہوں امی، جیسے ہی کھلتا ہے میں آ رہا ہوں۔'' عاطف نے پہلی بار کراچی کے شدید ٹریفک جام کو دعائیں دیں جس کی بدولت اس کا جھوٹ چل گیا ورنہ امی کی ڈانٹ اور غصہ، اللہ دے اور بندہ لے' موبائل بند کر کے اس نے گاڑی اور تیز بھگائی۔ گھر پہنچا تو پونے سات بج رہے تھے۔ نہا دھو کر دوسرے کپڑے پہن کر جب وہ مہمانوں سے ملا تو سات بج رہے تھے۔ پانچ منٹ وہ مہمانوں سے دیر سے آنے کی معذرت کرتا رہا اور وہ خوش اخلاقی سے ہنس ہنس کر ''کوئی بات نہیں۔ ٹریفک ہی ایسا ہے یہاں کا۔ دیر ہو ہی جاتی ہے۔'' قسم کی باتیں کر کے اس کا احساس جرم کم کرنے کی کوشش کرتے رہے۔

فیملی اچھی تھی، ملنسار، خوش اخلاق ہنسنے ہنسانے والے لوگ۔ لڑکی کے والدین تھے، ایک بڑا بھائی اور بڑی بہن دونوں شادی شدہ تھے۔ ثانیہ سب سے چھوٹی اور سب کی لاڈلی تھی۔ بی ایس سی آنرز کر رہی تھی، بڑی بہن ثانیہ اور اس کے مشاغل، تعلیم اور دلچسپیوں کے بارے میں تفصیل سے بتا رہی تھیں، امی خوش ہو کر سن رہی تھیں۔

مہمانوں کے جانے کے بعد وہ عاطف سے مخاطب ہوئیں۔

''اگلے ہفتے منگنی کی رسم ادا کر دیں؟''

''فائنل کر لیا آپ نے؟'' عاطف کا دل بہت زیادہ تو نہیں مگر تھوڑا سا افسردہ ہو رہا تھا اور وہ اپنے دل کی اس افسردگی کی وجہ جاننا نہیں چاہتا تھا۔ جو راستے اور منزلیں دسترس سے باہر نظر آئیں، ان پہ قدم رکھنا اور سفر کرنا، خود کو بھی اذیت میں مبتلا کرنا ہے اور اپنے ہم سفر کو

بھی۔ وہ ماں کا خوش و خرم چہرہ دیکھ رہا تھا اور بس۔

"فائنل کر کے ہی تو ان لوگوں کو بلایا ہے۔" امی ہنس پڑیں "پگلا ہی ہے تو۔"

"جیسے آپ مناسب سمجھیں۔" عاطف کاؤچ پہ لیٹ گیا۔

"تم تو خوش ہو نا؟"

"آپ خوش ہیں تو میں بھی خوش ہوں۔"

"جیتا رہ میرے چاند۔" امی بہت خوش تھیں، عاطف ان کی امیدوں کا واحد مرکز تھا، زندگی کی ساری خوشیاں اسی سے وابستہ تھیں۔

عاطف آج رات بہت دیر تک جاگتا رہا، کچھ عرصے پہلے تک زندگی کسی حد تک سیدھے سادے انداز میں گزری تھی۔ پھر اچانک ہی آرزو اس کے سامنے آئی اور پھر عظمیٰ پھپھو، شہید احمد۔ ایک سست روی سے، دھیرے دھیرے بہتی ہوئی ندی اچانک ہی بپھرتے سمندر کے کسی بھنور میں جا گری تھی۔ وہ اکثر سوچتا تھا کہ یہ سلسلہ کب تک یونہی چلے گا، وہ جانتا تھا کہ اس دنیا میں، اپنی زندگی میں کسی راز کی حفاظت کرنا بڑا کٹھن کام ہے۔ راز تو ہوتے ہی فاش ہونے کے لیے ہیں۔ اگر امی کو پتا چل گیا کہ وہ...... اس سے آگے عاطف کچھ نہیں سوچتا تھا۔

ایسے دکھوں کے بارے میں وہ نہیں سوچتا تھا، جو اسے یا ماں کو درپیش ہونے والے ہوں، جن غموں کے پہنچنے کا امکان ہو انہیں اپنے خیالات سے پرے جھٹک دیتا تھا جیسے کبوتر بلی کو دیکھ کر اپنا سر ریت میں چھپا لے، آرزو کے متعلق دل نے خواہش کی، سوچنے کی کوشش کی، مگر وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ بعض خواب محض خوش فہمی ہوتے ہیں جن کے پورا ہونے کا کوئی امکان نہیں ہوتا اور اسے یہ بھی علم تھا کہ اس خواہش کے آگے صرف اور صرف دکھ ہے، صرف اس کے لیے نہیں بلکہ اس سے وابستہ اور بھی لوگوں کے لیے۔

اس کے تصور میں بار بار عظمیٰ پھپھو کا چہرہ آ رہا تھا، جب اس نے اپنے رشتے کا ذکر کیا، کیسی مایوسی اور بے چارگی پھیلی تھی ان کے چہرے پہ، عاطف کو دیکھ کر بہت افسوس ہوا تھا، اب تک ہو رہا تھا، اور اس بات پر بھی ہو رہا تھا کہ وہ اس مایوسی اور بے چارگی کو ختم نہیں کر سکتا تھا۔ بہت دیر سوچنے کے بعد اس نے بالآخر خود کو بستر پہ ڈال دیا۔ بس اللہ ہی ہے جو سب پر تمام معاملات میں رحم کرنے والا ہے۔ سونے سے پہلے وہ بس یہی سوچ رہا تھا۔

اگلے روز آفس سے وہ سیدھا اورنگی ٹاؤن گیا۔ آج ان تینوں کو، بیگم ثاقبہ کے گھر پہنچنا تھا۔ عظمیٰ پھپھو کے گھر پہنچا تو وہ تیار ہی بیٹھی تھیں۔ ایک چھوٹا سا بیگ ان کے قریب رکھا تھا۔ یہ بیگ عاطف نے ہی دو چار دن پہلے انہیں لا کر دیا تھا۔ اپنے اور آرزو کے مختصر سے جوڑے اور دوسرا اسباب انہوں نے اس بیگ میں رکھ دیا تھا۔

"باقی سامان، میں کل پہنچا دوں گا۔" عاطف نے ان سے کہا۔

"کون سا سامان؟" پھپھو دھیرے سے مسکرائیں۔

"یہ سب تو مالک مکان کا ہے، انہوں نے دیکھا کہ ہمارے پاس کچھ نہیں ہے تو ہمارے استعمال کے لیے یہیں چھوڑ دیا۔ ہم تو بس اپنے تن کے کپڑوں کے ساتھ آئے تھے یہاں۔"

"چلیں؟" عاطف نے ایک گہری سانس لی اور شہید احمد کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ ان کی حالت میں کافی بہتری آتی جا رہی تھی۔ عاطف کے سہارے چل کر وہ باہر آئے اور اس کی مدد سے گاڑی میں بیٹھ گئے۔ آج ان کی سہولت کی خاطر اس نے گھر کے سامنے ہی کار کھڑی کی تھی۔ آرزو خاموش تھی، بالکل چپ، جیسے کسی نے منہ پہ تالا لگا دیا ہو۔

بیگم ثاقبہ کو عاطف نے فون کیا تھا، وہ گھر پر ہی تھیں۔ عاطف ان تینوں کو لے کر ملیر کینٹ ان کے بنگلے پہ پہنچا، شہید احمد کو سرونٹ کوارٹر میں پہنچایا۔ دو کمروں کا مختصر سے لاؤنج، کچن اور باتھ روم پہ مشتمل وہ کوارٹر ضروری ساز و سامان سے بھی آراستہ تھا۔ ایک بیڈ پڑا ہوا تھا۔ ایک الماری بھی تھی۔ عاطف گھوم پھر کر پورے کوارٹر کا معائنہ کر کے دل ہی دل میں طے کر رہا تھا کہ اسے ضرورت کا کیا کیا سامان

مہیا کرنا ہے۔ گوکہ اسے اچھی طرح اندازہ تھا کہ اس کی اس عنایت کو آرزو نہ تو پسند کرے گی نہ ہی قبول۔ "ٹھیک ہے میڈم، آپ اپنے مزاج سے مجبور ہیں اور میں اپنی عادت سے۔" عاطف مسکرایا۔

"اپنے اور امی کے لیے آرزو نے بستر نیچے ہی لگا لیا تھا۔ ابھی تو پچھلے گھر سے ہی ٹھیک سے مانوس نہیں ہوئی تھی کہ پھر سے اگلے پڑاؤ کی طرف اذن سفر، ایک ہاتھ گال کے نیچے رکھے پہلو کے بل لیٹی وہ سوچ رہی تھی۔ تو اب زندگی اس طور گزرے گی؟ جو مانوس تھے کبھی، اجنبی بن گئے اور اجنبی جو ہیں آہستہ آہستہ مانوس بنتے جا رہے ہیں۔ چاہے وہ مقامات ہوں یا چہرے سوچتے سوچتے اس نے گھبرا کر کروٹ بدلی۔

جو راہیں ہمارے لیے نہ ہوں ان پر قدم رکھنا بے وقوفی کے سوا اور کچھ نہیں، سختی سے آنکھیں میچے وہ اس سے بھی زیادہ سختی سے دل کو باور کرا رہی تھی، جس رستے پہ واضح طور پر "نو گوایریا" اور "آگے راستہ بند ہے" کے بورڈز لگے نظر آ رہے ہوں، وہاں قدم رکھنا، آگے بڑھنا اور منزل کی توقع رکھنا حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔

آرزو کے باہر سختی اور تلخی کا خول ویسا ہی تھا مگر اندر سے یہ خول کچھ تڑخ رہا تھا۔ آرزو نہیں چاہتی تھی، یہ خول تڑخے مگر کوئی اور طاقت بھی تھی جو اس پر اثر انداز ہو رہی تھی۔ یہ کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ؟ وہ حیران بھی ہو رہی تھی اور خوف زدہ بھی، وہ جو بالکل ہی دسترس سے باہر اتنے فاصلوں پر ہے کہ زندگی ختم ہو جائے گی مگر فاصلے ختم نہیں ہوں گے، پھر ایسی خواہش کیوں بے دار ہو رہی ہے، ایسی تمنا کیوں جاگ رہی ہے؟

"خود کو سنبھالو آرزو بی بی۔" آرزو نے اپنے آپ کو ڈانٹا۔ "کیوں آگ میں کودنے چلی ہو، جل جاؤ گی، خاک ہو جاؤ گی۔" دماغ ڈانٹ بھی رہا تھا، سمجھا بھی رہا تھا، دل ایسی بے بسی اور بے کسی سے دم سادھے بیٹھا تھا کہ بس، نہ بھی آئے تو رحم آ ہی جائے ترس آ ہی جائے۔

"کسی پہ بھروسا نہیں ہے مجھ کو نہ اپنوں پر نہ دوسروں پر اور نہ ہی خود پر، بہتر ہے کہ قدم زمین پر ہی رہیں، زیادہ ہواؤں میں اڑنے کی کوشش کی تو منہ کے بل گرو گی۔" جب تک نیند کی پریاں مہربان نہیں ہوئیں، وہ خود کو ملامت کرتی رہی۔

اگلے دن باقاعدہ اس کی نوکری کا آغاز تھا۔ آج رات سے اسے سونا بھی بڑی بی کے ساتھ تھا، ان کے کمرے میں، اب تو عرصے سے علی الصباح بیدار ہونے کی عادت پڑ گئی تھی۔ بیگم ثاقبہ نے سات بجے آنے کو کہا تھا اس نے پہلے امی اور ماموں کو ناشتہ بنا کر دیا کہ وہ دونوں بھی اس نئی جگہ بہت جلدی بیدار ہو گئے تھے۔ سات بجے وہ بنگلے میں اندر گئی۔ بیگم ثاقبہ اپنی ساس کے کمرے میں تھیں۔

"آؤ، میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی۔" آرزو کو دیکھ کر وہ دوستانہ انداز میں مسکرائیں۔ پھر انہوں نے آرزو کو وہ سب کچھ ایک بار پھر سمجھایا جو وہ کل بھی بتا چکی تھیں۔ اپنی ساس کے معمولات، خوراک، دوائیں، احتیاط سب کچھ اسے اچھی طرح ذہن نشین کرا کر وہ اپنی تیاری کرنے چلی گئیں۔

آرزو کچن میں آ گئی۔ بڑی بیگم صاحبہ کے لیے ناشتہ بنانے۔ وہاں مسرت پہلے سے موجود تھی، وہ بھی ملازمہ تھی، بیگم ثاقبہ نے اس سے بھی تعارف کرایا تھا۔

"بی بی صاحبہ کا ناشتہ بنانا ہے۔" آرزو اس کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔

"وہی بنا رہی ہوں۔" مسرت پورج بنا رہی تھی۔ سانولی رنگت کی لمبی تڑنگی مضبوط کاٹھی کی عورت تھی۔ لہجہ کھردرا مگر مزاج اچھا تھا۔ وہ آرزو سے مخاطب تھی۔

"آج تو میں بتا دیتی ہوں، کام سمجھ لو، کل سے کر لینا۔"

"اچھا۔" آرزو اس کے پاس کھڑی اسے دیکھتی رہی۔ تمام خیالات، دماغ سے جھٹک دیے، جو کام آگے جا کر کرنا ہے، اسے پوری لگن، ایمان داری اور دل جمعی کے ساتھ سیکھنا چاہیے۔

☆☆☆

مہربانو نے جانے سے انکار کر دیا تھا۔ معیز عالم

نے لے جانے سے انکار کر دیا تھا۔ مہر بانو کے غرور کو بڑی سخت چوٹ پہنچی تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ خوشخبری سنتے ہی وہ کچے دھاگے کی طرح بندھا چلا آئے گا اور مہر بانو جیسے چاہے اس دھاگے کو اپنی مرضی کے مطابق موڑ لے گی مگر معیز عالم تو جیسے لوہے کی دیوار بن گیا تھا، سر پھوڑ کر اپنا ہی سر زخمی کر لو۔ دراصل معیز عالم کے پندار کو بھی تو خاصی چوٹ پہنچی تھی اپنی خانگی زندگی کے متعلق قریبی لوگوں کی سرگوشیاں ، باتیں اور افواہیں سن کر انہیں بہت خفت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اپنے گھریلو اور نجی معاملات کا اپنے کمرے سے باہر جانا پسند نہیں کرتے تھے کجا یہ کہ وہ گھر سے باہر لوگوں کی زبان کے چٹخاروں کا سبب بنے، وہ چاہتے تو تھے کہ مہر بانو گھر آ جائے اور لوگوں کی زبانیں اور منہ بند ہوں مگر مہر بانو نے واپس آنے کی جو شرط رکھی تھی وہ انہیں ذرہ برابر بھی قبول نہیں تھی۔ ناراضی اور فاصلے بڑھ رہے تھے، معاملہ طوالت اختیار کر رہا تھا۔ مصالحت کی راہ پر چلنے کو دونوں میں سے کوئی تیار نہ تھا۔

حمیرا نے بیٹی کو یہ بات سمجھائی کہ بچے کی پیدائش تک انتظار کر لے بس پھر معیز عالم چاروں شانے چت ہوا کہ ہوا، مہر بانو نے یہ بھی کر لیا۔ کڑکتی سردیوں کی ایک بہت ہی ٹھنڈی رات میں بہت پیارے سے گل گوتھنے بیٹے کو جنم دے کر اس نے سوچا کہ اب اس کے اور معیز عالم کے درمیان سرد مہری کی جو برف ہے وہ پگھل جائے گی اور اس برف کے ساتھ ساتھ معیز عالم بھی پگھل جائے گا۔ اس کی توقع کسی حد تک پوری ہوئی، پوتے کا سن کر دادی آئیں، ڈھیروں ڈھیر مٹھائی لے کر، پوتے کو دیکھ کر بہت ہی خوش تھیں، ساری باتیں فراموش کر دیں۔

''گھر چلو مہر بانو، اللہ نے خوشی کا موقع دکھایا ہے۔ اسے سب کے ساتھ مل کر مناؤ۔ بچے کو تمہارے ساتھ ساتھ باپ کی بھی ضرورت ہے۔'' وہ بڑی بن کر سمجھا رہی تھیں۔

''معیز کب آئیں گے؟'' مہر بانو نے نخوت سے سوال کیا۔

''میں معیز سے بڑی ہوں، میں آ گئی، کیا یہ کافی نہیں؟'' وہ ابھی تک بردباری سے کام لے رہی تھیں۔

''جی نہیں، یہ کافی نہیں ہے۔'' مہر بانو نے بے حد تنفر سے اپنی ساس کو دیکھا۔ بڑھیا سے جتنا پیچھا چھڑانے کی کوشش کر رہی ہوں اتنا ہی مجھ سے چپک رہی ہے۔

''آپ ہی سمجھائیں مہر بانو کو۔'' انہوں نے مدد طلب نظروں سے اپنی سمدھن کو دیکھا۔

''ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہے بچی، اتنے مہینوں خبر نہیں لی، پلٹ کر نہیں دیکھا کہ کس حال میں ہے۔ اب بھی آپ کے بیٹے کی اکڑ نہیں گئی، اپنے بچے کو دیکھنے تک نہیں آیا۔ خدا جانے، کس نے بھڑکایا ہوا ہے، کیا تعویذ گنڈے کروائے ہیں کہ بیوی کی فکر نہیں ذرا بھی نہ بچے کو دیکھنے کا ہوش، برا مت مانیے گا، رشتہ تو اصل میں آپ کے بیٹے سے ہے۔ نکاح کے دو بول اسی کے ساتھ پڑھوائے تھے۔ آپ سے بھی جو واسطہ تعلق بنتا ہے وہ اسی کی وجہ سے بنتا ہے۔ بیٹے کو بھیجنا چاہیے تھا، بجائے اس کے، خود اٹھ کر چلی آئیں۔'' حمیرا نے ایسے کڑوے لہجے میں یہ سب کہا کہ وہ جہاں کی تہاں بیٹھی رہ گئیں۔

آئی تھیں خوشی خوشی، واپسی بڑے بوجھل اور بجھے بجھے دل کے ساتھ ہوئی۔ بیٹا منتظر تھا کہ شاید بزرگی کا لحاظ کر کے مہر بانو مان جائے، واپس آ جائے، مگر ماں کو اکیلا دیکھ کر اتنا جھٹکا نہیں لگا جتنا انہیں اداس بلکہ رنجیدہ دیکھ کر وہ ٹھٹک گیا۔

''کیا ہوا امی؟'' معیز نے سنجیدگی سے انہیں دیکھا۔

''بیٹا، میرا خیال ہے کہ مہر بانو کو لینے تم کو ہی جانا چاہیے، آخر کو شوہر تم ہو، اصل رشتہ تو تم سے ہے۔'' وہ دل گرفتگی کے عالم میں گویا ہوئیں۔

''کیا کہا ہے ان لوگوں نے؟'' معیز کے سوال پہ انہوں نے یہ سوچ کر سب کچھ بتا دیا کہ شاید یہ سب

سن کر معیز اپنی بیوی کو لینے چلا جائے کہ وہ شوہر کے بغیر آنے پر راضی نہیں تھی۔

''ویسے دیکھا جائے تو ایک طرح سے ٹھیک ہی کہہ رہی ہیں وہ، بیٹا تم چلے جاؤ بہو کو لینے، سب گلے شکوے ختم کرو، خیر سے ماں بن گئی ہے تمہارے بچے کی، اب تم بھی اپنی ضد چھوڑ دو۔'' وہ ملتجی لہجے میں بیٹے سے مخاطب تھیں اور بیٹے کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔ ماں کی عزت اور محبت کے حوالے سے وہ جتنا حساس تھا' خود ماں کو بھی اس کا اندازہ نہیں تھا۔

''ان لوگوں کی ہمت کیسے ہوئی آپ کو ذلیل کرنے کی۔'' مٹھیاں بھینچ کر وہ گھٹی گھٹی آواز میں ماں سے مخاطب ہوا، چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔

''ان سب باتوں کو چھوڑو معیز، معاملہ بنانے کی بات کرو۔'' بیٹے کا چہرہ اور حالت دیکھ کر وہ بھی گھبرا سی گئیں۔ انہیں اندازہ نہیں تھا کہ معیز کا ردعمل اتنا سخت ہوگا۔

''معاملہ بنانے کے لیے چھوڑا ہی کیا ہے ان لوگوں نے۔'' انتہائی سخت لہجے میں بولتا ہوا وہ ایک جھٹکے سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

''معیز، معیز، بات تو سنو۔'' وہ پیچھے سے آوازیں دیتی رہ گئیں، مگر معیز نہیں رکا۔

☆☆☆

منگنی کی تقریب گھر میں ہی رکھی گئی تھی، ثانیہ کی فیملی نے عاطف اور اس کے مہمانوں کو اپنے گھر ہی بلا لیا تھا کہ ایک ہی جگہ دونوں کی رسم ہو جائے گی، ویسے بھی عاطف کی طرف سے مہمانوں کی تعداد بس گنی چنی ہی تھی۔ سسرال سے تو سارے رشتے اور رابطے ختم تھے ان کے، میکے میں بھی والدین رہے نہیں اور تین بہن بھائی' تینوں ملک سے باہر' شادی پہ آنے کا سب نے وعدہ کیا تھا۔ فی الحال کسی کا بھی آنا مشکل تھا۔ امی نے محلے کے چند افراد بلا لیے تھے اور ایک دو عاطف کے دوست تھے۔

ثانیہ کا گھر ٹھیک ٹھاک بنگلہ تھا جس کی بڑی ساری چھت پہ تقریب کا اہتمام کیا گیا تھا۔ معیز، اپنی امی کی خوشی میں خوش تھا۔ وہ خود بھی دل سے خوش ہونا چاہتا تھا۔ ضروری تو نہیں کہ دل کی ہر خواہش پوری ہو اور یہ بھی ضروری نہیں کہ ادھوری خواہش کے پیچھے انسان جوگ بجوگ میں مبتلا ہو جائے، روگ لگا لے خود کو، عاطف یہاں آنے سے پہلے تھوڑا سا پریشان تھا، منتشر ذہن کے ساتھ وہ یہاں آیا تھا پھر دھیرے دھیرے ساری کلفت ڈھلنے لگی، اداسی زائل ہونے لگی ماحول کا اثر تھا یا اس اجتماع کا جو یہاں فقط دو مہمانان خصوصی کے لیے اکٹھے ہوئے تھے، عاطف اور ثانیہ، عاطف ہنستے، بولتے، مسکراتے چہروں کو دیکھ رہا تھا اور پھر یہ مسکراہٹ سفر کرتی ہوئی اس تک بھی آن پہنچی۔ ثانیہ کو اس کے پہلو میں لا کر بٹھا دیا گیا۔ پور پور سنگھار، نک سک سے تیار، جیتی جاگتی خوب صورت سی لڑکی، اس کے پہلو میں منگیتر کی حیثیت سے بیٹھی تھی۔ ماحول کا فسوں تھا یا اس کی حقیقت پسندی کہ کچھ دیر کے لیے وہ سب کچھ فراموش کر بیٹھا تھا۔ بڑوں نے انگوٹھیاں پہنا دیں۔ سب نے مٹھائی کھلائی۔ دعائیں دیں، تبصرے کیے۔

''ماشاء اللہ چاند سورج کی جوڑی ہے۔'' امی نے باری باری دونوں کی پیشانی چومی، تھوڑی دیر میں باربی کیو کی مزے دار خوشبو نے سب کو بے چین کر دیا اور پھر کھانے کا دور شروع ہو گیا۔ کھانا لذیذ تھا۔ سب نے ہی تعریف کی۔ امی بہت خوش تھیں۔ ان کے ساتھ جو مہمان گئے تھے سب نے ان کی پسند اور عاطف کی قسمت کو خوب ہی سراہا۔ اس کے سسرال والوں نے مہمانوں کی آؤ بھگت میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ بڑی عزت اور محبت کے ساتھ خیر مقدم کیا اور اسی طرح رخصت کیا۔

رات گئے جب عاطف سونے کے لیے لیٹا تو دماغ پھر مختلف خیالات کی آماجگاہ بن گیا۔

''ایک تو میں سوچنے بہت لگا ہوں۔'' اس نے جھنجلا کر کروٹ لی، اسی وقت موبائل بجنے لگا۔ عاطف نے موبائل دیکھا، کوئی اجنبی نمبر تھا۔

''ہیلو۔''
''ہیلو، جناب عاطف صاحب بات کر رہے ہیں۔''
''جی۔'' وہ حیران ہوا۔
''ہیپی انگیجمنٹ۔''
''شکریہ، مگر آپ......کون ہیں؟''
''میں......؟'' شوخ آواز کھلکھلائی۔
''میں......وہ ہوں، جسے آج، آپ کی امی نے انگوٹھی پہنائی ہے۔'' عاطف تیزی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔
''آ......آپ۔'' اس کی سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ آگے کیا کہے۔
''ہیلو، کیا ہوا، آپ چپ کیوں ہو گئے۔''
''میں تو چپ ہی تھا، بول تو آپ رہی تھیں۔''
''اتنی دیر سے میں ویٹ کر رہی تھی کہ شاید آپ فون کر کے مبارکباد دیں مجبوراً پھر مجھے ہی کال کرنی پڑی۔'' وہ اتنے مان اور اپنائیت سے بات کر رہی تھی جیسے پتا نہیں کتنی پرانی جان پہچان ہو۔
''میں کیسے کال کرتا' میرے پاس تو نمبر ہی نہیں تھا آپ کا۔'' عاطف نے نہ چاہتے ہوئے بھی صفائی پیش کی۔ اچانک سے فون بند کرنا بھی بداخلاقی لگ رہا تھا۔
''دیکھ لیں، ہم نے تو آپ کا نمبر حاصل کر لیا۔''
''کہاں سے؟''
''بس، کہیں سے بھی۔'' اس کی آواز میں شوخی کے ساتھ ناز بھی تھا۔
''اچھا ایک بات بتائیں۔''
''جی۔'' (پتا نہیں کیا پوچھنے والی ہے؟)
''آپ خوش تو ہیں نا اپنی انگیجمنٹ پر؟''
''بات تو خوشی کی ہے۔ اس لیے خوش ہوں میں بھی۔'' عاطف نے ایک گہری سانس لی۔
''میں بھی بہت بہت......بہت خوش ہوں۔''
''اتنی بے تحاشا خوشی کی وجہ پوچھ سکتا ہوں؟''
''دراصل میری جتنی بھی کلاس فیلوز اور دوستیں ہیں نا، سب کی سب ٹھکانے لگ گئیں، یا تو شادیاں ہو گئی ہیں یا منگنیاں اور نہیں تو کم از کم افیئر تو ضرور ہی ہیں۔ ایک میں ہی تھی اکیلی، لنڈوری، نہ منگنی، نہ شادی نہ کوئی اور......'' وہ بنا رکے بولتی چلی گئی۔
''پھر تو آپ سرخرو ہو گئیں آج اپنی دوستوں میں۔'' عاطف بے ساختہ ہنس پڑا۔
''میں نے فوراً اپنی فیس بک آئی ڈی پہ اسٹیٹس لگا دیا ہے، ہم دونوں کی جو سب سے اچھی پک (تصویر) ہے وہ لگا دی۔ بائی داوے آپ کی آئی ڈی کیا ہے؟''
''سینڈ کر دوں گا۔''
''ٹھیک ہے، میں بھی آپ کو اپنی آئی ڈی اور وہ پک سینڈ کرتی ہوں جو میں نے لگائی ہے۔''
''اچھا، اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو مجھے صبح آفس جانا ہے تو میں۔''
''اوہ......شیور۔'' اس نے جلدی سے عاطف کی بات کاٹی، پھر خدا حافظ کہہ کے لائن کاٹ دی۔
عاطف نے ایک نظر ہاتھ میں پکڑے موبائل کو دیکھا پھر ایک گہری سانس لے کر آنکھیں بند کر لیں۔
اگلے روز عظمیٰ پھپھو کی طرف گیا تو مٹھائی لے گیا۔ اب فاصلہ کافی کم ہو گیا تھا۔ وہاں کچھ دیر بیٹھنے کے بعد گھر واپس آ جاتا، پندرہ بیس منٹ لگتے تھے۔ شہید احمد کی حالت میں کافی بہتری آ چکی تھی۔ بس ایک بات تھی کہ وہ اب تک کچھ بولتے نہیں تھے۔ اپنی زبان کو انہوں نے خود ہی خاموشی کے ہاتھوں گروی رکھا ہوا تھا۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ اب ان کی آنکھیں اتنی ویران اتنی خالی نہیں رہی تھیں، ان میں کوئی نہ کوئی تاثر نظر آنے لگا تھا، ہلکی سی حیرانی کا، خوشی کا، اطمینان کا۔
عاطف ان کے قریب بیٹھ کر انہیں اپنے ہاتھ سے کچھ کھلاتا تو ان کی آنکھوں میں طمانیت اور تشکر کے ساتھ ہلکی سی ایک خوشی کی لہر بھی نظر آتی مٹھائی لے کر پہنچا تو آرزو بنگلے کے اندر تھی' بڑی بیگم صاحبہ کے ساتھ، سرونٹ کوارٹر میں عظمیٰ پھپھو اور شہید احمد تھے۔ پھپھو نے اسے مبارکباد دی۔ عاطف نے شہید احمد کو مٹھائی کھلائی۔ انہوں نے سوالیہ نظروں

سے اسے دیکھا۔
''میری منگنی ہوگئی ہے۔'' عاطف نے انہیں بتایا۔
وہ کچھ دیر حسرت بھری نگاہوں سے عاطف کو دیکھتے رہے۔ دو دن پہلے ہی عاطف نے ان کی شیو بنائی تھی۔ غسل کروا کر کپڑے بدلوائے تھے۔ ان کے لیے چند نئے جوڑے لے کر آیا تھا۔ ان ہی میں سے ایک پہنایا تھا۔ ان کا چہرہ اور مجموعی حالت پہلے سے بہت بہتر لگ رہی تھی۔
''کیا ہوا؟ آپ خوش نہیں ہوئے میری منگنی کا سن کر؟'' عاطف نے ان کی آنکھوں میں حسرت دیکھی تو بے اختیار پوچھ بیٹھا۔
شہید احمد نے یک ٹک اسے دیکھتے ہوئے اپنا ہاتھ اٹھا کر اس کے کندھے پہ رکھا اور اس کا شانہ دبایا، ان کا ہاتھ لرز رہا تھا' کمزوری سے بھی اور شدت جذبات سے بھی اور پھر ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔
''ابو پلیز، ایسے مت کریں، مجھے سچ مچ تکلیف ہو رہی ہے۔'' عاطف ان کے گلے لگ گیا۔
''مجھے معلوم ہے میں سب کچھ ٹھیک نہیں کر سکتا مگر تھوڑا بہت جو میرے اختیار میں ہے اسے تو بہتر کر سکتا ہوں۔ گزرا وقت نہیں لا سکتا مگر جو وقت میرے پاس ہے وہ آپ کو دے سکتا ہوں، جتنا ہو سکتا ہے اپنا آپ دے سکتا ہوں۔ میں آپ کو خوش اور صحت مند دیکھنا چاہتا ہوں۔'' عاطف دھیرے دھیرے بول رہا تھا۔ آہستہ سے وہ ان سے الگ ہوا۔ جیب سے رومال نکال کر ان کا چہرہ صاف کیا۔
''ایک گفٹ لایا ہوں میں آپ کے لیے۔''
عاطف نے اپنی جیب سے نیا موبائل نکالا اور اسے آن کرنے لگا، گھر سے وہ اس میں سم ڈال کر لایا تھا۔ چارجر نکال کر عظمیٰ پھپھو کو دیا۔
''یہ دیکھیں۔'' اس نے اپنی منگنی کی کچھ تصاویر اور مووی اس میں ڈالی تھی، وہ انہیں دکھا رہا تھا۔ اس کے علاوہ اس میں اس کی بہت ساری تصاویر تھیں اور وائی فائی کنکشن کے بعد تو ایک پوری دنیا اس میں آباد تھی۔

''چھوٹی بیگم صاحبہ نے آرزو کو بھی ایک فون دیا ہے۔'' عظمیٰ پھپھو نے بتایا۔ ''دن میں ایک دو بار فون کرتی ہیں بڑی بیگم صاحبہ کی طبیعت پوچھنے کے لیے۔''
''اچھا، اچھی بات ہے۔'' عاطف نے کمرے کا جائزہ لیا۔ ایک دو نئی چیزیں نظر آ رہی تھیں۔ یہ شاید نہیں بلکہ یقیناً مالکوں کی دین تھی۔
''آرزو کب آتی ہے یہاں؟''
''دو تین چکر لگا لیتی ہے، دن میں اور شام میں، کھانا ہمارے ساتھ ہی کھاتی ہے۔''
''ابھی، کب آئے گی؟''
''کوئی ٹائم نہیں ہے۔ خود ہی آ جاتی ہے جب فارغ ہو۔''
''اچھا۔'' عاطف کچھ مایوس سا ہو گیا۔
''کسی شے کی ضرورت ہو تو آپ بلا جھجک کہہ سکتی ہیں۔ دراصل مجھے خود سے اندازہ نہیں ہوتا، کیا ضروری ہے کیا غیر ضروری۔'' عاطف دونوں سے ہی مخاطب تھا۔
''اتنا کچھ تو کر چکے ہو۔ میرا سگا بیٹا بھی یہاں ہوتا تو شاید یہ سب نہ کرتا۔'' پھپھو جذباتی اور آبدیدہ ہو گئیں۔
''افوہ، میرا یہ مطلب تھوڑی تھا۔'' عاطف نے خفیف ہو کر اپنا سر کھجایا۔ ان سے رخصت لے کر گھر پہنچا تو خلاف معمول امی لیٹی ہوئی تھیں۔ ورنہ اس وقت وہ عموماً یا تو کچن میں ہوتی تھیں اس کے لیے گرم گرم تازی روٹی ڈالنے کے لیے یا پھر ٹی وی دیکھ رہی ہوتیں۔
''کیا ہوا امی، آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔''
عاطف ان کے قریب پہنچ کر جھکا۔
''پتا نہیں کیا ہو رہا ہے۔'' بند آنکھیں کھولے بغیر وہ بڑبڑائیں۔ ''طبیعت گری گری ہو رہی تھی، میں سمجھی بی پی لو ہو رہا ہے، انڈا ابال کر کھا لیا مگر طبیعت اور بھی عجیب سی ہو گئی، سر میں سوئیاں سی چبھ رہی ہیں۔''
''آپ اٹھیں، میں ڈاکٹر کے پاس لے چلتا ہوں۔''

عاطف نے فوراً ان کا بازو پکڑ کر اٹھانے کی کوشش کی۔
''ابھی تو تم جاب سے آئے ہو تھکے ہارے، بھوکے پیاسے، کھانا کھالو، پھر لے چلنا۔''
''کھانا میں آ کر کھالوں گا، آپ بس ابھی اٹھیں، فوراً۔'' عاطف بدستور ان کا بازو پکڑے ہوئے تھا۔

''ایک تو تم ضد بہت کرتے ہو۔'' اٹھ کر بیٹھتے ہوئے انہوں نے بمشکل آنکھیں کھولیں۔
''اور آپ لاپروائی بہت دکھاتی ہیں اپنی تکلیف کے بارے میں۔'' عاطف انہیں سہارا دے کر باہر لایا اور گاڑی میں بٹھا کر ڈاکٹر کے پاس لے آیا۔ فوراً ایمرجنسی میں دکھایا۔ وہ باہر بیٹھا تھا۔ ڈاکٹر نے کچھ دیر بعد اسے اندر بلایا۔
''کیا ہوا ہے انہیں۔'' عاطف کچھ گھبرا سا گیا، ڈاکٹر کے چہرے پہ انتہائی سنجیدگی دیکھ کر۔
''آپ کو اندازہ ہے کیا' ہوا ہے ان کے ساتھ؟'' ڈاکٹر عاطف کے بیٹھتے ہی شروع ہوگیا۔
''بی پی لو سمجھ کر انڈا ابال کر کھالیا جبکہ بی پی ہائی تھا۔ ان کا انڈا کھانے کے بعد اور ہائی ہوگیا۔ تھوڑی دیر اور نہ لاتے تو خدانخواستہ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ فالج کا اٹیک بھی اور برین ہیمبرج بھی۔ اسی لیے ہم لوگ منع کرتے ہیں کہ سیلف میڈیکیشن نہ کیا کریں۔ خاص طور پر بلڈ پریشر کے بارے میں خود سے کبھی فیصلہ نہ کریں جب تک چیک نہ کروالیں۔'' ڈاکٹر نے لمبی چوڑی ڈانٹ نما تقریر کے بعد دواؤں کا نسخہ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔
گھر واپس آیا تو امی کی حالت کچھ بہتر تھی یا وہ خود کو بہتر ظاہر کررہی تھیں۔ بیٹے کا مزاج معلوم تھا۔ وہ کتنی جلدی، کتنا زیادہ پریشان ہو جاتا ہے۔
''سن لیا نا ڈاکٹر نے کیا کہا ہے، اب ذرا سی بھی طبیعت میں اونچ نیچ ہو آپ فوراً مجھے بتائیں گی۔ میں ڈاکٹر کے لے چلوں گا، خود سے کوئی علاج کرنے کی کوشش نہیں کریں گی، ٹھیک ہے۔ اب آپ تھوڑا کھانا کھائیں اور یہ میڈیسن ڈاکٹر نے لکھی ہے میں لے آیا ہوں، اسے کھا کر سو جائیں اور صبح اگر نیند آرہی ہو تو اٹھنے کی ضرورت نہیں ہے اپنی نیند پوری کیجیے گا۔ میں اپنا ناشتہ بنا لوں گا۔ آپ کے لیے بھی رکھ جاؤں گا۔''
عاطف ایک دم ہی بہت پریشان سا ہو گیا تھا۔ وہ بار بار یہی سوچ رہا تھا کہ اگر اسے آنے میں دیر ہو جاتی یا معمول کی طبیعت سمجھ کر ڈاکٹر کے نہیں لے جاتا تو...... اس تو کے آگے کا خیالی منظر بہت بھیانک تھا جس کی تصویر ڈاکٹر نے کھینچی تھی۔ اپنی سوچوں میں الجھا سلجھا اس نے اپنے کھانے پہ کم اور امی کے کھانے پہ زیادہ توجہ دی۔
دوائی کھلا کر وہ ان کے پاس بیٹھا رہا، جب تک وہ سو نہیں گئیں۔ ان کے پاس سے اٹھ کر وہ سونے لیٹا تو دل میں ایک فیصلہ کر چکا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ امی کا مکمل چیک اپ اسی ہفتے کروائے گا۔ نیند کی پری مہربان ہو کر اپنی بانہوں میں لینے ہی والی تھی کہ موبائل بجنے لگا۔
''ہیلو۔'' نمبر دیکھے بغیر اس نے خمار آلود آواز میں ہیلو کیا۔
''ہیلو السلام علیکم! کیا ہو رہا ہے؟'' ثانیہ کی چہکتی ہوئی آواز آئی۔
''رات کے بارہ بجے ایک شریف آدمی کیا کر رہا ہوتا ہے؟'' عاطف نے منہ پہ ہاتھ رکھ کر جمائی روکی۔
''ہر شریف کے الگ الگ شوق اور مشاغل ہوتے ہیں۔ ہم بھی کوئی بدمعاش نہیں ہیں مگر جاگ رہے ہیں۔''
''آپ کو صبح آفس نہیں جانا اس لیے۔''
''ہمیں صبح یونی ورسٹی تو جانا ہوتا ہے جناب۔''
''اس کی چھٹی ہو سکتی ہے۔ جاب کی طرح پابندی نہیں ہے۔'' عاطف نے ایک اور جمائی لی۔
''آفس سے آنے کے بعد آپ کیا کرتے ہیں!'' ثانیہ تو بہت فرصت سے فارغ ہو کر بیٹھی تھی اس کا انٹرویو کرنے کے لیے۔

"کبھی کچھ، کبھی کچھ، کوئی خاص روٹین نہیں ہے۔"

"آج کیا کیا؟"

"آج..... آج امی کو ڈاکٹر کے لے گیا تھا۔"

"خیریت؟"

"ہاں، خیریت ہے، طبیعت خراب ہوگئی تھی ان کی، اب تو ٹھیک ہے۔"

"اچھا، مجھے لگ رہا ہے آپ کو نیند آ رہی ہے۔"

"ٹھیک پہچانا خدا کی بندی، اب تو موبائل کا پیچھا چھوڑ دو۔" عاطف دل ہی دل میں کراہا۔

"ہے نا، ٹھیک کہہ رہی ہوں نا میں۔" بلبل سے اس کا قریبی رشتہ تھا چہکنے کے معاملے میں۔

"چلیں آپ سوئیں، میں نے خواہ مخواہ ڈسٹرب کر دیا، خدا حافظ۔"

"خدا حافظ۔" عاطف نے ایک گہری سانس لے کر فون بند کیا اور پھر سے آنکھیں بند کر کے نیند کی مہربان پری کو ڈھونڈنے لگا جو غائب ہوگئی تھی۔

☆☆☆

مہربانو کا رو رو کر برا حال تھا۔ یہ سب تو اس نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ معیز عالم اتنا انتہائی قدم بھی اٹھا سکتا ہے۔ حمیرا بھی جیسے سکتے کے عالم میں بیٹھی کی بیٹھی رہ گئیں۔

"سارا قصور آپ کا ہے، آپ سمجھتی ہیں کہ ہر کوئی ابو کی طرح آپ کے رعب میں آ جائے گا، دوسرے کی نرمی اور شرافت کو آپ کمزوری اور بزدلی سمجھتی رہیں۔ دیکھ لیا نتیجہ اپنی من مانی کرنے کا، ابو نے ہم سب نے آپ کو سمجھایا کہ مہربانو کو گھر جانے دیں، آپ پہ پتا نہیں کیا ضد سوار تھی، اسی ضد کو مہر نے بھی اپنے پلو سے باندھا ہوا تھا اپنی بھی زندگی تباہ کی، بچے کی بھی، ساتھ میں ہم سب کو خوار کر دیا۔" ارسلان اپنا سارا غصہ، ساری جھنجلاہٹ ماں پہ نکال رہا تھا اور اس کے بس میں تھا بھی کیا۔ جتنا عرصہ مہربانو بیٹھی رہی وہ اسے بھی سمجھاتا رہا اور ماں کو بھی، مگر دونوں ہی ضدی اور ہٹیلی فطرت کی تھیں۔ اب اپنی ضد کا نتیجہ دیکھ رہی تھیں۔

"مجھے کیا پتا تھا وہ نامراد یوں فٹافٹ کاغذ بھیج دے گا، کم بخت کو فیصلہ دیتے ہوئے ذرا لاج نہ آئی۔ بچے کا بھی خیال نہ کیا۔ ایسے بھی کوئی کرتا ہے بھلا، لڑائی جھگڑے تو سب کے گھروں میں ہوتے ہیں، ذرا ذرا سی باتوں پر کیا لوگ طلاق دے دیتے ہیں۔" منہ پہ دوپٹا رکھ کر سسکتے ہوئے وہ بچوں کی طرح شکوہ کر رہی تھیں۔

"ڈیڑھ سال کی شادی میں ایک سال سے تو آپ نے بیٹی کو گھر بٹھایا ہوا ہے۔ اوپر سے آنٹی آئیں تو ان کا کوئی لحاظ نہیں کیا۔"

ارسلان دونوں ہاتھوں سے سر تھامے بیٹھا تھا۔

"سب آگ اسی بڑھیا کی لگائی ہوئی ہے بیٹے کا گھر برباد کر کے ہی چھوڑا۔ بڑھیا سے میری معصوم بچی برداشت نہیں ہوئی۔" حمیرا بیگم کا تنتنا اور وتیرہ وہی تھا۔ سارا الزام اپنی سمدھن پر رکھ کر خود بری الذمہ ہوگئیں۔

"آپ کبھی نہیں سدھریں گی۔" افسوس اور کوفت کے عالم میں سر جھٹکتا ہوا وہ وہاں سے اٹھ گیا۔

"اب کیا ہوگا امی؟" رو رو کر مہربانو کی آنکھیں سوج گئی تھیں۔

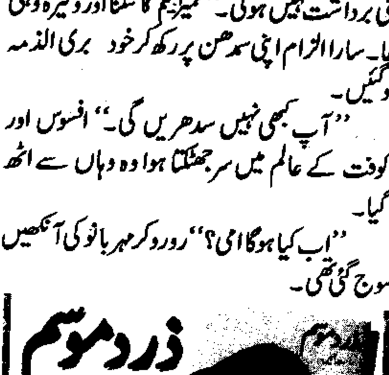

"کچھ نہ کچھ تو ہوگا ہی بچی، اللہ مالک ہے۔"
سارے کام اور گھر بگاڑنے کے بعد اب حمیرا خاتون کو اللہ یاد آرہا تھا۔

"یہ تم نے کیا کیا معیز؟ کم سے کم بچے کا تو خیال کیا ہوتا۔" معیز کی والدہ دونوں ہاتھوں سے سر تھامے شدید صدمے کی کیفیت میں بیٹھی تھیں۔ "اسی لیے غصے کو حرام کہا گیا ہے۔ اس میں انسان کو پتا ہی نہیں چلتا وہ صحیح کر رہا ہے یا غلط۔" وہ یک ٹک بیٹے کو دیکھتی جارہی تھیں اور بولتی جارہی تھیں۔ معیز عالم محض پہلو بدل کر رہ گئے۔ چند لمحوں بعد بولے تو ان کی آواز ہموار اور لہجہ پرسکون تھا۔

"میں نے جو فیصلہ کیا ہے وہ یوں ہی غصے میں آکر قدم نہیں اٹھایا بلکہ سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ کئی مہینوں سے میں اس معاملے پر سوچ بچار کر رہا تھا اور بہت سوچ سمجھ کر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مہربانو کا اس گھر میں ہمارے ساتھ گزارا مشکل ہے۔" "ہمارا کیا ہے بیٹا، آج ہیں۔ کل نہیں ہوں گے۔ مجھے کون سا قیامت کے بورے سمیٹنے ہیں طویل عرصے تک زندہ رہ کر، سب مل بیٹھ کر کوئی مصالحت کی راہ نکال لیتے۔ بیوی کا نہ سہی بچے کے بارے میں تو سوچتے، اس کا کیا ہوگا؟"

"بچے کے لیے جو ہوسکے گا کروں گا۔"

"اور اس کی شخصیت میں جو ٹوٹ پھوٹ ہوگی؟ باپ سے الگ ماں نے کہیں اور بیاہ کرلیا تو سمجھو ماں سے بھی محروم۔"

"سارا قصور میرا نہیں ہے امی، اس وقت ہم مصالحت کی کوئی راہ نکال بھی لیتے تو آگے جاکر پھر خرابی ہونی تھی۔ بچے کے ذریعے وہ بار بار ہر بار بلیک میل کرتی اور اپنی بات منواتی۔" معیز بے بسی سے ماں کو سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ "میں ایسی عورت کے ساتھ اپنی زندگی جہنم نہیں بنا سکتا۔ ہر وقت میں ٹینشن کا شکار رہتا۔"

"اپنی اولاد کے بارے میں کیا سوچا ہے۔" امی نے ایک گہری سانس لے کر سوال کیا۔
اسے میں عدالت سے بھی لے سکتا ہوں۔"

"معیز۔" امی نے تنبیہی نظروں سے اسے دیکھا۔
اس عورت پر ایک ظلم تم کرچکے ہو اب دوسرا مت کرو۔ مہر تم دے چکے ہو۔ بچے کا خرچا باندھو اور اس سے ملنے کے بارے میں کوئی ایگریمنٹ کرو۔"

"ٹھیک ہے۔" معیز نے بغیر کسی چوں چرا کے ان کی بات سن لی۔

"کتنے ارمانوں سے بہو بیاہ کر لائی تھی۔ سارے ارمان خاک میں مل گئے۔ آئندہ کے لیے مسائل اور کھڑے ہوگئے۔ امی کو بار بار اپنے پوتے کا خیال آرہا تھا۔ خدا جانے کیسی قسمت لکھوا کر لایا ہے وہ معصوم، وہ تاسف سے سوچ رہی تھیں۔

☆☆☆

ثمینہ بیگم اپنے پوتے کی دوسری سالگرہ کا نیوتا دینے آئی تھیں۔ خود ہی بولتی رہیں سارا وقت، حمیرا بیگم کی بولتی بالکل بند تو نہ ہوئی تھی مگر کم ضرور ہوگئی تھی۔ بے دلی اور بے زاری کے ساتھ ثمینہ بیگم کی چرب زبانی پر ہوں ہاں کرتی رہیں۔

"مہر کو بھی ضرور لانا۔ اچھا ہے بچی کا دل بہل جائے گا۔ گھر میں بند اتنے مہینے گزارنا آسان ہے کیا۔ مہر کی وجہ سے تو سالگرہ کا فنکشن دو ہفتے آگے کردیا تھا کہ چلو بچی کی عدت بھی ختم ہوجائے گی۔ وہ بھی شرکت کرلے گی۔" بولتے بولتے وہ ایک لمحے کے لیے سانس لینے کو رکیں پھر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"شہزادہ نظر نہیں آرہا؟" مہربانو نے اپنے بیٹے کا نام شہزادہ رکھا تھا۔

"اپنی دادی کے گھر گیا ہوا ہے۔" مہربانو دھیرے سے بولی۔

"اچھا۔" انہوں نے حیرت کا مصنوعی اظہار کیا۔ پھر بولیں۔

"چلو اچھا ہے۔ ناخن سے گوشت جدا تھوڑی ہوتا ہے۔ رشتہ تو اپنی جگہ موجود ہے۔ باپ اور دادی سے چاہے کتنا ہی الگ رہے۔ نام کے آگے تو باپ کا نام ہی آئے گا۔ ہاتھی پھرے گاؤں گاؤں جس کا ہاتھی اس کا ناؤں۔"

"اف، یہ امی بھی کیا باتیں لے کر بیٹھ گئیں۔" اپنی بیٹی کو سیریلیک کھلاتے ہوئے عظمیٰ جز بز ہو رہی تھی۔ کتنی بار سمجھایا ہے امی کو ایسی باتیں نہ کیا کریں۔ بعد میں اماں بیٹی اور ساتھ میں شوہر صاحب بھی مجھے باتیں سناتے ہیں۔ مگر امی کی سمجھ میں ہی نہیں آتا بیٹی کے منہ میں جلدی جلدی وہ ایک کے بعد ایک چمچہ ڈال رہی تھی تاکہ ماں کے پاس جا کر بیٹھے اور ان کا موضوع تبدیل کرے۔

ادھر ثمینہ بیگم اور شوشا چھوڑنے لگی تھیں۔

"سنا ہے، معیز کی شادی ہو رہی ہے؟"

"جس سے سنا ہے اسی سے باقی تفصیلات بھی معلوم کر لیتیں، ہم سے کیوں پوچھ رہی ہیں؟" حمیرا بیگم نے جل بھن کر جواب دیا۔ ان کے صبر کے پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ مہربانو کے چہرے پر مایوسی اور اداسی کے گہرے بادل چھا گئے۔ عظمیٰ لپک کر آئی اور آرزو کو اپنی امی کی گود میں دیا۔

"چلو بھئی گگو! نانی سے باتیں کرو۔"

"ساری باتیں تو نانی نے کر ہی لیں۔ اب نواسی سے کیا کریں گی۔" حمیرا تن فن کرتی، اٹھ کر چل دیں۔ عظمیٰ نے چور نظروں سے مہربانو کو دیکھا۔ رنج اور بے بسی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔

"میں ابھی آتی ہوں۔" وہ بھی اٹھ کر چل دی۔

"کیا ضرورت تھی معیز کا ذکر کرنے کی، دیکھا کیسے منہ بن گئے دونوں کے؟" عظمیٰ نے دبی دبی آواز میں ماں کو مخاطب کیا۔

"کوئی نئی بات ہے۔ منہ تو ہر وقت بنا کر رکھتی ہیں دونوں ماں بیٹی۔" ثمینہ بیگم نے ناک سے مکھی اڑائی۔

"سالگرہ والے دن ذرا جلدی آنا، یہ نہیں کہ مہمانوں کی طرح عین وقت پر آؤ۔" ثمینہ بیگم نے دزدیدہ نظروں سے بیٹی کو دیکھا۔

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، اب کوئی اور بات کریں۔" حمیرا بے شک عظمیٰ کی پھپھو تھیں مگر ساس بننے کے بعد وہ فقط ساس ہی تھیں پھپھو کا رشتہ کہیں گم ہو گیا تھا۔ ثمینہ کی زبان کا شاخسانہ اکثر و بیشتر عظمیٰ کو بھگتنا پڑتا۔ پھر جب سے مہربانو کے ساتھ طلاق جیسا سانحہ ہوا تھا' وہ بات بات پر بکھر جاتی۔ رونے بیٹھ جاتی۔ ارسلان نے بیشتر مردوں کی طرح دوغلی پالیسی اپنائی ہوئی تھی۔ بیڈروم میں وہ بیوی کا دم بھرتا تھا۔ ماں بہن کے سامنے ان ہی کی جی حضوری کرتا اور عظمیٰ کو لتاڑ دیتا۔ عظمیٰ کے لیے ان تینوں کو سنبھالنا بلکہ بیک وقت ان تینوں سے نمٹنا بڑا مشکل اور صبر آزما مرحلہ ہوتا۔ ماں سے دبی زبان میں چپ رہنے کی استدعا کرتی۔ مگر وہ عظمیٰ کو اس کی اور اپنی نازک پوزیشن کو ذرا خاطر میں نہ لاتی تھیں۔

عظمیٰ زیادہ کھل کر انہیں اپنے حالات سے آگاہ نہیں کرتی تھی۔ ان سے بعید نہ تھا آستینیں چڑھا کر لڑنے آجاتیں' خود تو لڑائی میں فاتح بن کر اپنے گھر لوٹ جاتیں۔ شامت عظمیٰ کی آتی۔ شادی کے بعد لڑکیاں صرف اپنی بدزبانی اور بد دماغی کا خمیازہ نہیں بھگتتیں۔ کبھی اپنی ماں کی بدزبانی اور بددماغی کا خمیازہ بھی انہیں ہی بھگتنا پڑتا ہے۔ عظمیٰ کے ساتھ یہی صورت حال تھی۔

سالگرہ کی تقریب میں عظمیٰ لاکھ چاہنے اور ماں کی ہدایت کے باوجود بھی جلدی نہیں جا سکی۔ آرزو کو الٹی اور موشن لگے ہوئے تھے۔ اسے دوائی دلا کر لائی۔ گھر کے کام نمٹاتے نمٹاتے شام ہی ہو گئی۔ آرزو الگ چڑچڑی ہو رہی تھی، اس کے دانت نکل رہے تھے۔ اس کا رونا بند نہیں ہو رہا تھا۔ ناچار اسے ہی سنبھالے رہی۔ خدا خدا کر کے وہ سوئی تو عظمیٰ تیار ہوئی۔

مارے باندھے حمیرا اور مہربانو بھی تیار ہو ہی گئیں جانے کے لیے۔ حالانکہ حمیرا کا تو بالکل دل نہیں تھا جانے کا' کچھ ایسا ہی حال مہربانو کا بھی تھا مگر دنیا کا سامنا تو کرنا ہی تھا۔ کب تک گھر میں منہ چھپائے بیٹھی رہتی۔

تقریب کا اہتمام گھر پر ہی کیا گیا تھا۔ قریبی رشتہ دار مدعو تھے اور اڑوس پڑوس والے، سنہری شیروانی میں ملبوس عاطف بڑا پیارا اور بھولا بھالا سا لگ رہا تھا۔ عفت نے بھاری بنارسی ساڑھی باندھی تھی۔ شہید احمد کے پہلو میں کھڑے ہو کر، دونوں میاں بیوی نے بچے کے ہاتھوں

کیک کٹوایا۔ ہیپی برتھ ڈے کا شور اٹھا، بچوں نے غبارے پھوڑنے شروع کردیے۔ عفت سب کو کیک کھلا رہی تھی۔ مہربانو اپنے بیٹے کو گود میں لیے پتا نہیں کیوں دل مسوس کررہ گئی۔

"پھپھو آپ نے کیک کھایا؟" شہید احمد ان کے قریب آیا۔ مخاطب وہ پھپو سے ہوا تھا مگر اس کی نگاہوں کا مرکز مہر بھی تھی۔ مہربانو سے شادی کے بعد ایک دو بار ہی ملاقات ہوئی تھی۔ اسے خوش و خرم دیکھ کر شہید احمد کا احساس جرم بڑی حد تک ختم ہوگیا تھا اور اب اسے اس طرح لٹے پٹے حال میں دیکھ کر ترس رحم، ہمدردی پتہ نہیں کون کون سے جذبات اس کے دل میں اٹھ رہے تھے۔

"تمہاری بیوی جب سارے مہمانوں کو کھلا کر فارغ ہوجائے گی تب شاید آئے گی ادھر" حمیرا کا لہجہ جلا کٹا تھا۔

"اچھا میں لے کر آتا ہوں۔" شہید احمد میز کے قریب گیا اور دو پلیٹوں میں کیک کے دو ٹکڑے رکھ کر لے آیا۔

"یہ لیں" ایک پلیٹ اس نے مہر کو دی اور ایک حمیرا پھپو کو عفت بے خبر اور لاپرواہ نہیں تھی۔ کن اکھیوں سے سب پر خصوصاً اپنے شوہر پر نگاہ رکھے ہوئے تھی۔ حمیرا پھپو اور مہربانو کی موجودگی سے اس کے دل کو کھٹکا ہی لگا رہتا تھا اور عجیب بات تھی کہ اسے جو بھی دھڑکا ہوتا اپنے شوہر کے متعلق وہ اسے سچ کر دکھاتا۔ ابھی وہ شہید احمد کو کیک لے جاکر، دیتا ہوا دیکھ رہی تھی۔ اس کی پیشانی پر شکنیں ابھر آئیں اور آنکھوں میں ناگواری، تھوڑی دیر میں یہ ناگواری غصے میں بدل گئی۔ جب کھانے کے دوران بھی شہید ایک اچھا میزبان بنا اپنے "خاص الخاص" مہمانوں کو ہی توجہ دیتا رہا۔

پتا نہیں کیوں مہربانو کی اس حالت کا ذمہ دار شہید احمد خود کو سمجھ رہا تھا۔ اسے ایسا نہیں سوچنا چاہیے تھا مگر وہ سوچ رہا تھا۔ خود کو مجرم مان رہا تھا۔ جیسے مہربانو کے ساتھ جو کچھ ہوا، اس میں قصور شہید احمد کا ہے۔ اپنے قصور، غلطی اور جرم کی تلافی کے لیے وہ ان دونوں آگے پیچھے گھوم رہا تھا۔

"ذرا اسے پکڑیے گا۔ تنگ کررہا ہے بہت۔" عفت سے ضبط نہیں ہوا، وہ عاطف کو اور شہید احمد کو تھما گئی لیکن جاتے جاتے ایک کٹیلی اور جتاتی ہوئی نگاہ مہربانو پر ڈالنا نہیں بھولی تھی۔

تقریب رات گئے ختم ہوئی۔ سب مہمان اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے مگر ثمینہ بیگم نے شہید احمد کی خوب کلاس لی۔ وہ عفت سے زیادہ چوکنی تھیں۔ تقریب کے دوران، بیٹے کو حمیرا اور مہربانو کے اردگرد منڈلاتے دیکھ کر ان کا بھی خون کھولتا رہا۔ اس وقت تو کچھ نہ کہہ سکیں مگر اب اسے لتاڑ رہی تھیں۔

"شادی شدہ ہو، ایک بچے کے باپ ہو۔ کچھ عقل ہے کہ نہیں، دونوں ماں بیٹی کے سوا تمہیں اور کوئی نظر نہیں آیا۔ خاطریں کرنے کو؟ لوگوں کو اندھا سمجھتے ہو یا گونگا، مرچ مسالے لگا کر باتیں ایک منہ سے دوسرے منہ پھیلتی ہیں۔ خبردار جو میں نے آئندہ تمہیں مہربانو کے آس پاس بھی دیکھا۔ تمہارا بھی مزاج درست کردوں گی اور اس کا بھی۔"

ثمینہ بیگم خوب گرج رہی تھیں۔ عفت کے دل کو ٹھنڈک مل رہی تھی۔ شہید احمد بھیگی بلی بن کر بیٹھا ان کی صلواتیں سن رہا تھا۔

"میں تو بس انہیں کمپنی دینے کی کوشش کررہا تھا۔ اتنے عرصے بعد آئی تھیں پھپو۔" شہید احمد منمنایا۔

"کسی کو بھی کمپنی دینے کے لیے تمہاری ماں اور بیوی موجود ہے۔ تم زیادہ اتاؤلے باؤلے نہ بنو۔" سخت لہجے میں بول کر وہ اٹھ گئیں۔

☆☆☆

مہربانو کے دل کو گھر پہنچ کر بھی قرار نہ آیا تھا۔ سارے زخموں کے دھاگے جیسے پھر سے ادھڑ گئے تھے۔ شہید احمد کے پہلو میں کھڑی خوش و خرم عفت سے ایک عجیب جلاپا اور حسد سا محسوس ہورہا تھا اسے۔

اگر یہ چڑیل درمیان میں نہ آتی تو آج شہید کے ساتھ میں راج کررہی ہوتی۔ چت لیٹے لیٹے وہ

سوچ رہی تھی۔ اب وہ بہت کچھ سوچنے لگی تھی۔ خصوصاً اپنے مستقبل کے بارے میں، آگے زندگی کے بارے میں سوچتی تو تاریکی اور خلا کے سوا اسے کچھ نظر نہ آتا۔ ہاں اس اندھیرے میں روشنی کی ایک کرن تھی۔ مگر وہ کسی اور کی تھی۔ کسی اور کے لیے تھی نہ وہ اس کرن کو اپنا کہہ سکتی تھی نہ اپنا بنا سکتی تھی۔ سوچتے سوچتے وہ ثمینہ کی طرح خود ترسی میں مبتلا ہوگئی۔

''اللہ، میرے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوا؟ میرا کیا قصور تھا جو یوں میری زندگی تباہ ہوگئی، آنکھوں میں آنسو بھرے وہ اپنے رب سے شکوے کر رہی تھی۔ اس حقیقت کو فراموش کر کے، کہ عموماً انسان کے اوپر جو مصیبت آتی ہے وہ اس کے کرتوتوں کے سبب آتی ہے۔ جو مصیبت رب کی طرف سے آزمائش کے طور پر آتی ہے۔ اس میں ''اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو صبر بھی دیتا ہے اور اس مصیبت سے نمٹنے کا حوصلہ بھی۔''

مہر بانو کو خود پہ آئی مصیبت کے لیے نہ صبر آرہا تھا نہ اس سے نمٹنے کے لیے حوصلہ خود وہ تو ایسا حساس اور نازک آبگینہ بن گئی تھی جو ذرا سی ٹھیس پر ٹوٹ کے بکھر جاتا ہے چور چور ہو جاتا ہے۔ گھر میں بھی اس کا مزاج تلخ ہوتا جا رہا تھا۔ عظمیٰ سے الجھنا، اس کا معمول بنتا جا رہا تھا۔ معمولی معمولی باتوں پر بھی غصہ آنے لگتا۔

عظمیٰ ساس اور شوہر کے دباؤ میں تھی۔ مہر بانو کو تو کچھ نہ کہہ سکتی تھی، جی ہی جی میں کلس کر رہ جاتی۔ کبھی اسے مہر بانو پر ترس بھی آجاتا۔ خدانخواستہ میں مہر بانو کی جگہ ہوتی اور میرے ساتھ ایسا ہو جاتا تو شاید میں بھی بدمزاج ہو جاتی، غصہ اور تلخی میرے اندر بھر جاتے۔ عظمیٰ ایمان داری سے سوچتی اور مہر بانو کے رویے اور مزاج کو نظر انداز کرنے کی کوشش کرتی۔

☆☆☆

''لڑکی، یہاں آؤ۔'' بڑی بی کا لہجہ بڑا بارعب تھا۔ بعد میں آرزو کو پتہ چلا تھا کہ وہ کالج کی ریٹائرڈ پرنسپل تھیں۔ ہڈیوں کے کسی عارضے میں مبتلا تھیں۔ زیادہ چل پھر نہ سکتی تھیں۔ الماری میں ان کے کپڑے ترتیب سے رکھتی ہوئی آرزو نے الماری کا پٹ بند کر دیا اور ان کے پاس گئی۔

''جی''

''اخبار پڑھ لیتی ہو؟ انگریزی یا ہے؟''

''جی۔''

''آج کا اخبار لے آؤ، پڑھ کر سناؤ مجھے۔'' انہوں نے حکم دیا۔

آرزو لاؤنج کی میز پر رکھا اخبار اٹھا کر ان کے کمرے میں لے آئی۔ دو گھنٹے تک ان کی فرمائش کے مطابق پڑھتی رہی۔ حلق خشک ہو جاتا تو پانی پی لیتی۔ اپنے لیے جو پانی کی بوتل وہ لائی تھی وہ تقریباً پوری ہی ختم ہوگئی جب مطالعہ پورا ہوا۔

''تمہارا تلفظ خاصا خراب ہے۔ کیوں؟'' وہ کسی ٹیچر کی طرح ہی باز پرس کر رہی تھیں۔

''پتا نہیں۔'' آرزو نے بے زاری سے جواب دیا۔ تلفظ خراب ہو نہ ہو مزاج ضرور خراب ہونے والا تھا۔

''جوس لاؤں آپ کے لیے۔'' آرزو نے جان چھڑانی چاہی۔

''بازار کا نہ لانا، فریش نکال کر لاؤ۔''

''جی اچھا۔'' جیل سے چھوٹے قیدی کی طرح وہ کمرے سے نکل بھاگی۔ سیب کا تازہ جوس نکالتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی، مجموعی طور پر تو بڑی بی اچھی ہیں بس کبھی کبھی نا قابل برداشت ہو جاتی تھیں۔ ان کا لباس بدلوانا بھی ایک بڑا مشکل اور صبر آزما مرحلہ ہوتا تھا۔

ایک ایک کر کے وہ الماری سے تقریباً سارے ہی لباس نکلوا لیتیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کون سا لباس پہنیں اور آرزو کی سمجھ میں یہ نہیں آتا تھا کہ یہ لباس منتخب کرنے میں اسے انتہائی رچ کر کیوں کرتی ہیں اتنے گھنٹے کیوں لگاتی ہیں جب کہ انہیں لباس بدل کر اسی کمرے میں رہنا ہے یا پھر زیادہ سے زیادہ لان میں بیٹھ جانا ہے۔ کسی کی بارات میں تو جانا نہیں۔

انہیں جوس دے کر ان سے اجازت لے کر۔ آرزو اپنے کوارٹر میں آئی۔ عظمیٰ کچن میں کھانا پکا رہی

تھیں۔
''میں نے منع کیا تھا آپ کو کچن میں گھسنے سے میں آتو گئی ہوں، چڑھا دیتی'' آرزو ماں پہ خفا ہونے لگی۔ رات سے عظمیٰ کی طبیعت خراب تھی۔ آرزو صبح ناشتہ بنا کر دے گئی تھی۔ دوپہر کا بول گئی تھی کہ آ کر پکائے گی۔ یہاں آئی تو ماں کو کچن میں دیکھا۔
''اب تو بہتر ہے طبیعت پھر فارغ بیٹھے بیٹھے بھی جی گھبراتا ہے۔ میں نے سوچا کھانا ہی پکا لوں۔'' عظمیٰ نے جیسے صفائی پیش کی بیٹی کے آگے۔
''اچھا آپ یہاں سے نکلیں۔ میں کرلوں گی۔'' آرزو چولہے پر ہنڈیا کی طرف متوجہ ہوئی۔ وہ قیمہ بھون رہی تھیں۔
''ماموں کو جوس دیا تھا؟'' ہنڈیا میں چمچہ چلاتے ہوئے عظمیٰ سے سوال کیا۔
''دے دیا تھا۔ میں نے بھی پی لیا تھا۔'' انہیں معلوم تھا کہ بیٹی کا اگلا سوال کیا ہوگا اس لیے پہلے ہی جواب دے دیا۔
''عاطف نہیں آیا کل۔''
''مصروف ہوگا۔'' آرزو نے لاپروائی سے کہا۔
''فون بھی نہیں کیا۔ ورنہ روز کرتا ہے۔'' عظمیٰ کے لہجے میں تشویش تھی۔
''اس کی منگنی ہوگئی ہے۔ ذمہ داریاں بڑھ گئی ہوں گی۔ کس کس کے لیے وقت نکالے وہ۔'' آرزو نے اچھی طرح سالن بھون کر اس میں آلو ڈال دیے۔
''میں نے سوچا شاید آج آجائے اس لیے قیمہ چڑھا دیا تھا۔'' عظمیٰ کے لہجے میں تھوڑی آس تھی۔ کچھ حسرت اور کچھ مایوسی۔
''آپ کیوں فضول میں انتظار کرتی ہیں اس کا، وہ اپنے باپ کے لیے آتا ہے یہاں۔'' آرزو بولتے ہوئے کچن سے باہر آگئی۔ اب وہ دونوں لاؤنج میں تھیں۔
''بھتیجا تو ہے میرا، پھوپھی ہوں اس کی۔''
''سگے بیٹے نے تو اپنا اور آپ کا رشتہ نہ یاد رکھا نہ نبھایا۔ دوسرے کی اولاد سے کوئی رشتہ اور توقع نہ ہی رکھیں تو بہتر ہے۔'' آرزو دوٹوک اور بے لچک انداز میں بول رہی تھی۔
''میرا بیٹا ایک دن ضرور آئے گا مجھے لینے۔ دیکھنا تم۔'' عظمیٰ کے لہجے میں اتنا یقین اور مان تھا کہ ایک لمحے کو وہ ماں کی صورت دیکھ کر رہ گئی۔ پھر اگلے ہی لمحے خود کو سنبھالتے ہوئے بولی تو لہجہ بدستور کاٹ دار تھا۔
''معجزہ ہوجائے گا پھر تو۔''
''معجزے اسی دنیا میں، اسی زمین پر ہوتے ہیں۔ کسی اور دنیا اور آسمان پر نہیں ہوتے۔''
''معجزے منتخب لوگوں کے لیے ہوتے ہیں۔ ہر ایک کے لیے نہیں۔''
''میری آس کو قائم رہنے دو گوگو، میں امید میں زندہ ہوں تو تمہارا کیا جاتا ہے۔'' عظمیٰ کی آنکھوں میں، لہجے میں درد تھا۔
''آپ کی زبان پہ بھی یہ نام چڑھ گیا؟ میرا نام آرزو ہے۔ گوگو نہیں۔'' آرزو جھلا کر وہاں سے اٹھ گئی۔
پتا نہیں آج بھی آئے گا یا نہیں۔ عظمیٰ عاطف کے بارے میں سوچ رہی تھیں۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ عاطف کس مشکل بلکہ مصیبت میں گرفتار ہے۔

☆☆☆

کل کی بات تھی۔ عاطف دن میں امی کا مکمل چیک اپ کروانے کلینک لے گیا تھا۔ وہیں جہاں اس کے دوست کے بڑے بھائی ڈاکٹر تھے۔ بڑے مہربان، ہمدرد اور انسان دوست، ان کی خاص بات یہ تھی کہ وہ فیس سے زیادہ مریض پر توجہ دیتے تھے۔
''یہ میری امی ہیں۔ گزشتہ دنوں ان کا بی پی بہت ہائی ہوگیا تھا۔ میں ان کا مکمل چیک اپ کروانے آیا ہوں۔ ان کا ڈائٹ پلان، پرہیز احتیاط، سب بتا دیں۔'' عاطف نے اپنے آنے کی وجہ بیان کی۔
ڈاکٹر احسن خوش خلقی سے مسکرائے اور امی کی طرف متوجہ ہوگئے۔ پہلے ان کا تفصیلی معائنہ ہوا۔ کچھ ٹیسٹ

لکھے ان کی رپورٹس دیکھ کر وہ عاطف سے مخاطب ہوئے۔

"ویسے تو ماشاء اللہ آپ کی والدہ کی مجموعی صحت ٹھیک ہے۔ بی پی اگر کبھی ہائی ہو جاتا ہے تو احتیاط کی ضرورت ہے۔ میں نے سب کچھ اس پرچے پر لکھ دیا ہے احتیاط پرہیز اور کچھ ٹانک، یہ آپ رکھ لیں۔" ڈاکٹر احسن نے پرچہ عاطف کی طرف بڑھایا۔ معاً انہیں کچھ یاد آیا۔ عاطف کی شکل دیکھ کر بولے۔

"آپ کے والد صاحب اب کیسے ہیں؟ کچھ بہتری تو آئی ہے ان میں پہلے کے مقابلے میں، تھوڑا سا فرق لگا تھا مجھے بھی۔"

"جی...... وہ......" عاطف بری طرح سٹ پٹایا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ڈاکٹر احسن اپنے مریضوں کو یوں یاد رکھتے ہوں گے۔ ان کے پاس تو روزانہ کتنے ہی مریض آتے ہیں مگر عاطف یہ بھول گیا کہ وہ شہید احمد کو ایک سے زیادہ بار ان کے پاس لایا تھا۔ ابھی بھی دو ہفتے پہلے ہی تو وہ انہیں لے کر آیا تھا یہاں۔

ڈاکٹر صاحب کو بتانے کے لیے اسے کوئی جواب نہیں سوجھ رہا تھا۔ امی الگ حیران پریشان سی ڈاکٹر صاحب کو دیکھ رہی تھیں۔

"ڈاکٹر صاحب! آپ کس کی بات کر رہے ہیں؟"

"آپ کے ہزبینڈ شہید صاحب کی، ان کا علاج بھی پچھلے کئی ماہ سے میں ہی کر رہا ہوں۔" ڈاکٹر نے خاصے لا پروا سے لہجے میں کہا تھا اور امی پہ گویا بجلی گر پڑی تھی۔ ان کا چہرہ یہ نام سن کر یوں سفید ہو گیا جیسے سارا خون نچڑ گیا ہو۔

"گھر چلیں امی، میں بتاتا ہوں سب۔" عاطف نے ماں سے نظریں ملائے بغیر دھیرے سے کہا اور کرسی سے کھڑا ہو گیا۔ ناچارہ وہ بھی کھڑی ہو گئیں۔ گاڑی تک پہنچتے پہنچتے ان کا یہ حال تھا کہ پاؤں کہیں رکھتی تھیں اور وہ پڑتا کہیں اور تھا۔ وہ جیسے نیم بیہوشی کی حالت میں تھیں۔ عاطف نے انہیں تھامنے کے لیے ان کا بازو تھامنا چاہا مگر انہوں نے جھٹک دیا۔

"دور رہو مجھ سے۔" وہ غرائیں، عاطف ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔

تمام راستے اس کی ہمت نہیں ہوئی ماں کو مخاطب کرنے کی یا ان کی طرف دیکھنے کی بھی۔

گھر پہنچ کر وہ اندر گئیں اور صوفے پر ڈھے گئیں۔

"میری سمجھ یہ میں نہیں آرہا کہ تم اس شخص تک پہنچے کیسے، اور کب سے؟ کب سے چل رہا ہے یہ معاملہ۔" عاطف کو مخاطب کیے بغیر وہ بڑبڑائیں۔

"امی۔" عاطف ماں کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

"امی، مجھے معاف کر دیں، میری وجہ سے آپ کا دل دکھا مگر یقین کریں میں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا۔ میری نیت آپ کو دھوکا دینے کی اور ہرٹ کرنے کی نہیں تھی۔ مجھے کسی نے ان کے بارے میں بتایا تھا کہ ان کی حالت بہت خراب ہے۔ میں نے انہیں دیکھا تو مجھے لگا کہ انہیں میری مدد اور تعاون کی ضرورت ہے۔ میں بس ان کی مدد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔" اٹکتے اٹکتے عاطف نے اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔

"تمہیں کس نے بتایا اس کے بارے میں؟" ماں کا انتہائی سرد لہجہ اسے مزید خائف کر گیا۔

"ایسے ہی کوئی تھا۔ آپ نہیں جانتیں۔" عاطف ان کی طرف دیکھے بغیر بول رہا تھا۔

"عاطف، ادھر دیکھو میری طرف، اور شروع سے آخر تک ایک ایک بات، ایک ایک سچ مجھے بتاؤ۔"

"امی! چھوڑیں جانے دیں، کیا کریں گی سب کچھ سن کر۔" عاطف آہستہ سے بولا، مگر وہ اس کی ایک نہیں سن رہی تھیں۔

"جب تک نہیں بتاؤ گے میں یوں ہی بھوکی پیاسی بیٹھی رہوں گی۔"

"امی!" عاطف نے دہل کر ماں کو دیکھا۔ وہ

اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کی ماں اپنے فیصلوں میں کتنی اٹل ہے اور اپنے معاملات میں کتنی ہٹ دھرم ہے۔ اب عاطف کے پاس کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ ماں کو سب کچھ سچ سچ بتادے اور اس نے بتادیا۔ عاطف چہرے پر شرمندگی سجائے دھیرے دھیرے اٹک اٹک کر بول رہا تھا۔ وہ سن رہی تھیں اور ان کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا۔ ایک جا رہا تھا۔ عاطف خاموش ہوا تو یک ٹک اس کا چہرہ دیکھ رہی تھیں۔

''تم میرے ہی بیٹے ہونا؟ میرے عاطف!'' کچھ دیر بعد جب وہ بولیں تو ان کی آواز زخم خوردہ تھی۔

''امی پلیز!'' عاطف تو تڑپ ہی گیا ان کی بات سن کر۔ ''مجھے اندازہ نہیں تھا کہ آپ اس بات سے اتنا دکھی ہوں گی۔ آپ مجھے معاف کردیں پلیز۔'' ماں کے پیر پکڑے وہ معافیاں مانگ رہا تھا۔

''تمہیں میرے دکھ کا اندازہ نہیں تھا؟'' امی بڑبڑائیں۔ ''کیا تم وہ سب بھول گئے جو بچپن سے لے کر آج تک تمہیں بتاتی چلی آئی ہوں؟ میں نے سب کچھ بتایا تمہیں۔ اس بے غیرت انسان کے سارے کرتوت، اس کی ذلیل بہن کی ساری حرکتیں۔ اس نے دوسری عورت کو مجھ پر ترجیح دی، کسی اور کے لیے مجھے چھوڑ دیا۔ دوسرے کی اولاد کو گلے لگا کر اپنی سگی اولاد کو چھوڑ دیا۔ ایسے جانور سے تمہیں نفرت کیوں نہیں ہوئی میری طرح؟'' عفت کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور لہجے میں شعلوں کی آنچ تھی۔

''صرف اور صرف نفرت کے قابل ہے وہ شخص، صرف نفرت کے، تم نے کیسے اسے گلے لگالیا۔'' وہ پھٹ پڑی تھیں۔ عاطف سر جھکائے ماں کے پیروں کو تھامے بیٹھا تھا۔ وہ زور زور سے رو رہی تھیں۔ چیخ چیخ کر رو رہی تھیں۔ ایک ہذیانی کیفیت ان پر طاری تھی۔ عاطف ان کی حالت دیکھ کر ڈر سا گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ دوڑ کر ایک گلاس پانی لے آیا۔

''پانی پی لیں۔'' بے چارگی سے کہتے ہوئے اس نے گلاس ماں کے آگے کیا۔

''ہٹاؤ اسے۔'' انہوں نے زور سے ہاتھ مار کر گلاس دور پھینک دیا۔

''چھوڑ دو مجھے، مرنے دو مجھے، اکیلے، تم جاؤ اس مردود کے پاس، اس کی خدمتیں کرو، اس سے ہمدردی کرو۔'' وہ اب بھی بری طرح رو رہی تھیں۔

''امی آپ مجھے مار لیں۔ مگر ایسے مت کریں پلیز، میں آپ سے جتنی محبت کرتا ہوں دنیا میں کسی سے نہیں کرتا، آپ بھی اچھی طرح جانتی ہیں، اس حقیقت کو۔'' عاطف ان کے سامنے ہاتھ جوڑے ہوئے تھا۔

''مجھ سے محبت کرتے ہو تو میرے سر پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاؤ، خدا کی قسم کھا کر کہو کہ تم ان دونوں بہن بھائی سے نہ کبھی ملو گے نہ بات کرو گے۔''

انہوں نے اپنی جذباتی اور ہیجانی کیفیت میں عاطف کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سر پر رکھا۔ ''کھاؤ قسم، خدا کی قسم کھا کر کہو۔'' وہ انتہائی مضطرب نظروں سے بیٹے کو دیکھ رہی تھیں۔ عاطف کا ہاتھ انہوں نے اپنے سر پر رکھا ہوا تھا۔

عاطف نے ایک نظر انہیں دیکھا اور آنکھیں بند کرلیں۔ جس میں پانی جمع ہونے لگا تھا۔ آنکھیں بند کیے اس نے وہ سب دہرادیا۔ جو ماں کی خواہش تھی۔ آج کی رات بڑی عجیب تھی۔ اتنی سیاہ، اتنی ہی خاموش اور ستم بالائے ستم، گزرنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔

کیا ضروری تھا یہ سب ہونا، جو ہوا۔ انسانوں کی غلطیاں کبھی ان ہی تک محدود نہیں رہتیں۔ نسل در نسل چلتی ہیں۔ نسلوں کو بھگتنی پڑتی ہیں۔ پہلی نسل کا کیا، اگلی نسل بھگت رہی تھی۔ باپ کا بھگتان بیٹا بھر رہا تھا۔ دل میں تمام غموں کو سمیٹے وہ چپ چاپ لیٹا ہوا تھا۔

اسے اپنی ماں سے محبت تھی شدید محبت، مگر نہ جانے کیوں ان کے لاکھ چاہنے پر بھی باپ کی ہزار زیادتیاں گنوانے پر بھی، اسے اپنے باپ سے نفرت

نہیں ہو سکی تھی۔

کبھی لڑکپن میں جب ماں سے ان کی داستان حیات سنتا تو سوچتا تھا جذباتی ہو کر، کہ باپ سے جب بھی ملاقات ہوگی تو ان کا گریبان پکڑ کر ان زیادتیوں اور مظالم کا حساب لے گا جو اس کی ماں پر ہوئے مگر جب وہ ان سے ملا تو پتا نہیں وہ کیسے بھول گیا کہ اسے اپنے باپ سے نفرت کرنی ہے۔ ماں کے ساتھ ہوئے ظلم کا حساب لینا ہے۔

وہ بھول گیا۔ فراموش کر دیا اس نے اُسے بس اتنا یاد تھا کہ وہ ایک بیٹا ہے اور پلنگ پر پڑا بے لاچار اور بے بس بوڑھا اس کا باپ، رگوں میں دوڑتے لہو کا اثر تھا یا اس شخص سے بندھے رشتے کی کرامت تھی کہ وہ صرف اور صرف ہمدردی کر سکا اس شخص سے، نفرت نہیں۔ مہربان ہو سکا اس پر، بے اعتنائی نہیں برت سکا۔

اب لیٹا لیٹا یہ سوچ رہا تھا کہ یہ بات امی کو کیسے سمجھائے کہ وہ کس وجہ سے مجبور ہوا باپ کے ساتھ ہمدردی کرنے پر، کیوں مجبور ہوا ان کا خیال رکھنے پر، شاید اپنی مہربان فطرت اور عادت کی وجہ سے؟ یا خون کی کشش کی وجہ سے؟ عاطف خود بھی سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ ماں کو کیا سمجھاتا۔

نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ خیالات کے بھنور میں دل و دماغ سمیت پورا وجود ہی چکرایا ہوا تھا۔ پھر بھی آنکھیں بند کر کے سونے کی ناکام کوشش کر رہا تھا کہ موبائل بجنے لگا۔ جب سے اس کی منگنی ہوئی تھی۔ روزانہ موبائل بجنا معمول بن گیا تھا۔ دیر سویر، ثانیہ کی کال روز آتی تھی۔

''ہیلو کیا حال ہے آپ کا؟'' عاطف کی ہیلو کے جواب میں ثانیہ شروع ہو گئی۔ وہ امی کیسی ہیں؟ چیک اپ ہو گیا ان کا؟ کیا رہا؟'' اس کے سوال پر سوال جاری تھے۔ دن میں روزانہ اپنی ہونے والی ساس سے باتیں کرتی تھی جنہیں ابھی سے ہی امی کہنا شروع کر دیا تھا۔ رات میں سونے سے پہلے بیٹے کا دماغ چاٹتی تھی۔ عاطف کبھی کبھی یہی سوچتا تھا حالانکہ بے چاری اتنی اچھی تو تھی خوش مزاج، خوش اخلاق، بس ذرا باتونی تھی۔ تو کیا ہوا، امی کو تو اس کی یہی عادت اچھی لگتی تھی۔

''مینا کی طرح چہچہاتی رہتی ہے۔ اچھا ہے۔ میرا دل تو لگا رہے گا بہو کے ساتھ۔'' امی ایک روز عاطف سے ہونے والی بہو کی تعریف کر رہی تھیں۔

''ہم لوگ کل آئیں گے امی کو دیکھنے۔'' عاطف کے جواب کا یا کچھ کہنے کا انتظار کیے بغیر وہ اگلی بات اگلا سوال شروع کر دیتی تھی۔

''اچھا۔''

''مجھے تو امی سے زیادہ آپ کی طبیعت خراب لگ رہی ہے۔ آپ ٹھیک تو ہیں؟''

''میں ٹھیک ہوں۔''

''آپ کہتے ہیں تو یقین کر لیتی ہوں چلیں آج اپنی پسند ناپسند بتائیں۔ کھانے میں کیا پسند ہے آپ کو۔'' عاطف کا انٹرویو شروع ہوا۔

''ہر وہ شے جو اچھی پکی ہوئی ہو۔''

''مثلاً کریلے، بھنڈی، توری، کدو، لوکی، دالیں اچھی پکی ہوں تو کھا لیتے ہیں آپ؟ وہ مذاق نہیں کر رہی تھی سچ مچ حیران ہو رہی تھی۔

''بالکل کھا لیتا ہوں۔ میری امی یہ سب چیزیں گوشت کے ساتھ پکاتی ہیں۔ میں کھا لیتا ہوں۔''

''مگر مجھے تو یہ سب نہ پکانا آتا ہے نہ میں کھاتی ہوں۔''

''پھر آپ کو کیا پکانا آتا ہے اور آپ کیا کھاتی ہیں؟''

''میں ...... پیزا، شوارما، برگر......'' ایک ایک کر کے اس نے کتنے ہی جنک فوڈ کے نام گنوا دیے اور ساتھ میں یہ بھی کہ یہ سب اسے بنانے بھی آتے ہیں۔

''آپ ایسا کیجیے گا کبھی اپنی پسند کا پکا لیجیے گا کبھی میری مرضی کا۔''

''ہاں۔ یہ بھی ٹھیک ہے۔ ویسے آپ ہیں بہت اچھے، کسی بات پر نہ غصہ دکھاتے ہیں نہ نخرہ، اپنی

ٹیوٹ نہیں ہے آپ میں، ورنہ میری ایک سہیلی کا فیانسی تو اتنا کھڑوس، نخریلا اور اترائی شکل ہے کہ کیا بتاؤں، بات بات پر عب جماتا ہے۔ غصہ دکھاتا ہے پابندیاں لگاتا ہے۔ یہ کرو، وہ نہ کرو، ایسے کرو، ویسے نہ کرو، بے چاری ہما کی جان مصیبت میں آ گئی ہے۔'' وہ اپنی سہیلی کا دکھڑا رو رہی تھی۔

''کیا پتا میں بھی ایسا ہی نکلوں، تھوڑی دیر کی بات چیت سے کسی کے بارے میں کیا پتا چلتا ہے؟''

''جی نہیں، مجھے پتا ہے آپ ایسے نہیں ہیں۔ ویسے بھی سب لوگ آپ کی اتنی تعریفیں کرتے ہیں۔''

''اچھا!'' عاطف کے لبوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی۔

''اب سونے کی اجازت ہے؟''

''اوہ، بالکل، خدا حافظ۔''

اگلے روز ثانیہ کے گھر والے امی کی عیادت کرنے آئے۔ امی، ابو، بہن اور بھائی، ساتھ میں بہت سے لوازمات بھی لائے تھے۔ پھل، جوس اور دودھ کے پیکٹ شہد کی بوتل،

''یہ سب تکلف کرنے کیا ضرورت تھی، آپ لوگ آئے بس کافی تھا۔'' عفت بیگم سمدھیانے کے اعلا اخلاق کی قائل بلکہ گھائل ہو گئی تھیں۔

''تکلف کیسا بس آپ جلد از جلد یہ سب ختم کر دیجیے گا۔ ہمیں خوشی ہوگی۔ ویسے بھی آپ بہت کمزور اور زرد ہو رہی ہیں۔'' ثانیہ کی امی نے عفت بیگم کا ستا ہوا چہرہ دیکھا جو واقعی کمزور اور زرد ہو رہا تھا۔

''کمزوری ہے، ڈاکٹر نے ٹانک لکھے ہیں صحت کے۔'' عفت کل والی ساری کلفت اور اپنے اندرونی اضطراب و بے چینی کو بڑی کامیابی سے چھپائے سمدھن کے ساتھ محو گفتگو تھیں۔ لیکن باتیں کرتے کرتے انہیں گزری کل کا خیال آ جاتا اور ان کے چہرے کا رنگ بدل جاتا۔

''آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی عفت بہن! ثانیہ نے آپ کے لیے خاص طور پر سوپ بنا کر بھیجا ہے۔ اور تاکید کی تھی کہ آپ کو پلا کر ہی آئیں۔ میں نکال دیتی ہوں۔ ابھی گرم اور تازہ ہے۔'' سمدھن صاحبہ نے خوش اخلاق سے بولتے ہوئے فلاسک نکالا جس میں سوپ تھا۔

''دل تو نہیں چاہ رہا مگر بچی نے اتنی محبت اور اصرار کے ساتھ بھیجا ہے تو تھوڑا سا پی لیتی ہوں۔'' عفت ثانیہ کی توجہ اور خیال رکھنے کے خیال سے ہی مسرور ہو گئیں۔ ملازمہ کو آواز دی جو کچن میں مہمانوں کی خاطر تواضع کا بندوبست کر رہی تھی۔ وہ فوراً آ گئی۔

''یہ لے جاؤ، اس میں سوپ ہے نکال کر لے آنا۔ میری بہو نے بنا کر بھیجا ہے۔'' عفت نے فخریہ بولتے ہوئے اسے فلاسک تھمایا۔

''جی اچھا۔'' سر ہلاتی ہوئی فلاسک لے کر چلی گئی۔

مہمانوں کے جانے کے بعد عفت پھر سوچ میں پڑ گئی تھیں۔ اب انہیں بار بار عاطف کا خیال آ رہا تھا۔

''میرا بچہ کیسا رو پڑا تھا میرے آگے۔ ہاتھ جوڑ کے معافیاں مانگ رہا تھا، میں نے بھی اتنا غصہ دکھایا اسے۔ کہیں زیادتی تو نہیں کر دی اس کے ساتھ؟'' ان کی ممتا بے چین ہو رہی تھی۔

وہ تو شروع سے ہی ایسا ہے، گداز دل کا مالک، نرم خو اور حساس، بلی کے اور پرندوں کے گرے پڑے بچے اٹھا کر گھر میں لے آتا تھا ان کا خیال رکھنے کے لیے۔ دیکھ بھال کرنے کے لیے۔ پھر یہ بھی تو نہیں معلوم کہ ان چلتر بازوں نے کیا کہانیاں سنا کر میرے معصوم اور سیدھے سادے بیٹے کو قابو میں کر لیا کہ ماں کو بتائے بغیر ان کی خدمت میں حاضری دینے لگا۔

ان دونوں بہن بھائیوں کے مکر و فریب اور چھل سے تو میں ہی واقف ہوں۔ عاطف بے چارے کو کیا خبر اس کا باپ اور پھوپھی کتنے گن اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں چالباز، دھوکے باز، مکار، سازشی، میری زندگی برباد کر کے اب میرے بیٹے پر قبضہ جمانے چلے ہیں دونوں، میں ہونے دوں گی ایسا؟ مر بھی رہے ہوں میرے بیٹے کے سامنے تو حلق میں پانی نہ ٹپکانے دوں؟ بیٹے کو دل کی عدالت میں بے گناہ بری

کر کے وہ ان دونوں کو اسی شدت اور نفرت کے ساتھ سوچ رہی تھیں جیسے سوچتی چلی آئی تھیں۔

عاطف بہت پریشان تھا۔ ویسے تو شہید احمد اب اس قابل تھے کہ اپنے ہاتھ پاؤں استعمال کرنے لگے تھے۔ غسل اور حوائج ضروریہ سے فراغت، کھانا کھانا، اب اپنے ہاتھوں سے کرنے لگے تھے۔ بولتے اب بھی نہیں تھے مگر کبھی کبھی عاطف کی باتوں پر مسکرا دیتے تھے' جب وہ ان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر نہ جانے کیا کیا باتیں کرتا رہتا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ شہید احمد بہت بے چینی سے اس کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ مگر وہ جا نہیں سکتا تھا۔ وہاں بات نہیں کر سکتا تھا۔ ان سے۔

پھر اسے بار بار امی کا خیال بھی آ رہا تھا، ان کی ہسٹریائی کیفیت، ان کا زار زار رونا، ان کی بے یقین نگاہیں انہیں کسی طور یقین نہیں آ رہا تھا کہ جس شخص سے وہ شدید نفرت کرتی تھیں۔ اس شخص سے ویسی نفرت ان کا بیٹا نہیں کر سکتا۔ عاطف چاہ کر بھی انہیں یہ بات کبھی نہیں سمجھا سکتا تھا کہ اس نے محض اپنے بیٹے ہونے کا فرض نبھایا ہے۔ تھوڑی سی ذمہ داری اٹھانے کی کوشش کی ہے اپنے باپ کی۔ جو ایک بیٹے پر فرض ہے۔

ہاں ٹھیک ہے کہ چھ سال کی عمر کے بعد انہوں نے باپ ہونے کا حق ادا نہیں کیا۔ اسے ماں کے ساتھ چھوڑ دیا تو پھر پلٹ کر خبر نہیں لی۔ وہ محرومیوں کا شکار رہا۔ باپ کی شفقت محبت سے محروم رہا۔ باپ کی انگلی پکڑ کے اسکول جانا، پارک جانا، آئس کریم کھانے یا جھولا جھولنے جانا، محرومیاں تھیں اس کی زندگی میں جن کا اس نے سامنا کیا، ایک دو نہیں بہت ساری مگر پھر بھی اس کا دل اس شدت سے شہید احمد کے خلاف نہیں ہو سکا۔ اتنا کٹھور اور سنگ دل نہیں ہو سکا کہ باپ سے اس بات کا بدلہ لیتا کہ انہوں نے اپنے فرائض سے غفلت برتی۔ انہیں ادا کرنے سے پہلو تہی کی، مگر عاطف پیچھے نہیں ہٹ سکا۔ نظر انداز نہیں کر سکا انہیں۔

مگر یہ سب باتیں وہ خود ہی سوچ سکتا تھا۔ اس معاملے پر وہ اپنے آپ سے ہی بات کر سکتا تھا۔ اپنی امی کو اگر یہ سب بتا بھی دیتا تو جانتا تھا کہ انہیں اس بات سے تکلیف ہو گی۔ شہید احمد کے لیے عاطف کی اعلا ظرفی نرم دلی انہیں صدمہ پہنچائے گی۔ غصہ دلائے گی۔ عاطف خاموش رہنے پر مجبور تھا۔ اب تو امی نے زبردستی قسم دلا کر اس سے وعدہ بھی لے لیا تھا۔

پتا نہیں اب کیا ہو گا۔ وہ انتہائی بے بسی کے عالم میں تھا۔

☆☆☆

مہربانو نے شہزادے کو چاند گاڑی سے نکال کر کھڑا کیا۔ وہ اب کھڑا ہو جاتا تھا۔ دو چار قدم آگے بڑھتا، لڑکھڑاتا اور مہربانو اسے تھام لیتی، شہزادے کو کھڑا کر کے وہ سامنے بیٹھ گئی۔

''آؤ!'' مہربانو نے اسے بلایا۔ وہ مسکرا کے ایک قدم آگے بڑھا۔ اس وقت آرزو بھاگتی ہوئی اندر آئی اور شہزادے سے ٹکرائی۔ دونوں گر پڑے اور رونے لگے۔ مہربانو نے جھپٹ کر شہزادے کو گود میں اٹھایا۔

''ہائے میرا چاند، کتنے زور سے دھکا دے کر گرایا ہے۔ اندھی ہے کیا، دیکھ کر نہیں بھاگتی۔'' آرزو کو قہر آلود نظروں سے دیکھتے ہوئے ایک تھپڑ اس کے جڑ دیا۔ بلکتی ہوئی آرزو اور زور زور سے رونے لگی۔ عظمیٰ جو آرزو کے رونے کی آواز سن کر آئی تھی۔ مہربانو کو تھپڑ مارتے دیکھ چکی تھی۔

''یہ کیا کر رہی ہو، مار کیوں رہی ہو بچی کو؟'' عظمیٰ نے اپنی روتی ہوئی بیٹی کو گود میں اٹھایا اور چپ کرانے لگی۔ چہرے پر نا گواری تھی۔

''بچی کی حرکت دیکھی، آ کر میرے بیٹے کو گرا دیا۔'' مہربانو نے تڑاخ کر جواب دیا۔

''وہ تو کھیلنے آئی تھی، خوشی خوشی بھاگ کر آئی تھی کہ بھائی کے ساتھ کھیلنے جا رہی ہوں۔'' عظمیٰ کو غصہ آ رہا تھا۔

''اتنی سی بچی کو کون مارتا ہے؟''

''اپنا بھائی ہے تو اس کے ساتھ کھیلے، یہاں کیوں آئی ہے۔'' مہربانو انتہائی بدتمیزی سے بول رہی تھی۔
''اس کا بھائی ابھی سو رہا ہے ورنہ اس کے ساتھ کھیل لیتی۔ یہاں نہ آتی۔'' عظمیٰ بیٹی کو لے کر چلی گئی۔''

رات میں وہ اپنا دکھڑا ارسلان کے آگے رو رہی تھی۔

''برداشت کرلو، اب کیا کریں، جب تک اس کی کہیں اور شادی نہیں ہو جاتی تب تک یہی سیاپے چلتے رہیں گے گھر میں۔'' ارسلان نے بے زاری سے جواب دیا تھا۔ آئے دن کے جھگڑوں سے وہ بھی تنگ آچکا تھا۔
''آئندہ اگر اس نے میرے کسی بھی بچے کو ہاتھ لگایا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔'' عظمیٰ بپھر کر بولی۔
'' اچھا جو تمہارے بچے کو مارے تو تم بھی اسے دو چار تھپڑ لگا دینا۔ چاہے تمہاری نند ہو، ساس ہو یا شوہر۔'' ارسلان بھی جوتے مارنے میں کم نہیں تھا۔
''ارسلان!'' عظمیٰ نے اس کے طنز پر شکایتی نگاہوں سے اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آنے لگے۔
''میرا میکہ نہیں رہا تو سب نے مجھے بے وقعت سمجھ لیا۔''
''میکہ کیوں نہیں ہے۔ بھائی بھاوج ہیں تو سہی۔'' ارسلان نے جمائی لیتے ہوئے تکیہ ٹھیک کیا۔
اس وقت دن بھر کا تھکا ہارا ہوتا تھا۔ نیند کا غلبہ ہوتا تھا اور عظمیٰ دن بھر کی روداد انتہائی باریکیوں سے تفصیلات کے ساتھ اس کے گوش گزار تھی۔
''میکہ ماں باپ کے دم سے ہوتا ہے۔ بھائی بھاوج کا کیا ہے۔ ایسے آنکھیں بدل لیتے ہیں جیسے جانتے نہیں، اب ذرا عفت کو دیکھو، سگی کزن ہے بھابھی تو بعد میں بنی ہے۔ مگر اب تو ایسی غیریت برتتی ہے کہ کیا بتاؤں، میرا گھر جانا تو اس سے بالکل برداشت ہی نہیں ہوتا۔''
عظمیٰ نے نیا دکھڑا رونا شروع کر دیا۔

''ہوں۔'' ارسلان نے آنکھیں بند کے ہنکارا بھرا۔
''کتنی جلدی چلی گئیں میری امی یوں اچانک، رات کو اچھی بھلی سوئیں اور صبح ختم، جب تک میری امی تھیں۔ عفت کی مجال بھی کہ مجھے ایک لفظ بھی کہہ سکتی۔ اب تو دھڑلے سے بول رہی تھی کہ روز روز آنے سے قدر کم ہو جاتی ہے۔'' بولتے بولتے عظمیٰ نے ارسلان کی طرف دیکھا۔ جس نے اب خراٹے لینے شروع کر دیے تھے۔
لو یہ بھی سو گئے۔ عظمیٰ نے مایوسی سے شوہر کو دیکھا۔ اکثر ہی ایسا ہوتا تھا۔ وہ اپنے دکھڑے رو رہی ہوتی ارسلان کے آگے اور وہ سنتے سنتے سو بھی جاتا اور خراٹے لینے شروع کر دیتا۔
بیوی کی باتوں کے جواب میں شوہر کے پاس خراٹے ہی ہوتے ہیں۔ عظمیٰ نے ذرا تلخ ہو کر شوہر کو دیکھا۔
حمیرا کوششوں میں لگی ہوئی تھیں کہ کسی طرح مہربانو کی کسی اور جگہ شادی ہو جائے مگر ہزار جتن کے باوجود بھی ان کی کوششیں بار آور نہیں ہو رہی تھیں۔ ان کی خواہشات اور مطالبات کی اڑان اونچی تھی۔ وہ چاہتی تھیں کہ معیز عالم جیسا بلکہ اس سے بھی بڑھ کر کوئی ملے۔ وہ اس حقیقت کو فراموش کر گئیں کہ آج کل کنواریوں کے لیے بر ملنا ایک سنگین مسئلہ بن چکا ہے تو طلاق یافتہ، ایک بچے کی ماں کو اپنی مرضی اور پسند کا رشتہ کیسے ملے گا؟ چاہے لڑکی کتنی خوب صورت ہی کیوں نہ ہو مگر طلاق کے داغ اور بچے کے ساتھ حسن کچھ گہنا جاتا ہے۔
مہربانو کے لیے رشتے کرانے والی سے رابطہ کیا گیا تھا۔ وہ جتنے بھی رشتے لائی سب دوسری، تیسری شادی والے تھے۔ ادھیڑ عمر، معمولی نوکری یا چھوٹا موٹا کاروبار، کسی کے دو بچے، کسی کے تین چار، کوئی ایک رشتہ بھی حمیرا کی نظر میں نہ جچا۔
''یہ کیسے رشتے لائی ہو میری بچی کے لیے، نہ دولت، نہ شکل، نہ کچھ، اور اوپر سے بال بچوں والے،

مہربانو تو پھول سی نازک ہے، اس نے اپنے بچے کو سنبھالنے کے لیے آیا رکھی ہے، وہ دوسروں کی اولادیں سنبھالے گی؟ تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے کیا؟حمیرا ''وچولن'' پہ برس پڑی۔

''دنیا والے بڑے سیانے ہیں جی، خوب صورت تو کنواریوں میں بھی بہت ہیں، جیسے آپ کو پیسے والا داماد چاہیے۔ ایسے ہی مردوں کو بھی اپنے سے اونچا گھرانہ چاہیے، کم بخت لوگ دوسرے کی مجبوری سے فائدہ اٹھانے کا سوچتے ہیں۔ جیسا داماد آپ چاہ رہی ہیں وہ تو اللہ نے پہلے ہی دے دیا تھا، آپ نے قدر نہ کی، اب بہت مشکل ہے ویسا ملنا، کوئی اپنی مرضی اور چاہ سے بیاہ لے جائے تو الگ بات ہے۔'' حمیرا کے چپ ہوتے ہی وچولن نے ایک سانس میں سب کچھ کہہ دیا، حمیرا خاموش بیٹھی رہ گئیں۔

مہربانو کی اذیت اور بڑھ گئی تھی۔ اس نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا اس کی زندگی میں یہ وقت بھی آئے گا۔ اس نے نوعمری سے ہی اپنے سپنوں کے تار شہید احمد کے تصور سے بنے تھے۔ وہ خواب چکنا چور ہو گیا۔ سپنوں کے سارے تار آپس میں الجھ کر رہ گئے پھر قسمت نے معیز عالم کے ہاتھ میں اس کا ہاتھ دے دیا اس کی بدقسمتی تھی جو خود چل کر اس کے پاس آئی یا اس نے خود اسے آواز لگائی، بہرحال معیز عالم کا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ دونوں کے رستے جدا ہو گئے۔

اب زندگی عجیب دوراہے پہ کھڑی تھی۔

کبھی تو اسے لگتا کہ اس کی ساری خواہشیں مر گئی ہیں، سارے خواب جل گئے ہیں، اب کوئی تمنا دل میں باقی نہیں رہی، اور کبھی......؟

کبھی اس کا دل چاہتا اس دنیا کو آگ لگا دے، اس کا دل چاہتا کہ معیز عالم کا منہ نوچ لے ایسے کہ پھر وہ کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہ رہے، خودترسی کی اسی کیفیت میں اسے عفت پر بھی شدید غصہ آتا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ اگر عفت اس کے اور شہید احمد کے درمیان نہ آتی تو اس کی زندگی یوں اندھے کنویں میں نہ گرتی جس میں اب گری ہوئی ہے، ایسا اندھا کنواں جس سے باہر نکلنے کا نہ کوئی در ہے نہ امکان، تلخی کا زہر آہستہ آہستہ اس کے رگ و پے میں سرائیت کرتا جا رہا تھا۔

عظمیٰ اور ارسلان کا التفات دیکھتی تو اس کے تن بدن میں آگ لگ جاتی۔ عفت اور شہید احمد کے بارے میں سوچتی تو جلن، حسد کے مارے برا حال ہو جاتا، میرے ہی نصیب میں یہ بربادی لکھی تھی، آخر کیوں ؟ اگر وہ ایمان داری سے اپنا بے لاگ احتساب کرتی تو اسے اس کیوں کا جواب مل جاتا مگر وہ اپنے آپ کو بالکل بے گناہ، اور بے قصور سمجھتے ہوئے اپنی ہر مصیبت اور تکلیف کا ذمہ دار دوسروں کو ٹھہرا بھی رہی تھی اور سمجھ بھی رہی تھی۔

عظمیٰ نے شہید احمد کو فون کیا تھا۔

''بھائی، مجھے بہت تیز بخار ہے ڈاکٹر کے جانا ہے، لے چلیں گے، ارسلان تو اس وقت آفس میں ہیں۔ رات تک ہی آئیں گے۔'' فون پہ عظمیٰ کی نقاہت بھری آواز سن کر شہید دکان ملازموں پر چھوڑ کر فوراً ہی پھوپھی کے گھر آ گیا۔ مین روڈ پر اس کی الیکٹرونکس کے سامان کی بہت بڑی دکان تھی۔ اچھا خاصا چلتا ہوا کاروبار تھا۔ ملازم ابا کے زمانے کے تھے، پرانے اور قابل بھروسہ، اسی لیے شہید احمد دکان ان کے حوالے کر کے آرام سے آ گیا تھا۔

عظمیٰ کو بہت تیز بخار تھا۔ دونوں بچوں کو دادی کے پاس چھوڑ کر وہ بھائی کے ساتھ قریبی کلینک آئی۔ ڈاکٹر کے پاس مریضوں کی لائن لگی ہوئی تھی۔ ڈیڑھ دو گھنٹے لگ گئے۔ میڈیکل اسٹور سے دوائی لے کر اسے گھر چھوڑا۔

''اندر آ جائیں بھائی، آپ نے تو آنا ہی چھوڑ دیا۔ ہمارا میکے آنا، آپ کی بیوی نے چھڑوا دیا۔'' عظمیٰ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''کیا ہوا، عفت نے کچھ کہا ہے کیا؟'' شہید احمد چونک پڑا۔

''نہیں لگتا ہے کہ میں گھر آؤں گی تو مہربانو

کے قدم بھی اس کے گھر میں پڑیں گے جو وہ چاہتی نہیں ہیں۔'' عظمیٰ نے اپنے آنسو صاف کیے۔ اب تو موقع ملا تھا بھائی کے سامنے وہ ساری باتیں کہنے کا جو کب سے دل میں سلگ رہی تھیں۔

''مہربانو کہاں سے آ گئی بیچ میں۔'' شہید احمد گڑبڑا گیا۔

''آئی تو کہیں سے نہیں، مگر انہیں یہی لگتا ہے کہ وہ بیچ میں ہے۔'' عظمیٰ اسے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر ساس کے کمرے میں گئی۔ وہ فوراً ہی آ گئیں۔

''ارے اندر آؤ نا، ڈرائنگ روم میں کہاں بیٹھ گئے' ہمانوں کی طرح۔'' حمیرا اسے لاؤنج میں لے آئیں۔

''اب تو تم نے شکل دکھانا بھی چھوڑ دی، ایک وہ وقت تھا جب دن میں دو تین چکر لگائے بغیر تمہارا کھانا ہضم نہیں ہوتا تھا۔ سارا سارا دن یہیں رہتے تھے، ہائے، وہ بھی کیا وقت تھا۔'' حمیرا نے ایک آہ بھری۔

''ہاں، وہ بھی کیا وقت تھا۔'' شہید احمد کی نظر بلا ارادہ ہی سامنے مہربانو پہ پڑی جو کچن میں اپنے بچے کے لیے دودھ گرم کر رہی تھی۔

''مہر بیٹا، ذرا چائے بنا لینا، دیکھو کباب رکھے ہوں گے، تل لو ذرا۔ عظمیٰ تو بخار میں پڑی ہے، اس سے کہاں ہوگا یہ سب۔''

''نہیں نہیں، میں بس اب چلوں گا، دکان ملازموں پہ چھوڑ کر آیا ہوں آپ یہ تکلف رہنے دیں۔'' شہید احمد اٹھنے لگا۔

''ملازم دیکھ لیں گے دکان' نئے ملازم تھوڑی ہیں، سب پرانے ہیں۔'' حمیرا بیگم نے ناک سے مکھی اڑائی ''اور تکلیف کی کیا بات ہے، جیسے پہلے تھے۔'' ایسے ہی آیا کرو، تمہارا اپنا گھر ہے۔''

''جی۔'' شہید احمد ان کے اصرار اور باتوں کے آگے فقط جی کہہ کر رہ گیا۔ وہ کیا بتاتا کہ عفت کو اس گھر کے مکین کتنے ناگوار گزرتے ہیں۔ مگر خیر عورت ذات ہونے کی حیثیت سے، ایک بیوی ہونے کی حیثیت سے یہ اس اس کا حق تھا کہ وہ اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے چوکنا رہتی مگر کبھی حد سے زیادہ احتیاط اور بے جا شکوک وشبہات زندگی اور تعلقات کے خوب صورت رنگوں میں بھنگ ملا دیتے ہیں۔

شہزادے کو دودھ دے کر مہربانو کباب تلنے لگی، چائے اور کباب کی خوشبو فضا میں مہک رہی تھی۔ اس نے چائے اور دیگر لوازمات لا کر میز رکھے اور خود چپ چاپ صوفے پہ بیٹھ گئی۔ قریب رکھی چھوٹی سی کرسی پہ اس کا بیٹا بیٹھا دودھ پی رہا تھا۔ شہید احمد خاموشی سے کباب اٹھا کر کھانے لگا۔ کبھی وہ وقت تھا کہ بے تکان اور لگاتار باتیں کیا کرتے تھے دونوں، اب مخاطب کرنے کے لیے کوئی موضوع ہی نہیں مل رہا تھا۔

''ماموں......، آرزو پتا نہیں کب کمرے سے نکل کر آئی تھی۔ بال بکھرے ہوئے، سوئی سوئی خمار آلود آنکھیں۔

''ارے میرا بیٹا۔'' شہید احمد نے اسے گود میں بٹھا لیا۔

''ماموں کو اپنا نام بتاؤ۔'' دادی نے ہدایت کی۔

''گوگو'' وہ ابھی چھوٹی تھی اپنا پیار کا نام گگو ٹھیک سے ادا نہیں ہوتا تھا۔ بڑے پیارے اور بھولے انداز میں گوگو کہتی تھی۔ گھر میں سب یہی سوال بار بار اس سے کرتے تھے اور اس کا جواب انجوائے کرتے تھے۔ اب بھی اس کی توتلی زبان سے گوگو سن کر سب ہنس پڑے۔

''کھانا کھا کر چلے، جاتے؟'' چائے پی کر شہید احمد نے جانے کے لیے پر تولے تو حمیرا بیگم بولیں۔

''پھر کبھی سہی۔''

''اچھا پھر ایسا کرو کل رات کا کھانا یہاں کھا لینا، عفت اور عاطف کو بھی لے آنا۔'' حمیرا بھتیجے کے آگے بچھی بچھی جا رہی تھیں۔ شادی کے بعد تو ثمینہ اور عفت نے اس کی لگام میں ایسی کسی تھیں کہ وہ یہاں کا رخ بھی بھول گیا تھا۔

''جی اچھا۔'' شہید احمد کو دکان پہنچنے کی جلدی تھی، سب کو جلدی جلدی خدا حافظ کہہ کے، عظمیٰ کو ایک بار پھر پوچھ کر اس کے سر پہ ہاتھ رکھ کر وہ گھر سے

نکل آیا۔
پتا نہیں مہر بانو کے ساتھ زندگی نے، قسمت نے ایسا سنگین مذاق کیوں کیا؟ مہر بانو کا اداس حسن بار بار نظروں میں آ رہا تھا۔ اس کا سوگوار چہرہ شہید احمد کو ایک الجھن بلکہ اذیت میں مبتلا کر رہا تھا۔
رات میں کھانا کھانے بیٹھا تو اس کا دماغ منتشر تھا۔ اس نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ میز پہ اس کے پسندیدہ کوفتوں کی ڈش بھی موجود تھی۔ اس نے ماش کی دال پلیٹ میں نکالی اور کھانا شروع کر دیا۔ جس پہ اس کی پہلی نگاہ پڑی تھی۔
''آج دن بھر کہاں تھے؟ دوبار ملازموں کا فون آیا تھا گھر پر، سامان کی ڈلیوری آئی ہوئی تھی اور آپ غائب تھے۔'' عفت نے اچانک ہی سوال کیا تھا۔
''عظمیٰ کو ڈاکٹر کے پاس لے گیا تھا۔ بیمار ہے وہ۔'' شہید احمد نے گڑبڑائے بغیر آہستہ سے جواب دیا۔
''اس کا شوہر نہیں لے جا سکتا؟ آپ کی ذمہ داری ہے یہ؟'' عفت کا منہ بن گیا۔
''ارسلان آفس میں تھا۔''
''ساس تو ہیں۔ وہ لے جاتیں۔''
''میری بہن ہے وہ، مجھے بلا لیا تو کیا ہوا؟'' شہید احمد چھوٹے چھوٹے نوالے لیتا ہوا کسی سوچ میں گم تھا۔
''وہاں جانے سے ہوا یہ کہ آپ کو اپنے سامنے کی نہ چیزیں نظر آتی ہیں نہ انسان۔'' عفت نے ایک ایک لفظ چبا کر کہا اور اس کے سامنے کوفتوں کا ڈونگا تقریباً پٹخ ہی دیا۔
''یہ آپ کے لیے بنائے تھے، آپ نے دال کھانا شروع کر دی، جو آپ کو پسند بھی نہیں۔''
''ناپسندیدہ چیزوں کو بھی، قبول کر لینا چاہیے۔'' نہ جانے کیسے شہید احمد کے منہ سے نکلا۔
''اوہ، جیسے آپ نے کیا ہے، اپنی ماں کی پسند کو قبول کر کے؟'' عفت کا لہجہ انتہائی کٹیلا تھا۔ وہ آج تک اس احساس کمتری سے باہر نہیں نکلی تھی کہ وہ شہید احمد کی پسند نہیں مجبوری تھی۔ ''مجبوری'' کی اختراع بھی اس کے دل و دماغ نے خود ہی گھڑی اور اسے پال پوس کر بڑا ہی کرتی گئی۔
''پتا نہیں کیوں تم ہر وقت لڑائی جھگڑے پہ تلی رہتی ہو۔'' شہید احمد نے پلیٹ میں کوفتے نکالتے ہوئے بے بسی سے اسے دیکھا۔
''کچھ دیکھتی ہوں، سوچتی ہوں تب ہی بولتی ہوں، کوئی پاگل نہیں ہوں میں۔'' شہید احمد نے خاموشی کو غنیمت سمجھا اور اختیار کر لیا۔ ورنہ وہ یہ سوال بھی پوچھ سکتا تھا کہ وہ کیا دیکھتی ہے یا کیا دیکھا ہے اس نے، جو وہ ''کچھ'' سوچنے پر مجبور ہوئی ہے۔ سر جھکائے سکون سے وہ کھانا ختم کرتا رہا۔ پانی پی کر اس نے عفت کی طرف دیکھا اور اسے مخاطب کیا۔
''کل حمیرا پھپھو نے ہمیں رات کے کھانے پہ بلایا ہے۔''
''کس خوشی میں؟'' عفت نے انتہائی کڑوے لہجے میں کڑوا سوال کیا تھا۔
''رات میں تیار رہنا، جانا ہے۔'' شہید احمد نے اس کا سوال فضول سمجھ کر نظر انداز کیا اور شوہرانہ استحقاق کے ساتھ حکم جاری کیا۔
''میری جوتی بھی نہ جائے وہاں۔'' عفت بھڑک اٹھی۔
''تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے؟ ہوا کیا ہے آخر؟ ان لوگوں سے کیا تکلیف ہے تمہیں؟'' شہید احمد کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ ''میری بہن کے لیے بھی تم اس گھر کے دروازے بند کرنا چاہتی ہو اس کے ساتھ تمہارا رویہ......''
''کان بھر دیے بہن نے؟'' عفت نے سلگتی ہوئی نگاہوں سے شوہر کو دیکھا، جو کبھی اسے بہت اجنبی اور خود سے دور محسوس ہوتا تھا۔
''سیدھی سی بات یہ ہے کہ مجھے عظمیٰ کا سسرال بالکل پسند نہیں اور پھپھو (ثمینہ) بھی یہی تاکید کرتی تھیں کہ ان لوگوں سے دور رہو اور ویسے بھی آپ کی امی تو اتنا میل ملاپ نہیں رکھتی تھیں ان لوگوں سے، پھر آپ کیوں اتنا گھستے ہیں؟''

''میری پھپھو کا گھر ہے وہ، آج سے نہیں، شروع سے ہی آنا جانا ہے میرا۔''

''تو یہ آنیاں جانیاں کب تک جاری رہیں گی؟ آج آپ جائیں گے، کل کو مہر بانو یہاں آئے گی، مجھے تو آج تک نہ آپ کی پھوپھی سمجھ آئیں نہ ان کی بیٹی، اپنا گھر تو برباد کر چکی ہے اب لگتا ہے کہ دوسرے کا گھر برباد کرے گی۔'' عفت کے اندر جو کینہ اور بغض بھرا ہوا تھا، باہر آ رہا تھا۔

''بکواس مت کرو، تمہیں نہ کسی کی عزت کرنا آتی ہے نہ اپنی کروانی۔'' شہید احمد رنج کے مارے زیادہ بول بھی نہیں سکا۔

جب سے ثمینہ بیگم کا انتقال ہوا تھا۔ عفت کی زبان کچھ زیادہ ہی چل پڑی تھی۔ وہ خود ہی سوچ سوچ کے رائی سے پہاڑ بنالیتی اور پھر اس پہاڑ کے بوجھ تلے شہید احمد کو بھی پیستی اور خود بھی روتی کراہتی۔

اسے معلوم نہیں تھا یا شاید اندازہ نہیں تھا کہ بعض الزامات ایسے ہیں جنہیں کبھی کبھی مرد سچ بھی ثابت کر دیتا ہے محض اس ضد میں کہ اس پہ الزام لگایا کیوں گیا۔ بار بار شکوک و شبہات کا اظہار کرنے سے ہر مرد ہر بار اپنی صفائی پیش نہیں کرتا یہ اس کی انا اور مردانگی کے خلاف ہے۔ وہ اپنی شان پھر اس میں سمجھتا ہے کہ اس شک کو صحیح ثابت کر دے تاکہ عورت کو نیچا دکھایا جا سکے۔ عفت اپنی زبان کے تیر چلا چلا کر اسے اکسا رہی تھی کہ وہ اس راستے پہ قدم رکھے اور چلے، جس کے بارے میں وہ سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا۔

''تم تیار نہیں ہوئیں؟'' رات میں وہ واپس آیا تو عفت اسی گھر کے حلیے میں پھر رہی تھی۔

''کھانا لگا رہی ہوں، ہاتھ منہ دھو کر آ جائیں۔'' عفت نے اس کا سوال یوں نظر انداز کیا جیسے سنا ہی نہ ہو۔

''کس پاگل عورت سے واسطہ پڑا ہے؟'' شہید احمد بے بسی سے اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

''تمہیں بتایا تھا کہ آج پھپھو نے کھانے پہ بلایا ہے۔''

''کوئی جھوٹے کو بلائے تم سچے کو دوڑ پڑتے ہو۔'' عفت نے ایسی مضحکہ خیز نظروں سے اس کا مذاق اڑایا تھا کہ اپنے دل میں اٹھتے اشتعال کو اس نے بمشکل دبایا وگرنہ دل تو یہی چاہ رہا تھا کہ اس عورت کی اس زبان کو ہی کاٹ دے جس سے وہ زہر اگلتی ہے۔

''تمہیں نہیں جانا تو عاطف کو تیار کر دو۔'' شہید احمد نے اس پاگل عورت سے نہ الجھنے کا فیصلہ کیا۔

''جہاں میں نہیں جاؤں گی وہاں میرا بیٹا کیسے جائے گا؟''

''وہ صرف تمہارا نہیں میرا بھی بیٹا ہے۔''

''اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اسے لے جا کر دوسری عورت کی جھولی میں ڈال دو۔'' عفت کی اکڑ ختم ہو رہی تھی نہ طنطنہ۔

شہید احمد کے سینے میں وہ آگ بھڑک اٹھی جو عفت کی زبان بھڑکا رہی تھی، اس نے قہر آلود نگاہوں سے اس الٹی کھوپڑی کی عورت کو دیکھا اور بولا۔

''میں اپنا بیٹا کیوں کسی کی جھولی میں ڈالوں گا، اس کی گود پہلے ہی بیٹے سے بھری ہوئی ہے۔''

''دیکھا! تمہارے دل میں کھوٹ تھا نا، زبان پہ آ ہی گیا۔'' عفت ایسی بھڑکی کہ اس کے ہاتھ شہید احمد کے گریبان تک پہنچ گئے۔

''پیچھے ہٹو پاگل عورت۔'' شہید احمد نے ایک جھٹکے سے گریبان چھڑا کر اسے پیچھے دھکا دیا۔

''تیرے دل میں شک ہے نا اور میرے دل میں کھوٹ، اب دیکھنا، ان دونوں کو سچ کر کے دکھاؤں گا۔'' وہ فیصلہ اس کی شرارے اگلتی آنکھوں اور غم و غصے سے بھرے دل سے نکلا تھا۔

عفت نیچے گری ہوئی پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کا یہ روپ پہلی بار دیکھ رہی تھی۔

☆

(باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ)

سنبل اپنے مقابل کھڑی لڑکی کو نگاہوں سے ٹٹول رہی تھی۔ موازنہ اور رقابت آہستہ آہستہ اپنی جڑیں پھیلائے ہوئے سنبل کے ذہن سے منصفی کا تصور مٹائے جا رہے تھے۔ سنبل نے اپنے چاؤ سے بسائے گھر کو ایک ترازو میں بدل دیا تھا۔ جہاں ایک پلڑے میں وہ خود تھی اور دوسرے میں اس نے اس

سعدیہ عمیر

آئینہ

لڑکی کو لا بٹھایا تھا۔ اپنے دلائل سے اپنے پلڑے کو وزنی کرتے ہوئے وہ بھول رہی تھی کہ ترازو کی رسی اس نے اس مرد کے گلے میں باندھ دی تھی جس سے محبت کے ان دونوں کے بلند و بانگ دعوے تھے۔

نو بیاہتا لڑکی کی بھری کلائیاں چھکتا دمکتا لباس اور جگمگاتے چہرے کو دیکھ کر سنبل کو ناگواری محسوس ہوئی پھر جب اس کی نظر تمام بناؤ سنگھار کو ٹٹولتی اس کی آنکھوں پر آ کر ٹھہری تو وہ ٹھٹک گئی۔ وہاں اس کا اپنا عکس تھا۔ اتنا اجنبی کہ وہ پہچان نہ پائی۔ سنبل جس کے ہاتھ کے میٹھے پکوان دور دور تک مشہور تھے۔ اپنے ہی چہرے کی کڑواہٹ دیکھ کر گڑبڑا گئی۔ اس عکس میں اس کا حال تو قید تھا ہی مگر اس سے کہیں نمایاں اس کا ماضی تھا جو آج اس پر نئے سرے سے عیاں ہوا تھا۔

☆☆☆

وہ بھی ایسی ہی ہوا کرتی تھی۔ کم عمر، زندگی سے بھرپور، ایسی ہی ادا سے مسکراتی اور ناز سے قدم دھرتی تھی۔ خوب صورت تو وہ تھی ہی پھر اپنی خوب صورتی سنوارنے کے لیے اس کے پاس دولت اور ذوق دونوں ہی بہت تھے۔ جب ایک بڑے سے کنبے سے اس کے لیے رشتہ آیا جہاں ایک ہی تین منزلہ گھر میں سب دیورانیاں، جٹھانیاں ایک ساتھ رہتی تھیں اور ان میں درجن بھر ملتی جلتی صورتوں کے بچے طوفان مچاتے پھرتے تھے تو کسی کو ایک آنکھ نہ بھایا۔

کوئی بھی نازوں پلی سنبل کو اس جنجال پورے میں بیاہنے پر راضی نہ تھا جہاں گن کر روٹیاں پکتی تھیں۔

پھر سنبل کے ابا نے گھر کے بڑوں کو بٹھا کر تصویر کا نیا رخ دکھایا۔ خاندان بہت امیر نہ سہی لیکن کھاتا پیتا اور شریف تھا۔ لڑکا تو خاندان کا سب سے ہونہار سپوت تھا گویا ہیرا تھا۔ بہت بڑی کمپنی میں انجینئر تھا اور ملازمت کے سلسلے میں دوسرے شہر میں مقیم تھا۔ ابا نے انگلی اٹھا کر سب کو نصیحت کی کہ گمان پر فیصلہ ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔ اس لیے روایتی انداز میں بات چل پڑی۔

لڑکے والے سنبل کو دیکھنے آئے تو ایک گاڑی سے اتنی سواریاں نکلیں کہ پورا کمرا بھر گیا۔ جب لڑکی والے احمر کو دیکھنے گئے تو ایک بندے کی آؤ بھگت میں چار چار بندے لگے ہوئے تھے جو منٹ منٹ بعد لوازمات کی پلیٹیں لا کر پیش کرتے رہے اور اپنی ملنساری سے ان کو سیر کر کے بھیجا۔ پھر بھی اطمینان کرنے کے لیے سنبل کے ابا دوسرے شہر جا کر احمر کا اصل ٹھکانا اور ٹھاٹھ باٹھ دیکھ کر تسلی کر آئے اور پھر ہامی بھری۔

منگنی کی تقریب میں اتنے بچوں نے دلہن بنی سنبل کے ساتھ جڑ جڑ کر تصاویر بنوائیں کہ اگر سب کے نام بغیر وقفے کے بولیں تو یوں لگے کہ کلاس میں استانی حاضری لے رہی ہے۔ کئی رشتہ داروں نے لمبا چوڑا سسرال دیکھ کر سنبل کو ڈرانا چاہا مگر وہ نہ ہی سسرال والوں کی طرف سے کسی بدگمانی کا شکار ہوئی نہ ہی احمر کی طرف سے کسی خوش فہمی میں مبتلا ہوئی۔ اس لیے شادی کے بعد احمر کو توقع سے بھی بہتر پا کر اسے اپنے ابا کے فیصلے پر ناز ہوا۔

احمر سب سے چھوٹا بیٹا تھا جو پہلے پڑھائی پھر نوکری کے باعث گھر میں مسافروں کی طرح ہی رہتا تھا۔ سنبل پر بھی زیادہ ذمہ داریاں نہ تھیں کیونکہ گھر کا نظام ان دونوں کے بغیر بھی مکمل تھا۔ البتہ گھر کے خرچ میں احمر کی تنخواہ کا پلڑا ہی سب سے بھاری تھا۔

بڑے گھر سے آنے والی سنبل کی تعلیم اور حسن کا پہلے ہی گھر والوں پر رعب تھا۔ جب اس رعب میں اس کے اخلاق کی خوشبو اور خلوص کی چاشنی ملی تو دنوں میں اس نے سب کا دل موہ لیا۔ ساس صاحبہ کا کمرہ پہلی منزل پر تھا اور سنبل کو تیسری منزل کا کمرہ ملا تھا جہاں احمر کے کالج کے دنوں کی کتابیں بھری ہوئی تھیں۔ جب رات کو لائٹ جاتی تو گرمی سے اکتا کر وہ اور احمر چھت پر بیٹھ کر کسوٹی کھیلنے لگتے۔ شخصیت پوچھنے میں تو پندرہویں سوال کی نوبت بھی نہ آتی لیکن

غلطی سے کوئی واقعہ پوچھ لیتے تو سوال پوچھ پوچھ لاڈلے ہونے لگتے۔
"باقی کرہ ارض تو میں نے چھان لیا ہے۔اب یا تو تمہارے خاندان کا واقعہ ہے یا میرے خاندان کا۔" احمر زچ ہوکر کہتا۔
"اب آپ کا اور میرا خاندان ایک ہی ہے۔" سنبل لاڈ سے یاد دلاتی۔
"ابھی نہیں ہوا لیکن جلد ایک ہو جائے گا۔" شریعت اور قانون سے جڑے تعلق خونی رشتوں پر کبھی فوقیت نہیں پا سکتے۔اس لیے احمر یہی سوچتا تھا کہ جب ان کی اولاد ہوگی تو وہ دونوں طرف کا خون ہوگی۔ وہی حقیقی معنوں میں دونوں خاندانوں کو جوڑے گی۔
شادی کے ابتدائی دن سسرال میں رسم و رواج کی طرح ہی گزرے۔ صبح سنبل کلائیاں بھر بھر چوڑیاں پہن کر تیسری منزل سے چھن چھن کرتی اترتی دوسری منزل پر منجھلی جٹھانی کو سلام کرتی ان کے بچوں کو پچکارتی پھر پہلی منزل پر بڑی جٹھانی کو اپنے کپڑے دکھاتی، تعریف بٹورتی اور پیار لینے کے لیے ساس کے کمرے میں جا بیٹھتی۔ سارا دن بچے اسے گھیرے رہتے۔ جب اس کے ہاتھوں کی مہندی ہلکی ہوئی تو انگریزی طرز کا تہوں والا میٹھا بنا کر کچن کی بسم اللہ کی نت نئے اجزاء والی تہوں کے اس میٹھے کا نام آدھے لوگوں کے منہ پر نہ چڑھا پر ذائقہ سب کو ایسا بھایا کہ بار بار پیالی بھر کر کھایا۔
مہندی اترنے سے پہلے ہی وہ احمر کے ساتھ رخصت ہوکر دوسرے شہر چلی گئی جہاں اسے کمپنی سے ایک آراستہ گھر ملا ہوا تھا۔وہاں بیشتر افراد ان ہی کی طرح دوسرے علاقوں کے تھے۔اس لیے سلوک سے ایک فیملی کی طرح رہا کرتے تھے۔ جلد ہی ان کے احباب میں مسز احمر اپنی شوخی، خلوص اور باتونی طبیعت کی وجہ سے رچ بس گئیں۔ پہلے نئے نویلے جوڑے کی دعوتوں کا اہتمام ہوا۔جب وہ رسم نپٹی تو شکر گزاری کے طور پر احمر اور سنبل نے ملنے والوں کو دعوت پر مدعو کیا۔ پرتکلف اہتمام سے زیادہ لوگوں کو میاں بیوی کا بے تکلف انداز محفوظ کر رہا تھا۔
"روسٹ تو بے حد لذیذ ہے۔" ایک خاتون نے تعریف کی۔
"مجھے روسٹ بنانا نہیں آتا۔ یہ تو میس کے خانساماں توصیف سے بنوایا ہے۔احمر نے خود کھڑے ہو کر بنوایا ہے۔" اس نے بلا جھجک اقرار کیا۔
"لیکن نان تو توصیف کے ہاتھ کے نہیں لگ رہے اس کو نرم کہو تو کچا چھوڑ دیتا ہے۔خستہ کہو تو پاپڑ بنا دیتا ہے یہ تو بالکل مناسب ہیں۔" کسی اور نے لقمہ لیتے ہوئے کہا۔
"توصیف نے ہی بنائے ہیں۔اچھے اس لیے بنے ہیں کیونکہ احمر نے خود کھڑے ہوکر بنوائے ہیں۔" سنبل فخر سے بولی۔
"ہم تو میٹھے کے شوقین ہیں ہماری پسند تو یہ رینبو (Rainbow) ٹرائفل ہے۔" احمر کے دوست نے ٹھنڈا ٹھار ڈونگا اپنی طرف کھینچا۔
"ہاں احمر نے خود کھڑے ہوکر بنوایا ہے۔" بے خیالی میں بول کر سنبل ایک دم ٹھٹکی۔ ٹرائفل تو اس نے خود بنایا تھا اور وہ واضح طور پر گھر کا بنا ہوا نظر آ رہا تھا۔
سب ہی اس کی زبان کی پھسلن پر ہنس پڑے۔
"تو گویا احمر صاحب کچن میں آپ کی نگرانی بھی کرتے ہیں۔"
سنبل جھینپ کے چپ ہوگئی۔ بڑے عرصے تک ان کے جاننے والوں میں یہ جملہ یاد رکھا گیا۔ جب بھی کسی کو اس بات پر زور دینا ہوتا کہ کوئی کام بہت محنت اور لگن سے کیا گیا ہے۔تو اقوال زریں کی طرح بولتے کہ احمر نے خود کھڑے ہوکر کروایا ہے۔
اس نوبیاہتا جوڑے کے لاڈ دوسروں کی نسبت زیادہ اٹھائے گئے اور زیادہ دیر تک اٹھائے گئے۔ کیونکہ ان کی ناز برداریاں بانٹنے کے لیے کوئی اولاد نہ آئی۔
پانچ سال تک سنبل اپنی باتوں کے تڑکے اور ہاتھوں کے میٹھے بنا بنا کر احمر کی زندگی میں لذت بھرتی

رہی۔ جب ناز برداریاں کرنے والوں نے سوال جواب شروع کیے تو زندگی کے ذائقے مدھم ہونے لگے۔علاج معالجے نے بھی کوئی افاقہ نہ کیا۔ الٹا مایوسی کی تلخی ان کی زندگی میں شامل ہوگئی۔

سنبل نے وقت گزاری کے لیے ایک اسکول میں نوکری کرلی۔ دن بھر شرارتی، پھرتیلے بچوں میں گھری رہ کر جب گھر آتی تو اپنا سلیقے سے سجا سجایا گھر دیکھ کر کوفت ہوتی۔ قیمتی سجاوٹی اشیاء میزوں پر دھری تھیں۔ قالین پردے سب بے داغ تھے۔ یہ سب اسے اب مصنوعی اور بے رونق لگنے لگا تھا۔ جس دن دل زیادہ دکھتا' وہ کمر باندھ کر کچن میں احمر کے لیے کچھ میٹھا بنانے کھڑی ہوجاتی۔ اب تو وہ حلووں کی کئی قسموں میں بھی ماہر ہوگئی تھی۔ کئی سالوں تک وہ یوں ہی زندگی کا پھیکا پن اپنے ہاتھوں کے بنے میٹھے سے بدلنے کی کوشش کرتے گزار گئی۔

☆☆☆

لاکھوں میں تنخواہ لینے والے' بڑے بڑے عہدوں پر فائز افسر بھی سال میں کم از کم ایک دفعہ اسکول کی سادہ سی نوکری کرنے والی ٹیچر کو حسرت سے ضرور دیکھتے ہیں اور وہ گرمیوں کی چھٹیوں کا وقت ہوتا ہے۔ سنبل عید' بقرعید میں فرض کی طرح سسرال جاتی تھی۔ اس کے علاوہ بھی کوئی تقریب ہوتو موقع سے دو تین ہفتے پہلے ہی پہنچ کر تیاریوں میں مدد کرواتی تھی۔ گھر والے اس کی پسند اور انتظامات کے ہمیشہ سے قائل تھے پھر بچے بھی سنبل چاچی سنبل چاچی کی گردان کرتے نہ تھکتے تھے۔ وقت گزرتا رہا۔ وہ وہیں ٹھہر گئی۔ اردگرد سب کچھ بدلنے لگا۔ بچے بڑے ہونے لگے۔ ان کی مصروفیات تبدیل ہونے لگیں۔ ان کے نئے روز و شب میں ماں باپ بھی ثانوی کردار بن گئے تھے تو چاچی کی گنجائش مزید کم ہوگئی تھی۔

تقاریب تو اب بھی چاچی کی بے ساختہ گفتگو اور رونق کے بغیر ناممکن تھیں۔ مگر ان کے پہلے کے انتظامات میں گھر کے پہلے کے بچے اور اب کے جوانوں کی ہی مرضی چلتی اور بعد کے معاملات تو پہلے ہی ان کے والدین بہت اچھے سے سنبھالتے تھے۔ جب بڑی جٹھانی کی بیٹی کی منگنی ہوئی تو احمر اور سنبل نے زیور اور جوڑے دیکھے۔ رشتہ داروں کی تفصیل پوچھی پھر بھی فراغت کا بہت وقت مل گیا۔

جب سنبل کا رشتہ طے ہوا تھا تو اس کی چھوٹی بہن نے شرارت سے کہا تھا۔

''آپی! جب ہم آپ سے ملنے آیا کریں گے تو لان میں اودھم مچاتے بچوں کی فوج میں سے آپ کا بچہ کیسے پہچانیں گے۔''

اب وہ لان خالی پڑا تھا۔ اس کی ویرانی پر سنبل شرمسار ہونے لگی۔ وہ گھاس پر ٹہلتے ٹہلتے پچھلی سمت نکل آئی جہاں اس کی ساس کے کمرے کی کھڑکی کھلتی تھی۔

''اولاد تو ایسی نعمت ہے جس کی طلب سے انبیاء کو بھی انکار نہیں۔ کیا حضرت زکریا علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے گڑگڑا کر خدا سے اولاد کی دعا نہیں مانگی۔ تم خود کو کیا سمجھتے ہو؟ جو اولاد کے بغیر خوش رہنے کے دعوے دار ہو؟'' اندر سے اس کے بڑے جیٹھ کی آواز آئی یعنی کمرے میں پنچایت لگی تھی۔

''میں ان کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ میں انصاف نہیں کرسکوں گا۔ آٹھ سال ہوگئے ہیں ہمارے ساتھ کو میں، سنبل سے راستہ الگ کرنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔'' احمر نے بہت مستحکم آواز میں جواب دیا پھر بھی سنبل کے قدم لرز گئے۔

''سنبل ہمیں بھی عزیز ہے لیکن ہم نے ثوبیہ کا انتخاب بھی بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ ایک کو یہاں رکھو۔ ایک کو وہاں۔ شرعاً اور قانوناً تمہیں حق ہے۔''

اس مختصر سی محفل میں جذباتی پن' دلیلیں اور حکم ہتھیار بنے ہر سمت سے احمر پر حملہ آور تھے اور اسے دوسری شادی پر رضامند کرنے کی جان توڑ کوشش کر رہے تھے۔ یہ جنگ ان دونوں کی تھی مگر لڑ احمر تنہا رہا تھا۔ سنبل گھر والوں کی ہر دلیل پر لحہ بھر کو سن ہوتی مگر

احمر کے جواب پر تو گویا برف بن جاتی۔ وہ وفادار محبت کرنے والی بیوی تھی مگر سب بیویاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ وہ فرمائشیں بھی کرتی تھی لڑتی بھی تھی۔ اس میں تو کچھ ایسا خاص نہ تھا جو احمر اپنے خاندان سے اس کے لیے لڑ پڑا اور انکار کر کے سرخرو ہو کر نکلا۔

سنبل آٹھ سال سے اولاد کے لیے دعا گو تھی۔

اس رات بھی اس نے رو رو کر دعا کی مگر اپنی نہیں احمر کی اولاد کی۔ وہ اس شخص کو اولاد کی خوشی دینا چاہتی تھی جو اس کی ڈھال بنا کھڑا رہتا تھا اور محرومیوں کا چرچا بھی نہیں کرتا تھا۔ اس لیے سنبل کو گمان بھی نہ ہوا کہ وہ بھی ادھورا پن محسوس کرتا ہے۔ وہ اسے مکمل دیکھنا چاہتی تھی اور کہیں یہ آرزو بھی تھی، کہ وہ ہی اس کو اولاد کی خوشی دے مگر دعا کے اس حصے پر آ کر اس کی زبان میں لڑکھڑاہٹ پیدا ہونے لگتی تھی۔

احمر نے سنبل پر ظاہر نہ ہونے دیا کہ اس کے گھر والے اس پر کس قسم کا دباؤ ڈال رہے ہیں۔ پر سنبل کا دل تقریب کی رونقوں سے اٹھ گیا تھا۔ احمر صحیح کہتا تھا کہ اس کا اور سنبل کا خاندان ابھی ایک نہیں ہوا اور اس کے ایک ہونے کے آثار بھی نہیں تھے۔

منگنی کی تقریب میں بہت زیادہ لوگ نہیں تھے۔ اس لیے جب اس کی جٹھانی نے ایک چھوٹے قد کی درمیانی صورت لڑکی کو دیکھ کر اپنی سمت بلایا تو سنبل کے کان کھڑے ہو گئے۔

"امی! یہ ثوبیہ ہے۔ ہماری ہمسائی فرحت آنٹی کی بھابھی، کچھ مہینوں سے ان کے پاس آ گئی ہے۔"

اس کی منجھلی جٹھانی نے یوں تعارف کروایا جیسے نام کے علاوہ باقی تفصیل صرف مروت ہو یعنی بات ہر سمت پھیل چکی تھی۔

سنبل نے غور سے اس کا بناؤ سنگھار دیکھا۔

ایک ایک چیز پر توجہ دی گئی تھی۔ وہ بہت خوب صورت نہیں تھی مگر کم عمری اور بھولپن کی چمک اس کو پر کشش بنا رہی تھی۔ اس محفل میں سنبل اکیلی نہیں تھی جو احمر کی ستائشی نظروں کی خواہاں تھی۔ بٹوارے کی ابتداء ہو چکی تھی۔ پورے فنکشن میں وہ شاکی نظروں سے ٹٹولتی رہی کہ کوئی اس سے نظر بچا کر ثوبیہ اور احمر کی ملاقات نہ کروا دے۔ احمر مردانے میں ہوتے ہوئے بھی اس کی نظروں کے حصار سے دور نہ گیا۔

رسم و رواج کے بعد کھانا لگا تو سب کی نشستیں بدل گئیں۔ احمر پلیٹ تھامے کسی رشتہ دار سے گفتگو کر رہا تھا۔ مگر ثوبیہ اور دوسری لڑکیاں اندر کمروں میں جا بیٹھی تھیں۔ وہ خطرہ ٹل جانے پر سکون کا سانس لے کر خود بھی کھانے لگی۔

"میں تو بس یہی دعا کرتی ہوں میرے بچے اور ان کے بچے جتنے فرماں بردار ہیں۔ اللہ ان کے نصیب اتنے ہی اچھے کرے۔" اس کی ساس تعریفیں بٹور رہی تھیں اور دعائیں نچھاور کر رہی تھیں۔

اچانک سنبل کی منجھلی جٹھانی کی بیٹی نے دادی کے کان میں آ کر کچھ کہا تو وہ سنجیدہ ہو کر فوراً اٹھ گئیں اور اس کمرے کی طرف بڑھیں جہاں ثوبیہ اور باقی لڑکیاں بیٹھی تھیں۔

سنبل کو اپنا دل بیٹھتا محسوس ہوا اس سے رہا نہ گیا آدھے کھانے کی پلیٹ وہیں دھر کے وہ بھی پیچھے ہو لی۔

پہلے وہ دروازے سے ہی داخل ہونے لگی مگر یہ سوچ کر رک گئی کہ اس کو آتا دیکھ سب ہی چپ ہو جائیں گے۔ نہ ثوبیہ نمبر بنائے گی نہ جٹھانی چاپلوسی کر کے ثوبیہ کی راہ ہموار کرے گی۔ اس لیے قدم روک کر باہر سے ہی کان لگا کر سننے لگی۔

"آنٹی! کوئی کام ہے تو مجھے بتائیں۔ میں آپ کے گھر کا فرد ہی تو ہوں۔" ثوبیہ نے انہیں تیزی سے آتا دیکھ بڑھ کر خدمات پیش کیں۔

"نہیں بیٹا! وہ تو میں ملنے ملانے میں اس قدر بوکھلائی ہوئی تھی کہ خبر ہی نہ ہوئی، میرا ازار بند لٹک رہا تھا۔ ابھی بچی نے بتایا۔ نظر کے ساتھ عقل بھی کمزور ہو گئی ہے۔" وہ سادگی سے شرمندہ ہوتی ہوئی باتھ روم میں چلی گئیں۔

دروازے سے ٹیک لگائے سنبل اپنی ہی بدگمانی کی کھودی کھائی میں گرنے لگی، وہ ایسی تو نہ تھی۔ اتنی شکی مزاج' بے اعتماد، بے اعتبار اور اسے ایسا بنانا بھی

نہیں تھا۔ وہ بچوں کو پڑھاتی تھی اور ان کو بدگمانی مایوسی' چغل خوری جیسی عادتوں سے دور رہنے کی نصیحت کرتی تھی اب اپنے گمان کے باعث خود ان کو اپنے ذہن سے چمٹائے جا رہی تھی۔ اس نے جھرجھری لی جیسے خود سے ان بری عادتوں کو جھٹکنا چاہتی ہو۔ اسے احمر پر بھروسہ تھا اور خود پر بھی وہ ہر قسم کا حالات کے مقابلہ کرسکتی تھی۔ وہ پلٹ آئی مگر تب وہ ناواقف تھی کہ مقابلہ بازی کیسا جان جوکھم کا کھیل ہے۔

اگلے روز اپنی کوفت کو کم کرنے کے لیے اس نے میٹھے میں دودھ دلاری بنائی جو دیسی انداز کا تہہ دار میٹھا تھا۔ اس میں لڑکے والوں کی طرف سے آئے پھل اور چم چم ڈال کر اس کو خوب ذائقے دار بنایا۔ کچن میں اب بھی استحقاق سے کام کرنا اکثر لوگوں کے منہ کڑوے کر گیا مگر اب اسے احمر کے سوا کسی کی پرواہ نہیں رہی تھی۔ احمر کا وہ پہلے سے بھی زیادہ خیال رکھنے لگی تھی۔ ہر چند دن بعد تفریح کا کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈ لیتی تاکہ فراغت، احساس محرومی جگا نہ سکے۔ دو ماہ بعد ہی اس کی ساس کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی۔ اسکول میں امتحانات ہو رہے تھے۔ اس لیے سنبل کے پاس نہ جانے کا مضبوط بہانہ تھا۔

اب سسرال میں اس کا دل نہیں لگتا تھا۔ اس نے احمر کا سامان باندھ کر اس کی ماں کی خیریت کی ڈھیروں دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا۔ احمر کو بھی یہی لگا کہ سنبل کی دعائیں بہت کارگر ہیں کیونکہ جب وہ گھر پہنچا تو اس کی ماں بستر کے بجائے اسٹور میں لوہے کے اسٹول پر چڑھی ٹرنک سے سامان نکال رہی تھی۔

''بھائی نے فون کیا تھا کہ امی کی طبیعت خراب ہے۔ کہیں اپنی ساس کا ذکر تو نہیں کر رہے تھے؟'' احمر کو سچ میں اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔

''دل کی تکلیف ہے مجھے' ٹانگوں کی نہیں۔'' وہ ان سلی بنارسی ساڑھی نکال کر اسٹول سے اتر آئیں۔

''اب دل کو کیا ہوا؟''

''تیری بے اولادی نے اسے ہولا رکھا ہے اور مجھے نظر نہیں آتا۔'' وہ کمرے کی طرف گئیں تو احمر بھی پیچھے ہولیا۔

''اب دوبارہ یہ بحث نہ چھیڑیں۔'' وہ ان جھمیلوں سے تنگ آ گیا تھا۔

''نہیں ہوگی بحث، میری طرف سے وعدہ ہے اور تو بھی بحث نہ کرنا۔ کل جمعے کے ساتھ تیرا نکاح ہے۔ ثوبیہ کے ساتھ۔''

احمر سٹپٹا گیا مگر وہ ہر طرف سے گھیرا جا چکا تھا۔ نکاح کے تمام انتظامات مکمل تھے۔ اس کی بھابھی اور بھتیجیاں لڑکی کو مہندی، جوڑا سب دے آئی تھیں۔ وہ رشتہ دار جو پیٹ میں بات رکھنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ انہیں دعوت نامے بھی جا چکے تھے۔ ہر کوئی تقریب کے انتظامات میں جتا ہوا تھا۔

احمر نے احتجاج کیا تو ماں نے پہلے یہ کہہ کر چپ کروا دیا کہ اب انکار کیا تو گزرے ہوئے باپ دادا کے سر میں خاک جھونکو گے۔'' فرماں برداری تو اس کی رگوں میں دوڑتی تھی۔ بس سر جھکا کر بیٹھ گیا تو ماں نے لاڈ سے سمجھایا۔

''میں نے بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے۔ ثوبیہ کی شادی ہوئی تھی۔ لڑکے نے پہلے ہی باہر گوری بیاہی ہوئی تھی۔ ماں باپ کی خوشی کے لیے شادی کی اور دو ماہ میں فارغ کر دیا۔ اب اپنی خالہ کے رہ رہی ہے۔ خدمت گزار ہے اور کم پڑھی لکھی بھی۔ جہاں سنبل کا پلڑا تعلیم اور رکھ رکھاؤ سے بھاری رہے گا وہاں اس کا اولاد سے جھک جائے گا۔ دونوں میں برابری کا احساس رہے گا۔ ابھی تو اسے رخصت کروا کر ادھر ہی رکھنا تب تک، جب تک حالات سازگار نہ ہو جائیں۔ مظلوم کو سہارا دینا اللہ کی رضا حاصل کرنا ہے۔'' دین و دنیا و گناہ ثواب، کئی بیڑیاں اس کے قدموں میں ڈال دی گئیں تو وہ بھی ہکا بکا بیٹھا رہا۔

سنبل تو سب کی لاڈلی تھی اور سب کی پسند سے آئی تھی' صرف اولاد نہ ہوئی تو وہ دلوں سے کیسے نکل گئی۔ احمر رات اپنے کمرے میں بیٹھا سوچ رہا تھا۔ یہ کمرا اس

نے پڑھائی کے دنوں میں خود چنا تھا تاکہ سکون سے اوپر پڑھتا رہے۔ جب شادی ہوئی تو اس کی ماں نے کہا۔ نیچے کمرا لے لو۔ تیسری منزل سے تو پانی پینے کے لیے بھی چالیس سیڑھیاں اتر کر آنا پڑتا ہے۔ احمر اپنے وقتی ٹھکانے کی خاطر بھتیجے کا مستقل ٹھکانا خراب نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے ہنس کر جواب دیا۔

''پہلی سیڑھی پر قدم پڑتے ہی چاپ پورے گھر میں گونج جاتی ہے۔ سب کو خبر ہو جاتی ہے کہ میں آرہا ہوں۔ چار سیڑھیاں اترتا ہوں تو کوئی مدد کو آجاتا ہے اور ہر چوتھی سیڑھی پر کوئی نہ کوئی آکر پوچھتا ہے، کہاں جارہے ہیں۔ کچھ چاہیے تو ہم لا دیتے ہیں۔ آج تک پانی کا گلاس خود پینے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ آگے بھی نہیں آئے گی۔''

یہی حقیقت تھی۔ ان سیڑھیوں پر آواز بہت گونجتی تھی۔ اس لیے رات کے آخری پہر احمر بہت احتیاط سے اپنا مختصر سامان لیے سیڑھیاں اتر رہا تھا۔ ایک قدم نیچے اترتا تو دل دس دس بار ڈولتا اور اگلے قدم پر وہی دل ملامت کر کے پلٹنے کا کہتا۔ مگر وہ انصاف کرنے والوں میں سے ہونا چاہتا تھا اور منصفی کا تقاضا یہی تھا کہ پہلے سنبل سے کیا عہد نبھائے۔ سنسان پڑے گھر میں چرچر کرتی سیڑھیاں مدھم قدموں سے اتر کر اس نے بہت ہمت سے چوکھٹ پار کی اور ویران سڑکوں پر واپسی کی راہ ٹٹولتا رہا۔ اس کا ہر قدم اسے اصل سے دور کرتا گیا۔

☆☆☆

''امی جی تو ٹھیک ہیں؟'' سنبل دروازے کھولتے ہی گھبرا گئی۔

''میں آیا تو ٹھیک تھیں۔ اب کا حال فون کر کے پتا کروں گا۔''

''اتنی جلدی کیوں آگئے؟'' وہ اب بھی مشکوک تھی۔

''تم ہی میری منزل ہو، جلد یا بدیر پلٹنا تو یہیں تھا۔''

وہ سنبل کے پیچھے کچن میں ہی آگیا جہاں سنبل اسٹاف روم ٹی پارٹی کے لیے کپ کیک بنا رہی تھی۔

''گئے تھے تو دو دن تو رکنا تھا۔'' وہ احمر کو پانی تھما کر پھر کام کرنے لگی۔

''ٹھہر جاتا تو واپسی ممکن نہ رہتی۔'' وہ اس کو چاہ کر بھی حقیقت نہیں بتا پا رہا تھا کیونکہ یہ فیصلہ کرنا دشوار تھا کہ یہ غم بانٹنے سے ہلکا ہو گا یا بڑھ جائے گا۔

سنبل کام میں مگن ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی اور احمر دروازے سے ٹیک لگائے بے ربط تبصرے کرتا رہا۔ جب اوون سے کپ کیک کی پہلی گرما گرم ٹرے نکلی تو سنبل نے ایک ٹکڑا کاٹ کر چکھا۔

''مزے کے بنے ہیں۔'' اس نے دوسرا ٹکڑا احمر کے منہ میں ڈالا۔

''اچھے تو بننے تھے، ہی احمر نے خود کھڑے ہو کر بنوائے ہیں۔'' وہ پھیکی مسکراہٹ سے کہہ کر پلٹ گیا۔ اس میں اپنے گھر والوں کی کمزوری بیان کرنے کی ہمت نہ تھی۔

ایسی باتیں کہاں چھپتی ہیں۔ سنبل کو چند گھنٹے بعد ہی پتا لگ گیا جب لعن طعن اور طیش بھرا فون موصول ہوا اور احمر نے کرب سے اس کا سامنا کیا۔ پھر وہاں گہرا سناٹا چھا گیا۔ واپسی کا وقت گزر گیا تھا۔ جیسے آدم اور حوا نے ممنوع شجر سے پھل کھایا تھا اور وہ دونوں جنت سے نکال دیے گئے تھے۔ ویسے ہی یہ احمر اور سنبل بھی اس دنیا کے باسی تھے۔ مشقت کے عادی اور سکون کے متلاشی۔

سنبل نے غموں کی پیوندکاری چھوڑ دی تھی۔ اب وقت بے وقت تفریح نہیں کرتے تھے۔ شادی کی سالگرہ پر بھی خوش ہونے کے بجائے گویا شرمندہ ہونے لگے تھے۔ اس لیے جب ان کی شادی کی نویں سالگرہ آئی تو احمر تاریخ سے آنکھ بچا کر کام نبٹاتا رہا۔ پر جب گھر پہنچا تو بستر پر لیٹی سنبل جھٹکے سے جاگ اٹھی۔

''مجھے اسپتال جانا ہے۔'' وہ بالوں میں تیز تیز برش کرنے لگی۔

''طبیعت ٹھیک ہے؟'' وہ فکرمند ہوا۔

''ٹھیک ہے، ویسے ہی کام ہے۔'' اس نے بات ٹالنے کی سعی کی۔

''کوئی بیمار ہے؟ کسی کی عیادت کو جانا ہے؟''

احمر کے اوسان خطا ہونے لگے۔

"نہیں، کچھ بھی نہیں جائیں گے۔ تو خود ہی واضح ہو جائے گا۔" وہ شک کو الفاظ میں ڈھال کر خوش فہمی کا شکار نہیں ہونا چاہتی تھی۔

احمر سوال پہ سوال کیے گیا اور سنبل نے ادھورے جوابوں کا سلسلہ نہ توڑا تو وہ زچ ہو کر بولا۔

"باقی تو کرہ ارض میں نے چھان لیا ہے۔ اب یہاں تمہارے خاندان میں کچھ واقعہ ہوا ہے یا میرے خاندان میں۔"

"ہمارے خاندان میں۔" بہت عرصے بعد سنبل نے یہ بات کہی تھی اور سچ کہی تھی۔

شادی کی دسویں سالگرہ سے پہلے خدا نے ان کی جھولی بھر دی۔ ان کے بیٹے نے پہلی سانس لیتے ہی ہر ٹوٹے رشتے کو جوڑ ڈالا۔ ایک بار پھر اس کے سسرال میں جشن منایا گیا۔

ساس صاحبہ نے پھر اسٹول پر چڑھ کر ٹرنک کھولا۔ سالوں سے سنبھالے ان سلے کپڑے نکال کر ننھے سعد کے لیے کئی جوڑے بنوائے۔ سب ایسے ہو گیا تھا جیسے کچھ بگڑا ہی نہ ہو۔

وہ لوگ جو اپنی زندگی کے منفرد ہونے پر اتراتے ہیں، اصل میں خود اس بھیڑ چال نما عام زندگی کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ سنبل اور احمر بھی زندگی کی بھیڑ چال میں لگ کر خود کو دنیا کا سب سے خوش قسمت جوڑا گردانتے تھے۔

بچے کو پالنا، بڑا کرنا تربیت کرنا، اچھے کام پر انعام دینا، بڑے کام پر سزا دینا۔ بچے کے بارے میں فیصلہ کرتے ہوئے آپس میں الجھنا اور اس کے مفادات کا دفاع کرتے ہوئے دنیا سے جھگڑنا، ان کا معمول بن گیا اور سالوں بیت گئے۔

☆☆☆

اکلوتے ہونہار اور خوبرو بیٹے کی دلہن ڈھونڈنے کے لیے سنبل نے شہر چھان مارا اور جس روز حنا کو منگنی کی انگوٹھی پہنا کر گھر آئی تو اپنی ہی پسند پر ناز ہونے لگا۔

"خوب صورت، قابل اور رکھ رکھاؤ والی ایسی ہی لڑکی ہونی چاہیے تھی ہمارے سعد کے لیے۔" اس نے گردن اکڑا اکڑا احمر سے کہا۔

"ہاں مگر تقریب میں کھیر بہت بے ذائقہ تھی۔ تم نے بڑے دنوں سے زردہ نہیں بنایا۔" احمر کو لگ رہا تھا کہ بہو ڈھونڈنے کے چکر میں سنبل اسے نظر انداز کر رہی ہے۔

"ہاں جس دن وقت ملا بنا دوں گی۔" سنبل نے مسکرا کر کہا پر اس کو وقت نہیں ملا۔ شادی کی تیاریوں، دعوت ناموں کی تقسیم پھر بہو بیاہ لاتے تک اس کو فرصت ہی نہ ملی۔

پھر تب فرصت ملی جب سعد اور حنا گھومنے پھرنے گئے ہوئے تھے تو بارونق گھر ایک دم سناٹے میں گھر گیا۔ پسند کی شادی کرنے والے لڑکے کی ماں کو شراکت داری کا احساس اسی لمحے ہو جاتا ہے جب وہ اپنے بیٹے کی پسند پر نظر ڈالتی ہے۔

اپنی پسند سے بیاہ کر لائی ہوئی بہو تو تب آنکھوں میں کھٹکتی ہے جب شادی کے چند دن بعد شوہر کے دفتر سے آنے سے چند منٹ پہلے وہ زرق برق کپڑوں میں مہکتی، چوڑیاں کھنکھناتی دروازے کے گرد منڈلاتی ہے، اور بیٹا پہلا سلام ماں کو نہیں بیوی کو کرتا ہے۔

سنبل پر بھی حسد کی بیل چڑھنے لگی اور اس کو اپنی کیفیت پر اختیار نہیں تھا۔ سعد دفتر سے لیٹ ہو جاتا تو سنبل بے فکر ہو کر کھانا کھا لیتی تھی پر حنا کے ساتھ باہر جاتا تو سنبل کے لیے نوالے حلق سے اتارنا دوبھر ہو جاتا۔ اس کی عمر بھر کی ایک ہی پونجی تھی اس کا بیٹا، وہ اس میں شراکت داری کیسے برداشت کر سکتی تھی۔ چند ہفتوں صبر کے بعد ضبط کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔

گھڑی کی سوئیاں نو سے دس پھر گیارہ بجانے لگیں تو سنبل بھی غصے سے بھرے طعنوں سے لیس تیار تھی کہ اس نئے جوڑے کی بے قاعدگیوں کو لگام ڈالے۔

ان دونوں کے قہقہے گیٹ سے ہی اندر تک آ رہے تھے اور سنبل کھولنے لگی۔ اپنے لاپرواہ انداز میں دونوں مسکراتے ہوئے آگے بڑھے تو حنا، سنبل کے مقابل آ کھڑی ہوئی اور سعد دونوں کے بیچ کھڑا تھا۔

سنبل کو حنا کا بناؤ سنگھار، روشن چہرا سب کاٹنے

لگا اور اسی نخوت سے اس نے اس کی آنکھوں میں جھانکا جہاں دنیا بھر کی خوشی کے فریم میں اس کا اپنا ہی تلملاتا عکس تھا جس نے سنبل کی نظر زنجیر کر دی۔ یہ ماتھے پر تیوری سجائے، چہرے پر غصہ لیے، غصے سے پھٹ پڑنے کو تیار عورت کیا وہ خود تھی؟

سنبل نے الجھ کر ماحول کا جائزہ لیا۔ وہ گھر نہیں ایک ترازو لگ رہا تھا۔ جس کے ایک پلڑے میں وہ خود تھی اور دوسری میں حنا تھی۔ اب وہ مقابلہ بازی کر کے ثابت کرے کہ سعد کے لیے کون زیادہ اہم ہے تو اس کے نازوں پلے بیٹے کی گردن اس ترازو کے وزن سے ڈول ڈول کر جھک جائے گی۔

سنبل خیال جھٹک کر دو قدم پیچھے ہوئی۔ حنا اپنے انداز میں اپنی تفریح کا قصہ سنا رہی تھی اور سنبل کو کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ پھر سے مقابلہ کرنے لگی تو احساس ہوا۔ اس کا اور حنا کا مقابلہ ہے ہی نہیں۔

ماں اور بیوی دونوں الگ مقام رکھتی ہیں۔

مقابلہ بازی تو تب شروع ہوتی جب احمر اپنے خاندان کے گھیرے میں ہتھیار ڈال کر دوسری شادی کر لیتا۔ تب حنا کی جگہ ثوبیہ ہوتی اور ترازو وزنی کرنے کے لیے سنبل کو پل پل پتھر چننے پڑتے۔ یہ سالوں کی خوش گوار زندگی جو اسے ملی تھی...... یہ ایسی نہ ہوتی۔ احمر جو زمانے سے اس کے لیے تنہا لڑتا رہا تھا۔ اب بھی کمرے میں تنہا بیٹھا تھا۔ سنبل کو اس پر بے اختیار پیار آیا۔ ایسا پیار جو اس حدیث کی تشریح کر دیتا ہے کہ اگر خدا کے علاوہ کسی کو سجدہ کرنے کا حکم ہوتا تو وہ شوہر ہوتا۔ اس کی زندگی بھر کی پونجی تو اس کا شوہر تھا۔ اس کا سائبان اس کا رکھوالا تو پھر سعد کیا تھا؟

سنبل کو یاد آیا۔ شادی کے پہلے سال وہ رونق کے غرض سے اولاد کی منتظر تھی پھر لوگوں کے سوال اور تجربے کی خواہش سے اولاد چاہنے لگی۔ مگر آخری سال وہ صرف احمر کی اولاد کی دعا کرتی تھی۔ وہ احمر اور اپنے رشتے کو بچانے کے لیے اور اسے مکمل کرنے کے لیے اولاد مانگتی تھی۔

وہ بے خیالی میں حنا کو آرام کرنے کا کہہ پلٹ گئی۔ ایک بار پھر احمر کی محبت نے اسے بھٹکنے سے روکا تھا۔ وہ کمرے میں آئی تو احمر سو چکا تھا۔ اب وہ جلد تھک جاتا تھا۔ سعد اس کا مضبوط سہارا بنا کھڑا تھا اس لیے وہ جلد بے فکر ہو کر سو سکتا تھا۔ سنبل مسکرانے لگی۔ اس کی زندگی کے دونوں مرد اپنا فرض بخوبی نبھا رہے تھے۔

احمر صبح اٹھا تو سنبل بستر پر نہ تھی اور کچن میں سے آوازیں آ رہی تھیں۔ کچن میں پہنچا تو حنا میز پر ناشتہ لگا رہی تھی اور سنبل چولہے کے پاس دیگچے کو ڈھک رہی تھی۔

''کیا پک رہا ہے؟'' اس نے بلند آواز میں کہا۔

''زردہ...... آپ بہت دن سے فرمائش کر رہے تھے۔'' سنبل نے مسکرا کر کہا۔

''یہ معجزہ ہی ہے کہ اتنے سالوں آپ کے ہاتھ کے میٹھے کھا کھا کر بھی میں شوگر کا مریض نہیں بنا۔'' اس نے محبت سے مسکرا کر سنبل کو دیکھا۔

معجزہ تو یہ ہے کہ آپ کی زندگی میں میرے بنائے میٹھوں کی جگہ کوئی نہ لے سکا۔'' اس نے سکون سے سوچا اور شکر کیا۔

حنا شرارت سے انہیں دیکھ بے مقصد دور جا کھڑی ہوئی اور مسکرانے لگی۔ نئے نویلے جوڑے کو بڑی عمر کے جوڑے کے محبت بے موقع محل ہی لگتی ہے کیونکہ وہ جانتے نہیں کہ زندگی کے جو نشیب و فراز ایک جوڑا ساتھ رہ کر گزارتا ہے اس کے باعث محبت ایک فطری عمل بن جاتی ہے۔

سنبل نے اعتماد سے پلٹ کر احمر کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں اس کا مکمل عکس تھا۔ اپنی زندگی کی کہانی کے علاوہ ان آنکھوں میں ایک معتبر باوفا عورت کی شبیہہ۔ بس تھی جو گھر کو گھر بنانا جانتی تھی اور اسے دوبارہ ترازو میں کبھی بدلنے نہیں دے گی۔

نمرہ احمد

حالم

تالیہ خواب میں فاتح کے سن باؤ والے گھر میں، خود کو ایڈم کے ساتھ خزانہ تلاش کرتے ہوئے دیکھتی ہے۔ فاتح تالیہ سے اپنی فائل کی واپسی کا مطالبہ کرتا ہے اور اسے اپنے گھر آنے سے منع کر دیتا ہے۔ تالیہ کو عصرہ سے پتا چلتا ہے کہ وہ سکہ ایڈم کے پاس ہے۔ ایڈم اسے ایک جیولر کو بیچ دیتا ہے۔ تالیہ اس کے حوالے سے اسے الجھا دیتی ہے اور جیولر کو بلیک میل کر کے سکہ نکلوا لیتی ہے، مگر سکہ اس کے ہاتھ میں دینے کے بجائے ایڈم اپنے قبضے میں کر لیتا ہے۔

فارض صاحب کے ذریعے فاتح کو حالم کا پتا چلتا ہے۔ فائل کی واپسی کے لیے حالم صبح تک کا وقت مانگتا ہے اور اس منصوبے میں فاتح کو بھی شامل کرتا ہے۔ فاتح اس کی باتوں سے متاثر ہو کر راضی ہو جاتا ہے۔ ایڈم پر سکے کا اسرار کھلتا ہے۔ حالم پتا چلا لیتا ہے کہ فائل اشعر کے آفس میں ہے۔

سمیع، تالیہ کو بلیک میل کرنے آتا ہے۔ بازار میں داتن، سمیع کو خوف زدہ کر دیتی ہے۔ حالم جان پہ کھیل کے اگلے روز ہی فائل اشعر کے سیف سے چرا کر لا دیتا ہے۔ فاتح، حالم سے بے حد متاثر ہوتا ہے۔

ایڈم کو تالیہ مشکوک لگتی ہے۔ وہ تالیہ کی گردن پہ نشان دیکھتا ہے تو اسے تاریخی کہانی یاد آ جاتی ہے اور وہ سمجھ جاتا ہے کہ تالیہ اس سکے کے پیچھے ہے جو ایڈم کے پاس ہے۔ عصرہ سے فاتح جھوٹ بولتا ہے۔ عصرہ کو فاتح اور اشعر دونوں پہ غصہ آتا ہے۔ فاتح سن باؤ کو بیچنے سے پہلے وہاں ایک دن گزارنے جاتا ہے۔ عصرہ، تالیہ کی فرمائش پہ اسے بھی بلا لیتی ہے۔ فاتح سن باؤ کے گھر کی کہانی سناتا ہے۔ تالیہ اس گھر کے کنویں کو دیکھ کر سمجھ جاتی ہے کہ خزانہ کہاں ہے۔ وہ فاتح سے اس گھر کو خریدنے کی خواہش کا اظہار کرتی ہے۔

مگر وہ اسے بیچنے سے انکار کر دیتا ہے۔ فاتح کو یاد آتا ہے کہ وہ عصرہ اور بچوں کے ساتھ پہاڑوں کی سیر کو جاتا ہے، جہاں آریانہ کو اس کی آیا دھوکے سے اغوا کر لیتی ہے۔ فاتح، آریانہ کے گرائے ہوئے پاپ کارن کے ذریعے آریانہ کی لاش تک پہنچ جاتا ہے۔ آریانہ مزاحمت کے دوران پہاڑ سے گر کر ہلاک ہو جاتی ہے۔ اس کے اغوا کار بھی کھائی میں گر کر مر جاتے ہیں۔ فاتح آریانہ کی مسخ شدہ لاش دفنا دیتا ہے۔ اور اس کی موت کا کسی کو نہیں بتاتا، کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ آریانہ کو صوفیہ رحمن نے اغوا کرایا تھا۔

ایڈم ملاکہ پہنچ جاتا ہے۔ ایڈم کو یقین دلانے کے لیے تالیہ بریسلیٹ اس کو دے دیتی ہے۔ ایڈم شک میں پڑ کر راستے میں فاتح کو سچ بتاتا ہے۔

تالیہ فاتح کے گھر میں خزانے کا راستہ تلاش کر لیتی ہے۔ فاتح اور ایڈم بھی پہنچ جاتے ہیں۔ فاتح اسے پولیس کے حوالے کرنا چاہتا ہے، مگر تالیہ خزانہ دیکھنے پر بضد ہوتی ہے۔ بالآخر تینوں بحث کے بعد ایک دروازے سے گزرتے ہیں۔ جہاں سے وہ ایک جنگل میں پہنچ جاتے ہیں۔ دروازہ غائب ہو جاتا ہے۔

راستے میں وہ ہی حالات پیش آتے ہیں جو تالیہ خواب میں دیکھ چکی ہے۔ اسے داتن کی باتوں میں سچائی نظر آنے لگتی ہے کہ وہ پندرہویں صدی کی لڑکی ہے جو وقت سے آگے نکل آئی تھی۔ خزانے کے لالچ میں، اور سچ کی تلاش میں تالیہ، فاتح اور ایڈم پرانے زمانے میں پہنچ جاتے ہیں۔

فاتح پر کھل جاتا ہے کہ تالیہ ہی حالم ہے۔ اب اس کا رویہ بدل جاتا ہے۔ وہ حالات سے گھبرانے کے بجائے جنگل سے نکلنے کا سوچتا ہے۔ اور از خود ان دونوں کا لیڈر بن جاتا ہے۔

جنگل میں تالیہ کو آگہی ملتی ہے۔ کہ شہزادی تاشہ اس کے گاؤں کے لوگوں پر ظلم ڈھا رہی ہے اور اس نے تالیہ کے بابا کو بھی قید کر لیا ہے۔ تالیہ کو شہزادی تاشہ سے نفرت محسوس ہوتی ہے۔ مگر ایڈم اور وان فاتح تاریخی کتابوں کے حوالے سے تاشہ کو جانتے ہیں۔ وہ دونوں تاشہ کی تعریف کرتے ہیں اور وان فاتح تاشہ کا فین ہے۔

وان فاتح کو اپنے ملک میں ہونے والے انتخابات کی بھی فکر ہے اس کا خیال ہے کہ مراد دوبارہ چابی بنا دے گا تو وہ واپس اپنے ملک چلے جائیں گے اس مقصد کے لیے قدیم ملاکہ جانا ضروری ہے۔

یہ لوگ رین فاریسٹ میں سے راستہ تلاش کر کے جنگل میں جاتے ہیں۔ جہاں تالیہ ہرن کا شکار کر کے اسے آگ پر بھونتی ہے۔ کھانے کی یہ خوشبو قدیم ملاکہ کے لوگوں کو متوجہ کر لیتی ہے۔ اور تین قدیم باشندے وان فاتح، ایڈم اور تالیہ کو زبردستی پکڑ کر اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ ایسے میں تالیہ کو دوبارہ آگہی ملتی ہے جب وہ ملاکہ کے ایک یتیم خانے میں جانے کیسے پہنچ گئی تھی۔ وہاں کی انچارج مسز ماریہ نے اس کا بریسلیٹ اتار لیا تھا اور ایک سنار کو بیچ دیا تھا مگر وہ سنار کے لیے بدبختی لایا تھا۔ وہ پگھل نہیں رہا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ دوسری مصیبتوں میں بھی مبتلا ہو گیا تھا۔ یتیم خانے کی میڈم ایگنیس تالیہ پر چوری کا غلط الزام لگاتی ہے۔ اور اسی ضد میں تالیہ چوری کرنا اور زبردستی اپنا حق چھیننا سیکھتی ہے۔

یتیم خانے میں مسٹر ذوالکفلی آتے ہیں جو تھوڑا وقت بچوں کے ساتھ گزارنا چاہتے ہیں تاکہ اپنا من پسند بچہ ایڈاپٹ کریں۔ ان کا زیادہ وقت تالیہ مراد کے ساتھ گزرتا ہے۔ جو ہمہ وقت کسی پہاڑی پر محل کا اسکیچ بناتی ہے۔ ذوالکفلی اسے پیلے گلاب اور سکے کا ایک شعبدہ دکھا کر متاثر کرتے ہیں۔

ذوالکفلی ایک کون آرٹسٹ اور اسکامر ہے۔ وہ یتیم خانے میں بچہ ایڈاپٹ کرنے نہیں آیا تھا، بلکہ کسی جگہ نظر رکھنے آیا تھا اور موقع ملتے ہی وہاں سے ہیرا لے اڑا۔ پولیس تالیہ سے اس کا اسکیچ بنواتی ہے۔ تو وہ غلط اسکیچ بنا کر اسے بچا لیتی ہے۔

تالیہ کو بار بار یتیم خانے میں اپنے ساتھ ہونے والا برا سلوک یاد آتا ہے۔ اسے لاہور کے ایک گھر میں لے جایا جاتا ہے، جہاں اس پر اس فیملی کے دادا جی کے قتل کا جھوٹا الزام لگایا جاتا ہے۔ وہ سچائی ثابت کرنے میں ناکام ہو جاتی ہے۔ وہ ملائیشیا کو یاد کرتی ہے۔ جہاں اس نے بالآخر ذوالکفلی کو ڈھونڈ نکالا تھا اور احسان مندی کے طور پر ذوالکفلی نے اسے اپنا سارا ہنر سکھا دیا تھا۔

تالیہ، ایڈم اور فاتح کو "ابوالخیر" نامی آدمی کے کارندے ایک پنجرے میں قید کر کے گھوڑا گاڑی کے ذریعے قدیم ملاکہ کے شہر لے جاتے ہیں۔ تالیہ خود کو اور ایڈم کو آزاد کرا لیتی ہے۔ مگر فاتح کو آزاد کرانے سے پہلے اغوا کاروں کو خبر ہو

جاتی ہے۔ وہ دونوں فاتح کو چھوڑ کر فرار ہو جاتے ہیں۔ فاتح کو ایک قید خانے میں منتقل کر دیا جاتا ہے۔ جہاں ایک ''البینو'' قیدی کے ساتھ برا سلوک کیا جاتا ہے۔

قید میں فاتح کو ادراک ہوتا ہے، وہ ماضی میں کسی خاص مقصد سے بھیجا گیا ہے۔ وہ خود کو حالات کے رحم و کرم پہ چھوڑنے کے بجائے ان کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ تالیہ کی ذہانت سے وہ دونوں اپنے اغوا کاروں کو جل دے کر بھیس بدل کر شہر میں ہی پھرتے ہیں۔ جہاں تالیہ پہ انکشاف ہوتا ہے کہ وہ خود شہزادی تاشہ ہے اور بنداہارا کی بیٹی ہے۔ بنداہارا مراد اپنے ساتھیوں سے غداری کر کے انہیں پکڑوا دیتا ہے اور خود بادشاہ سے جو اس کا ماموں زاد ہے مل جاتا ہے۔ تالیہ صدمے سے چور ہو کر خزانے کی چابی حاصل کر لیتی ہے اور وقت کا دروازہ پار کر جاتی ہے۔ راجہ مراد، تالیہ کو اپنی بیٹی تاشہ کی حیثیت سے تسلیم کر لیتا ہے۔

ایڈم، وان فاتح کو ابوالخیر کی غلامی میں کام کرتے ہوئے، موقع پا کر تالیہ کے بارے میں بتاتا ہے فاتح اسے تالیہ کی کہانی سمجھتا ہے تالیہ یہ جان کر غصے میں آ جاتی ہے اور طاقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے تین بے گناہ افراد جن میں ایڈم بھی شامل ہے گرفتار کروا کے مختلف سزائیں دیتی ہے ایڈم کو شاہی کتب خانے میں کام کرنے کی سزا ملتی ہے۔

تالیہ کو اپنے باپ مراد کے خیالات جان کر دھچکا لگتا ہے۔ وہ ہر صورت چابی حاصل کر کے ملائیشیا واپس آنا چاہتی ہے۔ مگر راجہ مراد بے جا طاقت کا اور ظلم کا مظاہرہ کر کے تالیہ کو خوفزدہ کر دیتا ہے۔ راجہ کی خاص کنیز شریفہ اس کی جاسوسی کرتی ہے۔ مگر تالیہ اس کی کمزوری پتا چلا کر اس کی وفاداری خرید لیتی ہے۔

ملکہ یان سوفو چینی بادشاہ کی بیٹی اور بادشاہ مرسل کی بیوی ہے مگر وہ ایک ظالم عورت ہے اور اس کے مقابل بنداہارا مراد ہے۔ جو بادشاہ کے فیصلوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔

وان فاتح کو ابوالخیر اپنے باورچی خانے میں کام پر رکھ لیتا ہے۔ وہ اسے اچھی غذائیں کھانے کو دیتا ہے تاکہ نیلامی میں اس غلام کی اچھی قیمت ملے۔

تالیہ، فاتح سے ملاقات کا موقع نکال لیتی ہے۔ وہ جاننا چاہتی ہے کہ تاریخ میں اس نے کیا کارنامے انجام دیئے تھے مگر فاتح نہیں بتاتا۔ ایڈم ''بنگارایابلایو'' کے رائٹر کا تھیلا چرا لیتا ہے۔ جس نے ابھی کتاب لکھنی شروع نہیں کی۔ تالیہ وہ تھیلا لیتی ہے۔

ابوالخیر شاہی خزانچی بننا چاہتا ہے وہ بادشاہ کی دعوت کرتا ہے۔ جہاں ملکہ اور راجہ مراد بھی ہوتے ہیں۔ تالیہ بھی وہاں پہنچ جاتی ہے۔ بادشاہ اس سے متاثر ہوتا ہے۔ ملکہ یان سوفو ''وانگ لی'' کو شاہی خزانچی بنانا چاہتی ہے۔ مراد، ابوالخیر کو۔ وان فاتح سن باؤ کے وانگ لی سے متاثر ہے دعوت میں سن باؤ وانگ لی بھی موجود ہوتا ہے۔ ابوالخیر اس سے خطرہ محسوس کر کے فاتح کے ہاتھوں اسے زہر دلواتا ہے مگر فاتح وانگ لی کو خبردار کر دیتا ہے۔

فاتح، وانگ لی سے بے حد متاثر ہے اور اسے خزانچی دیکھنا چاہتا ہے مگر تالیہ ابوالخیر کو خزانچی بنانے کی سفارش کرتی ہے۔ فاتح کو یہ بات ناگوار گزرتی ہے، تالیہ، ایڈم کو شاہی مورخ تعینات کرتی ہے۔ فاتح تمام غلاموں میں آزادی کا جذبہ جگاتا ہے اور اپنے ساتھ کا یقین دلاتا ہے۔ راجہ مراد تمام اہم عہدوں پر بادشاہ کو قائل کر کے اپنے آدمی تعینات کر دیتا ہے اور ہر ادارے کا کنٹرول اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے۔ تالیہ، شاہی مورخ سے اپنی جھوٹی تعریفیں لکھواتی ہے۔

تالیہ راجہ مراد کی غیر موجودگی میں اس کے خزانے کے کمرے کی تلاشی لیتی ہے تو اس پر انکشاف ہوتا ہے کہ راجہ خفیہ طور پر کمائی گئی دولت، کسی خفیہ جگہ پر چھپا کر رکھتا ہے۔ تالیہ، مسجد کے نام پر پیسہ حاصل کرنے کے لیے ابوالخیر سے ساز باز کر لیتی ہے۔ فاتح کو پتا چل جاتا ہے، وہ ناراض ہوتا ہے اور نیلامی میں وانگ لی کا غلام بننے کو ترجیح دیتا ہے۔ فاتح مستقبل کی باتیں بتا کر وانگ لی کو متاثر کرتا ہے۔

یان سوفو کے والد کو بادشاہ مرسل کی نظر لگ جاتی ہے، وہ اس کے توڑ کے لیے بادشاہ کا مستعمل غسل کا پانی

چاہتی ہے مگر شاہی طبیب آنا کافی کرتا ہے۔ تالیہ مداخلت کر کے طبیب کو ملکہ کا حکم ماننے پر مجبور کر دیتی ہے۔
ملکہ، تالیہ کی جاسوسی کرواتی ہے مگر تالیہ باتوں باتوں میں اس کا دل اپنی طرف سے صاف کر دیتی ہے۔ بادشاہ کے حوالے سے اس کے خدشات بھی دور کر کے واضح کرتی ہے کہ وہ اپنے محبوب کی خاطر ضرور واپس جائے گی۔

فاتح کے کہنے پر محمود مرفی، وانگ لی سے مدد چاہتا ہے مگر وہ انکار کر دیتا ہے۔ وانگ لی کے انکار سے اس کی شخصیت کا بت فاتح کے سامنے ٹوٹ جاتا ہے۔

راجہ مرسل تالیہ کے فن اور تالیہ سے متاثر ہو کر اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ ایڈم کی زبانی یہ بات سن کر فاتح کا دماغ گھوم جاتا ہے۔ راجہ مراد کو شک ہو جاتا ہے کہ تالیہ اپنے ساتھ کسی مرد کو لائی ہے وہ اسے تلاش کرواتا ہے۔ تالیہ بھی یہ بات بھانپ لیتی ہے اور فاتح کو خبردار کرتی ہے۔ راجہ مرسل تالیہ کے باپ کو تالیہ کا رشتہ دیتا ہے۔
ملکہ یان سوفو کی کنیز یہ بات ملکہ کو بتاتی ہے۔

پندرہویں قسط

وقت کے اس پار

اس نے خواب میں دیکھا......
گھنٹی کی تیز آواز سے اس کی آنکھ کھلتی ہے......
وہ ہڑبڑا کے لحاف پھینکتی ہے، پھر بستر سے پیر نیچے اتارتی ہے......
اور چپل پیروں میں ڈالے باہر کو لپکتی ہے......
اب وہ تیز تیز زینہ پھلانگ رہی ہے، دل زور زور سے دھڑک رہا ہے۔
وہ دروازہ کھول کے باہر ڈرائیو وے پہ آتی ہے۔
سامنے گیٹ کے پار کوئی کھڑا ہے....اس کے ہاتھ میں ایک ٹوکری ہے۔
اس کے قدم سست پڑ جاتے ہیں۔ وہ گیٹ تک آتی ہے، جنگلے کے اوپر سے ہاتھ بڑھاتی ہے۔ آدمی اس کو ٹوکری پکڑاتا ہے، وہ وہیں نیچے زمین پہ بیٹھتی چلی جاتی ہے۔ ٹوکری اس کے ہاتھ میں ہے اور چہرہ شکست خوردہ سا لگتا ہے۔
اب وہ ٹوکری میں موجود اشیاء پہ ہاتھ پھیر رہی ہے، ان کی خوشبو نتھنوں سے ٹکرا رہی ہے، تیز مانوس خوشبو......
اور اس کی آنکھیں بھیگتی جا رہی ہیں....
ٹوکری میں رکھی چیزیں دھندلی نظر آ رہی ہیں...
اور....خواب ہوا میں تحلیل ہو جاتا ہے....

☆☆☆

سرد ہوا کے زوردار جھونکے نے اس کے سر سے چغے کی ٹوپی گرا دی۔
تالیہ مراد چونک کے اٹھی۔
وہ سوئی نہیں تھی۔ بس کشتی کے کونے میں بیٹھے بیٹھے گھٹنوں پہ چہرہ ٹکا کے آنکھیں موندی ہی تھیں کہ یہ خواب دکھائی دیا۔ اب آنکھ کھلی تو دیکھا... کشتی پانی پہ تیرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی اور جزیرہ قریب آتا دکھائی دے رہا تھا۔
''کوئی برا خواب دیکھا ہے کیا؟''
ایڈم ہاتھوں پہ رسی لپیٹتے ہوئے قریب آیا تو اس نے گردن اٹھا کے اسے دیکھا۔ چغے میں ملبوس وہ رسی اٹھائے مصروف دکھائی دیتا تھا۔
''اچھے برے کا معلوم نہیں۔ مگر ہاں....خواب ہی دیکھا ہے۔'' اس نے جھرجھری لی۔
''کیا دیکھا آپ نے؟'' وہ اس کے قریب آ رکا۔ ساتھ ساتھ رسی بھی لپیٹ رہا تھا۔
''میں نے خود کو اپنے کے ایل والے گھر میں

دیکھا۔ گھنٹی بجتی ہے۔ ایسی گھنٹی جس کا مجھے انتظار تھا جیسے۔ کوئی عادت ہو جیسے۔ میں بھاگ کے دروازہ کھولتی ہوں تو مجھے کوئی شخص ایک ٹوکری دیتا ہے جیسے تحفہ ہو.... مگر میں....'

وہ کہتے کہتے رک گئی جیسے خود میں ہی الجھ گئی ہو۔

''تحفہ ملنے پہ یوں غمگین کون ہوتا ہے ایڈم؟''

''جو خزانے ڈھونڈنے کے لیے جاتا ہے اور وقت کے اس پار کھو جاتا ہے.... شاید وہ۔'' اداسی سے مسکراتے ہوئے ایڈم نے رسّی کا گچھا دور ایک سپاہی کی طرف اچھالا جس نے فوراً اسے تھام لیا۔ دوسرے سپاہی اور خادم بھی لنگر انداز ہونے کی تیاریوں میں لگے ہوئے تھے۔

''مگر اس ٹوکری میں کیا تھا؟'' اس نے آنکھیں بند کر کے یاد کرنا چاہا۔ ''میں اس چیز کی خوشبو پہچانتی ہوں۔ ایسے جیسے.... جیسے رسیلا چاکلیٹ ہو....'' پھر اس نے گہری سانس لی اور کھڑی ہوئی۔

''خیر.... ایک بات تو طے ہے کہ ہم اس زمانے کی قید سے جلد نکل جائیں گے۔''

''ہم یا صرف آپ؟''

تالیہ نے گلہ آمیز نظروں سے اسے دیکھا۔ ''تمہیں لگتا ہے، میں تم دونوں کو چھوڑ کے جا سکتی ہوں۔''

''جی بالکل، مجھے ایسا لگتا ہے۔ کیونکہ.... آپ کو بیس فیصد خزانہ بھی مجھ سے بانٹنا برا لگ رہا ہو گا اندر ہی اندر۔''

''ہاں لگ تو رہا ہے۔ بیس فیصد جتنا کام تو تم نے کیا نہیں ہے۔ ہونہہ۔'' بالوں کو بے نیازی سے پیچھے جھٹکا اور عرشے پہ آگے بڑھ گئی۔ جزیرہ جیسے جیسے قریب آ رہا تھا.... سورج اسی رفتار سے ڈھلنے کی تیاری میں تھا۔

ایڈم نے کینہ توز نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے گہری سانس بھری۔

''بچے تالیہ جل بھی جائیں تو ان کے بل نہیں جائیں گے۔'' یہ تو طے تھا۔

☆☆☆

بنداہارا کے دربار میں کھڑا وان فاتح کہہ رہا تھا۔

''وہ ایک سمندری سفر پہ گئی تھی جس سے وہ لوٹ کے نہیں آئی تھی۔ اگر تم اس کو بچانا چاہتے ہو تو اسے کسی سمندری سفر پہ نہ بھیجنا۔''

مراد راجہ کے دل پہ کسی نے پیر رکھ دیا۔

''بس یہی یا کچھ اور بھی جاننا چاہتے ہو تم راجہ؟'' بے تاثر سے انداز میں اس نے بات جاری رکھی۔

مراد کی گردن میں گلٹی سی ڈوب کے ابھرتی دکھائی دی۔ مگر چہرے کے تاثرات اس نے بہت ضبط سے ہموار رکھے۔

''مجھے تمہاری کسی بات پہ یقین نہیں ہے۔ جاؤ اور میرے قید خانے میں اپنی باقی ماندہ زندگی گزارو۔'' وہ قدرے غصے اور حقارت سے ہاتھ جھلا کے بولا تو فاتح ہلکا سا مسکرایا۔

''بہت جلد تم اتنے مجبور ہو جاؤ گے مراد راجہ کہ تم مجھے خود یہاں واپس بلاؤ گے اور اس کرسی (تخت کے ساتھ والی کرسی کی جانب اشارہ کیا) پہ بٹھا کے میرے ساتھ مذاکرات کرو گے۔''

مراد نے جواب نہیں دیا۔ ہاتھ دوبارہ جھلایا اور رخ موڑ لیا۔ سپاہی تیزی سے وارد ہوئے اور اسے بازوؤں سے پکڑا۔ اس نے مزاحمت نہیں کی۔ بس ایک نظر راجہ پہ ڈالی جو کمر پہ ہاتھ باندھے رخ موڑ گیا تھا اور پلٹ گیا۔

''عارف!'' اس کے جانے کے بعد مراد قدرے بے چینی سے عارف کی طرف گھوما جو فکرمند سا وہیں کھڑا تھا۔ پیشانی شکن آلود تھی اور آنکھوں میں پریشانی تھی۔

''کیا تمہیں اس آدمی کی باتوں پہ یقین ہے؟''

عارف نے ایک نظر بند دروازے پہ ڈالی جہاں سے فاتح ابھی گیا تھا۔

''اس کی پیشانی کشادہ اور آنکھیں روشن ہیں۔ جھوٹے لوگوں کے چہرے ایسے نہیں ہوتے۔''

''پھر تم ابھی اسی وقت جنوبی محل کی طرف روانہ ہو جاؤ اور شہزادی کو بحفاظت واپس لے آؤ۔ ابھی' عارف!'' آخر میں اس کی مضطرب آواز بلند ہوئی تو عارف نے جھٹ سر جھکا دیا۔

''جو حکم راجہ!'' اور پھر تیزی سے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

مراد اب مارے اضطراب کے دربار میں دائیں بائیں چکر کاٹ رہا تھا۔ وہ اندر تک ہل کے رہ گیا تھا۔

☆☆☆

شام ڈھل گئی تو بنداہارا محل کے در و دیوار نے سرگوشیوں میں ایک دوسرے کو تہ خانے کا احوال سنایا۔ کھڑکیاں احتجاجاً ذرا کھڑکیں اور دروازوں نے اپنے پٹ جھلائے مگر اونچے ستون بے حسی سے قید خانے کا منظر نامہ سنتے رہے۔

وہ جیل نیچے تہ خانے میں بنی تھی۔ تاریک کال کوٹھڑیوں کی قطار جن کے دروازے آہنی اور سلاخ دار تھے۔ ایسی ہی ایک کوٹھڑی کے اندر زمین پہ فاتح بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ کھلے تھے مگر دائیں پیر سے بندھی زنجیر کے سرے پہ بڑا سا لوہے کا وزن بندھا تھا جس کے باعث وہ چند قدم سے زیادہ نہیں چل سکتا تھا مگر اس نے کھڑے ہونے کی کوشش بھی نہیں کی۔ بس کونے میں اکڑوں بیٹھا دیوار کو دیکھتا رہا۔

دیوار پہ لگے گارے اور اینٹوں پر وہ ناخن سے لکیریں کھینچ کے حساب کتاب کر رہا تھا۔

''کیا سوچ رہے ہیں آپ؟'' آریانہ دوسرے کونے میں چپکے سے آن بیٹھی تھی۔ فاتح نے نظریں اس کی طرف اٹھائیں۔

وہ سفید ہیئر بینڈ میں بال جکڑے' آلتی پالتی مار کے بیٹھی اس کو غور سے دیکھ رہی تھی۔

''کتنے گھنٹے بیت چکے' یہ حساب کر رہا ہوں۔ تمہارے باپ کے پاس ہمیشہ پلان ہوتا ہے اور میرے حساب کے مطابق وہ ٹھیک جا رہا ہے۔'' وہ دوبارہ ناخن سے لکیر کھینچنے لگا۔

''آپ کو ڈر نہیں لگ رہا؟''

''مجھے ڈرنا نہیں' محض انتظار کرنا ہے۔ وقت کے اس پار جانے کا انتظار۔''

''اور اس کے بعد؟ واپس جا کے آپ تالیہ کے ساتھ کیا کریں گے؟''

''وہی جس کا میں نے اس سے وعدہ کیا ہے۔ میں اس کو آزاد کر دوں گا۔ وہ اپنی زندگی گزارے' خوش رہے' میں اپنی زندگی گزاروں گا۔''

اس نے ہلکے سے کندھے اچکائے اور ایک لکیر کھینچی۔ ناخن کی سوکھے گارے سے رگڑے جانے کی آواز سنائی دی۔

''اور اگر کسی موقعے پہ آپ کو 'واپسی' یا 'تالیہ مراد' میں سے کسی ایک کو چننا پڑا تو کیا کریں گے؟''

وہ چونکا۔ ''تمہیں یہ خیال کیسے آیا؟'' بے حد حیرت سے اس نے کونے میں بیٹھی آریانہ کو دیکھا۔ جواب میں وہ استہزائیہ مسکرائی۔

''مجھے؟ مگر میں تو کوئی نہیں ہوں' ڈیڈ۔ میں آپ کا لاشعور ہوں جو آپ سے پوچھ رہا ہے کہ اگر چناؤ کا موقع آیا تو کیا کریں گے آپ؟''

اس نے جواب نہیں دیا۔ بس گردن موڑ کے دیوار پہ بنی لکیروں کو دیکھنے لگا۔ ماتھے پہ بل پڑ گئے تھے اور آنکھوں میں بے چینی در آئی تھی۔ ذہن میں ایک دم آوازوں کا ہجوم اکٹھا ہو گیا تھا۔

(ایک وقت آئے گا جب آپ مجھ سے کہیں گے کہ آپ کو میری ضرورت ہے وان فاتح! کہ میں آپ کے ساتھ رہوں۔) تالیہ ہنسی تھی۔

(یہ ایک بے وفا آدمی ہے جس کو وعدے نبھانے نہیں آتے۔) ملکہ کی آواز میں سنجیدگی تھی۔

("میں وان فاتح ہوں اور مجھے کبھی کسی کی ضرورت نہیں ہوتی۔") اس نے ایک زمانے میں کبھی یہ کہا تھا۔

(وان فاتح کو صرف وان فاتح سے محبت ہے!) عصرہ بے رحم ہوئی تھی۔

آوازیں.... یادیں....سب دیوار پہ بنی لکیروں سے ٹکرا رہی تھیں۔ وہ سر جھٹک کے اپنی توجہ منصوبے پہ مرکوز کرنے لگا۔

☆☆☆

تین چاند والے جزیرے پہ سورج ڈوب رہا تھا۔ کشتی ساحل پہ لنگر انداز ہو چکی تھی اور سپاہیوں کا گروہ ریت پہ اُترا کھڑا تھا۔ دائرے کی صورت وہ تالیہ اور ایڈم کے گرد کھڑے تھے۔ مورخ خاموش تھا جبکہ چغہ پوش شہزادی ان کو ہدایات دے رہی تھی۔

"سب ٹولیوں کی صورت جزیرے میں پھیل جاؤ' مگر ساحل کی پٹی کے ساتھ ساتھ۔ اندر کی طرف جنگل شروع ہو جاتا ہے۔ ہمیں رات میں جنگل کے اندر نہیں جانا۔ صرف ساحل کی پٹی کے ساتھ جزیرے کا محاصرہ کرنا ہے۔ کوئی بھی غیر معمولی چیز نظر آئے تو ایسی صورت میں......" اس نے ایک ترکش سامنے کیا جو تیروں سے بھرا تھا۔ "یہ آتش بار تیر ہیں اور تم سب کے پاس یہ موجود ہیں۔ اس کو سلگا کے ہوا میں چھوڑ دو گے تو یہ فضا میں پھٹ جائے گا اور روشنی دیکھ کے باقی سب تمہاری طرف بھاگے آئیں گے۔"

"جو حکم شہزادی!" سپاہی سر ہلا رہے تھے۔

"آپ میرے ساتھ رہیے گا۔" وہ سب بکھر گئے تو ایڈم نے مربیانہ انداز میں کہا۔

"اوہ! اتنے بڑے ہو گئے ہو اور اندھیرے سے ڈرتے ہو؟ چچ چچ!" تالیہ نے سادگی سے پلکیں جھپکائیں۔

ایڈم کی پیشانی پہ بل پڑے۔ "میں آپ کے لیے کہہ رہا تھا۔"

"میرے لیے؟" وہ ہنسی۔ "میں تاشہ پسونا ہوں' میں کسی سے نہیں ڈرتی۔" پھر بالوں کو جھٹکا' چغے کی ٹوپی برابر کی اور ایک طرف کو مڑی تو ایڈم بولا۔

"ابھی تک نہ میں نے بنگارا یا ملایو میں آپ کو "ساحرہ" کا لقب دیا ہے' نہ ہی ملاکہ میں کوئی آپ کو اس نام سے پکارتا ہے۔"

"شاید وہ وقت ابھی آتا ہے جب میں پسونا بنوں گی۔ تم جلنا چھوڑ دو۔ اور خزانے کو تلاش کرو۔" گھمنڈی شہزادی اس کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے ایک طرف کو چل دی۔ ایڈم ضبط کے گھونٹ بھرتا رہ گیا۔

سورج ڈوب گیا اور جزیرے پہ اندھیرا چھا گیا۔ ایسے میں پورا چاند آسمان پہ چمکنے لگا۔

جزیرہ بالکل خاموش تھا۔ کسی فوج' کسی مخلوق کی چاپ تک نہ سنائی دیتی تھی۔ کیا واقعی خزانہ اسی جزیرے پہ تھا؟ یا ان کے سارے حساب کتاب غلط تھے؟

وہ ٹھنڈی ریت پہ قدم بہ قدم چل رہی تھی۔ چوکنی نظریں چاروں طرف لگی تھیں۔ جزیرہ بالکل خاموش اور ساکن تھا۔ سوائے ساحل کی لہروں کے شور کے کوئی آواز....

پھر ایک دم آواز سنائی دی۔ غراتی ہوئی آواز۔

وہ سناٹے میں رہ گئی۔

پس ثابت ہوا کہ جزیرہ زندہ تھا۔ ملاکہ کے اس قدیم جنگل کی طرح جس میں وہ چار دن تک پھنسے رہے تھے۔

تالیہ محتاط انداز میں آواز کی سمت چلنے لگی۔ آواز کسی جانور کے ڈکرانے کی معلوم ہوتی تھی۔

جوتے میں کوئی سوراخ ہو گیا تھا جو ریت پیروں میں گھس رہی تھی۔ یوں لگتا تھا وہ ٹھنڈی ریت پہ ننگے پیر چل رہی ہے۔

ننھی ننھی چیزیں پیروں میں چبھ رہی تھیں مگر وہ چبھن سے بے پرواہ قدم اٹھاتی رہی۔ چغے کی ٹوپی نے اس کے سر کو ڈھانپ رکھا تھا مگر ہوا کے باعث وہ

پشت سے پھڑ پھڑا رہا تھا۔

دفعتاً ایک مقام پہ وہ ٹھہری۔ سامنے آسمان پہ مکھن کی ٹکیا جیسا چاند چمک رہا تھا۔ اس نے نظریں دائیں طرف موڑیں۔ وہاں ایک چھوٹی سی پہاڑی تھی جس کی چوٹی خوب روشن تھی۔ جیسے شیشے کی بنی ہو...

اس چوٹی کے چمکتے شیشے میں ایک دوسرا چاند نظر آرہا تھا....

وہ ایک دم گھومی۔

ہوا سے چغے کی ٹوپی پیچھے کو ڈھلک گئی۔ مگر اس کی سیاہ آنکھیں سامنے جم گئیں....

وہاں سیاہ کانچ جیسے سمندر کا پانی بہہ رہا تھا اور ایک چاند پانی کی سطح پہ چمک رہا تھا....

''جہاں ملتے ہیں تین چاند۔''

وہ چونک کے بڑبڑائی.... پھر اس کے ہونٹ مسکراہٹ میں ڈھلے...

''یہاں.... ہاں' یہاں ملتے ہیں تین چاند۔''

پہاڑی کی چوٹی شیشے یا کانچ کی بنی لگتی تھی۔ چاند آسمان پہ چمک رہا تھا مگر اس کا عکس سمندر کے پانی اور چوٹی دونوں میں دکھائی دے رہا تھا۔

''تین چاند۔'' اس نے گہری سانس لی۔ ''تو یہ تھے تین چاند۔'' ان ہی کے آس پاس آواز آئی تھی۔

''بچ تالیہ۔'' ایڈم نے قریب سے آواز دی تو وہ چونکی۔ وہ پیچھے سے تیز تیز آرہا تھا۔

تالیہ کے ماتھے پہ بل پڑے۔ ''سنو! تم باڈی مین ہو گے وان فاتح کے... میں اپنی حفاظت خود کر سکتی ہوں۔''

ایڈم نے جواب نہیں دیا۔ ایک دم ترکش سے تیر نکالا اور تالیہ کی طرف کمان تان کے تیر چلا دیا۔ وہ ہکا بکا رہ گئی۔ تیر زن سے اس کے پاس سے ہوا میں تیرتا پیچھے کو گیا۔ تالیہ گھومی۔

پہاڑی کے قدموں میں ایک آدمی کھڑا تھا اور وہ تالیہ کی طرف تلوار تانے بھاگا چلا آرہا تھا۔ تیر اس کے ہاتھ پہ لگا تو تلوار چھوٹ گئی۔ وہ کراہ کے نیچے گرا

تالیہ نے جھٹ اپنا تیر کمان اس پہ تان لیا۔

''آپ اپنی حفاظت خود کرنا جانتی ہیں شہزادی' ہے نا۔'' طنز سے کہتا ایڈم قریب آیا۔ تالیہ نے بس تھوک نگلا۔ نظریں اس آدمی پہ جمائے رکھیں۔

اس کی تلوار دور جا گری تھی۔ تلوار اٹھانے کے بجائے وہ لڑکھڑاتا ہوا اٹھا اور پیچھے ہٹنے لگا۔ ہاتھ سے بھل بھل خون بہہ رہا تھا۔

''رک جاؤ ورنہ اگلا تیر تمہاری گردن کے آر پار ہوگا۔'' وہ تیر سے اس کا نشانہ لے کر غرائی تو آدمی ٹھہر گیا۔ تالیہ نے اس کے آس پاس نظر دوڑائی۔

''تمہارے ساتھی کہاں ہیں؟ بولو! کہاں ہیں مراد راجہ کے دوسرے آدمی۔''

وہ خستہ حال حلیے والا جنگلی سا آدمی لگتا تھا۔ جواب دینے کے بجائے دائیں طرف دیکھنے لگا۔ ہونٹ بند رہے۔

''میں کچھ پوچھ رہی ہوں۔''

مگر وہ مسلسل دائیں طرف دیکھ رہا تھا جیسے کسی کا منتظر ہو۔

''کہیں اس کے ساتھی حملہ ہی نہ کر دیں۔ ہمیں سپاہیوں کی ضرورت ہے۔''

ایڈم نے فکرمندی سے کہتے ہوئے آتش بھرے تیر کو سلگایا اور زور سے اوپر فضا میں چھوڑا۔ تیر اوپر جا کے پھٹ گیا۔ ہر سو آتش بازی کی صورت روشنیاں بکھر گئیں اور پھر اندھیرا چھا گیا۔ مگر ذرا سی روشنی میں تالیہ کو اس آدمی کے دائیں طرف کوئی حرکت دکھائی دی تھی۔

کوئی رینگتی ہوئی شے۔ جو اس طرف بڑھ رہی تھی۔

تیر کمان تانے تالیہ کی نظریں اس طرف اٹھیں۔ چاندنی میں اب واضح دکھائی دینے لگا تھا۔

زمین پہ کوئی چیز رینگ رہی تھی۔ چھپکلی کی شکل کا مگرمچھ۔ لیکن عام مگرمچھ سے دوگنا۔

"کموڈو ڈریگن ہے یہ تو۔" تالیہ چونکی۔ "تو راجہ نے اپنے خزانے کی حفاظت کے لیے کموڈو ڈریگن پال رکھا ہے اور اس کا خیال یہ شکار باز رکھتا ہے یعنی....."

"یعنی اس آدمی کا کوئی ساتھی ادھر تعینات نہیں ہے۔ یہ ایک ڈریگن کافی ہے۔"

ڈریگن (اژدھا) زمین پہ رینگتا آہستہ آہستہ اس آدمی کے سامنے آرکا۔ اس کا بھاری پیٹ نیچے رگڑتا ریت پہ نشان بناتا جا رہا تھا۔ سامنے آکے اس نے منہ کھولا اور غرایا۔ ایڈم اور تالیہ نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

"اب کیا کریں؟" وہ ذرا فکر مند ہوئی۔ ڈریگن ایک ہی نوالے میں سالم بندہ نگلنے کی صلاحیت رکھتا تھا اور یہ آج کے ملائیشیاء کے ڈریگن سے دگنا تھا، یہ تو ایک ہی سانس میں ان دونوں کو ہضم کر جاتا۔

"ایسا کرو تم اس آدمی پہ تیر چلاؤ اور میں ڈریگن کا نشانہ باندھتی ہوں۔ ان دونوں کو مار کے ہی ہم اس پہاڑی تک جا سکتے ہیں۔ یہ اگر اس پہاڑی کی حفاظت کر رہے ہیں تو خزانہ ادھر ہی ہے۔"

"مگر ہم کموڈو ڈریگن کو نہیں مارتے۔" ایڈم ایک دم بولا۔

"اف ایڈم....." اس نے دانت پیسے۔ "یہ ہمیں کھا جائے گا۔"

مگر ایڈم نے کمان نیچے کر دی۔ "ہم سانپ کو بھی نہیں مارتے۔ ان کو ان کے علاقوں میں چھوڑ دیتے ہیں۔ میں نے وائلڈ لائف پارک میں ایک بچی کی جان بچائی تھی کموڈو ڈریگن سے.... لیکن میں نے اس کو بھی نہیں مارا تھا۔ نہیں بچے تالیہ.... ہم جانوروں کو مارنے والے لوگ نہیں ہیں۔" اس کے اندر کا اورنگ اصلی جاگ گیا تھا۔ تالیہ چند لمحے اسے دیکھتی رہی۔

"تو تم کموڈو ڈریگن سے پہلے مقابلہ کر چکے ہو؟" اس نے اپنا تیر کمان نیچے کر لیا۔

بیوٹی بکس کا تیار کردہ

سوہنی ہیئر آئل

SOHNI HAIR OIL

- گرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے
- نئے بال اگاتا ہے۔
- بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے۔
- مردوں، عورتوں اور بچوں کے لئے یکساں مفید۔
- ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔

قیمت-/150 روپے

سوہنی ہیئر آئل 12 جڑی بوٹیوں کا مرکب ہے اور اس کی تیاری کے مراحل بہت مشکل ہیں لہذا یہ تھوڑی مقدار میں تیار ہوتا ہے، یہ بازار میں یا کسی دوسرے شہر میں دستیاب نہیں، کراچی میں دستی خریدا جاسکتا ہے، ایک بوتل کی قیمت صرف-/150 روپے ہے، دوسرے شہر والے منی آرڈر بھیج کر رجسٹرڈ پارسل سے منگوالیں، رجسٹری سے منگوانے والے منی آرڈر اس حساب سے بھجوائیں۔

2 بوتلوں کے لئے ---------- -/350 روپے
3 بوتلوں کے لئے ---------- -/500 روپے
6 بوتلوں کے لئے ---------- -/1000 روپے

نوٹ: اس میں ڈاک خرچ اور پیکنگ چارجز شامل ہیں۔

منی آرڈر بھیجنے کے لئے ہمارا پتہ:

بیوٹی بکس، 53-اورنگزیب مارکیٹ، سیکنڈ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی

دستی خریدنے والے حضرات سوہنی ہیئر آئل ان جگہوں سے حاصل کریں

بیوٹی بکس، 53-اورنگزیب مارکیٹ، سیکنڈ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی

مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37-اردو بازار، کراچی۔

فون نمبر: 32735021

''میں اس سے ایک بچی کی جان بچا چکا ہوں لیکن سرکاری اعزاز دیتے وقت مجھے بھلا دیا گیا تھا۔''

''مگر تم تو اس واقعہ کو نہیں بھولے نا۔ ہو سکتا ہے اُس دنیا کے واقعات اِس دنیا کی تیاری کے لیے ہوں۔ جاؤ اور ہمیں اس ڈریگن سے نجات دلاؤ۔'' شہزادی نے کمان بلند کر کے اس طرف اشارہ کیا جہاں ڈریگن تھا۔

شہزادی کے حکم پہ ایڈم نے بے اختیار تھوک نگلا۔ چند فٹ کے فاصلے پہ ڈریگن کھڑا غرا رہا تھا اور شکار باز اس کی اوٹ میں کھڑا اپنے زخم کو دوسرے ہاتھ سے دبائے ہوئے تھا۔ خون دھاروں کی صورت بہہ رہا تھا مگر اس کی بے تاثر آنکھیں ایڈم پہ جمی تھیں۔ عجیب پتھریلا چہرہ تھا اس کا۔

''کیا نام ہے تمہارا؟'' ایڈم بھاری آواز میں استفسار کرتے ہوئے آگے بڑھا۔

پیچھے دوڑتے قدموں کی آواز آرہی تھی۔ ایک ایک کر کے سپاہی وہاں اکٹھے ہو رہے تھے۔ تالیہ نے ان کو خاموشی سے اپنے عقب میں کھڑے ہونے کا اشارہ کیا۔ انہوں نے اپنے کمان تانے وہیں جگہ سنبھال لی۔

''احمد.... کمال.... علی.... ایسا ہی کوئی نام ہوگا تمہارا۔'' ایڈم تبصرہ کرنے والے انداز میں ڈریگن کی سیدھ میں کئی فٹ کے فاصلے پہ ٹھہر گیا۔ سنجیدہ نظریں اس شکار باز پہ جمی تھیں۔

''مفید۔'' وہ دھیرے سے بولا۔ ''مفید نام ہے میرا اور تم نے اگر آگے بڑھنے کی کوشش کی تو میرا دوست تمہیں نگل جائے گا۔''

''یعنی تم نے اس کی اچھی تربیت کی ہے' مفید!'' وہ اونچی آواز میں بولا۔ ''یہ جانور تمہارا پالتو ہے۔ تمہارے اشارے کی تعمیل کرنا جانتا ہے۔''

''یہ سب کچھ کرنا جانتا ہے۔''

''سب کچھ کرنا تو تم بھی جانتے ہو' لیکن کیا یہ معلوم ہے کہ تم یہ سب کیوں کر رہے ہو؟''

چاندنی میں ڈوبا خاموش جزیرہ.... اور اس پہ ایڈم کی آواز.... سب خاموشی سے اسے سن رہے تھے۔ تالیہ البتہ بے چینی سے بار بار ڈریگن کو دیکھتی تھی۔ کمان تانے وہ ڈوری کو پیچھے کھینچے ہوئے تھی۔ ادھر انگلی چھوڑی' ادھر تیر ڈریگن کی آنکھ میں جا لگے۔

''ہر انسان کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ جو وہ کر رہا ہے' وہ اسے ''کیوں'' کر رہا ہے! تم بتاؤ۔ تم اس بیاباں جزیرے پہ ایک جانور کے ساتھ راجہ کے خزانے کی حفاظت کیوں کر رہے ہو۔''

''تم کچھ نہیں جانتے۔'' زخمی شکار باز غصے سے بولا۔ ''یہ چند مشکل دن ہم نے گزارنے ہیں' پھر ہمارے پاس اتنا خزانہ اکٹھا ہو جائے گا کہ ہم ساری دنیا پہ حکومت کریں گے۔'' اس کے لمبے بال کندھوں پہ گر رہے تھے۔ میلا کچیلا چہرہ' الجھی ڈاڑھی... لہو ٹپکاتی آنکھیں... وہ ذہنی طور پہ صحت مند نہیں لگتا تھا۔

''تو یہ وعدہ کیا ہے راجہ نے تم سے؟''

''مراد راجہ ہمارا سردار ہے اور یہ خزانہ.... یہ صرف ہمارا ہے۔''

''میرے پیارے دوست!'' دونوں پہلوؤں پہ ہاتھ رکھے کھڑے ایڈم نے افسوس سے گہری سانس لی۔ ''تم غالباً مراد راجہ کے تخت سنبھالنے کے دن سے یہیں ہو۔ تم نہیں جانتے کہ ملاکہ میں کیا ہو رہا ہے۔ بے وقوف انسان! مراد راجہ اس وقت ملاکہ کا بے تاج سلطان بن چکا ہے۔''

''نہیں۔ ابھی سلطان مرسل زندہ ہے۔'' شکار باز فوراً غرایا۔ ''جب وہ مرے گا تو ہم حکومت کریں گے۔''

''تم کتنے بے وقوف ہو' مفید۔ تم یہاں مراد راجہ کے خزانے کی حفاظت کر رہے ہو اس آس میں کہ مراد، سلطان کو قتل کر کے تخت سنبھال لے گا؟ نادان انسان.... وہ سلطان کو کبھی قتل نہیں کرے گا۔ پوچھو کیوں؟''

''وہ سلطان کو قتل کر دے گا۔'' وہ ہٹ دھرمی سے چلایا۔ خون بہاتے ہاتھ کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔

''نہیں کرے گا۔ کیونکہ وہ اپنی بیٹی شہزادی تاشہ کی شادی مرسل شاہ سے کر رہا ہے۔ کیا اپنے داماد کو قتل کرے گا وہ؟''

''تم جھوٹ بول رہے ہو کیونکہ مراد راجہ کی کوئی بیٹی تاشہ نہیں ہے۔''

''میں ہوں۔ مراد راجہ کی بڑی بیٹی، اور اللہ شاہد ہے کہ میں سچ کہہ رہی ہوں۔'' تیر سے اس کا نشانہ باندھے، وہ بلند آواز میں بولی تو مفید بے اختیار اس کو دیکھنے لگا۔

''شاید تمہیں میرے بابا نے اپنے بارے میں ہر بات نہیں بتائی۔ میں شہزادی تاشہ بنت مراد ہوں اور مجھے میرے بابا نے یہ خزانہ لینے اور تمہیں مارنے بھیجا ہے.... لیکن میرا یہ جرنیل چاہتا ہے کہ تمہاری جان بخش دی جائے۔''

ایڈم نے گردن موڑ کے اسے گھورا۔ (اپنی کہانیاں گھڑنے والی عادتوں سے آپ باز نہ آئیے گا۔)

''اب بتاؤ' مرنا چاہتے ہو یا قید ہونا چاہتے ہو۔''

''نہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''تم لوگ جھوٹ بول رہے ہو؟''

''مجھے بات کرنے دیں۔'' ایڈم ہلکے سے بولا پھر مفید کی طرف چہرہ موڑا۔ ''مفید! تم راجہ مراد کے وفادار ہو' مگر اپنے دل سے پوچھو۔ راجہ تمہیں بھول چکا ہے۔ وہ وہاں عیش سے حکمرانی کر رہا ہے اور تم ادھر تنہا ہو۔ تمہارا دل اب راجہ سے محبت نہیں کرتا۔''

مفید لب بھینچے اسے دیکھے گیا۔

''جانتے ہو تمہارا دل کس سے محبت کرتا ہے؟'' انگلی اٹھا کے اشارہ کیا۔ ''اس جان دار سے جس کے ساتھ تمہیں جنگل میں چھوڑ دیا گیا ہے۔ جب ایسے کوئی کسی کو کسی کے ساتھ جنگل میں چھوڑ دے تو پیچھے ساری دنیا اجنبی ہو جاتی ہے۔ صرف وہ اندھیروں کا دوست رہ جاتا ہے۔ یہ تمہارا دوست' تمہارا ساتھی ہے۔ تمہیں اسی سے محبت ہے اور جن سے محبت کی جاتی ہے' ان کو اپنی خواہشات کی رسی سے قید نہیں کیا جاتا۔ انہیں آزاد چھوڑ دیا جاتا ہے۔ انہیں کھل کے جینے دیا جاتا ہے اور دنیا کے جنگلوں میں اپنی مرضی سے بھٹکنے دیا جاتا ہے۔ اگر وہ لوٹ کے آجائیں تو ہم محبت میں سچے تھے۔ اگر نہ آئیں تو ہم صرف بد قسمت تھے۔ اب وقت آگیا ہے کہ تم اس معصوم جانور کو آزاد کر دو۔''

مگر مفید نفی میں سر ہلاتا ان سب کے چہرے دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے جیسے تھک کے خون بہاتا ہاتھ پہلو میں گرا دیا۔

''تم لوگ جھوٹ بول رہے ہو۔''

''مراد راجہ وہاں عیش کر رہا ہے اور تم یہاں پاگل ہو رہے ہو۔ کب تک اس جانور کو اپنے ساتھ قید میں رکھو گے؟ کم از کم اس کو تو آزاد کر دو۔ اس سے کہو کہ واپس جنگل میں چلا جائے اور تم ہمارے ساتھ ملا کہ چلو۔ پھر اپنی آنکھوں سے دیکھو کہ مراد راجہ نے تمہیں کس کس طرح دھوکا دیا ہے.... اور اگر تم نے یہ نہ کیا تو ہم سب تیر مار مار کے اس ڈریگن کی آنکھیں اور شریان پھوڑ دیں گے۔''

مفید نے ایک نظر اس ڈریگن کو دیکھا جو پنجوں کے بل کھڑا ان لوگوں پہ مسلسل غرا رہا تھا۔ پھر اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ اس نے سیٹی سی بجائی۔ انجان زبان میں چند آوازیں نکالیں۔ ڈریگن نے اس کی طرف گردن موڑی۔ مفید نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔

سپاہیوں کے تیر کمان ابھی تک ہاتھوں میں تھے۔ خود تالیہ کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ تیر تیار تھا۔ ادھر ڈریگن حملہ کرتا' ادھر وہ اس کے اندر تیر اتار دیتی۔

مگر ڈریگن نے چند لمحے کے لیے مفید کی بات سنی' پھر واپس مڑا اور درختوں کی طرف جانے لگا۔ ایڈم نے گہرا سانس لیا۔ تالیہ کی بھی تیر کمان پہ گرفت ڈھیلی ہوئی۔

''تم نے اچھا فیصلہ کیا' مفید! اب ہمیں راستہ دکھاؤ۔ خزانہ کہاں ہے اور تم یقین رکھو' واپس جا کے میں....''

"راجہ سے کہنا، مجھے معاف کر دے' میں خزانے کی حفاظت نہیں کر سکا۔" مفید نے آنسوؤں بھری آنکھوں سے کہتے ہوئے ہوئے اپنے ہاتھ میں لگا تیر ایک دم کھینچ نکالا اور پھر.... اگلے ہی لمحے.... اسے اپنے سینے میں پیوست کرلیا۔ زور سے اس کی چیخ نکلی' اور وہ زمین پہ گر کے تڑپنے لگا۔

لمحے بھر کو وہ سب ششدر رہ گئے۔ پھر ایڈم بے اختیار اس کی طرف بھاگا۔

اور صرف ایڈم نہیں تھا جو اس کی طرف بھاگا تھا۔ جنگل کی طرف جاتا کموڈو ڈریگن بھی اپنے مالک کی چیخ سن کے تیزی سے واپس لپکا تھا۔

اگلے ہی لمحے سپاہیوں کے تیر فضا میں بلند ہوئے اور ڈریگن کے جسم میں پیوست ہو گئے۔ تالیہ کا تیر اس کی آنکھ میں لگا۔ ڈریگن گھائل ہو کے زمین پہ لوٹنے لگا۔ اس کے حلق سے چیخیں نکل رہی تھیں۔

"اسے مت مارو...." ایڈم منت بھرے انداز میں چلّایا۔ "خدارا اسے مت مارو۔"

تالیہ نے چغے کی ڈوری گردن تلے سے کھینچی چغہ کندھوں سے ڈھلک کے زمین پہ جا گرا۔ پھر اس نے تیر کمان پرے پھینکا اور تلوار میان سے نکالی۔

درندہ الٹا زمین پہ گرا تڑپ رہا تھا۔ تیر زہر میں بجھے تھے اور اثر دکھا رہے تھے۔ تالیہ تلوار لیے تیزی سے اس کے سر پہ آئی۔

"بے تالیہ.... اس کو مت ماریں.... یہ ایک معصوم جانور ہے۔" ایڈم چلّاتا ہوا اس کی طرف بڑھا مگر تالیہ نے زور سے تلوار اس کی گردن پہ دے ماری۔

ڈریگن کے سر میں بڑا سا کٹ پڑ گیا۔ اس کی تڑپ دم توڑ گئی۔ آنکھوں سے زندگی کی روشنی نکل گئی۔

ایڈم ساکت کھڑا رہ گیا۔

تالیہ اسی طرح آگے بڑھی اور زمین پہ گرے مفید کو گردن سے دبوچ کے اٹھایا۔ پھر اس کے سینے سے زور سے تیر باہر کھینچ نکالا۔ خون بھل بھل گرنے لگا۔

"جنگل میں رہتے ہوئے اتنے سے زخم سے مر نہیں جاؤ گے۔" اس کا چہرہ اپنے سامنے کیے وہ غرائی۔ وہ مسلسل کراہ رہا تھا۔

"ناٹک بند کرو۔ راجہ کے چوری کے مال کی حفاظت نے تمہیں یہ دن دکھایا ہے۔ اب سیدھی طرح مجھے خزانے کا راستہ دکھاؤ تاکہ تمہاری جان بخش دوں۔ ورنہ خدا کی قسم' تمہارے جسم میں اتنے گھاؤ لگاؤں گی کہ گھنٹوں تکلیف سے تڑپتے رہو گے۔" اس کی گردن کو جھٹکا دیا تو تکلیف سے بے حال شکار باز فوراً ایک طرف اشارہ کرنے لگا۔

"ادھر.... غار میں.... ہے خزانہ۔" سپاہی فوراً مشعلیں اٹھائے اس طرف لپکے۔

تالیہ اس کی گردن دبوچے آگے بڑھنے لگی' پھر رک کے مڑی اور ایڈم کو سنجیدگی سے دیکھا۔

"سارے بھاؤ تاؤ جنگ سے پہلے ہوتے ہیں۔ لیکن جب ایک دفعہ لڑائی شروع ہو جائے تو دشمن پہ ترس کھانا کمزوری ہوتی ہے ایڈم! اور یہ اصول ہر زمانے کے لیے ہے۔" اور اسے لیے آگے بڑھ گئی۔ ایڈم بس شل سا کھڑا رہ گیا تھا۔

سپاہی اب غار کی طرف بڑھ رہے تھے اور سر کٹا کموڈو ڈریگن خون کے تالاب میں بے حس و حرکت پڑا تھا۔

☆☆☆

سلطنت محل کی مخروطی چھتوں پہ اس رات بارش برس رہی تھی۔ اپنی خواب گاہ سے ملحقہ بالکونی میں سلطان مرسل شاہ کھڑا تھا۔ کمر پہ ہاتھ باندھے' شاہی قبا میں ملبوس' وہ نیچے دور تک پھیلے تاریک سبزہ زار کو دیکھ رہا تھا۔ پانی چھت کے کناروں سے پھسلتا بالکونی کے ستونوں پہ لڑھک رہا تھا۔ موسم خاصا خوش گوار تھا۔

"آقا!"

ملکہ کی آمد کی منادی کے چند ثانیے بعد یان سوفو اس کے عقب میں آ کھڑی ہوئی تو مرسل چونکا۔ پھر

اس کی طرف گھوما۔
''ملکہ! طبیعت کیسی ہے آپ کی؟ مجھے خبر ملی تھی کہ آج قدرے بیمار تھیں آپ۔''
''میرے بابا کی جان آپ نے بچالی' ان کی نظرِ بد کا علاج ہو گیا' اس سے زیادہ اور کیا چاہیے مجھے آقا؟'' اس نے مسکرا کے تعظیم پیش کی۔ پھر سیدھی ہوئی اور ان ہی مسکراتی آنکھوں سے سلطان کو دیکھا۔
''آپ کو مجھ سے بات کرنی تھی؟''
وہ دونوں بالکونی میں آمنے سامنے کھڑے تھے' اردگرد بارش برس رہی تھی مگر وہ محفوظ تھے۔
''جی ہاں۔''
''حکم کیجیے' آقا!'' وہ اس کی آنکھوں پہ مسکراتی نظریں جمائے ہوئے تھی۔
''اب تک آپ کو اطلاع تو مل گئی ہو گی کہ میں شادی کرنے جا رہا ہوں۔ تیاری شروع ہو چکی ہے اور انتظامات کیے جا رہے ہیں۔''
یان سوفو کے چہرے پہ ایک دم ڈھیروں اداسی بکھر گئی۔ اس نے سر جھکا لیا۔ ''جی آقا! سنا تو تھا میں نے مگر یقین نہیں آیا تھا۔''
''آپ خفا ہوں گی' یقیناً۔'' مرسل شاہ پُرسکون سا پوچھ رہا تھا۔
''یہ تو شہزادیوں کی قسمت ہوتی ہے آقا۔'' ملکہ نے تھکی تھکی سی پلکیں اٹھائیں۔ ''میرے بابا کے حرم میں تین بیویاں اور کئی خواتین تھیں۔ میں نے اپنی والدہ کی تکلیف دیکھی ہے۔ یہ نہیں کہوں گی کہ مجھے فرق نہیں پڑتا۔ فرق تو پڑتا ہے۔ دل دکھتا ہے' لیکن....'' وہ زخمی سا مسکرائی۔
''اگر آقا کی خوشی اسی میں ہے تو میں اعتراض نہیں کروں گی۔ میں اس تقریب میں شامل بھی ہوں گی اور کھلے دل سے آپ کی نئی منکوحہ کو خوش آمدید کہوں گی۔''
مرسل شاہ کا چہرہ کھل اٹھا۔ وہ پورے دل سے مسکرایا۔ ''مجھے آپ سے یہی امید تھی ملکہ! جو ہونا ہے وہ ہونا ہی ہے۔ لیکن میں آپ کو اتنا یقین دلا سکتا ہوں کہ آپ ملاکہ سلطنت کی ملکہ ہیں' اور رہیں گی۔''
''سارے سلاطین دوسری شادی سے پہلے یہی کہتے ہیں' آقا۔'' وہ بجھے دل سے مسکرائی۔ پھر سر جھٹکا۔ ''خیر.... کیا کسی خاتون کا انتخاب کیا ہے آپ نے یا یہ کام بھی مجھے کرنا ہو گا؟'' (شاہی دستور کے مطابق بعض دفعہ ملکہ خود سلطان کی نئی منکوحہ یا خاتون چنتی تھی۔)
''کیا آپ کو نہیں معلوم۔'' سلطان حیران ہوا۔ ''میں نے شہزادی تاشہ کا انتخاب کیا ہے۔ مگر آپ کو کیسے معلوم ہو گا۔ یہ نام میرے اور مراد راجہ کے درمیان ہی تھا اب تک۔''
''شہزادی تاشہ؟'' ملکہ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔
بالکونی کے باہر زور کی بجلی کڑکی۔ پل بھر کو سارا محل روشن ہو گیا۔ جگہ جگہ زمین پہ پانی کھڑا نظر آتا تھا۔ اگلے ہی پل اندھیرا چھا گیا۔
''جی۔ مراد راجہ کی دختر۔''
''مگر....'' ملکہ بے اختیار الجھن سے بولی۔ ''شاہی دستور کے مطابق.... آپ کے نکاح میں آنے والی خاتون کا چند شرائط پہ اترنا ضروری ہے آقا!''
''تو شہزادی تاشہ کسی لحاظ سے کم نہیں ہیں۔ وہ ہمارے خاندان سے تعلق رکھتی ہیں' ان کی رگوں میں ہمارا ہی خون ہے۔ پھر وہ خوبصورت ہیں اور شاہی آداب جانتی ہیں۔'' مرسل شاہ نے سینہ اکڑاتے ہوئے فخر سے کہا تھا۔
ملکہ چند لمحے سادگی سے اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔
''تو پھر.... طلاق دلوائیں گے اسے یا اس کے شوہر کی گردن ماری جائے گی؟''
بادلوں کے گرجنے کی زوردار آواز سنائی دی۔ ایسی دہشت' ایسی گرج کہ محل کے ہر ذی نفس کی روح تک کانپ گئی۔
مرسل شاہ بھونچکا کھڑا رہ گیا۔

''کیا کہہ رہی ہیں آپ ملکہ؟'' اس کی رنگت سرخ پڑنے لگی۔ ''دماغ درست ہے آپ کا؟''

''میرا دماغ تو درست ہے آقا لیکن آپ کی معلومات درست نہیں۔ شہزادی تاشہ نے خود مجھے اعتماد میں لیتے ہوئے بتایا تھا کہ چین سے جو آدمی اس کے ساتھ آیا ہے' وہ اس سے شادی کر چکی ہیں۔ کیا آپ کو مراد راجہ نے نہیں بتایا؟ حیرت ہے۔ وہ اپنی شادی شدہ بیٹی کو کنواری لڑکی کے طور پہ کیسے پیش کر سکتا ہے۔ چچ چچ یہ تو سنگین جرم ہے۔ گناہ کبیرہ ہے۔'' وہ خود حیران تھی۔

''آپ کو....'' مرسل کی آواز بلند اور آنکھیں سرخ ہوئیں۔ ''غلط فہمی ہوئی ہوگی۔ شہزادی تاشہ غیر شادی شدہ ہیں۔'' اس کا تنفس تیز ہو گیا تھا۔

''آپ خود شہزادی سے اللہ تعالیٰ کی پاک کتاب پہ ہاتھ رکھوا کے پوچھ لیں۔ اگر اس نے اس شادی سے انکار کیا تو میری گردن مار دیجیے گا مگر آقا... وہ لڑکی شادی شدہ ہے اور اس کے شوہر کو مراد راجہ نے اپنے محل میں پناہ دے رکھی ہے۔ آپ کو جس سے شادی کرنی ہے' کیجیے آقا' لیکن بزرگوں کے رسم و رواج کو ٹھوکر مار کے نہیں۔ یہ آپ کی خاندانی غیرت اور حمیّت کا سوال ہے۔'' وہ اس کی آنکھوں سے نظریں ہٹائے بغیر کہہ رہی تھی۔ مرسل کے چہرے پہ ایک رنگ آرہا تھا' ایک جا رہا تھا۔

''یہ جھوٹ ہے۔ میں نہیں مانتا۔'' وہ ایک دم ملکہ کے قریب سے گزرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ ملکہ یان سوفو نے آرام سے اسے جاتے ہوئے دیکھا اور زیرِ لب بڑبڑائی۔ ''چچ چچ'' پھر افسوس سے سر جھٹکا۔

بالکونی کی مخروطی چھت کے کنارے ٹپکے جا رہے تھے۔ بارش میں تیزی آگئی تھی۔

☆☆☆

جس غار کی حفاظت کموڈو ڈریگن کر رہا تھا' اس کا راستہ تنگ اور تاریک تھا' لیکن زخمی مفید کراہتا ہوا' تالیہ کی راہنمائی کرتا' انہیں اندر لے آیا۔

غار کے اندر پتھروں کا ڈھیر لگا تھا۔ سپاہیوں نے فوراً پتھر ہٹائے تو وہاں زمین میں ایک ڈھکن بنا تھا۔ ایک سپاہی نے ڈھکن اٹھایا' دوسرے نے اندر روشنی کی۔ وہاں سیڑھیاں نیچے جاتی تھیں۔ محض پندرہ بیس سیڑھیاں جن کو اتر کے ایک بڑا سا کمرہ آجاتا تھا۔

اس نے مفید کی گردن چھوڑ دی۔ دو سپاہی اس کی پٹی وغیرہ کرنے اسے باہر لے گئے۔ دیگر سپاہی نیچے اترے اور کمرے کی دیواروں پہ لگی مشعلیں روشن کیں۔ پل بھر میں وہ کمرہ خوب روشن ہو گیا۔

تالیہ مراد کے کندھے پہ تیروں سے بھرا ترکش تھا اور ہاتھ میں پکڑی تلوار سے ڈریگن کا خون ٹپک رہا تھا۔ وہ مٹی کی سیڑھیاں قدم قدم نیچے اترنے لگی۔ لبوں پہ مسکراہٹ تھی۔ اداسی سے بھری مسکراہٹ۔

ایک زینہ.....دوسرا زینہ.....جیسے جیسے وہ اترتی گئی' کمرہ سامنے آنے لگا۔ اس میں قطار در قطار لکڑی کے صندوق رکھے تھے۔ سپاہیوں نے فوراً صندوقوں کے منہ کھول دیے تھے۔ اندر سونے کے موٹے موٹے سکے چمکتے دکھائی دے رہے تھے۔

اس نے ایک عرصہ یہ منظر دیکھنے کی خواہش کی تھی۔

کوئی رازوں سے بھرا کمرہ جس کا دروازہ وہ کھولے گی تو اندر سونے کے ڈھیر لگے ہوں گے۔

آج وہ پندرہویں صدی کے قدیم ملاکہ کے اس جزیرے کے زینے اُتر رہی تھی اور سامنے موجود کمرہ ڈھیروں خزانے سے بھرا۔ دکھائی دیتا تھا۔

بالآخر اسے خزانہ مل گیا تھا۔

ایڈم اس کے عقب میں زینے اُتر رہا تھا۔ وہ خاموش تھا مگر سنبھل چکا تھا۔

تالیہ پہلے صندوق تک آئی اور اندر ہاتھ ڈالا۔ سکوں کی کھنک.....سونے کی چمک.....اس کے جذبات مچلنے لگے۔

وہ دوسرے صندوق تک آئی.....ہاتھ اس کے سکوں کے اوپر سے گزارا۔ سونے کا لمس.....وہ ٹھنڈک...وہ چمک جو آنکھوں کو خیرہ کر دیتی تھی۔

"تم لوگ اوپر جاؤ۔" ایڈم نے سپاہیوں کو اشارہ کیا تو وہ سر تسلیم خم کرتے اوپر کی طرف چلے گئے۔

دیواروں پہ لگی مشعلوں کے شعلے جل رہے تھے اور زرد روشنی میں وہ دونوں اس دولت سے بھرے کمرے میں تنہا کھڑے نظر آرہے تھے۔

"یااللہ.... اتنا سونا.... اتنی دولت۔" وہ ایک صندوق پہ جھکی۔ جس میں طرح طرح کے زیورات کا ڈھیر لگا تھا۔ اس نے ہاتھ سے چند زیور اٹھائے اور ان کو واپس اندر گرادیا جیسے ان سے کھیل رہی ہو۔

"یہ آپ کے نہیں ہیں' چے تالیہ۔" ایڈم کھنکھارتا ہوا آگے آیا اور صندوق کا ڈھکن بند کیا۔ وہ سنے بغیر اگلے صندوق تک آئی اور اس میں رکھی سونے کی ننھی اینٹ اٹھائی۔

"خالص سونا۔ اس کی چمک دیکھو۔ اس کو محسوس تو کرو ایڈم۔" اس کے چہرے پہ بچوں جیسی خوشی تھی۔

"یہ ملاکہ کے غریب لوگوں کی امانت ہے' چے تالیہ۔" ایڈم نے جلدی سے اینٹ اٹھا کے واپس اندر ڈالی اور دھڑام سے اس صندوق کا بھی ڈھکن گرایا۔ وہ بدقت ضبط کر رہا تھا۔

مگر وہ مست مگن سی ایک کے بعد ایک صندوق کی طرف جارہی تھی۔ سونے میں ہاتھ ڈالتی اور کچھ نہ کچھ نکال لیتی۔ ایڈم بار بار اس کے پیچھے لپکتا اور ہر چیز اس سے واپس لے کر اندر ڈالتا۔

"یہ امانت ہے' چے تالیہ۔ ہم اس کو نہیں چھو سکتے۔"

"سوچو.... اگر یہ ہمارا ہو جائے تو...."

"چے تالیہ!" وہ ناراض ہوا تو اس نے گہری سانس لی اور نروٹھے پن سے اسے دیکھا۔

"جانتی ہوں، جانتی ہوں۔ مگر تھوڑی دیر کے لیے خوش تو ہو لینے دو۔"

"آپ نے خوشی خوشی میں اس خزانے میں نقب لگانا شروع کر دینا ہے۔"

"بے فکر رہو۔ اب میں اپنی اصلاح کر چکی ہوں۔ اب میں چوری نہیں کرتی۔" وہ مڑ کے جانے لگی۔

"جی، اسی لیے آپ نے ہر صندوق سے چند اشرفیاں اور اس والے سے تھوڑا سا زیور کھسکا کے اپنی جیب میں ڈالا ہے۔" وہ اس کے سامنے آ کھڑا ہوا اور کڑے تیوروں سے اسے دیکھتے ہتھیلی پھیلائی۔ تالیہ نے خفگی سے پلکیں اٹھائیں اور اسے دیکھا۔

"اتنے...... سارے خزانے میں سے دو تین چیزیں نکال لینے سے کس کا نقصان ہوگا؟"

"ہمارے ایمان کا نقصان ہوگا۔ اور وہ سب سے بڑا نقصان ہوتا ہے۔ اب واپس کریں سب۔"

تالیہ نے (ہونہہ) کر کے سر جھٹکا اور جیبیں الٹ دیں۔ زیور' انگوٹھی' سکے نکال کے اس کی ہتھیلی پہ رکھے۔

"اور وہ جو آپ نے کان کے پیچھے بال اڑستے ہوئے سکہ اپنے جوڑے میں چھپایا تھا' وہ بھی دیں۔"

تالیہ نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے بالوں میں ہاتھ ڈالا اور سکہ اس کی ہتھیلی پہ پٹخا۔ ایڈم کے لبوں پہ فاتحانہ مسکراہٹ بکھر گئی۔

"میدان جنگ میں نہ دشمن پہ ترس کھاتے ہیں نہ دوست کی طرف سے آنکھیں بند کرتے ہیں۔" سمجھداری سے اسے بتایا۔

تالیہ اسے نظر انداز کر کے آگے بڑھ گئی۔

کمرے کے کونے میں ایک ڈیوڑھی سی بنی تھی جس میں مختلف خانے تھے۔ ان میں عجیب وغریب چیزیں رکھی تھیں۔ کڑے' انگوٹھیاں۔ تالے۔ ایک سونے کی گڑیا۔ اور سب سے اوپر ایک بوتل تھی۔ وہ اس بوتل کو پہچانتی تھی۔

اس نے بوتل اٹھائی اور اسے اوپر کر کے غور سے دیکھا۔

کانچ کی بنی بوتل خالی تھی۔ صرف پیندے میں چند قطرے جتنا باقی ماندہ مائع موجود تھا۔

"ایسی ہی بوتل میں ایک مشروب کے اندر

چابی رکھی ہوتی تھی۔'' وہ بڑبڑائی۔
''مگر اب یہ خالی ہے۔''
''خالی ہے نہیں۔اس کو خالی کیا گیا ہے۔'' اس نے سنجیدگی سے کہتے بوتل واپس رکھی۔ ''باپا کے ملازم یقیناً چابی کو کہیں اور لے گئے ہیں۔شاید واپس باپا کے پاس۔'' وہ اس کی طرف گھومی تو قدرے فکرمند لگتی تھی۔
''اب ہم چابی کیسے ڈھونڈیں گے؟''
تالیہ نے ایک نظر اطراف میں دوڑائی۔ ''ابھی چابی کی فکر نہیں کرنی۔ وان فاتح کا کہنا تھا کہ ہمیں پلان کے مطابق چلنا ہے۔ اس لیے بہتر ہے کہ ہم پلان کے مطابق چلیں۔''
''ٹھیک ہے۔'' ایڈم نے گہری سانس لی اور ایک عزم سے بولا۔ ''میں ان صندوقوں کو باہر نکلواتا ہوں۔پھر میں واپس چلا جاؤں گا اور.....''
''نہیں ایڈم!'' وہ بولی تو آنکھیں ایڈم کی آنکھوں پہ جمی تھیں۔ ''یہ خزانہ تم نے ڈھونڈا ہے۔ یہ جزیرہ تم نے ڈھونڈا ہے۔تمہارے الفاظ نے ڈریگن کے مالک کو مجبور کیا کہ وہ پسپائی اختیار کرے۔اس خزانے کا راز تمہارا ہے۔اس راز کو افشا کرنا بھی تمہارا حق ہے۔''
''مگر.....'' ایڈم لمحے بھر کو گنگ ہو گیا۔ ''پلان کے مطابق مجھے واپس جانا تھا اور آپ کو بعد میں یہ خزانہ لے کر واپس ملاکہ آنا تھا۔آپ شہزادی ہیں اور میں تو بس.....(نگاہیں جھک گئیں)...ایک ادنیٰ غلام ہوں۔''
''اور ساتھ میں ایک بھگوڑے فوجی بھی ہو۔مگر خیر.....'' شہزادی نے بڑی نخوت سے گال پہ آئی لٹ پیچھے کی۔ ''تم بھی کیا یاد کرو گے۔کیا اعزاز بخشنے جا رہی ہوں تمہیں۔''
''کیا واقعی؟'' اس نے حیران سی نظریں اٹھائیں۔ ''آپ مجھے اس خزانے کا امین بنا رہی ہیں؟''
''میں جانتی ہوں۔پلان کے مطابق مجھے یہیں رہ کے اگلے مرحلے کا انتظار کرنا تھا مگر میں نے واپس جانے کا فیصلہ کیا ہے۔ مجھے ملکہ کی طرف سے خطرہ ہے۔وہ فاتح کو مشکل میں نہ ڈال دیں۔''
''مگر وان فاتح کو تو کبھی کسی کی ضرورت نہیں رہی۔''
''یہ ان کا خیال ہے اور ضروری نہیں کہ ان کا ہر خیال درست ہو۔'' پھر تالیہ نے گردن گھمائی اور خزانے سے بھرے کمرے کو دیکھا۔
''تمہاری ماں نے کہا تھا کہ ایک دن آئے گا جب ایڈم بن محمد کو اللہ تعالیٰ زمین میں مدفن خزانوں کے راز سمجھا دے گا اور اس دن ایڈم دنیا کے بڑے بڑے حکمرانوں اور بادشاہوں سے بھی زیادہ طاقت ور ہو گا اور میں نے کہا تھا۔ آمین۔شاید یہ وہی دن ہے ایڈم! تم اس خزانے کے مالک ہو۔اب یہ تمہارا امتحان ہے کہ تم حق کے لیے کھڑے ہوتے ہو یا نہیں۔رہی میں' تو میرا خزانہ سن باؤ کے گھر چھپا ہے اور میرا مقصود صرف وہ چابی ہے۔اس لیے مجھے جانا ہو گا۔''
تالیہ مراد کی آواز میں تحکم کی ہلکی سی رمق موجود تھی۔ایڈم بن محمد نے سر کو تسلیم خم کر دیا۔
شہزادی حکم سنا کے اب سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔اس کے کندھے کی پشت پہ بندھے ترکش میں اب بھی کافی تیر باقی تھے۔ بچے تالیہ کے منصوبوں کی طرح۔
وہ خزانے سے بھرے کمرے میں تنہا کھڑا سوچ رہا تھا۔
''اگر یہ وہ دن ہے.....جب مجھے زمین کے خزانوں کا راز معلوم ہو جانا تھا.....تو مجھے دنیا کے سارے بادشاہوں سے زیادہ طاقت ور ہونا تھا۔پھر اتنا طاقت ور کیوں نہیں محسوس کر رہا میں خود کو؟''
وہ سوچ رہا تھا۔حیران۔پریشان۔
سپاہی اب نیچے اتر رہے تھے۔کچھ کو تالیہ کے ساتھ واپس جانا تھا۔کچھ کو ایڈم کے ساتھ یہیں رہ کے اگلے مرحلے کا انتظار کرنا تھا۔

☆☆☆

مدھم موم بتیاں مراد راجہ کی خواب گاہ کو نیم روشن کیے ہوئے تھیں۔ وہ کمرے کے ایک کونے میں بیٹھا تھا۔ چوکڑی مار رکھی تھی۔ اور ارد گرد تیرہ موم بتیاں قطار میں جلا رکھی تھیں۔ سامنے ایک بھری ہوئی بوتل رکھی تھی جس کے پیندے میں سنہری سکہ اور زنجیر تیر رہی تھی۔ وہ آنکھیں بند کیے' دونوں ہاتھ بوتل سے چند انچ اوپر پھیلائے زیرِ لب کچھ پڑھ رہا تھا جب دروازے پہ دستک ہوئی۔

مراد نے توجہ نہ دی۔ وہ اسی طرح آنکھیں موندے منتر پڑھنے میں مصروف رہا۔

دفعتاً دوبارہ دستک ہوئی۔ اس نے آنکھیں کھولیں۔ وہ سرخ پڑ رہی تھیں۔

دستک تواتر سے ہونے لگی۔

مراد نے برہمی سے دروازے کو دیکھا۔ پھر پھونک مار کے ساری موم بتیاں بجھا دیں۔ کمرے میں اندھیرا چھا گیا۔ وہ اندھیرے میں اٹھا۔ کھڑکی تک گیا۔ پیالے سے پانی لے کر چہرے پہ ڈالا' پھر دیا سلائی سلگائی اور قندیل روشن کی۔

اندھیرا چھٹا اور اب کی دفعہ کمرہ عام روشنی سے روشن ہوا۔ وہ موم بتیوں کی نحوست بھری روشنی عنقا ہو چکی تھی۔

اس کے گیلے چہرے کے تاثرات نارمل ہو چکے تھے اور آنکھوں کی سرخی کم تھی۔ سادہ سفید کرتے پاجامے میں ملبوس مراد نے سرخ پٹی ماتھے پہ باندھی اور دروازے کی طرف بڑھا جو مسلسل بج رہا تھا۔

''کون سا عذاب آ گیا تھا جو مجھے اس وقت تنگ کیا ہے؟'' پٹ کھولتے ہی وہ دھاڑا۔ ''کیا جانتے نہیں ہو، یہ بنداہارا کی عبادت کا وقت ہوتا ہے۔''

''راجہ!'' سپاہی نے دونوں ہاتھ باندھے عرض کی۔ ''سلطان کا پیغام آیا ہے۔ آپ کو فوری طور پہ بلا بھیجا ہے۔''

''اس وقت؟'' مراد کے ماتھے پہ بل پڑے۔

''سلطان نے .... کہا ہے کہ ....'' سپاہی نے تھوک نگلا۔ ''اگر مراد اپنے پیروں پہ چل کے نہ آئے تو بیڑیوں میں لے آؤ۔''

ملاکہ سلطنت کے عظیم بنداہارا مراد راجہ کے ماتھے کی ساری شکنیں غائب ہو گئیں۔

''ہوا کیا ہے؟'' اسے پریشانی ہوئی۔

''معلوم نہیں' راجہ۔ مگر آقا سخت برہم لگ رہے ہیں۔''

''چلو۔'' وہ فوراً مڑا' اپنی قبا اٹھا کے کندھوں پہ ڈالی' پیروں میں جوتی گھسیٹی' تلوار اٹھانے لگا' پھر واپس رکھ دی۔ اس کے کسی انداز سے جارحیت کی بو نہیں آنی چاہیے۔

باہر نکلنے سے قبل وہ بوتل کو خاص جگہ پہ چھپانا نہیں بھولا تھا۔

☆☆☆

تین چاند والے جزیرے کی وہ چھوٹی پہاڑی چاندنی میں دمک رہی تھی۔ اس کی چوٹی پہ بڑا سا شیشہ تراش کے لگایا گیا تھا یا شاید وہ نمک تھا جو اتنا شفاف تھا کہ چاند کا عکس اس میں جھلملاتا تھا۔

دوسرا چاند سمندر پہ تیر رہا تھا اور تیسرا چاند آسمان پہ بادلوں کے اوپر ٹیک لگائے نیم دراز نیچے جزیرے کے ساحل کو دیکھ رہا تھا۔

دور افق پہ مدھم سی روشنی دکھائی دیتی تھی۔ سیاہ آسمان جامنی ہو رہا تھا اور ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ صبح ہونے میں کم وقت رہ گیا تھا۔ ایسے میں ساحل پہ کھڑی کشتی کو سپاہی سفر کے لیے تیار کر رہے تھے۔ چند سپاہی پہاڑی کے دامن میں غار کی طرف آتے جاتے دکھائی دیتے تھے۔

تالیہ اور ایڈم کشتی کے ساتھ کھڑے تھے۔ آمنے سامنے۔ تالیہ نے اپنا چغہ پہن رکھا تھا' تیز ہوا سے اس کے بال بار بار چہرے پہ آتے جن کو وہ کانوں کے پیچھے اڑستی۔ ایڈم اداس مسکراہٹ سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''احتیاط سے جائیے گا۔ سمندری سفر خطرے

سے خالی نہیں ہوتا۔"

"ہمیشہ مایوسی کی باتیں کرتے ہو ایڈم۔" وہ بے فکری سے مسکرائی۔ "ہم پلان پہ چل رہے ہیں تو ڈر کیسا؟ بس کل تک میں واپس ملاکہ پہنچ جاؤں گی۔ تم تب آنا جب دوسرا مرحلہ پورا ہو جائے۔" اس نے ذومعنی انداز میں یاد دلایا۔

ایڈم نے سر اثبات میں ہلایا۔ پھر آنکھوں کی پتلیاں سکیڑ کے غور سے اسے دیکھا۔

"کیا واقعی آپ یہاں سے کچھ چرا کے نہیں لے جا رہی ہیں؟ آپ چوری سے جا سکتی ہیں۔ ہیرا پھیری سے نہیں۔"

"ارے وہ سب تو میں نے مذاق میں اٹھایا تھا۔" وہ کھلکھلائی۔ "ابھی اتنی ٹرکس نہیں سکھائیں تمہیں کہ میرے ہاتھ کی صفائی پکڑ سکو۔"

"میری نظر بہت اچھی ہے تالیہ! یاد کریں، مسز عصرہ کی گیلری میں پہچان گیا تھا کہ آپ تنکو کا مل کی ملازمہ ہیں۔"

اور وہ دونوں ہنس پڑے۔ پھر تالیہ نے گردن گھمائی۔ وہ دونوں ساحل پہ کھڑے تھے اور سامنے چاندنی سے چمکتے پانی کا سمندر بہہ رہا تھا۔ خاموش ساکن سمندر۔ پندرہویں صدی کا سمندر۔

"وقت کے اس پار کیا ہو رہا ہوگا ایڈم؟" نیلے پانی کو دیکھتے ہوئے اس کی آواز میں اداسی گھل گئی۔

"میں تو صرف یہ سوچ رہا ہوں کہ پانی کے اس پار کیا ہو رہا ہوگا۔ اگر وان فاتح کا راز کھل گیا اور راجہ نے ان کو گرفتار کر لیا یا ان کی جان لینے کی کوشش کی تو کیا ہوگا۔"

"نہیں۔ بابا ان کو یوں ایک دم مار نہیں دیں گے۔"

"یہی تو میں سوچ رہا ہوں کہ اگر راجہ نے ان کو مارا نہیں بلکہ چناؤ کا اختیار دے دیا تو وہ کس کو چنیں گے۔"

تالیہ چونکی۔ سمندر کی لہریں پل بھر کو تھم گئیں۔ سارا جزیرہ دم سادھے سننے لگا۔

"کیا مطلب؟"

"یاد رکھیے گا۔ اگر ان کو چناؤ کا موقع ملا تو وہ آپ کو یا مجھے کبھی نہیں چنیں گے۔"

تالیہ کی رنگت گلابی پڑنے لگی۔ ماتھے پہ بل در آئے۔ "تم میں اور مجھ میں فرق ہے ایڈم۔"

"صرف اتنا کہ آپ سے انہوں نے نکاح کیا ہے' مگر یاد رکھیے گا۔ وہ ہمیشہ ہمارے ہیرو رہیں گے اور ہم ان کے فینز۔ ادنیٰ کارکن۔ بس!"

"تمہیں کیوں لگتا ہے بابا ان کو چناؤ کا اختیار دیں گے اور کس قسم کے چناؤ کی بات کر رہے ہو تم؟" وہ الجھی ہوئی تھی۔ اسے یہ باتیں ناگوار گزر رہی تھیں۔

"یہ مجھے نہیں معلوم۔ مگر اتنے مہینے ایک محل میں رہا ہوں میں بے تالیہ۔ اتنا تو بتا سکتا ہوں کہ یہ حکمران بڑے فیصلوں میں ہم ادنیٰ کارکنوں کو شریک نہیں کرتے۔ اس لیے..... اگر آپ کو چناؤ کا موقع ملے تو میرے جزیرے سے آنے کا انتظار مت کیجیے گا۔ خود اس دروازے کو پار کر لیجیے گا۔"

"نہیں ایڈم!" وہ بولی تو آنکھوں میں قدرے غصہ تھا۔ "ہم ایک ساتھ آئے تھے اور ایک ساتھ ہی جائیں گے۔ اگر ہم میں سے کوئی مر گیا تو اس کی لاش ساتھ جائے گی۔ تم فی الحال اس خزانے کو سنبھالو۔ میں ملاکہ میں تمہاری منتظر رہوں گی۔"

اس کا انداز قطعی اور حتمی تھا۔ ایڈم نے پھر سے سر کو خم دیا۔

"الوداع شہزادی!"

تالیہ نے چغے کی ٹوپی سر پہ برابر کی اور کشتی کی طرف بڑھ گئی۔ اس پہ بیٹھتے ہی اس نے پیچھے مڑ کے دیکھا۔

ساحل کنارے چغہ پوش آدم بن محمد کھڑا اسے جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ چند سپاہی اس کے آس پاس کام کرتے دکھائی دے رہے تھے۔ ملاح سپاہی نے بادبان کھول دیا اور کشتی کو پانی میں دھکیل دیا۔ پھر چپو چلانے لگا۔

وہ عرشے پہ ایک لکڑی کی چوکی پہ بیٹھ گئی اور رخ پانی کی طرف موڑ دیا۔ کن انکھیوں سے وہ ساحل کنارے کھڑے ایڈم کو دیکھ سکتی تھی۔

جب کشتی سمندر میں دور نکل آئی اور آسمان سے فجر طلوع ہونے لگی تو تالیہ نے چغے کے اندر ہاتھ ڈال کے نکالا تو اس میں ایک چمکتی ہوئی شے تھی۔

یہ وہ چیز تھی جو اس نے غار میں رکھی عجیب و غریب چیزوں میں سے اٹھائی تھی۔ یہ سونے کی ہیئر پن تھی جس کو جوڑے میں لگایا جاتا تھا۔ اس کے دہانے پہ ہرن کا چہرہ بنا تھا' آنکھوں میں ہیرے لگے تھے۔ اور پیچھے جا کے وہ لمبی نوکیلی ہو جاتی تھی۔ تالیہ نے اسے اٹھا کے روشنی میں دیکھا اور مسکرائی۔

''ایڈم بن محمد...... یہ ملاکہ کے لوگوں کی نہیں میرے پاپا کی شے ہے۔ جانے یہ کس لیے استعمال ہوتی ہے مگر نئے دور میں جا کے یہ اچھی خاصی قیمت پہ بک جائے گی۔ اس میں قیمتی ہیرے اور خالص سونا استعمال کیا گیا ہے۔ اس کو میں اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔'' وہ خوش اور مطمئن نظر آرہی تھی۔ اس کی کشتی سمندر پہ تیرتی جزیرے سے دور ہوتی جا رہی تھی۔

☆☆☆

مراد راجہ جب سلطنت محل پہنچا تو صبح ہونے میں کافی وقت تھا۔ سپاہی اسے فوراً اندر لے گئے۔ مراد نے چہرہ بے تاثر رکھا مگر حقیقتاً وہ پریشان تھا۔

اسے ایک ملاقاتی کمرے میں بٹھا کے سپاہی چلے گئے۔ وہ کافی دیر انتظار کرتا رہا۔ بے چینی سے ٹہلتا رہا۔ ایک دو بار دربانوں کو آواز دی تو انہوں نے بتایا کہ آقا غسل فرما رہے ہیں۔ مراد ضبط کے گھونٹ پی کے رہ گیا۔

اسے مرسل نے پہلی دفعہ اتنا انتظار کروایا تھا۔

صبح کی پہلی کرن باہر آسمان پہ دکھائی دی تو مرسل شاہ کمرے میں داخل ہوا۔ وہ کہیں سے بھی حالت نیند میں نہیں لگتا تھا نہ بال گیلے تھے۔ شاید وہ اتنی دیر کچھ سوچنے میں مصروف رہا تھا۔ پیشانی سلوٹ زدہ تھی۔ مراد نے غور سے اسے اندر آتے اور مسہری پہ براجمان ہوتے دیکھا۔ ایک ہاتھ گھٹنے پہ جمائے' وہ سیدھا بیٹھا قدرے خفگی سے مراد کو دیکھ کے بولا۔

''آگئے تم؟'' ساتھ ہی اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

مراد آہستہ سے سامنے بیٹھا۔

''کافی دیر ہو چکی' آقا۔ خیریت تھی؟ کہیں بغاوت کا اندیشہ تو نہیں ہوا؟ یا دشمن کا حملہ؟'' وہ بظاہر فکرمندی سے بولا مگر آواز میں معمولی سا گلہ بھی تھا۔

''مراد راجہ!'' مرسل نے بھنویں اکٹھی کر کے سنجیدگی سے اسے دیکھا۔ ''دشمن کے حملے سے زیادہ تکلیف دہ بات میرے لیے یہ ہوگی کہ میرا بندا ہارا مجھ سے جھوٹ بولے۔''

مراد کی گردن میں گلٹی سی ابھر کے معدوم ہوئی۔ تاثرات میں حیرانی گھل گئی۔

''میری جان لے لیجیے آقا' مگر مجھے بتائیے تو سہی کہ ہوا کیا ہے۔'' پھر اسے خیال گزرا۔ ''کیا چین سے قرضہ لینے کے فیصلے پہ میری رائے......''

''تم نے اپنی بیٹی کو کنواری کیوں کہا جب کہ مجھے اطلاع ملی ہے کہ وہ شادی شدہ ہے۔'' وہ اکھڑے اکھڑے مگر مضطرب لہجے میں بولا تو مراد نے تعجب سے دونوں ابرو اچکائے۔

''میری بیٹی....شادی شدہ؟'' پھر وہ ہلکا سا ہنس دیا۔ ''ایسا مذاق کس نے کیا آپ سے آقا؟'' وہ حیران تھا مگر جیسے محظوظ بھی ہوا تھا۔

مرسل کے تاثرات قدرے بدلے۔ چہرے کے تناؤ میں کمی آئی۔ وہ ذرا آگے کو ہوا۔

''تو یہ بات غلط ہے کہ ملک چین میں تمہاری بیٹی کی پہلے شادی ہو چکی ہے اور اس بات کو چھپا کے تم مجھ سے جھوٹ بول رہے تھے۔'' وہ بے چین لگتا تھا۔

کھڑکی کے پار جامنی آسمان سفید پڑ رہا تھا۔ روشنی اندر آئی تو کمرہ منور ہونے لگا اور قندیلوں کی روشنی ماند پڑنے لگی۔

''میں سمجھ گیا آقا'' مراد نے گہری سانس لے

کر سر ہلایا۔ ''آپ کو ایسی بات کسی چینن سے تعلق رکھنے والے نے کہی ہو گی۔ ظاہر ہے اس شادی پہ سب سے زیادہ تکلیف چینیوں کو ہی ہو گی۔ کیا آپ نے سمجھ لیا تھا کہ یہ شادی آپ آرام سے کرلیں گے اور گستاخی معاف' ملکہ کوئی ردعمل نہیں دیں گی؟ آپ تو برے سے برے حالات کے لیے بھی تیار تھے آقا! پھر اب ان فضول باتوں پہ کیوں دھیان دے رہے ہیں۔'' کمرہ مزید منور ہوا تو مرسل کے چہرے پہ آئے شک کے بادل بھی چھٹنے لگے۔

''یعنی..... شہزادی تاشہ کی کوئی شادی نہیں ہوئی اور وہ..... وہ میرے نکاح میں آسکتی ہیں۔''

مرسل کے چہرے پہ خوشی اور اندیشے ایک ساتھ موجود تھے۔ مراد رسان سے مسکرایا اور آگے کو جھکا۔

''آقا! یہ صرف ایک سازش ہے' مجھے آپ سے دور کرنے اور اس شادی کو رکوانے کے لیے۔ میری بیٹی غیر شادی شدہ ہے اور وہ آپ کی ہی ملکہ بنے گی۔ آپ اس کو بلوا کے بھی پوچھ سکتے ہیں۔ میں خود قرآن پہ ہاتھ رکھ کے حلف لینے کو تیار ہوں۔ آپ ان واہموں سے نکل آئیں۔''

''اوہ۔'' مرسل شاہ نے گہری سانس لی۔ کھڑکی سے آتی روشنی نے کمرے کے سارے اندھیرے دور کر دیے تھے۔ فضا جیسے صاف ہو گئی تھی۔

''تو یہ صرف ایک سازش تھی؟ میں خواہ مخواہ اتنا پریشان رہا۔'' اس نے بے اختیار پیشانی مسلی جیسے بہت سے تناؤ کو خارج کیا۔

''یہ تو ابھی شروعات ہیں' آقا! آگے بہت کچھ ہوگا۔ آپ کو خود کو مضبوط بنانا ہوگا۔ ہمیں مل کے ان سب سازشوں کا مقابلہ کرنا ہے۔'' پھر مراد نے کھڑکی سے باہر نگاہ دوڑائی۔ ''مجھے فوج کی مشقوں کی نگرانی کے لیے جانا ہے۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو.....''

''ہاں ہاں۔ تم جاؤ۔'' مرسل نے ہاتھ جھلایا۔ وہ مطمئن اور پرسکون نظر آنے لگا تھا۔ مراد ادب سے سر کو خم دے کے اٹھا اور الٹے قدموں دروازے کی طرف بڑھا۔ کمرہ اتنا روشن ہو چکا تھا کہ دروازے کے ساتھ جلتی قندیل کا شعلہ بے معنی سا لگتا تھا۔ اس نے لوہے کا ڈھکن اٹھایا تاکہ قندیل کے اوپر رکھ کے شعلہ بجھا دے۔

''اصل میں ملکہ نے بھی عجیب غلط سلط باتیں میرے ذہن میں ڈال دیں۔'' مرسل شاہ پیچھے بڑبڑا رہا تھا۔ ''وہ بولیں کہ تاشہ کی شادی اس مرد سے ہو گئی تھی جو اس کے ساتھ چینن سے یہاں آیا ہے' اور تو اور' مراد راجہ نے اس کو اپنے محل میں پناہ دے رکھی ہے۔''

مراد نے زوردار آواز سے لوہے کا ڈھکن شعلے کے اوپر رکھا۔

ہوا کا رستہ رک گیا۔

شعلہ بجھ گیا۔

مگر اس کا ہاتھ ڈھکن پہ ساکت ہو گیا۔

مرسل کی طرف اس کی پشت تھی' اس لیے مرسل اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکتا تھا جو ایک دم زلزلوں کی زد میں آگیا تھا۔

سیاہ پڑتا ساکت چہرہ۔

اس نے ڈھکن سے ہاتھ ہٹایا تو وہ بہت وزنی محسوس ہوتا تھا۔ بدقت مراد راجہ نے قدم آگے بڑھائے اور باہر نکل گیا۔

راہداری میں تیز تیز قدم اٹھاتا بندا ہارا اس چہرے کے ساتھ نہیں جا رہا تھا جس کے ساتھ وہ آیا تھا۔

☆☆☆

تین چاند والے جزیرے پہ بھی صبح طلوع ہو چکی تھی۔ سمندر کا پانی لہروں کی صورت بار بار ساحل سے ٹکراتا اور واپس پلٹ جاتا۔

پہاڑی کے دامن میں درختوں تلے صندوق قطار در قطار رکھے تھے اور ان کے اوپر لکڑیوں کے چھپر بنائے گئے تھے تاکہ وہ بارش سے محفوظ رہیں۔ سپاہی اب ایک طرف آگ جلا کے ناشتے کا انتظام کرنے میں مصروف تھے۔ جنگل کے اندر کوئی نہیں گیا تھا کیونکہ یقیناً وہاں بہت سے خونی کموڈو ڈریگن موجود تھے جو ہر سیاح کو کھا جاتے تھے اور لوگ اس

جزیرے سے واپس نہیں لوٹتے تھے۔

پھر ایک سپاہی نے جنگل میں جانے کی ہمت کی اور تھوڑی دیر بعد چند پرندے شکار کر کے لے آیا۔ ویسے تو ان کے پاس کھانے کا وافر سامان موجود تھا مگر پرندے مل جانا بھی غنیمت تھا۔ اب دو افراد ان پرندوں کو آگ پہ بھونتے دکھائی دے رہے تھے۔

ایڈم ساحل کے پتھروں کے پاس بیٹھا تھا۔ وہ کاغذ گھٹنوں پہ رکھے سیاہی میں قلم ڈبو ڈبو کے الفاظ صفحے پہ اتار رہا تھا۔

''مورخ صاحب!'' پیچھے سے ایک سپاہی نے اسے مخاطب کیا تو اس نے گردن موڑی۔

''ہاں کیا ہوا۔''

''میں سوچ رہا ہوں، لکڑیاں کاٹ کے کشتی بنانے کا انتظام کروں۔ شہزادی تاشہ کے چلے جانے کی وجہ سے ہمارے پاس کوئی کشتی نہیں ہے۔ بالفرض 'دوسرا مرحلہ' ناکام ہو جاتا ہے تو ہم کیا کریں گے؟'' وہ فکر مند لگتا تھا۔

ایڈم ہلکا سا مسکرایا۔ ''ہاں، تم اپنا انتظام پورا رکھو مگر مجھے یقین ہے کہ ہم دوسرے مرحلے تک ضرور پہنچ جائیں گے۔ جو لوگ سچ کا ساتھ دینا چاہتے ہیں' ان کے لیے راستے اللہ تعالیٰ خود کھولتا ہے۔''

سپاہی نے گردن موڑ کے درختوں کے چھپر تلے رکھے صندوقوں کو دیکھا اور پھر اس مؤرخ کو جو واپس کاغذوں کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ (سچ کیسا؟ ہم تو شہزادی کی غلامی اور احسانات کی وجہ سے ان سے وفا کر رہے ہیں۔ مگر خیر بڑے لوگوں کی بڑی باتیں۔)

پھر ایڈم کے قلم کاغذ کو دیکھا تو بولا۔ ''آپ لکھنے کا سامان ساتھ لائے تھے؟'' اسے حیرت ہوئی۔

''سراقہ کے کنگن والا واقعہ سنا ہے تم نے' سادونگ؟'' وہ لکھتے ہوئے مسکرا کے بولا تو سپاہی سوچ میں پڑ گیا۔

''وہ صحابی جن کو عمر بن خطابؓ نے فتح ایران کے بعد کسریٰ کے کنگن بھجوائے تھے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ان کے ہاتھوں میں کسریٰ کے کنگن دیکھے تھے؟''

''ہاں۔ جانتے ہو جب وہ صحابی نہیں تھے تو کیا تھے؟'' ایڈم لکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ لہروں کا شور اور نم ہوا' کچھ بھی اسے کام سے غافل نہیں کر پا رہا تھا۔ ''وہ ہجرت مدینہ کے موقع پہ رسول اللہ ﷺ اور ابو بکرؓ کا پیچھا کرتے ان سے جا ملے تھے۔ وہ ان کو گرفتار کروانا چاہتے تھے مگر رسول اللہ ﷺ کی دعا سے ان کا گھوڑا ملنے سے انکاری ہو گیا۔ اس کی ٹانگیں زمین میں دھنس گئیں۔ اس وقت انہوں نے آپ ﷺ سے امن کا پروانہ لکھ دینے کی درخواست کی تھی۔ اور رسول اللہ ﷺ کے حکم پہ ان کو وہ پروانہ لکھ کے دے دیا گیا تھا۔ جانتے ہو، مجھے اس واقعے میں سب سے زیادہ کیا چیز حیران کرتی ہے؟'' شاہی مؤرخ قلم ہاتھ میں لیے کہہ رہا تھا۔

''یہی کہ ہجرت کے وقت، بے سروسامانی کے عالم میں بھی لکھنے کا سامان ساتھ رکھا گیا تھا۔ جب مدینہ کی طرف جانے والوں کو اپنی جان بچانی تھی اور تعاقب کرنے والے کو سو اونٹوں کے لالچ نے بے تاب کر رکھا تھا' تب بھی کسی کے پاس لکھنے کا سامان موجود تھا۔ یہ لکھنا بھی عجیب چیز ہے۔ یہ کام انسان کو شروع سے نہیں آتا تھا۔ بہت سے کام انسان نے خود سیکھے۔ غاروں سے عمارتوں تک وہ خود پہنچا مگر لکھنا بالواسطہ اسے اللہ تعالیٰ نے سکھایا۔ کہتے ہیں کہ حضرت ادریس علیہ السلام کو وحی کے ذریعے لکھنا سکھایا گیا تھا۔ اس سے پہلے انسان لکھا نہیں کرتے تھے۔''

سادونگ نے گہری سانس لے کر اس مؤرخ کو دیکھا جو اپنے کاغذات کو دیکھتے ہوئے محبت سے کہہ رہا تھا۔

''تم نے پوچھا کہ میں نے لکھنے کا سامان کیوں ساتھ رکھا ہے؟ تو یہ ہے میرا جواب۔ یہ چھوٹی چھوٹی باتیں ہم مسلمانوں نے رسول اللہ ﷺ سے سیکھی ہیں۔ لوگ چاہتے ہیں کہ وہ بڑے بڑے کام کریں۔ میں شاید بڑے بڑے کام نہیں کر سکتا۔ مجھ میں نہ اتنا ہنر ہے نہ اتنی ذہانت۔ نہ میرے پاس اتنے ذرائع

ہیں۔ میں اکثر مایوس ہوتا تھا کہ میں اس اعلا مقام تک کبھی نہیں پہنچ سکتا جس کی مثالیں دی جاتی ہیں۔

وان فاتح مجھے بڑی بڑی مثالیں دیا کرتے تھے۔ مگر مجھے ملاکہ نے یہ سکھایا ہے کہ انسان کو بڑے کام کرنے کے لیے پہلے چھوٹے چھوٹے کام کرنے پڑتے ہیں اور میں نے اس چھوٹے کام سے شروع کیا۔" اس نے اپنا قلم اٹھا کے دکھایا۔

سادونگ خاموشی سے اسے دیکھے گیا۔ اس کی باتیں سننا اس کی مجبوری تھی۔

"قلم سے...... قلم نے اس واقعے میں کسی کی زندگی بچائی تھی۔ برسوں بعد بھی سراقہ بن مالک نے اس پروانے کو دکھا کے امن حاصل کیا تھا۔ تحریر میں جان بچانے کی طاقت ہوتی ہے سادونگ۔ جن لوگوں کو لکھنا آتا ہے ان کا نہ لکھنا گناہ ہوتا ہے اور مجھے لکھنا آتا ہے۔ جو سکون مجھے لکھنے سے ملتا ہے کسی چیز سے نہیں ملتا۔ اب لکھنا میری مجبوری ہے۔ میں اگر نہیں لکھوں گا تو ایک نعمت خداوندی کو ضائع کروں گا اور یہ گناہ ہے۔ تو میں یہ قلم کاغذ اس لیے ساتھ لایا تھا کیونکہ میں نے یہ بات اپنے نبی ﷺ کی زندگی سے سیکھی ہے۔ وہ دنیا کے سب سے عظیم انسان ہیں۔

میں یہ نہیں سوچتا کہ ہر وقت لکھنے کا سامان ساتھ رکھنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے مگر میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ اگر مجھے آپ ﷺ جیسا سچا اور دیانت دار انسان بننا ہے تو مجھے ان چھوٹی چھوٹی باتوں کو اپنانا ہوگا۔ تب ہی میں بڑے بڑے کام کر سکوں گا۔"

جرنیل سادونگ نے گہری سانس لی اور دونوں ابرو اٹھائے۔

"درست فرمایا۔ اب میں ذرا کشتی کا سامان بنانا شروع کردوں۔" اور ذرا سی جھرجھری لے کر وہ مڑ گیا۔ ایڈم نے مسکرا کے سر جھٹکا اور واپس کاغذ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

ابھی اسے بہت کچھ لکھنا تھا۔ اگر شہزادی تاشہ کی امیدیں سچی تھیں اور انہوں نے واقعی وقت کے اس پار چلے جانا تھا تو اسے یہ کتاب جلد از جلد مکمل کرنا تھی۔

☆☆☆

ملاکہ سلطنت کا بندا ہارا مراد راجہ اپنے محل میں داخل ہوا تو اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ اس کی نظر سے دیکھو تو سارے منظر نامے پہ سرخ دھند چھائی ہوئی تھی۔ دھندلی سی راہداری تھی جس میں وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا جا رہا تھا۔ تیز تیز.... راہداری بڑھتی جا رہی تھی.... وہ چلتا جا رہا تھا... سرخ دھند گہری ہوتی جا رہی تھی۔

درمیان میں کتنے لوگ آئے، پہرے دار، دربان، سپاہی، غلام۔ اس نے ہر ایک کو ہاتھ جھلا کے ہٹنے کا کہا۔ لوگ ہٹتے گئے۔ راستہ دیتے گئے۔ سرخ دھند دھوئیں میں بدلنے لگی۔ ایسا دھواں جس میں سانس لینا تک دشوار ہو رہا تھا۔

اس کا سینہ گھٹ رہا تھا۔ مٹھیاں بھنچی ہوئی اور ناخن ہتھیلی میں پیوست محسوس ہوتے تھے۔ آنکھیں دہکتے انگاروں جیسی ہو رہی تھیں۔ کسی بھوکے بھیڑیے کی مانند وہ جارحانہ انداز میں قدم اٹھا رہا تھا۔

(شہزادی نے اس شخص سے شادی کر رکھی ہے جو چین سے اس کے ساتھ آیا ہے اور مراد راجہ نے اس کو اپنے محل میں پناہ دے رکھی ہے۔) الفاظ اس کے کانوں میں پگھلا سیسہ انڈیل رہے تھے۔

گول زینہ سامنے آیا تو وہ بھی سرخ دھوئیں کی لپیٹ میں تھا۔ ایسا دھواں جس میں انسانی گوشت کے جلنے کی بو شامل ہوتی ہے۔

مراد راجہ زینے اترنے لگا۔ ایک ایک زینہ چھوڑ کے پھلانگتا...... وہ گول سیڑھیاں چکر کی صورت عبور کرتا نیچے آیا۔

وہاں قید خانے بنے تھے۔ قطار در قطار۔ قیدی اسے دیکھ کے اٹھ کھڑے ہوئے۔ مگر وہ سرخ آنکھوں کے ساتھ آگے بڑھتا گیا۔ سرخ دھواں گہرے سے گہرا ہوتا گیا۔ شدید بو محسوس ہو رہی تھی۔

راہداری کے سرے پہ وہ کال کوٹھڑی تھی۔ اس آتے کے ساتھ ہی زور سے دروازے پہ ہاتھ مارا۔

ساتھ کھڑے پہرے دار نے جلدی سے تالا کھولا تو مراد پٹ دھکیلتا اندر داخل ہوا۔
سرخ دھند میں اتنا نظر آیا کہ قیدی کونے میں زمین پہ بیٹھا ہے۔ پیر سے زنجیر بندھی ہے اور زنجیر کے سرے پہ وزنی لوہے کی گیند ہے۔ اسے دیکھ کے قیدی نے سر اٹھایا' اس کی چھوٹی آنکھوں میں چمک آئی اور وہ مسکرایا۔ سنہری رنگت اور چھوٹے بالوں والا خوش شکل قیدی جو بوسیدہ سفید کرتے پاجامے میں ملبوس اکڑوں بیٹھا تھا' اس وقت کسی دوسری دنیا کا باشندہ لگ رہا تھا۔
راجہ مراد کو سرخ دھند میں اس کے کپڑے بھی سرخی مائل نظر آرہے تھے۔
اس نے قیدی کو گریبان سے پکڑ کے کھڑا کیا اور دیوار سے لگا کے غرایا۔
''تمہارا میری بیٹی سے کیا تعلق ہے؟''
فاتح نے اپنے ہاتھ نہیں اٹھائے۔ سر کی پشت دیوار سے لگائے رکھی۔ اور ابرو اچکا کے مسکرایا۔
''تم یہ سوال مجھے کرسی پیش کر کے بھی پوچھ سکتے ہو۔''
''بتاؤ مجھے.... کون ہو تم؟ ورنہ میں تمہاری جان لے لوں گا۔'' مراد کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔
چند لمحے کے لیے قید خانے میں خاموشی چھا گئی۔ صرف مراد کے تیز' بے ربط تنفس کی آواز سنائی دیتی تھی۔
''ہماری دنیا میں ہمیں گیم تھیوری پڑھائی جاتی تھی۔ گیم تھیوری۔ حکمت چال۔ یہ ایک ایسی حکمت ہے جو کھیل' سیاست' جنگ حتیٰ کہ تمام بڑے فیصلے لیتے وقت استعمال کی جاتی ہے۔ کیا تم نے کبھی حکمتِ چال کے بارے میں سنا ہے' راجہ؟''
وہ تحمل سے بولا تو مراد راجہ نے جھٹکے سے اس کا گریبان چھوڑا اور دو قدم پیچھے ہٹا۔ اس کی سمجھ میں جیسے کچھ نہیں آرہا تھا کہ وہ اس آدمی کے ساتھ کیا کرے۔ بس دانت کچکچاتا وہ اسے دیکھ رہا تھا جو اپنی ہی رو میں کہہ رہا تھا۔
''کھلاڑی دو طرح کے ہوتے ہیں۔ متناہی اور لا متناہی۔ متناہی کھلاڑی محدود ہوتے ہیں۔ تمہارے جیسے۔ وہ جب کھیلتے ہیں تو اصولوں کے اندر رہتے ہوئے' ایک مقرر کردہ ہدف کو حاصل کرنے کے لیے کھیلتے ہیں۔ وہ صرف جیتنے کے لیے کھیلتے ہیں۔ محدود کھلاڑی ہارتے بھی ہیں اور جیتتے بھی ہیں کیونکہ ان کا مقصد صرف طاقت کا حصول ہوتا ہے۔''
''میں آخری بار انسانوں کی زبان میں پوچھ رہا ہوں کہ تم کون ہو؟'' وہ غرایا تھا۔ اس کا چہرہ غیظ وغضب سے سیاہ پڑ رہا تھا۔
''مگر لا متناہی کھلاڑی میرے جیسے ہوتے ہیں۔ لامحدود۔ وہ بغیر اصولوں کے' بغیر کسی ہدف کے کھیلتے ہیں۔ ان کا مقصد جیتنا یا کوئی مقصد حاصل کرنا یا طاقت پالینا نہیں ہوتا۔ وہ اپنے ارادے کی مضبوطی سے کھیلتے ہیں۔ وہ اپنی مرضی سے اصول بدل لیتے ہیں' حدود کو آگے پیچھے کر لیتے ہیں کیونکہ وہ اپنی بقا کی جنگ لڑ رہے ہوتے ہیں۔ وہ صرف کھیل کو بڑھاتے رہنے کی غرض سے کھیلتے جاتے ہیں۔ وہ جیتنے کے لیے نہیں کھیلتے۔ اس لیے غیر لا متناہی کھلاڑی کبھی نہیں ہارتے۔ ان کو کوئی ہرا ہی نہیں سکتا۔''
''تمہارا...... میری بیٹی سے...... کیا تعلق ہے؟'' راجہ نے چبا چبا کے الفاظ ادا کیے تو غصیلی نظریں اس پہ جمی تھیں۔ کال کوٹھڑی کے اندر وہ دونوں آمنے سامنے کھڑے تھے اور باہر راہداری میں سپاہی ہاتھ باندھے سر جھکائے کھڑے تھے۔
''ہماری دنیا کی حکمتِ چال کے مطابق... تم ایک لا متناہی کھلاڑی کو نہیں ہرا سکتے۔ بقا کی جنگ لڑنے والے زماں و مکاں کی قید سے نکل کے کھیلتے ہیں۔'' پھر اس نے افسوس سے سر ہلایا۔ ''ہمیں تمہارے ساتھ تب تک کھیل کھیلنا ہے جب تک کھیل جاری رہ سکے اور تم تھک کے ہمیں یہاں سے جانے دو۔ میں جب چاہتا ہوں اپنی مرضی سے اصول بدل لیتا ہوں کیونکہ تالیہ اور میرے کوئی اصول' کوئی حدود نہیں ہیں۔ ہمیں طاقت اور اہداف نہیں چاہئیں۔

ہمیں صرف اپنی دنیا میں واپس جانا ہے اور جب تم مجھے اپنے سامنے کرسی پہ بٹھانے کے لیے تیار ہو جاؤ گے تو میں تمہیں بتا دوں گا...... کہ میرا اور تالیہ کا کیا تعلق ہے۔''

مراد راجہ نچلا لب دانتوں سے دبائے' نفی میں سر ہلاتا الٹے قدموں پیچھے ہٹتا گیا۔

''خدا کی قسم! اگر ملکہ کی بات درست ہے تو میں تمہارا کھیل تم پہ الٹ دوں گا۔'' وہ الٹے قدموں پیچھے جا رہا تھا۔ سرخ دھواں آہستہ آہستہ چھٹ رہا تھا۔ نیم تاریک کمرہ صاف دکھائی دینے لگا۔

''میں تم سے نہیں ڈرتا' راجہ! تم مجھے کبھی نہیں مارو گے' میں جانتا ہوں اور اب تو بالکل بھی نہیں۔'' وہ دیوار سے لگا کھڑا تھا اور ہاتھ سینے پہ لپیٹ لیے تھے۔ آنکھوں میں راجہ کے لیے صرف ترحم تھا۔

''میں تمہیں...... ابھی...... ابھی اسی وقت مار سکتا ہوں۔'' وہ بلند آواز میں گرجا۔ غم و غصے سے اس کا چہرہ سرخ پڑ رہا تھا۔

سینے پہ بازو لپیٹے کھڑے فاتح نے ابرو اچکائے۔ ''اگر تم نے مجھے مار دیا تو تمہاری بیٹی اور تمہارے رشتے کا کیا بنے گا؟ وہ تمہیں کبھی معاف نہیں کرے گی۔ یہی سوچ رہے ہو نا تم اس وقت۔ میں تمہارا ذہن پڑھ سکتا ہوں' بنداہارا!'' وہ سرد سا مسکرایا۔ ''اس لیے بہتر ہے کہ مجھے مارنے کے بجائے تم اپنی فکر کرو کیونکہ تمہیں بہت جلد اس سے بڑے جھٹکے ملنے والے ہیں۔ کیونکہ میں کھیل جاری رکھنے کے لیے کھیل رہا ہوں۔''

''میں تمہیں دیکھ لوں گا۔'' وہ اس پہ غراتا ہوا آگے بڑھا۔ ساتھ ہی بلند آواز میں حکم صادر کیا۔ ''اس کا کھانا پانی بند کر دو اور...... اور......'' بے بسی سے جیسے وہ بس یہی حکم جاری کر پایا تھا۔ ''اور اس کو اتنا مارو کہ یہ خود بھی خود کو نہ پہچان سکے۔''

سپاہی فوراً فاتح کی کوٹھڑی کی طرف لپکے۔ دوسری کوٹھڑیوں کے قیدی بھی کھڑے ہونے لگے۔ مراد راجہ ماتھے پہ بل ڈالے' بازو پیچھے باندھے لمبے ڈگ بھرتا زینے کی طرف بڑھ گیا۔

سرخ دھند کی جگہ اب سیاہ دھوئیں نے لے لی تھی۔

اس کے اندر کا سارا گوشت جیسے جل گیا تھا اور اب صرف راکھ رہ گئی تھی۔

☆☆☆

بنداہارا کے محل کے داخلی دروازے کے سامنے جو روش بنی تھی' اس پہ پھولوں کی پتیاں گری ہوئی تھیں۔ آج صبح شہزادی تاشہ واپس آئی تھی تو بگھی سے اترتے ہی اس کا استقبال کنیزوں اور خادموں نے بہت محبت سے کیا تھا۔

اس کا کمرہ ویسا ہی تھا جیسا وہ چھوڑ کے گئی تھی' البتہ مختلف جگہوں پہ کھونٹیاں لگا کے زرتار کام دار ملبوسات لٹکائے گئے تھے۔ یہ اس کی شادی کے لیے بنوائے گئے تھے۔ وہ چغہ اتار کے مسہری پہ پھینکتی کینہ توز نظروں سے ان کپڑوں کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے جوڑے میں بندھے بال خشک ہو رہے تھے۔ دو دن پرانا سیاہ کرتا پاجامہ پہنے' وہ قدرے بے رونق سی لگ رہی تھی۔ چہرے پہ سفر کی تکان تھی اور آنکھوں میں بے زاری۔

ایک زمانے میں اس کی کتنی خواہش تھی کہ......

کہ وہ کوئی شہزادی ہوتی......

جس کی شادی کسی بادشاہ سے ہوتی......

اور سونے چاندی کے ڈھیر کے ساتھ زرتار عروسی ملبوسات میں اس کو رخصت کیا جاتا۔

اور آج اس نے جانا تھا کہ کچھ خواب پورے ہونے کے لیے نہیں' صرف دل کو خوش کرنے کے لیے ہوتے ہیں۔ فینٹسی۔ ذہن میں بنی کہانیاں۔ ان کو پورا نہیں ہونا چاہیے۔ ورنہ وہ ٹریجڈی بن جاتی ہیں۔

شریفہ ایک دم آندھی طوفان کی طرح اندر بھاگتی ہوئی داخل ہوئی تو تالیہ نے بے زاری سے اسے دیکھا۔ ''ابھی تو ہم سفر سے آئے ہیں...... دو گھڑی سانس تو لے لو' شریفہ!''

''شہزادی...... شہزادی......'' پھولے تنفس سے اس نے جو بات بتائی' وہ تالیہ مراد کو پتھر کا بت بنا گئی تھی۔

☆☆☆

قید خانے میں وہ صلیب کی صورت میں بندھا تھا اور سپاہی اس کی کمر پہ زور زور سے کوڑے مار رہا تھا۔ فاتح نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ اس کے کندھوں اور کمر سے خون بہہ رہا تھا۔ ہر ضرب کے ساتھ دماغ کی چولیں ہل جاتیں اور خون کے ہر قطرے کے ساتھ وہ مناظر یاد آنے لگتے۔

آریانہ سفید لباس میں پہاڑی پہ گری ہوئی تھی۔

اس کا لباس خون آلود تھا۔

اس کی آنکھیں بند تھیں۔

وہ اس کا سر گود میں رکھے رو رہا تھا۔

وہ اپنے ہاتھوں سے زمین کھود رہا تھا۔

سپاہی اس کی کمر پہ زور زور سے کوڑے برسا رہا تھا اور وہ...... وہ آریانہ کی پتھروں سے ڈھکی قبر کے سامنے گم صم بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پہ آنسوؤں کے نشانات تھے۔

اس کی کمر پہ خون کی دھاریں تھیں۔

جب تالیہ اس گول زینے کو اتر رہی تھی تو اس کے سامنے کوئی سرخ دھند نہ تھی۔ صرف خوف تھا اور امید تھی۔ دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ چہرہ غم و غصے سے دہک رہا تھا۔

وہ بھاگتی ہوئی نیچے آئی تھی۔ سیاہ کرتے پاجامے میں ملبوس' وہ ننگے پیر دیوانہ وار اس آخری کوٹھڑی کی طرف لپکی۔

چوکھٹ پہ پہنچ کے وہ دھک سے رہ گئی۔

کوٹھڑی کا دروازہ کھلا تھا۔ چند سپاہی اندر کھڑے تھے۔ ایک دیوار سے لگا کھڑا فاتح صلیب کی صورت بندھا تھا۔ اس کی گردن بائیں کندھے پہ ڈھلکی ہوئی تھی اور لباس پھٹا ہوا خون آلود تھا۔ پیشانی اور سر کے مختلف حصوں سے خون بہہ بہہ کے جسم پہ گر رہا تھا۔ کندھے' کمر' بازو...... ہر جگہ زخموں کے نشان نظر آتے تھے۔ اس کی آنکھیں بند تھیں جیسے بے ہوش ہو' یا کرب سے میچ رکھی ہوں۔

''ہٹو۔ چھوڑو اس کو۔ میں کہہ رہی ہوں' چھوڑ دو اس کو۔'' شہزادی تاشہ غراتی ہوئی آگے آئی اور جو سپاہی فاتح کے سر پہ کھڑا ہنٹر فضا میں بلند کیے اسے مارنے ہی لگا تھا' اسے پرے دھکیلا۔ سپاہی چونکا' پھر گرتے گرتے سنبھلا اور اس کی طرف دیکھا۔

سامنے وہ بھوکی شیرنی کی طرح کھڑی اسے گھور رہی تھی۔

''تمہاری ہمت کیسے ہوئی کہ تم اس کو ہاتھ بھی لگاؤ۔'' وہ جب اس کو سرخ آنکھوں سے دیکھتی غرائی تو اس کی آواز میں نسوانی پن نہ تھا۔ وہ کسی وحشی درندے کی غراہٹ لگتی تھی۔ وان فاتح نے اس عجیب آواز پہ آنکھیں ذرا سی کھولیں۔ وہ دونوں پہلوؤں پہ ہاتھ رکھے کھڑی سپاہی پہ چلا رہی تھی۔

''شہزادی...... یہ راجہ کا حکم ہے' اس لیے خدارا آپ یہاں سے جایئے اور ہمیں ہمارا کام کرنے دیں۔'' ہنٹر والا ہاتھ اس نے پیچھے کر کے بصد احترام بتایا تو شعلہ بار نظریں اس پہ جمائے چند قدم آگے آئی۔ سپاہی نے گردن جھکا دی۔

''میں ملاکہ سلطنت کے بنداہارا مراد راجہ کی بیٹی تاشہ ہوں۔ میں...... سلطان مرسل شاہ کی ہونے والی بیوی ہوں۔ میں ملاکہ سلطنت کی ہونے والی ملکہ ہوں۔ جب سلطان مرے گا تو میں اس ملک کی حکمران ہوں گی اور میرے بیٹے تخت سنبھالیں گے۔ مراد راجہ ماضی ہو گیا ہے۔ ملکہ بنتے ہی سب سے پہلے میں اس کی گردن قلم کرواؤں گی۔ اب تم بتاؤ' جرنیل' تمہیں کس کا حکم ماننا ہے؟ ہونے والی ملکہ کا؟ یا ہونے والے مقتول کا؟'' وہ آنکھوں میں خون لیے اسی غراہٹ کے ساتھ کہہ رہی تھی۔ فاتح کی طرف اس کا نیم رخ تھا۔ اس نے بدقت دھندلی بصارت سے منظر دیکھنا چاہا۔

سپاہی نے مزید سر جھکا دیا اور ہنٹر زمین پہ پھینک دیا۔ دوسرے سپاہی بھی پیچھے ہٹ گئے۔

"میں تمہارے راجہ سے مل کے آتی ہوں۔ تب تک اس قیدی کو کھانا کھلاؤ' پانی پلاؤ اور نیا لباس دو۔ پھر اس کی مرہم پٹی کرو۔"

اب غراہٹ نہیں تھی مگر آواز ہنوز بھاری تھی۔ اس میں شہزادیوں والا ناز و انداز نہیں' ملکہ والا قہر تھا۔ پھر وہ فاتح کی طرف گھومی جو بے حال سا بندھا کھڑا تھا اور ایک اچٹتی نظر اس پہ ڈالی۔

"جب میں واپس آؤں تو مجھے یہ تندرست نظر آنا چاہیے۔ اپنی ملکہ کی بات ماننا سیکھو' جرنیل!"

وان فاتح نے اسے دیکھتے ہوئے زخمی چہرے کے ساتھ اَبرو اچکائے۔ (سیریسلی؟) لب بے آواز ملے۔

تالیہ نے جواب نہیں دیا۔ بس اسے بھی ایک خشمگیں نظر سے نوازا اور تیز تیز باہر نکل گئی۔

مراد راجہ باغیچے میں تنہا ٹہل رہا تھا۔ سر پہ قیمتی جواہر سے مزین ٹوپی تھی اور کندھوں پہ سنہری قبا۔ بازو کمر پہ باندھے وہ کچھ سوچ رہا تھا۔

"راجہ... مراد راجہ!" آواز پہ وہ تیزی سے گھوما۔

سامنے سے دوڑتی ہوئی تالیہ آرہی تھی۔ وہ ملگجے لباس میں تھی اور چہرے پہ سخت طیش چھایا تھا۔

مراد اس کو دیکھ کے یک لخت سُن ہو گیا تھا۔ پھر جیسے ہی وہ قریب آئی اس نے اسے کندھوں سے تھاما۔ "تالیہ..... تم آگئیں۔"

اس نے سختی سے مراد کے ہاتھ جھٹکے۔

"آپ کو لگتا تھا' میں نہیں آؤں گی؟"

"وان فاتح نے کہا تھا کہ تمہارا انجام یہ ہوگا کہ.... (اس کی آواز ٹوٹی) تم سمندری سفر سے نہیں لوٹو گی۔"

"تو کیا آپ وان فاتح سے ہر ایک کا انجام پوچھ رہے تھے؟" اس کی آواز میں ترشی در آئی۔ "میرے جاتے ہی آپ نے اسے کھوج نکالا اور پھر قید کر کے یوں تشدد کیا جیسے مجھے کبھی واپس ہی نہیں آنا تھا؟ یہی چاہتے تھے آپ؟"

مراد کے چہرے پہ افسوس ابھرا۔ "میں کبھی بھی ایسا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے تمہارے پیچھے سپاہی بھیجے تاکہ وہ تمہیں واپس لائیں۔ وہ کل رات کو لوٹ آئے۔ ان کے مطابق تم جنوبی محل نہیں گئی تھیں۔ میں نہیں پوچھوں گا کہ تم کہاں گئیں کیونکہ تم اب واپس آگئی ہو' یہی بہت ہے۔"

پھر اس کی آنکھوں میں تکلیف ابھری۔ "تم میری بیٹی ہو' تالیہ۔ تم نے اتنے سال میرے ساتھ سارے کام مل کے کیے ہیں۔ تم جنگل میں میرے ساتھ جاتی تھیں' جب میں 'عبادت' میں مشغول ہوتا تھا تو تم میرے لیے کھانا بناتی تھیں۔" وہ تاسف سے اسے دیکھتا کہہ رہا تھا۔ "ہاں تم ایک دم سے...... بڑی ہو گئی ہو اور میں تمہارے اس..... (اس کی طرف اشارہ کیا) نئے روپ سے سمجھوتا نہیں کر سکا کیونکہ میرے لیے میری بیٹی وہی چھوٹی سی تھی۔ لیکن 'وقت' تمہیں جتنا بھی بدل دے' وہ میرے دل سے تالیہ کی جگہ کو نہیں بدل سکتا۔"

سامنے کھڑی تالیہ کی پیشانی شکن آلود ہوتی گئی۔ "اب ان باتوں کا وقت گزر گیا ہے' راجہ! یہ باتیں اب مجھ پہ اثر نہیں کرتیں۔ مجھے صرف اتنا بتائیے کہ وان فاتح پہ اتنا ظلم کیوں کیا آپ نے؟"

"کیونکہ اسے کرسی پہ بٹھانے کا وقت نہیں آیا۔" مراد کے تاثرات تن گئے۔ چہرے پہ برہمی عود آئی۔ "تم اس کی فکر کرنا چھوڑ دو۔"

"وہ کرسی کا حق دار ہے راجہ! وہ کرسی پہ ہی بیٹھے گا۔ وہ محلوں میں رہنے والا ہے اور محل ہی اس کا مقدر ہیں۔ اس کے سر کے اوپر سے حکمرانی کا ہما گزرا ہے۔ آپ اس کو نقصان نہیں پہنچا سکتے۔"

"تمہارا کیا تعلق ہے اس سے؟" وہ زیرِ لب آہستہ سے بولا۔ تیز شکاری نظریں تالیہ کے چہرے پہ جمی تھیں۔

"جب اس کو کرسی پیش کریں گے تو وہ بتا دے گا لیکن ابھی کے لیے' آپ اس کو جانے دیں ورنہ میں سپاہیوں سے کہوں گی اور وہ اسے جانے دیں

گے۔"

"میری پیاری شہزادی!" وہ طنز سے مسکرایا۔

"سپاہی میرے ہیں اور میرا حکم مانتے ہیں۔ کل میں نے ان سپاہیوں کو حکم دیا تھا کہ اسے تب تک مارو جب تک تاشہ نہ آجائے اور اگر وہ کہے کہ مت مارو تو ہاتھ روک دینا لیکن اگر وہ کہے کہ اسے چھوڑ دو تو اپنی تلواریں شہزادی تاشہ کے اوپر تان لینا۔ وہ خود ہی پیچھے ہٹ جائے گی۔"

کاٹ دار لہجے میں بولتا وہ بالکل اجنبی ہو گیا تھا۔

تالیہ کے اکڑے کندھے ڈھیلے پڑنے لگے۔

"بابا...." اس کے لب پھڑپھڑائے۔

"بابا کہنے کا وقت بھی گزر چکا ہے۔ مجھ پہ اب یہ الفاظ اثر نہیں کرتے۔ چند ثانیے پہلے تک میں شک میں تھا کہ ملکہ کی بات غلط ہو گی لیکن تمہارا انداز سب عیاں کر چکا ہے۔" وہ افسوس سے کہہ رہا تھا۔ "تم مجھے اپنا دشمن سمجھتی ہو' باپ نہیں۔ تم نے مجھ سے جھوٹ بولا کہ تم اکیلی آئی ہو۔ تم نے اپنی شادی کو چھپایا۔ تم نے سلطان کے سامنے مجھے مجرم بنا دیا۔ وان فاتح درست کہتا تھا۔ تم اپنی دنیا میں ایمان دار نہیں تھیں۔ مجھے تم سے ایمان داری کی توقع نہیں کرنا چاہیے تھی۔"

وہ چپ کھڑی اسے دیکھتی رہی۔

"میں تمہیں ملاکہ کی سلطنت دینے جا رہا تھا اور تم نے اپنی اس دنیا کو ترجیح دی جہاں تم اپنی محنت سے دو آنے تک نہیں کما سکتی تھیں۔ کیا ہو تم اس دنیا میں؟ یہ جو یہاں تمہاری آواز میں غراہٹ در آتی ہے نا' یہ اس دنیا میں نہیں ہو گی کیونکہ یہاں تمہارے پاس طاقت ہے اور طاقت جیسا اور کچھ بھی نہیں ہوتا۔ تم اپنی دنیا میں واپس چلی گئیں تو دیوانی ہو جاؤ گی' پاگل ہو جاؤ گی کیونکہ وہاں تم شہزادی نہیں ہو گی۔ اس لیے قدر کرو اس سلطنت کی جو تمہاری ہونے والی ہے۔ ابھی بھی وقت ہے تالیہ' ملکہ کے الزامات کو رد کر دو اور کہہ دو کہ تم نے اس..... (دانت پیسے) اس غلام سے نکاح نہیں کر رکھا۔ خدا کی قسم میں تمہیں بچا لوں گا۔"

تالیہ بس سپاٹ نظروں سے اسے دیکھے گئی۔

"سوچ لو تالیہ! میں آخری بار کہہ رہا ہوں۔"

"اس کو کرسی پیش کریں راجہ۔ اس سے پوچھیں کہ وہ کیا چاہتا ہے تو وہ بتا دے گا اور یہ آپ کی بھول ہے کہ آپ اسے قید میں زیادہ دیر رکھ سکتے ہیں۔ اگر میں اسے نہیں آزاد کروا سکتی تو کوئی ہے جس کے پاس مجھ سے زیادہ طاقت ہے اور جس دن اس کو اپنی طاقت کا علم ہوا' وہ اسے آزاد کروا لے گا۔"

مراد راجہ کے ابرو بھنچ گئے۔ "کون؟"

"آپ جلد جان جائیں گے۔" وہ تنفر سے کہتی ایک آخری نظر اس پہ ڈالتی پلٹ گئی۔ یقیناً اسے قیدی کے پاس جانے کی جلدی تھی۔

مراد نے ایک خشمگیں نگاہ اس پہ ڈالی اور پلٹ گیا۔ اس کا رخ اپنی تیار سواری کی طرف تھا۔ اسے بھی کسی سے ملنے کی جلدی تھی۔

دھند کا جالا بنتی سرخ مکڑی، اس نے ذہن سے نکال کے دور پھینک دی تھی۔

☆☆☆

قید خانے کا ماحول اب قدرے مختلف تھا۔ فضا سے تناؤ' خوف اور وحشت چھٹ چکی تھی۔ اب وہاں صرف خاموشی تھی۔

وان فاتح کی کوٹھڑی کا دروازہ بدستور کھلا ہوا تھا۔ اس کے پیر میں بندھی زنجیر ویسی ہی تھی' مگر لباس بدل چکا تھا۔ خاکی رنگ کا صاف پاجامہ اور اوپر بنا آستین کی جیکٹ نما شے پہن رکھی تھی۔ کمر پہ پٹیاں بندھی تھیں اور سامنے کھلے سینے پہ بھی کئی جگہ مرہم لگا ہوا تھا۔ وہ اکڑوں بیٹھا تھا اور دیوار سے ٹیک لگا رکھی تھی۔ چہرہ اب صاف تھا' مگر خون آلود کٹ دکھائی دیتے تھے۔

ایک خادم اس کے برہنہ بازو کے زخم کو دیکھ رہا تھا' دوسرا دوا کا تھال لیے سر پہ کھڑا تھا۔

"تم لوگ جاؤ' میں دیکھ لوں گی۔" آواز کے ساتھ نسوانی جوتی کی قریب آتی آہٹ سنائی دی تو فاتح نے آنکھیں کھولیں۔ کوٹھڑی کے کھلے دروازے

میں وہ نظر آئی تھی۔ اس نے پلکیں جھپکیں۔ دھندلا منظر ذرا واضح ہوا۔

وہ بھورے باجو کرنگ میں ملبوس' سر پہ دوپٹا لپیٹے' سادہ مگر خوبصورت کنیز لگ رہی تھی۔ سپاٹ چہرے کے ساتھ قریب آئی اور روئی خادم کے ہاتھ سے لی۔ پھر فاتح کے پاس دوزانو ہو کے بیٹھی۔

''یہ تھال یہیں رکھ دو اور جاؤ۔ مجھے دوسری دفعہ نہ کہنا پڑے۔'' انداز حتمی تھا۔

خادم تعظیم بجالائے اور باہر نکل گئے۔ دروازہ کھلا رہ گیا۔

تالیہ نے روئی تھال میں پڑے پیالے میں ڈبوئی' اس پہ پانی جیسا مائع لگ گیا اور پھر اس کے بازو کے اوپری حصے تک لائی۔ وہ جوادھ کھلی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا' کندھا پیچھے کیا۔ تالیہ نے محض سیاہ آنکھیں اٹھا کے اسے دیکھا۔

''مجھے زخم کو دیکھنے دیں۔'' انگریزی میں زیرِ لب بولی۔ گویا منت کی۔

''تمہیں زخموں کا کیا پتا؟''

''سنگاپور کی ایک امیر بیوہ کو لوٹا تھا میں نے۔ اس کی نرس بن کے گئی تھی۔ وہ ایکسیڈنٹ میں زخمی ہوئی تھی۔'' اس نے فاتح کے بازو کو دیکھتے اب بھیگی روئی زخم پہ رکھی تو اس نے (سس) کر کے آنکھیں مونديں۔

''کیا چرایا تھا اس کا؟''

''زیور اور کچھ نقدی۔ مگر جتنی خدمت اس کی میں نے کی' وہ میرا حق بنتا تھا۔ اس لیے تھوڑا بہت یہ کام آتا ہے مجھے۔''

''وقت کے اس پار زخموں کی دیکھ بھال کے طریقے مختلف ہوتے ہیں' حالم!''

وہ جو روئی سے آہستہ آہستہ زخم صاف کر رہی تھی' بے اختیار ہاتھ روک کے اسے دیکھنے لگی۔

''اتنے دن بعد میرا یہ نام کیسے یاد آیا آپ کو' تو انکو؟''

''جیسے تمہیں اتنے دن بعد اپنا پرانا کام یاد آیا۔'' وہ ماتھے پہ شکنیں لیے' آنکھیں میچے ہوئے تھا۔ بازو پہ سرخ لکیروں کی صورت لمبے لمبے کٹ پڑے تھے۔ تالیہ آہستہ آہستہ بھیگی روئی سے ان کو صاف کرنے لگی۔

''آپ تو کہتے تھے آپ کسی سے نہیں ڈرتے، راجہ کے سامنے کھڑے ہونے کے لیے تیار ہیں۔ اب ان زخموں سے تکلیف کیوں ہو رہی ہے؟''

فاتح نے آنکھیں کھول کے مصنوعی خفگی سے اسے دیکھا۔

''تکلیف تو سب کو ہوتی ہے۔''

''ڈر بھی سب کو لگتا ہے اور کسی کا ساتھ بھی سب کو ہی چاہیے ہوتا ہے۔ آپ جتنے بھی بہادر اور مضبوط بن جائیں فاتح صاحب' فطری جذبات سے نہیں بھاگ سکتے آپ!'' وہ پلکیں زخم پہ جھکائے کہہ رہی تھی۔ وہ چند لمحے اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔

''تم جلدی آ گئیں۔ حالانکہ تمہیں ادھر رہنا تھا اور ایڈم کو واپس آنا تھا۔''

''آپ کو میری ضرورت تھی۔ اسی لیے آ گئی۔''

فاتح نے ہلکا سا سر جھٹکا پھر بات بدل دی۔

''جزیرہ مل گیا تھا؟''

''اور سونا بھی۔ ایڈم وہ سب ساتھ لے کر ہی آئے گا۔'' وہ اب دھیمی آواز میں تفصیلات بتا رہی تھی۔

''گڈ۔ ہر چیز پلان کے مطابق جا رہی ہے۔''

''سوائے آپ کی گرفتاری اور اس قید کے۔''

اس نے روئی رکھی اور مرہم سے بھرا پیالہ اٹھایا۔ پھر انگلی اس میں ڈبوئی اور کندھے پہ دوا لگانا شروع کی۔ ٹھنڈے مرہم کے زخم پہ لگتے ہی وہ (سس) کراہا مگر ضبط کر گیا۔

''تو تم آ گئی ہو نا۔ مجھے چھڑوا لو گی۔''

''نہیں۔ راجہ کو ملکہ نے ہمارے نکاح کا بتا دیا ہے' وہ اب آپ سے کسی قسم کی رعایت نہیں برتے گا۔ سپاہی میرا حکم نہیں مانیں گے۔''

''پھر؟'' اس نے تشویش سے ابرو اٹھائے۔

''آخری مرحلے کے لیے میرا آزاد ہونا ضروری تھا۔''
''تالیہ کے پاس ہمیشہ پلان ہوتا ہے۔ پلان اے ناکام ہو جائے تو پلان سی ہے نا۔''
''اور پلان بی کا کیا؟''
''تالیہ کے پلانز ہیں۔ تالیہ کی مرضی!'' وہ توجہ سے دھیرے دھیرے دوا لیپ رہی تھی۔
کوٹھڑی میں خاموشی چھا گئی۔ باہر جانے کون سا پہر ہوا تھا' اندر ہمیشہ اندھیرا ہوتا تھا۔ ایسے میں دیوار پہ نصب مشعلوں کے شعلے مدھم روشنی بکھیرے ہوئے تھے۔
اس کے ہاتھ پہ بھی ضرب لگی تھی اور ہتھیلی کے اندر کی طرف بڑا سا کٹ لگا تھا۔ تالیہ نے اس کی ہتھیلی اپنے ایک ہاتھ پہ پھیلائی اور پھر بھیگی روئی سے ہتھیلی پہ لگی خون کی لکیر صاف کی۔
''تم واپس جا کے کیا کرو گی؟'' وہ اس کی جھکی پلکیں دیکھ کے پوچھنے لگا تو انداز نرم تھا۔
تالیہ نے چہرہ نہیں اٹھایا۔ بس مگن انداز میں اس کی ہتھیلی سے خون کے دھبے صاف کرتے ہوئے بولی۔ ''میں اپنی وہ دولت جس کو میں نے محنت سے نہیں کمایا.....''
''یعنی ساری دولت....''
''اس کو میں اپنے پاس نہیں رکھوں گی۔ فارغ وقت میں پینٹنگز بناؤں گی۔ جائز کمائی کروں گی اور خوش رہوں گی۔ شاید کسی دوسرے ملک چلی جاؤں۔ آپ تو ظاہر ہے' جاتے کے ساتھ ہی مجھے چھوڑ دیں گے۔''
''ہاں' ظاہر ہے۔'' اس نے عام سے انداز میں کہا۔ تالیہ کے ہاتھ لمحے بھر کو بھی نہیں تھمے۔ وہ زخم صاف کرتی رہی۔
بس اس وقت اس کو کمزور نہیں پڑنا تھا۔ اس تعلق پہ رونے کے لیے عمر پڑی تھی۔
''آپ کیا کریں گے؟''
''میں واپس جا کے ایک دنیا کو وضاحت دیتا رہوں گا کہ یہ چار ماہ میں نے کہاں گزارے۔'' اس نے جھرجھری لی۔
''چار ماہ!'' تالیہ نے گہری سانس لی۔ ''چار ماہ بیت گئے۔ لیکن....'' وہ چونکی۔ ''اگر وقت رک گیا ہو تو؟''
''اور اگر نہ رکا ہو تو؟ ہمیں ہر بات کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ سس۔'' وہ ہاتھ پہ دوا لگا رہی تھی' اس لیے اس کے لبوں سے سسکاری نکلی۔ آنکھیں بھی تکلیف سے میچیں۔ تالیہ نے رک کے اسے دیکھا۔
''ایک بات پوچھوں۔'' اس کا دھیان بٹانے کی غرض سے بولی۔ ''آپ کا والٹ کہاں گیا؟''
''موبائل' والٹ' جوتے' ہر چیز جنگل میں کھو گئی تھی جب ہمیں گرفتار کیا گیا تھا۔''
''آپ کا والٹ میرے پاس ہے۔ گر گیا تھا تو میں نے اٹھا لیا۔ دینا بھول گئی تھی۔''
وہ چونکا' پھر اسے دیکھ کے تاسف سے نفی میں سر ہلایا۔
''اور تمہیں تو بھول کے چیزیں اٹھانے کی بہت عادت ہے۔''
اس نے مسکراہٹ دبا کے شانے اچکائے۔ پھر دوا کا پیالہ رکھ دیا اور پٹی اٹھا لی۔
''اس کے اندر ایک زپ لاک بیگ میں مکئی کے چند دانے تھے۔ ٹوٹے پھوٹے پرانے پاپ کارن۔ آپ نے انہیں کیوں رکھا ہوا ہے سنبھال کے؟'' وہ اب پٹی اس کے ہاتھ پہ باندھ رہی تھی۔ جواب نہیں آیا تو سر جھکائے کام کرتے ہوئے بولی۔
''ٹھیک ہے' نہ بتائیں۔ ویسے بھی میں ہوں تو آپ کی بس ایک ادنیٰ سی کارکن۔ تالیہ دی فین گرل۔ اس لیے.....''
''وہ آریانہ کے تھے۔'' تالیہ نے چونک کے سر اٹھایا۔ پٹی کا بل دیتے ہاتھ وہیں تھم گئے۔
وہ اسی کو دیکھ رہا تھا مگر اس کی آنکھوں میں کچھ تھا جو اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ آواز بھی دھیمی ہو گئی تھی۔
''جس دن آریانہ کھوئی تھی' وہ انہیں کھا رہی تھی۔ جب میں اس کی تلاش میں پہاڑیوں کی طرف

دوڑا تو مجھے وہ نظر آئے۔ وہ اغوا کاروں کی نشان دہی کے لیے پاپ کارن گراتی گئی تھی تا کہ ہم ان کی مدد سے اسے تلاش کرلیں۔ اسے فیری ٹیلز پسند تھیں۔"

وہ اداسی سے مسکرائی۔ پھر چونکی۔ "لیکن آپ نے تو پریس میں کہا تھا کہ آریانہ کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ سب کو یہی معلوم ہے کہ اسے صوفیہ رحمن نے اغوا کروا کے غائب کر دیا تھا۔ مسز عصرہ تو ٹی وی پہ برملا کہتی ہیں کہ ان کی بیٹی کسی اچھے گھرانے کو ہی ملی ہو گی کیونکہ ان کو واپس نہیں ملی مگر....." اس کی آنکھیں وان فاتح کی زخمی آنکھوں پہ ٹھہر گئیں۔ "مگر.... کیا آپ کو پاپ کارن ملے تھے؟"

وہ خاموش رہا۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ وہ پلک تک نہیں جھپک رہی تھی۔

"تو انکو.... آپ کو.... وہ مل گئی تھی' ہے نا؟" اس کو اپنی آواز بھی سنائی نہ دیتی تھی۔ بے یقینی سی بے یقینی تھی۔ فاتح نے ہلکا سا سر کو خم دیا۔

"وہ جہاں مجھے ملی تھی' اس کے پاس سے مجھے یہ پاپ کارن ملے تھے۔ کچھ کو میں نے سنبھال لیا۔ کچھ مجھ سے کھو گئے۔"

"اور آریانہ؟" اس کا سانس اٹکا ہوا تھا۔ "آپ کی بیٹی؟"

"وہ مر چکی تھی' تالیہ! میں نے اسے وہیں دفنا دیا اور میں واپس چلا آیا۔" وہ گہری سانس لے کر بولا اور وہ اگلا سانس نہیں لے سکی۔

"مسز عصرہ کو معلوم ہے؟" بہت دیر بعد وہ بول پائی۔

"میں نہیں بتا سکا اسے۔"

"مگر کیوں؟" وہ دنگ رہ گئی۔

"مجھے جو صحیح لگا' میں نے وہ کیا۔ اس وقت میں اپنی بیٹی کی موت کو سیاسی ایشو نہیں بنا سکتا تھا۔ ہم خاندان کو سیاست سے الگ رکھنے والے لوگ ہیں۔ بہت سے لوگ خود ہی سمجھ گئے کہ وہ زندہ نہیں ہو گی۔"

وہ ٹھہر ٹھہر کے بول رہا تھا۔ اسے تکلیف ہو رہی تھی۔

"نہیں۔ مسز عصرہ کو نہیں معلوم تو کسی کو نہیں معلوم۔ آپ ان کو تو بتا سکتے تھے۔"

"کیسے بتاتا؟ اور اگر بتاتا تو وہ لاش دیکھنے کی ضد کرتی۔ میں اپنی آریانہ کی وہ حالت کسی کو نہیں دکھا سکتا تھا۔" اس کی آواز تیز ہوئی۔ "اور عصرہ بالکل ٹوٹ جاتی۔ اس لیے میں نے اس کو ایک امید تھما دی۔ کم از کم وہ اسٹیبل تو رہے گی۔ اسے سکون تو رہے گا۔"

"ایک ماں کو سکون کیسے آ سکتا ہے بھلا؟ آپ کو انہیں بتانا چاہیے تھا۔ مر جانے والے کا صبر کھو جانے والے سے جلدی آ جاتا ہے۔" وہ شکوہ کرنے لگی۔ پٹی لپیٹتے ہاتھ وہیں اس کے ہاتھ کے اوپر ٹھہرے ہوئے تھے۔

"عصرہ کو نہ آتا۔ وہ ایک مثبت عورت نہیں ہے۔ وہ ہمیشہ منفی رہتی ہے۔ میں اس کو مزید منفی پن سے بچانا چاہتا تھا۔"

"یا شاید آپ کو یہ ڈر تھا کہ وہ آپ کو الزام دیں گی۔ کیونکہ آپ کی سیاست نے یہ دن دکھایا تھا۔ اسی لیے اس روز پارٹی پہ وہ مجھ سے کہہ رہی تھیں کہ (اس نے یاد کرنے کی کوشش کی۔ چار ماہ پہلے کی شام بدقت یاد آئی۔) کہ آریانہ کے بعد انہوں نے سیاست میں حصہ لینا چھوڑ دیا۔ لیکن اگر آپ نے پہلے نہیں بتایا تو اب بتا دیں۔"

"کبھی بھی نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ آنکھوں سے وہ چیز چلی گئی اور پہلے جیسی سنجیدگی واپس چھا گئی۔ "ہماری شادی پہلے ہی بہت پیچیدہ ہو چکی ہے' میں اس میں مزید پیچیدگیاں نہیں بھر سکتا۔"

"آپ کی شادی پیچیدہ ہے؟" وہ چونکی۔ "کیا آپ دونوں کے درمیان مسئلے چل رہے ہیں؟"

"اس بات کو جانے دو۔ اور ہاں....." اس نے بات بدلی۔ "میں نے تمہارے بابا کو بتایا تھا کہ تم اس دنیا میں چور تھیں۔ اور مجھے وہ سب کہتے ہوئے اچھا نہیں لگا۔"

"مگر وہ پلان کا حصہ تھا۔ میں نے خود ہی آپ سے کہا تھا کہ ان کو بتا دیجیے گا تا کہ وہ آپ پہ بھروسا

کریں۔"

"لیکن تم...... اپنے باپ سے اپنا معاملہ درست کرلو تو اچھا ہوگا۔"

"اس کا وقت گزر چکا۔" وہ بات کاٹ کے بولی۔ "ویسے بھی ان کو کوئی فرق نہیں پڑتا اگر میں کسی سمندری سفر پہ جا کے کبھی واپس نہ آؤں۔" پھر وہ ہلکا سا ہنسی۔ "یہ جھوٹ کیوں بولا آپ نے میرے انجام کے بارے میں؟" وہ پٹی لپیٹ کے گرہ دیتے ہوئے بولی۔ "ایسی بے کار بات کہنے کی کیا ضرورت تھی؟"

وہ خاموشی سے اس کی جھکی نظریں دیکھے گیا' پھر نگاہیں پھیر لیں۔ گردن میں گلٹی سی ابھر کے معدوم ہوئی۔

"تم مجھے یہاں سے نکالنے کی فکر کرو۔ باقی باتیں چھوڑو۔" موضوع بدل دیا تو اس نے مسکرا کے پٹی کی گرہ لگائی اور تھال سے رومال اٹھا کے ہاتھ پونچھے۔

"جیسا کہ میں نے کہا...تالیہ کے پاس ہمیشہ پلان ہوتا ہے۔"

اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ مدھم روشنی میں بھی اس کی چمکتی آنکھیں واضح دکھائی دیتی تھیں۔

فاتح نے بس مسکرا کے اسے دیکھا۔ زخمی قیدی کے جسم پہ جابجا پٹیاں بندھی تھیں اور رنگت زرد ہو رہی تھی لیکن پھر بھی وہ مسکرا رہا تھا۔

☆☆☆

ابوالخیر کی حویلی کے احاطے میں غلام معمول کے مطابق کام کرتے دکھائی دے رہے تھے۔ سامان کندھوں پہ اٹھائے سوکھے سڑے نقاہت زدہ اجسام کے مالک غلام ادھر ادھر آ جا رہے تھے۔ پھر سے کوئی تعمیراتی کام شروع تھا اور وہ جانوروں کی مانند مشقت میں لگے تھے۔

حویلی کے اندر دیوان خانے میں بڑی بڑی کھڑکیاں تھیں جن کے پردے ہٹے تھے اور خوب ساری روشنی اندر آ رہی تھی۔ سامنے خوب صورت مسہریاں رکھی تھیں جن میں سے ایک پہ ابوالخیر بیٹھا غور سے سامنے براجمان مراد راجہ کو دیکھ رہا تھا۔

مراد بظاہر پرسکون نظر آتا تھا۔ ٹانگ پہ ٹانگ جمائے' روشن کھڑکیوں کو دیکھتے ہوئے مسلسل ناخن سے ٹھوڑی کو رگڑتا ہوا...... مگر جب سے وہ آیا تھا، فضا میں ایسا تناؤ گھل گیا تھا کہ ابوالخیر کو بھی اب تجسس ہونے لگا تھا۔

"راجہ...... سب ٹھیک تو ہے نا؟"

"بندا ہارا تمہارے مہمان خانے پہ آیا ہے تو ظاہر ہے سب ٹھیک نہیں ہے۔" مراد نے ابرو بھینچ لیے اور ناخوشی کے عالم میں کہنے لگا۔

"عجیب مشکلات آن پڑی ہیں۔"

ابوالخیر آگے کو ہوا۔ چہرے پہ تشویش ابھری۔

"راجہ...آپ ہر مشکل میں مجھے اپنے ساتھ پائیں گے۔ بتایئے، کیا بات ہے۔"

"میں نے تمہیں جب وزیر خزانہ بنوایا تھا اور ملاکہ میں امان دی تھی حالانکہ تم پچھلے سلطان کے حامی تھے تو میں نے ایک عہد لیا تھا تم سے۔"

"مجھے یاد ہے' راجہ۔ آپ نے کہا تھا کہ اگر میں سلطان سے زیادہ آپ کا وفادار ہو جاؤں تو وقت آنے پہ آپ سلطان سے زیادہ مجھ سے وفا نبھائیں گے۔"

"اور وہ وقت آ گیا ہے' ابوالخیر۔" مراد بھی آگے کو جھکا اور آواز دھیمی کی۔ "ہمیں مرسل شاہ کا تختہ الٹنا ہے۔"

کمرے میں ایک دم گمبھیر سناٹا چھا گیا۔ ابوالخیر نے بے یقینی سے ابرو اٹھایا۔ "لیکن مرسل شاہ تو ہماری مرضی کے مطابق کام کر رہا ہے۔"

باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ

ناولٹ

اسّی کی دہائی اور اگست کے گرم دن کا سورج سوا نیزے سے ڈھل چکا تھا۔ صبح سے ہی گہما گہمی تھی اور اب مغرب کے بعد ہی ڈھول باجے بج رہے تھے۔ لڑکیاں سج رہی تھیں۔ دن تو ڈھل گیا لیکن دلہن والوں کے گھر رات رنگ، نور اور خوشبو کی بارش میں نہا گئی۔ کرن سے سجے زرتار ریشمی آنچل صحن میں بکھر گئے۔ مہندی کی خوشبو میں بسے، چوڑیاں کھنکھناتے ہاتھ جب پھسلتے دوپٹوں کو سر پہ سیدھا کرتے تو اندر باہر آتے جاتے مردوں کے دلوں میں بجتا جلترنگ چوڑیوں کے ساز کا ہم نوا ہو جاتا اور نئی کہی ان کہی دھنیں بکھر کر ہوا میں تحلیل بھی ہو جاتیں اور منزل تک بھی پہنچ جاتیں۔

بلے بلے نی ماں دیے موم بتی اے

کا باہر کیا گیا تھا۔

"ریشم جا کر اپنے ابا سے کہہ دے کہ کھانے کے بعد چلتے ہیں۔"

"نہیں اماں! ابھی تو ساری رات ڈھولک بجے گی۔ پھر ثروت باجی (تایازاد) بھی تو کل رخصت ہو جائیں گی۔ بس آج ہی کی رات ہے۔ مجھے نہیں جانا۔" ریشم نے حلیم چاول کی پلیٹ اماں کو دی۔

"بس ریشم! تیری ہی ضد پہ صبح سے یہاں ہیں۔ ورنہ اس چھوٹے سے گھر میں میرا تو دم گھٹتا ہے۔ بس اپنے ابا کو کہہ دے جا کر اور توبہ یہ کھانا دیا ہے؟"

اب اماں نے ناک بھوں چڑھا کر کھانا شروع کر دیا۔ بددلی سے ریشم اٹھی کیونکہ اماں بھی اپنے نام

افراح سکندر خان

ریشم کہانی

ان بہت سی ہم آہنگ آوازوں میں ایک آواز اس کی بھی تھی جو ماں کی موم بتی تو تھی ہی لیکن "شمع محفل" بن جانا بھی خوب جانتی تھی۔ جس کی گردن میں سریا فٹ تھا۔ کیوں نہ ہوتا چار بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔

ناز و ادا تو اس پہ ختم تھا جیسے...... حسن ہو تو نزاکت آ ہی جاتی ہے لیکن اس کو "چار چاند" پیسہ لگاتا ہے۔ تو اس کے ناز و انداز کی چمک دمک ہی نرالی تھی۔

ہنستے ہوئے جب تان لگا کر وہ ڈھولک پیٹتی تو نوجوان اسے پلٹ کر دیکھتے۔ ان کی دھڑکنیں سرک کر پھسل سی جاتی تھیں "ریشم" کی ہر ادا پر۔

☆☆☆

مہندی کی رونق عروج پہ تھی کہ کھانا کھول دیا گیا۔ عورتوں کے کھانے کا انتظام چھت پہ اور مردوں

کی ایک تھیں۔ یہی شکر تھا کہ وہ شادی میں شرکت کر رہی تھیں۔ تائی سے تو کبھی بنی ہی نہیں تھی، لیکن زیادہ قصور تائی کا اس لیے بھی نکلتا تھا کہ تایا کی حیثیت کم تھی ورنہ ریشم اور ابا کا کتنا دل تھا کہ ثروت باجی کی شادی منجھلے بھائی سے ہو جاتی۔

برے برے منہ بناتی وہ ان ہی سوچوں میں الجھی تیزی سے سیڑھیاں اتر رہی تھی کہ اس کا ریشمی آنچل سیڑھیوں کے ساتھ لگی لوہے کی گرل سے الجھ گیا، بے دھیانی میں وہ تین چار سیڑھیاں اتر گئی تو آنچل تار تار ہونے کو ہی تھا۔

عین اسی وقت خاقان اپنی والدہ کو بلانے سیڑھیاں چڑھتے تیزی سے اوپر آیا۔ ریشم جو پلٹ کر اپنے دوپٹے کو کھینچنے ہی والی تھی تو اس نے یہ موقع

غنیمت جانا اور تیزی سے اس کے پاس سے گزر کر ریشم کے الجھاؤ کو سلجھا دیا۔ وہ اس سے تین سیڑھی اوپر پلو تھامے جھکا تھا اور ریشم کا خفا خفا سا رخ روشن گرل سے لگے برقی قمقموں سے جگ مگ کر رہا تھا۔ پس منظر میں خالی صحن تھا' جہاں مہندی اور پھولوں کے تھال اور ڈھولک تھے تو اوپر آسمان پہ تیرہویں کا چاند۔ سیدزادہ قید کیوں کر نہ ہوتا۔

ریشم نے جب اسے پلو پکڑے تکتے دیکھا تو اپنے مہندی لگے انگوٹھیوں سے سجے ہاتھ سے خود ہی اپنے آنچل کو کھینچنا چاہا لیکن پلو تو سیدزادے کے ہاتھ پہ لپٹتا ہی چلا گیا۔

یہ وہی لمحہ تھا جب ان کی آنکھیں چار ہوئیں اور دلوں کی دھڑکنوں نے ایک ہو کر ایسی دھن پروئی جو ان کو باندھ گئی، جو ان کے سوا کسی نے نہ سنی تھی۔

اس وقت تو ریشم دھڑکتے دل کے ساتھ پلٹ گئی۔ لیکن پھر بارات والے دن آنکھوں کی گستاخیاں عروج پہ رہیں۔ وہ چوری چوری خاقان کو دیکھتی رہی تو خاقان نے بھی اسے نظروں کے حصار میں رکھا۔

گھر کے اندر باہر سب کام خاقان ہی دیکھ رہا تھا۔ ریشم کے خیالوں میں تو شاید کب سے تھا لیکن خاقان کی نظروں میں وہ اب آئی تھی۔

اردگرد کتنے ہی لوگ تھے جو اس کی ایک نگاہ کے منتظر تھے۔ وہ اپنی اہمیت اور حسن سے خوب واقف تھی۔ لیکن وہ کیا کرتی اپنے دل کا۔ جو خاقان کا نام سنتے ہی سرپٹ دوڑتا تھا۔ جب جب ثروت باجی یہ کہتی تھیں، خاقان بھائی سے سموسے منگواتے ہیں۔ چلو تمثیلہ کے گھر چلیں، میں نے کروشیے کا ہک منگوایا تھا، خاقان بھائی تو کب کے لے بھی آئے۔

چھت پہ کھڑے ہو کر صحن میں لگے شہتوت کے درخت سے شہتوت توڑتے۔ کبھی مٹی کی دیوار سے ٹیک لگائے اچار یا سوجی کی ٹکڑیاں کھاتے وہ خاقان کو چوری چھپے دیکھتی تھی۔ تارا باجی، ثروت باجی کے لیے وہ بھائیوں جیسا ہی تھا کیونکہ ان کا سگا بھائی بہت چھوٹا تھا۔ تائی تو خاقان اور تمثیلہ کو جیسے اپنے بچوں کی طرح ہی سمجھتی تھیں اور اللہ گواہ ہے ریشم سے زیادہ انہیں تمثیلہ عزیز تھی۔ ریشم تو کبھی ایک آنکھ نہیں بھائی تھی انہیں۔ بس تایا ابا اور ثروت باجی تھیں جن کی وہ لاڈلی تھی' ان ہی کی محبت اسے یہاں لاتی یا بھی خاقان کو دیکھنے کی خواہش ورنہ وہ اس گھر میں کبھی نہ آتی۔

شادی ختم ہوئی اور ریشم کا دل جیسے خالی ہو گیا۔ ثروت باجی کی رخصتی کے ساتھ ہی سب بہانے بھی رخصت ہو گئے۔

وہ کالج کے گیٹ سے باہر نکلی تو اسے لگا کہ اس کا دل بند ہو جائے گا۔ خاقان درخت کے سائے تلے کھڑا تھا۔ اسے لگا کہ وہم ہے یا پھر وہ کسی کام سے یہاں آیا ہے۔ لیکن وہ اسے دیکھتے ہی اس کی طرف بڑھا۔

''ثروت آئی ہوئی ہے کل سے۔ تم ملنے نہیں آئیں؟''

''مجھے پتا ہی نہیں تھا کہ وہ آئی ہیں۔ آپ کو انہوں نے بھیجا ہے؟'' اپنے دل کی دھڑکن کو قابو میں کرتی ریشم بے یقین سی تھی۔

''آں نہیں...... میں......'' خاقان نے سانس روک کر نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اور نظر بھر کر دیکھا۔ جو زبان نہ کہہ سکی، وہ فسانہ آنکھوں نے بیان کر دیا اور کیا خوب کیا۔ ریشم نے جو اس کی نگاہوں میں محبت کی تڑپ دیکھی تو نظریں جھکا گئی۔

''میں شام میں آؤں گی۔'' جھکی نظروں اور لبوں پہ مسکان بکھیرتی وہ پلٹ گئی اور خاقان کی سانسیں معطر ہو کر واپس لوٹ آئیں۔ اسے جواب مل گیا تھا۔

پھر بہت سے جواب پیام محبت کی صورت وہ ایک دوسرے کو بھیجتے رہے۔ بس سوال نہیں کرتے تھے کیونکہ سوال اندیشے لاتے ہیں۔ خاقان جب محبت کی نظمیں کہتا تو دھنک کے رنگ اس کے چہرے پہ بکھر جاتے اور خاقان کے دل کی دھڑکنیں موروں طرح رقص چار پارہ کرنے لگتیں۔ مشک محبت فضا میں پھیل جاتی۔

لیکن ہوا وہی جو ہوتا ہے۔ جو ساز صرف محبت

کرنے والوں کے کانوں میں رس گھولتے ہیں، جو دھنیں ریشم کی نرمی اور اس کے راز کی طرح پوشیدہ ہوتی ہیں، وہ خوشبو بن جاتی ہیں۔ ہر طرف بکھر جاتی ہیں۔ وہاں بھی پہنچ جاتی ہیں جہاں ان کو سڑاند سمجھا جاتا ہے۔

ان کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ مہندی کی رات سے جو سلسلہ چلا تو سال بھر بعد اس آنکھ مچولی کا کھیل عروج پہ پہنچا تو وہ دونوں پکڑے گئے۔

"ریشم میں کیا کیا سوچتی رہی تیرے لیے اور تو نے اس ٹٹ پونجیے کو چنا اپنے لیے۔"

ریشم نے پانی بھری لال آنکھوں کو اٹھایا تو ان کے غضب نے اماں کو دہلا دیا۔

"اماں وہ میرے دل میں بستا ہے، اس کی حیثیت کا اندازہ ٹھیک سے نہیں لگا پائیں آپ۔"

چٹاخ کی آواز بھابھیوں نے کمرے کے باہر تک سنی۔ ریشم کے انگارہ ہوتے گالوں کا تصور ہی ان کے سینوں میں ٹھنڈک اتار گیا۔

باپ بھائی قصداً خاموش تھے۔ ان کا مان، ان کا غرور ٹوٹا تھا لیکن ریشم کی ہڈیاں توڑنا گوارا نہیں تھا انہیں۔

اس کا کالج جانا تو بند ہو ہی چکا تھا۔ اس پہ عذاب بھابھیوں کی شکلیں دیکھنا تھا۔ کل تک بھائیوں کی "سر" چڑھی۔ ریشم جو ان کے "سروں پہ چڑھ" کرنا چاہا کرتی تھی، آج وہ مزے لے کر اس کے کردار اور اماں کی تربیت کو "روندتی" تھیں۔

بس پھر اماں بھی میدان میں آ گئیں۔ کیا ہوا "بچی" ہی تو تھی ان کی لاڈلی، اب بچے غلطی نہیں کریں گے تو اور کون کرے گا؟

پھر گھر میں روز طبل جنگ بجتا، روز تماشا لگتا اور بھابھیاں یہ تماشا صحن میں لگاتیں تا کہ "تماشائی" جمع ہو سکیں — اماں نے کبھی ہار نہیں مانی تھی، پھر ان بالشت بھر کی چھوکریوں سے کیسے ہار مان لیتیں۔ لیکن پھر اماں ڈھے سی گئیں ان بالشت بھر چھوکریوں کے "شوہروں" کے سامنے۔ کیونکہ وہ انہیں خود "شیر جوان" کہتی تھیں۔ جن کی غیرت و حمیت کے قصوں سے بہوؤں کو داب کے رکھا تھا، جن کے غصے کا چرچا وہ اٹھتے بیٹھتے کرتی تھیں۔ وہ اماں کے سامنے تن گئے تھے۔ انہیں ریشم اچھوت لگنے لگی تھی اور ان کی زبانیں بیویوں کی بولیاں بولنے لگی تھیں۔

ابا نے چپ سادھ لی تھی کیونکہ قصہ زبان زد عام ہونے کو تھا۔ بس پھر ایک ہی حل تھا جو ہر باپ کے پاس ہوتا ہے۔

بڑے کمرے میں ہنگامی میٹنگ بلائی گئی۔ ریشم تو ضد کی پکی تھی وہ تو پہلے بھی کمرے سے نہیں نکلتی تھی کیونکہ بقول اس کے وہ تو "حق بجانب" تھی۔ بھابھیاں جلے پیر کی بلی کی طرح سن گن لینے کے لیے بے تاب تھیں۔

"بس اس کا رشتہ ڈھونڈو۔ یہاں سے چلی جائے گی تو لوگوں کی زبانیں خود ہی بند ہو جائیں گی۔"

میٹنگ برخاست ہوئی۔ بھائیوں نے پھرتی دکھائی اور تین دن بعد رشتہ بھی ڈھونڈ لائے۔

ریشم اتنی بھی بے خبر نہیں تھی۔ بڑے بھتیجے کی دوڑیں گلی کی نکڑ پہ کھڑے خاقان سے شروع ہو کر ریشم پہ ختم ہوتی تھیں۔

بھائیوں کا لایا رشتہ پکا ہوتا، اس سے پہلے سید

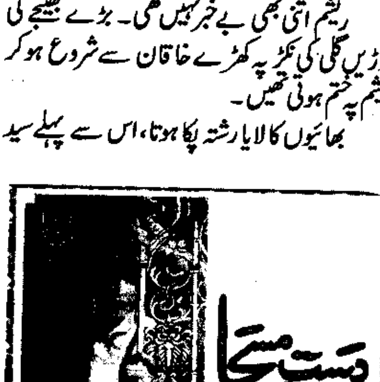

زادہ خاقان کی والدہ بیٹیوں کے ساتھ آموجود ہوئیں۔ گو دل پہ پتھر رکھے ہی لیکن وہ ریشم کا رشتہ مانگ رہی تھیں۔

ابا تو اٹھ کر چلے گئے۔ لیکن اماں نے اپنے تئیں ان کے ساتھ جو کیا وہ اُن کی سات نسلیں یاد رکھتیں۔

جب خاقان کی ماں دہلیز پار کر رہی تھیں تو ریشم کی اماں کی آواز ان کے کان پھاڑ رہی تھی۔

''کلرک کی ماں ہو کر میری شہزادی کا رشتہ لے آئیں ذرا شرم نہیں، پتا نہیں لوگ اپنی اوقات کیسے بھول جاتے ہیں۔ چلو اوقات تو بھول ہی گئے اپنے عقیدے کا ہی خیال رکھ لیتے۔''

لیکن پھر ریشم نے اماں سمیت سب گھر والوں کے ساتھ وہ کیا جو واقعی ان کی سات نسلوں پہ بھاری پڑنے والا تھا۔

☆☆☆

مجسٹریٹ کے دفتر سے نکل کر جب ریشم تیز تیز چلتے سید زادہ خاقان کے پیچھے چل رہی تھی تو اس کی چادر جنگلے کی باڑ میں اٹک گئی۔ یہاں ریشم نے پھر لاپروائی برتی اور دھیان نہ دیا بس وہ تیزی سے خاقان کے ہم قدم ہو جانا چاہتی تھی جو اپنے دوستوں کے ساتھ تیز تیز چل رہا تھا اس کا دھیان اس وقت قطعاً ریشم پہ نہیں تھا، جس کا پلو جنگلے میں اٹک کر پھٹ گیا تھا۔

وہ دن سید گھرانے پہ تازیانہ بن کر اترا تھا۔

جب اکلوتا بیٹا اس حال میں گھر میں داخل ہو کہ اس کے ہاتھ میں کاغذات ہوں اور اس کے پیچھے کھڑی لڑکی (بہو) کی چادر تار تار ہو تو ماؤں کی دنیا ہی اندھیر ہو جاتی ہے۔

خاقان کے گھر کی بھی بنیادیں ہل گئیں۔ اس کی ماں پہ غشی طاری ہو گئی۔

''ابا......ہم آپ کے پاس آئے ہیں، ہمارے سر پہ ہاتھ رکھ دیں یا ہمیں گھر سے نکال دیں۔''

خاقان کے ابا جو کرسی پہ گر سے گئے تھے۔ خاقان ان کے پاؤں پکڑ کر زمین پہ بیٹھا کہہ رہا تھا۔

اکلوتا بیٹا جوان کی امیدوں کا مرکز تھا جسے ان کا بازو بننا تھا۔ اس نے ان کے دماغ کو مفلوج کر دیا تھا۔ بیٹے کو گھر سے کیسے چلتا کرتے، جب کہ گھر ''چلتا'' ہی اس کی کمائی پہ تھا۔

''خاقان! تجھے ذرا حیا نہ آئی تو بھی بہنوں والا ہے۔'' خاقان سے سال بھر چھوٹی بہن تمثیلہ نے اس کا گریبان پکڑ لیا۔

''ہم میں سے کوئی ایسا کرتی تو تُو ہمیں مار کر غیرت کا شملہ اونچا کرتا۔ بتا اب تیرے ساتھ ہم کیا کریں؟ ہمیں تو معاشرے نے یہ حق ہی نہیں دیا کہ ہم غیرت کے نام پہ قتل کر سکیں۔''

خاقان تو زندہ زمین میں ہی گڑ گیا۔ ریشم جو اب تک صحن کے بیچ و بیچ کھڑی تھی لرز گئی۔ یہ تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا اس کے بھائی اگر اس کے پیچھے آ گئے تو......؟

اردگرد کی چھتوں پہ سر ابھرنے لگے تو خاقان کے ابا نے بیٹے کو کمرے میں بھیج دیا۔ ریشم کی طرف تو کسی نے دیکھا ہی نہیں تھا۔ دو ماں کے ہاتھ پاؤں سہلا رہی تھیں تو ایک باپ کو پانی دے کر ٹھنڈا کر رہی تھی۔

خاقان ہی اس کا ہاتھ تھام کر اپنے کمرے میں لے گیا اور پھر دو دن وہ اسی کمرے میں بند رہی۔ اگر کسی نے اسے نہیں بلایا تو وہ کیوں خود کو ہلکا کرتی اور ان جیسیوں (دُبو قسم) کے آگے تو قطعاً نہیں۔

ریشم کے بھائی تو مرنے مارنے پہ اتر آئے تھے۔ لیکن خاقان کے ابا کو بیٹا عزیز تھا۔ وہ ریشم کے تایا کے پاس گئے۔ گو کہ اس کے تایا کو بھی غصہ تھا لیکن بھتیجی کی ضد اور کارنامے سے بھی واقف تھے۔

پنچایتیں لگیں، کونسلر بلوائے گئے۔ گھر کی بات چوراہوں کی زینت بنی۔ وہ ناز و ادا کا پیکر ریشم جو بہت سوں کو پہنچ سے دور لگتی تھی۔ اب اس کا قصہ زبان زدعام تھا۔ لوگ خاقان کے گھر کی طرف دیکھتے اور باتوں کا چسکا لیتے۔ عورتیں بہانے بہانے سے گھر میں آنے کی کوشش کرتیں۔ خاقان کی اماں بانو نے دروازہ کھولنا ہی بند کر دیا۔

خیر فیصلہ یہ ہوا کہ دونوں عاقل و بالغ تھے، والدین کو شروع میں ہی مان جانا چاہیے تھا۔ حل یہی ہے کہ ولیمہ کیا جائے اور دونوں گھرانے اس میں شرکت کریں۔ ایک دوسرے کی عزت کو مزید نہ اچھالیں۔

ولیمہ سے ایک دن پہلے خاقان سے چھوٹی تمثیلہ کے سسرال والے آکر انگوٹھی واپس کر گئے۔

جس گھر کا لڑکا ایسا تھا وہاں کی لڑکیاں تو پھر الامان۔

شادیانے کیا بجتے اس گھر پہ تو نحوست نے ڈیرے ڈال لیے تھے۔

☆☆☆

''ہائے کتنا روپ آیا ہے۔۔''

ریشم خاقان کے کمرے میں ہی بیٹھی تھی۔ خاقان ہی اس کے لیے ایک سبز رنگ کا کام والا جوڑا لے آیا۔ ماں کے زیور پہ حق نہیں رہا تھا اور ساس اسے حق دار نہیں سمجھتی تھی۔ خاقان نے پھولوں کا زیور لاکر پہنا دیا آخر دلہن کو دلہن لگنا چاہیے۔ ولیمے کی نا سہی مہندی کی ہی سہی۔

ریشم نے اپنے مہندی سے عاری ہاتھوں کو دیکھا۔ کتنا شوق تھا اسے مہندی لگانے کا۔ بھائیوں کی شادیوں پہ کیسے بھر بھر مہندی لگائی تھی اور اپنی شادی؟ ایسا تو نہیں سوچا تھا کہ شادی ایسے ہوگی۔ اسے تو شہزادیوں کی طرح رخصت ہونا تھا۔ پہلی دفعہ احساس ہوا کہ بہت غلط ہو گیا ہے۔ اٹھارہ سالہ زندگی کی پہلی اور سنگین غلطی کا ادراک اب ہوا تھا۔

''ہائے روپ تو دیکھو، سادگی میں بھی غضب ڈھا رہی ہے۔''

''روپ کو ساری عمر چاٹنا تھوڑی ہوتا ہے یہ دیکھ کیسی سبز قدم ہے۔ جب سے آئی ہے گھر ماتم کدہ ہی بن گیا ہے۔''

''چڑھاوے کی چادر کتنی ہی عمدہ ریشم سے کیوں نہ تیار کی جائے، سونے کے تاروں سے سجائی جائے لیکن جگہ تو اس کی مرقد ہی ہے نا۔ بس یہ بھی وہی ریشم ہے۔ کیسی پاک بیبیوں کا گھرانہ تھا، اب تو ایسے ہے جیسے کوئی مزار۔''

کسی نے اسے کبھی اف بھی نہ کہا تھا اور اب جو عورت کمرے میں آتی، کچھ نہ کچھ بول کر ہی جاتی۔ بس ایک بار اماں ابا آجائیں ان کے پیروں میں گر جاؤں گی۔ وہ معاف کر دیں تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔

لیکن انتظار انتظار ہی رہا۔ اس کے گھر سے کوئی نہ آیا۔

کھانا کھول دیا گیا تو سب خواتین صحن میں چلی گئیں۔ ان کی میزبانی کرنے والا بھی کوئی نہ تھا۔ گھر کی خواتین نے خود کو کچن تک محدود کر لیا تھا۔

وہ پھر سے تنہا ہو گئی۔ اب اسے رونا آ رہا تھا۔ دھندلی آنکھوں کو دروازے کے پار کسی اپنے کا گمان ہوا تو وہ دوڑ کر دروازے کے پاس گئی۔ ثروت باجی اندر داخل ہو رہی تھیں۔ وہ ان سے لپٹ گئی۔

''کتنی حسرت تھی میری ریشم کہ تو میری بہن ہوتی۔ لیکن ابھی شکرانے کے نفل پڑھ کر آ رہی ہوں، کتنی خوش قسمت ہوں کہ تو میری بہن نہیں ہے۔''

ریشم جوان کے گلے لگی تھی جھٹکے سے پیچھے ہوئی۔

''دنیا دکھاوے کو آئی ہوں کیونکہ اور کوئی تیار ہی نہیں تھا آنے کو۔ یہ لے چاچی نے بھجوائے ہیں۔''

ایک چھوٹا سا بیگ انہوں نے اسے تھما دیا جس میں زیورات اور کچھ کپڑے اور نقدی تھی۔

''اور چاچا چاچی نے ایک پیغام دیا ہے، کہتے تھے ریشم کو کہنا ہم نے اس پہ فاتحہ پڑھ لی ہے، جیسے وہ ہمیں دفن کر گئی ہے۔''

ریشم تو واقعی ریشم ہی نکلی، اوپر سے نرم، چمکیلی اور اندر سے قاتل۔ تھوک کی پیداوار۔ جیسے ریشم کو بنتے بنتے ریشم کا کیڑا مر جاتا ہے، تُو نے بھی ویسے ہی چاچا چاچی کو مار دیا۔ ابا صحیح کہتے تھے حرام کمانا ایسا ہی ہے جیسے کوئی تھوک چاٹ لے۔

آج میں نے دیکھ بھی لیا کہ ابا کتنا صحیح کہتے تھے۔'' یہ کہہ کر وہ باہر چلی گئیں۔

دو گھر چھوڑ کر تایا جی کا گھر تھا۔ لیکن ریشم کی سمجھ میں آگیا کہ فاصلہ دو صدی جتنا ہے۔

☆☆☆

کتنا ناز تھا اسے اپنے حسن پہ، اپنے پیسے پہ۔ جسے کبھی گرم ہوا نے بھی نہ چھوا تھا۔ اس پہ زمانے نے اُس کی حقیقت واضح کر دی۔ اس کے گھر والوں نے اسے تھوک دیا اور سسرال والے چاٹنے پہ تیار نہ تھے۔

ایک دو مہینے تو یوں ہی گزر گئے، نہ وہ کسی کو بلاتی نہ ہی کوئی اس کو بلاتا۔ خاقان بھی نخرے اٹھا اٹھا کر تھکنے لگا تھا۔ کبھی ریشم کو سمجھاتا کبھی اماں اور بہنوں کو۔ لیکن دونوں طرف کوئی انا کی دیوار گرانے کو تیار نہ تھا۔

پھر اس کے ابا نے گھر کا سربراہ ہونے کا حق ادا کیا اور تینوں بیٹیوں اور بہو کے درمیان کاموں کی تقسیم کر دی۔ بہو گھر کے کاموں میں رچ بس جاتی۔ کسی نہ کسی بہانے اسے گھر کی لڑکیوں سے بات چیت کا موقع ملتا تو ماحول بہتر ہو سکتا تھا۔ لیکن ریشم کے لیے تو یہ حکم سسرال کے مظالم کی کہانی میں پہلا باب ثابت ہوا۔

☆☆☆

ریشم کے کیڑے کی کہانی بھی عجب ہے۔ تار تار کر کے وہ لعاب اپنے گرد لپیٹتا جاتا ہے یہاں تک کہ خود کو ان ریشمی تاروں کے کویا میں قید کر لیتا ہے۔ بس اس کی اتنی ہی سکت، اتنا ہی اختیار ہوتا ہے۔ اس کے آگے کی کہانی اس بات پہ منحصر ہے کہ وہ کویا کس کے ہاتھ لگتا ہے، اگر ہاتھ ہنر مند ہوں تو وہ اس کویے کو گرم پانی کی گرماہٹ سے نرم چکیلے چکیلے ریشم میں بدل دیں۔ لیکن اگر ہاتھ اناڑی ہوں تو وہ اس خول کی چمک دمک کو ہی عزیز جان لیں، یہاں تک کہ کیڑا خود ہی کویا توڑ کر باہر آ جائے، پھر نہ ہی ریشم بچتا ہے نہ ہی کیڑا ہاتھ آتا ہے۔

ریشم کی ماں نے بھی اسے زمانے کی گرم ہواؤں سے بچا کر رکھا تھا۔ اسے اپنی بیٹی کی ظاہری چمک دمک ہی عزیز تھی، تب ہی تو نہ وہ نرم اور چکیلی بن سکی نہ ہی گھر کی چار دیواری میں قید رہ سکی۔

گھر کے کام...... ایک عذاب تھا جو اس پہ مسلط کیا گیا تھا۔

آج کھانا بنانے کی باری اس کی تھی۔ پچھلے دن جو اس نے صفائی کی تھی اس پہ اس کی ساس کی بڑبڑاہٹیں کل سے جاری تھیں۔ اس وقت اسے شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ کاش خاقان کی ایک بہن سے ہی دوستی کر لیتی تو وہ ہی مدد کو آ جاتی۔

''لو اماں دیکھو تمہاری بہو پیاز کاٹ رہی ہے۔'' تمثیلہ نے مشین سے کپڑے نکالتے ہوئے کہا۔

''ہاں دیکھ رہی ہوں، کاٹ نہیں رہی ضائع کر رہی ہے رزق۔'' ریشم کا چہرہ پانی سے تربتر تھا۔ ناک بہہ رہی تھی اور ہاتھ پہ ایک دو کٹ بھی آ چکے تھے۔

''تو آ کر خود کاٹ لو۔'' اس نے بھی غصے سے چھری پٹخی۔

''اللہ معاف کرے، ماں نے دو ہی کام سکھائے یا تو زبان چلا لو یا معاشقہ...... اور کچھ نہیں سکھایا کیا؟'' انہوں نے طنزیہ کہا تو ریشم نے غصے کو دبا لیا۔ خاقان نے اب تک یہی تو سمجھایا تھا کہ کبھی اماں ابا سے بدتمیزی نہ کرنا، اسی لیے وہ ان کا لحاظ کر گئی۔

''جا تمثیلہ تو بنا لے ورنہ آج کھانا نہیں ملے گا۔'' بڑی بی نے جب سے بیٹیوں کو گھر داری سکھائی تھی خود یوں ہی کبھی صحن میں کبھی برآمدے میں تخت پہ بیٹھی کاموں کی نگرانی کرتی تھیں۔

''شرم کرو، مجھ سے تین سال چھوٹی ہو، نند نہ سمجھو لیکن بڑے ہونے کا لحاظ تو کرو۔'' تمثیلہ برآمدے میں کچن کے دروازے پہ آ کر بولی۔

''ہنہہ......'' ریشم نے بھی استہزا سے چہرہ جھٹکا۔

''لو اماں! پھر آج ابا اور خاقان کو دیکھ لینے دو اس کی کارکردگی۔'' تمثیلہ ثروت کی پکی دوست تھی۔ اسے بچپن سے ہی اترائی، ناک چڑھائی ریشم زہر لگا کرتی تھی۔ وہ جو مدد کے خیال سے آئی تھی، غصے میں دوبارہ پلٹ گئی۔

ریشم کو غلطی کا احساس ہوا لیکن ڈٹی رہی۔ ایک آلو مٹر کا سالن ہی تو تھا، بنا لے گی جیسے تیسے کر کے۔ لیکن یہی آلو مٹر اس کے کس بل نکال گئے۔ دوپہر کے کھانے میں عجیب دغریب ملغوبہ دیکھ کر

خاقان کا تو جی متلانے لگا۔ ابا نے بھی ایک دو لقموں کے بعد ہاتھ روک لیا۔

"میرے ہاتھ زخمی ہوگئے، جل بھی گئے اور آپ مجھے باتیں سنا رہے ہیں۔" ریشم کھانے کے بعد سے کمرے میں بند تھی۔

خاقان نے ان نرم ہاتھوں کو سہلانا شروع کردیا۔ "تم تمثیلہ سے کہہ دیتیں، وہ مدد کروا دیتی۔ بلکہ میں اسے کہہ دیتا ہوں۔ تم فکر نہ کرو وہ اور سمیعہ تمہیں سب کچھ سکھا دیں گی۔"

"نہیں، رہنے دیں، میں دیکھ لوں گی۔ ویسے میرے کرنے کی ضرورت تو نہیں، پہلے ہی وہ دونوں سب کچھ کر تو لیتی ہیں۔ چھوٹی بھی اسکول سے آکر ان کی مدد کروا دیتی ہے۔"

"لیکن میرا دل تو یہ کرتا ہے نا کہ میرے سب کام تم کرو، میں آفس سے آکر تمہیں پکاروں، کھانا، چائے مانگوں۔"

"ہائے اللہ پھر نوکرانی لے آتے، میری کیا ضرورت تھی۔"

"یہ ضرورت نہیں، مان ہے مان۔" خاقان نے اس دن تو اسے بہلا لیا۔ لیکن آئندہ آنے والے دن کسی کے لیے بھی خوش گوار نہیں تھے۔

☆☆☆

روٹھنا منانا، رونا دھونا، لڑنا جھگڑنا...... بس یہی سب تھا جو اس گھر کا معمول بن گیا تھا۔ صرف چھ مہینے میں ہی سب کی بس ہوگئی۔ خاقان اپنے گلے پڑا ڈھول بجانے پہ مجبور تھا، ورنہ ریشم اب دل سے اترتی جا رہی تھی، آخر وہ کب تک اس کے حسن کو خراج پیش کرتا۔

ریشم کا خمار بھی اُتر گیا۔ اس دیوی کو بھی ایک پجاری چاہیے تھا جو اسے پوجتا رہتا۔ پرستش کرنا تو ایک طرف اس کا تو حسن ہی کملا کر رکھ دیا تھا خاقان کی ذمہ داریوں نے۔ ماں بہنوں نے ریشم سے نوک جھونک کا بدلا کچھ یوں لیا کہ خاقان کے ہر کام سے ہاتھ اٹھا لیا۔

ماہنامہ حنا
بہنوں کا اپنا ماہنامہ
لاہور

جولائی 2018 کے شمارے کی ایک جھلک

☆ "ہتھیلی کا چاند" سباس گل کا مکمل ناول،
☆ "عید کے رنگ" فوزیہ سرور کا مکمل ناول،
☆ "بندھن" فروش شہک کا مکمل ناول،
☆ "[illegible]" بشریٰ سیال کا ناولٹ،
☆ "شہر دل کا راستہ" [illegible] کا ناولٹ،
☆ "چمکتا چاند" نائلہ طارق کا ناولٹ،
☆ "دل گزیدہ" اُم مریم کا سلسلے وار ناول،
☆ "پربت کے اس پار کہیں" نایاب جیلانی کا سلسلے وار ناول،
☆ وجیہہ بخاری، نادیہ جہانگیر، سویرا فلک، فرحت انصاری، فصیحہ آصف اور شبانہ شوکت کے افسانے،

پیارے نبی ﷺ کی پیاری باتیں، انشاء نامہ،
تمام مستقل سلسلوں کے علاوہ وہ سب کچھ جو
آپ پڑھنا چاہتے ہیں

جولائی 2018

خاقان کی آمدنی محدود تھی جو ساری گھر پہ خرچ ہو جاتی۔ ریشم کے لیے کچھ بچتا ہی نہیں تھا۔ چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لیے دل مارنا کسے کہتے ہیں یہ سمجھ میں اب آیا تھا۔

باہر والوں کی نظریں تو اسی گھر پہ ٹکی رہتی تھیں۔ روز نیا معرکہ ہوتا اور چٹ پٹی خبریں محلے میں ونڈی کی چیز کی طرح گردش کرتیں۔ سن گن لینے والی عورتوں کا تانتا بندھا رہتا اور نہیں تو ساتھ والے گھر کی چھت پہ محفل جمی رہتی کہ صحن میں کچھ ہو تو وہ سب براہِ راست ملاحظہ کریں۔ خاقان کے ابا نے زندگی میں اتنی بدنامی کا سامنا نہیں کیا تھا، جس گھر سے بیٹی کی ہنسی کی آواز بھی باہر نہ جاتی ہو۔ اب اس گھر کی خبریں سات محلوں تک سنی جاتی تھیں۔

''خاقان تُو نے میرے سر میں خاک ڈلوادی۔ مجھے بتا تو میرے کس گناہ کی سزا ہے۔ تمثیلہ کا رشتہ دیکھنے والے یہ کہہ کر چلے گئے تھے کہ انہیں عزت دار گھرانے میں رشتہ کرنا ہے۔

یااللہ تُو تو رحم کرنے والا ہے، مجھ پہ رحم کر، میرا پردہ ڈھک لے۔ اب اور ہمت نہیں ہے مجھ میں۔ تو رحم کردے مولا تو رحم کردے۔'' ڈرائنگ روم میں ہی موت کی دعا کرتے کرتے ابا نیچے گر پڑے۔ ان پہ فالج کا حملہ ہوا تھا۔

ابا کی آہ و بکا دو دن ریشم کے کانوں میں گونجتی رہی۔ خاقان کے ابا کا درد اسے پہلی بار محسوس ہوا۔ کیا وہ اور خاقان اتنے برے تھے کہ وہ شرفاء کے زمرے میں ہی نہیں آتے تھے۔

اس کا دل پسیج گیا۔ ہسپتال سے آنے کے بعد اس نے ابا کو یخنی پلانا چاہی تو تمثیلہ اور سمیعہ اس کے بال پکڑ کر اس کے کمرے میں گھسیٹ کر لے گئیں۔

''اب کیا ابا کی جان لو گی تم۔ تمہارا دل نہیں بھرتا یا ابھی ہمارا اور خون پینا ہے۔ ایسا کرو ایک ہی دفعہ ہم سب کے گلوں پہ چھریاں چلا دو شاید تمہاری پیاس بجھ جائے۔''

ریشم نے پہلی بار سب چپ چاپ سن لیا۔ اس کی ذہنی رو اپنے ماں باپ کے گھر جا بھٹکی۔ کیا اس کے ابا بھی اسی حال میں ہوں گے؟ ان پہ کیا بیت رہی ہو گی؟ وہ شادی سے اب تک ان سے خفا رہی تھی۔ اب اس کا دل اس خیال سے پھٹنے لگا کہ خدانخواستہ اس کے اماں ابا کو کچھ ہو نہ گیا ہو۔ وہ اسی عالم میں گھر سے نکل بھاگی۔

اب وہ تیسرے گھر کا دروازہ پیٹ رہی تھی۔ راہ گیر اسے رک کر دیکھنے لگے، کھڑکیاں کھل گئیں۔ جس گھڑی کا انتظار سب محلے والوں کو تھا کہ آخر کب ریشم کو اس گھر سے دھکے مار کر نکالا جائے گا، وہ شاید آ گئی تھی۔ تایا کا چھوٹا لڑکا جو دروازے کے پار کھڑا تھا کہ ماں کا حکم تھا کہ دروازہ نہیں کھولنا اس نے ایک بار پھر ماں کی طرف دیکھا۔

ریشم دروازہ پیٹ رہی تھی اور ایسے پیٹ رہی تھی کہ یا تو دروازہ توڑ دے گی یا پھر یہیں مر جائے گی۔ تائی غضب ناک ہوتی آئیں۔ دروازہ کھول کر ریشم کو اندر گھسیٹا۔ دھاڑ سے دروازہ بند کیا اور ایک زوردار تھپڑ اسے دے مارا۔ ریشم نیچے جا گری۔

''وہاں سے بھاگ کر آ رہی ہے یا انہوں نے نکال دیا۔'' اس وقت ریشم کا بھی دل کیا، سسر کی طرح آہ و بکا کرے اور رحم مانگ لے۔

''بتا اب کیا گل کھلا دیا تو نے جو انہوں نے نکال دیا۔''

''مجھے کسی نے نہیں نکالا، بس یہ بتا دیں کہ اماں ابا کیسے ہیں؟ میری بات کرا دیں اماں سے۔'' زمیں پہ بیٹھی، ہاتھ جوڑ کر منّت کرتی ریشم وہ ریشم نہیں تھی جسے وہ جانتی تھیں۔

''اماں......'' تائی کے بیٹے سے ریشم باجی کا حال دیکھا نہ گیا۔ دل تو تائی کا بھی پسیج گیا۔ شروع کے دو مہینوں کے بعد سے تو خاقان کے ساتھ بھی آتے جاتے نہیں دیکھا تھا اسے کسی نے۔ سننے میں یہی آیا تھا کہ ساس نے منع کیا ہے اسے باہر آنے جانے سے۔ چھ سات مہینوں میں ہی ہڈیوں کا ڈھانچا بن گئی تھی۔ حسن کو جیسے گرہن لگ گیا تھا۔ انہوں نے

اسے بازو سے پکڑا اور اندر لے گئیں۔

''تائی! بس اماں ابا سے بات کروا دیں۔ میں واپس چلی جاؤں گی۔ مجھے وسوسے آرہے ہیں۔ اللہ کا واسطہ اماں کی بس آواز سنوا دیں۔ میں بات بھی نہیں کروں گی۔ بس آواز سن لوں گی۔''

تائی کے دل میں بڑی کدورت تھی ریشم کے لئے اس کی ماں کے لیے۔ لیکن اس لمحے ان کا دل بدل گیا۔ وہ تائی سے ماں بن گئیں۔ انہوں نے اسے زور سے خود میں بھینچ لیا۔

''بس کر جا ریشم! بس کر جا، بھول جا نہیں۔''

دروازہ پھر دھڑ دھڑایا جانے لگا۔ دروازہ کھلنے پہ خاقان جن تیوروں سے اندر داخل ہوا تائی بہت کچھ سمجھ گئیں۔

''ریشم گھر جا اور زبان مت چلانا خاقان سے۔ خبردار جو آگے سے ایک لفظ بھی کہا۔ میں کل ملنے آؤں گی تجھ سے۔''

ان کی بات بھی پوری نہیں ہوئی تھی کہ خاقان اسے بازو سے پکڑ کر لے گیا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی اس نے دروازہ بند کیا اور ریشم کو زوردار تھپڑ دے مارا۔

''میری اجازت کے بغیر آئندہ تم اس گھر سے قدم بھی باہر نہیں نکالو گی۔''

ریشم گال پہ ہاتھ رکھے اپنے محبوب کو دیکھ رہی تھی، ایک یہی تو آسرا تھا کہ خاقان میرا ہے، میرے ساتھ ہے۔ اب وہ تنکا سا آسرا بھی پاس نہ رہا تو وہ ڈوبنے لگی۔ اس کا دل بند ہونے لگا۔ ناک میں جیسے ڈھیر سارا پانی چلا گیا۔ چہرہ جو تر بتر تھا آنسوؤں سے۔ تائی نے کہا تھا زبان نہ چلانا۔ وہ تو کسی قابل رہی ہی نہیں تھی۔ ڈیوڑھی میں کھڑی ریشم کو دیکھ کر برآمدے میں کھڑی تمثیلہ کے دل میں سکون اتر گیا۔ کیونکہ سزا اس نے بھی بھگتی تھی خاقان کی بہن ہونے کی۔ خاقان کمرے میں بند ہو چکا تھا۔

☆☆☆

گرم کھولتا ہوا پانی تھا جو اس پہ ڈالا جا رہا تھا۔ لیکن اس کا بدن نہیں دل جل رہا تھا۔ تپش سے وہ پگھلنے لگی۔ آگ کہیں نہیں تھی، بس پانی تھا، جس کا کنارہ کہیں نہیں تھا۔ ایک گرم آبشار اسے موم کی طرح پگھلا رہی تھی۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ بس پانی گرنے کی آواز تھی۔ قطرہ قطرہ، وہ پانی کا حصہ بننے لگی کہ کسی نے اس کے لمبے بالوں کی چٹیا پکڑ لی۔ دہشت سے وہ چیخنے ہی والی تھی کہ مانوس آواز اس کی سماعت کا حصہ بنی۔

''بس ریشم! یہ ضروری ہے۔ بس تھوڑی دیر اور برداشت کر لے۔ گھبرا نہ میری بچی، میں ہوں تیرے ساتھ۔''

اس نے جھٹکے سے آنکھیں کھول دیں۔ خاقان کروٹ بدلے سو رہا تھا۔ کل سے وہ خفا تھا، حالانکہ خفا ہونے کا حق تو ریشم کو تھا لیکن اب سب بدل گیا تھا۔ وہ بھی شاید بدل رہی تھی۔

وہ سمجھ نہ پائی کہ وہ کس کی آواز تھی۔ لیکن دوپہر کو سب سمجھ میں آ گیا۔ جب وہ خاقان کے کپڑے دھو رہی تھی تو وہی آواز ساس سسر کے کمرے سے آ رہی تھی۔

''بانو بہن میں شرمندگی میں نہ آسکی ورنہ تیرا میرا بہناپا تو کسی سے ڈھکا چھپا نہیں تھا۔'' تائی ہاتھ جوڑے اس کی ساس سے معافی مانگ رہی تھیں۔ ریشم کا دل بھر آیا۔ کتنے لوگوں کا سر نیچا کروایا تھا ان دونوں کی شادی نے۔ بڑے جو سر پہ شفقت سے ہاتھ رکھا کرتے تھے، اب ہاتھ جوڑتے تھے۔

''فضیلہ بھابھی! بس آپ مجھے شرمندہ کر رہی ہیں آپ کی کیا غلطی؟ بس غلطی تو کسی کی بھی نہیں تھی شاید ایسا ہی ہونا لکھا تھا۔ جنہیں شرمندہ ہونا چاہیے وہ تو بیانگ دہل پھر رہے ہیں۔'' تائی کے ہاتھ پکڑ کر وہ رو پڑیں۔

''بس اللہ کا کرم ہے کہ اس نے مجھے بیوگی سے بچا لیا۔ ورنہ شادی کے بعد سے ایک دن چین سے نہیں سوئے تھے شاہ صاحب۔ ہمارا بھی بیٹیوں والا گھر ہے۔ ساری عمر دعا کرتے رہے کہ اللہ عزت کی

حفاظت فرمائے۔ تہجد میں اٹھ اٹھ کر دعا کرتے تھے بیٹیوں کے نیک نصیب، نیک چلن کی۔ لیکن عزت کو بٹہ لگا بھی تو کہاں سے، بیٹے نے کہیں کا نہ چھوڑا۔ کیسی میری حیا والی بیٹیاں اور اب لوگ کہتے ہیں عزت داروں میں رشتہ کریں گے۔" تائی فضیلہ کے گلے لگ کر اس کی ساس کے بین، اس تک بخوبی پہنچ رہے تھے۔

کوئی گھنٹے بعد تائی فضیلہ کمرے سے باہر نکلیں۔ وہ برآمدے پہ تخت کے کنارے بیٹھی جیسے ان ہی کی منتظر تھی۔

"کل سے میرے دل کو پتنگے لگے ہوئے تھے خاقان جس طرح غصے میں آیا تھا، زیادہ گرما گرمی تو نہیں ہوئی؟" ریشم کے چہرے پہ انگلیوں کے نشان سب کہانی سنا رہے تھے ریشم ان کے گلے لگ کر رو پڑی۔

"بس صبر کر میری بیٹی! میں نے بانو سے اجازت لے لی ہے۔ کل سے آ جایا کرنا میرے گھر۔"

اور پھر زندگی کے نئے باب کا آغاز ہو گیا۔

☆☆☆

ہمیشہ سنا تھا تائی فضیلہ بڑی سخت ہیں۔ سارا بچپن ان سے ڈر کر گزارا تھا۔ جب وہ تایا کے گھر آ کر اچار کے مرتبانوں میں ہاتھ ڈالتی۔ چٹنیاں مربے چھت پہ چھپ چھپ کھا لی تھی تو تائی کی دھاڑ سے پورا گھر دہل جاتا تھا۔ لیکن وہ بھی باز نہیں آتی تھی۔ اب اس کے گھر میں یہ مزے کی چیزیں تھوڑی بنتی تھیں۔

اب سمجھ میں آیا تھا کہ ثروت باجی، تارا باجی پہ سختی کیوں کرتی تھیں۔ کیوں ہر وقت کاموں میں لگائے رکھتی تھیں۔

کتنی خوش تھیں تارا باجی اپنے گھر میں۔ ثروت باجی بھی سنا تھا دبئی جانے والی ہیں۔

"چل ریشم سالن بھون۔ چمچ چلاتی جا۔ مسالہ نیچے نہیں لگنا چاہیے۔" ریشم نے تابعداری سے سر ہلایا۔

"کچن ساتھ ساتھ ہی سمیٹ لینا اور ہانڈی بھی جاتے ہوئے آدھی ساتھ لے جانا۔" ریشم نے جلدی سے مسالا بھونا اور پھر پیاز کے چھلکے شاپر میں ڈالنے لگی۔

شروع شروع میں تایا جی اسے دیکھ کر منہ پھیر لیتے تھے۔ لیکن خون میں بڑا اثر ہوتا ہے، وقت گزرا تو وہ بھی نرم پڑ گئے۔

"چائے بنا دے ریشم! میں سمو سے لایا ہوں تیرے لیے۔" وہ سالن بنا کر فارغ ہوئی تو تایا جی نے کچن میں آ کر شاپر اس کے حوالے کیا۔ اس نے بھی جلدی سے پکڑا اور چائے بنانے لگی۔ اگر اس کی اماں اسے دیکھ لیتیں تو کہتیں۔ "میری بیٹی کو نوکرانی سمجھ لیا ہے" لیکن ریشم کو میکے کا مان مل گیا تھا۔ جب سے تائی نے اس کے سر پہ ہاتھ رکھا تھا، چیزیں بدل رہی تھیں۔ تائی اسے کھانا بنانا، گھر سنبھالنا، شوہر کے دل پہ راج کرنا سکھا رہی تھیں اور اسے لگ رہا تھا کہ خاقان پھر سے اس سے محبت کرنے لگا ہے۔

"چھوٹی! یہ دیکھو میں گلاب جامن لائی ہوں۔" گھر آ کر اس نے چپکے سے چھوٹی کو گلاب جامن دیں۔ سمعیہ اور چھوٹی سے اس کی دوستی ہو گئی تھی، گو کہ ساس کی اور تمثیلہ کی کوشش یہی ہوتی تھی کہ دونوں اس کی صحبت سے دور رہیں جیسے وہ اچھوت تھی۔ لیکن ایک ہی گھر تھا۔ آخر کتنا پردہ ممکن تھا۔ چھوٹی نے گلاب جامن کھائی اور اس کے گلے سے لگ گئی۔ "میں سمعیہ باجی کو بھی دیتی ہوں۔" وہ بھاگ کر کمرے میں چلی گئی۔

اماں ابا کی یاد کسک بن کر رہ گئی تھی، لیکن زندگی بھی رکی نہیں تھی۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ زندگی وہ جام ہے جو پل پل ذائقہ بدلتا ہے۔ نہ تو کبھی ایک سا رہا ہے نہ ہی رہے گا۔ کبھی کڑوا تو کبھی شہد۔

وہ لمحہ بھی شہد گھونٹ ہی تھا جب اسے نئی زندگی کے پنپنے کی خبر ملی تھی۔ تائی نے کتنی دعائیں دی تھیں کہ جلدی سے اس کی گود میں ایک بیٹا آ جائے تو اس کے قدم جم جائیں گے۔

خاقان مٹھائی کا ڈبا لا کر اماں ابا کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ کتنا روشن چہرہ لگ رہا تھا خاقان کا۔ انہوں نے دروازے کی اوٹ میں کھڑی تمثیلہ کا تاریک چہرہ دیکھا۔ جس کی منگنی ٹوٹ گئی تھی۔ جس

کے نصیب پہ جیسے تالا ہی لگ گیا تھا۔ ابا جو اب اٹھ کر بیٹھ جاتے تھے، تھوڑا چل پھر بھی لیتے تھے۔ انہوں نے مٹھائی اٹھالی۔ اماں نے بھی دل توڑنا مناسب نہیں سمجھا اور منہ میٹھا کر کے دعا دی۔

"خاقان مجھے نہیں دے گا۔" تمثیلہ اس کے پیچھے آ کھڑی ہوئی۔

"تیرے لیے تو اسپیشل کھوئے والی برفی ڈلوائی ہے۔" اس نے ڈبا آگے کیا۔

اس نے بھی ایک پھر دو ٹکڑیاں کھائیں۔

"اللہ کرے خاقان! تیرے گھر بیٹی پیدا ہو بالکل تیری بیوی کے جیسی۔" اپنا منہ میٹھا کر کے وہ خاقان کا منہ کڑوا اور دماغ زہریلا کر گئی۔ ریشم سے محبت اپنی جگہ لیکن پھر وہ اٹھتے بیٹھتے دعائیں کرنے لگا کہ بیٹی نہ ہو۔

☆☆☆

تمثیلہ کی دعا پوری ہو گئی تھی۔ اور کیا خوب پوری ہوئی تھی۔ اللہ نے ایک کے بعد ایک بیٹی بھیجی تھی۔

سسرال میں قدم جمانا تو دور کی بات، خاقان کا رویہ ہی بعض اوقات سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

تائی کے صحن میں بیٹھی وہ سیڑھیوں کو دیکھ رہی تھی جہاں اس کی تین اور چار سالہ بیٹیاں گڑیاں پکڑے کھیل رہی تھیں۔ ننھی بچیوں کے سر پہ کپڑوں کے ہم رنگ تکونے اسکارف بندھے تھے۔

"یہ لے "تلبینہ" کھا۔ تیرے دل سے غم کو اتار دے گا۔"

ریشم کے ابا کی وفات کو مہینہ ہو چکا تھا۔

"چل پکڑ، کھا لے چھوٹی بچی کا ساتھ ہے اپنے پہ اور اس پہ ظلم نہ کر۔" ان کا اشارہ اس کی گود میں چھ مہینے کی تانیہ کی طرف تھا۔

"تیرے بھائیوں کی مت تو ہمیشہ پٹھی ہی رہے گی۔ بات بات پہ مرنے مارنے پہ آ جاتے ہیں۔ تو دل برا نہ کر۔" ریشم کی آنکھوں میں وہ منظر گھوم گیا جب اس کے بھائیوں نے اسے باپ کا چہرہ بھی نہیں دیکھنے دیا تھا۔

"تیری ماں منوا لے گی اپنی۔ آخر کو بیٹی ہے تو اور اس کا دل کتنا تڑپا ہے یہ میں جانتی ہوں۔"

ہاں منوا تو لی تھی اس کی ماں نے، تب ہی تو اسے گھر میں داخل ہونے کی اجازت ملی تھی اور وہ گھر تو اس کے ابا کا تھا بھی نہیں۔ بھائیوں نے نئے گھر بنوائے تھے، چار بالکل ساتھ ساتھ۔ اب اس کا دھیان ان گھروں کی طرف چلا گیا۔ نئی نئی کالونی بنی تھی، کتنے عالی شان گھر تھے۔ اس کی چار سالہ پاکیزہ جو تایا تائی کو ہی نانا نانی سمجھتی تھی، کتنی حیران ہوتی تھی اتنے بڑے گھر دیکھ کر۔

"کھا بھی لے، اب ٹھنڈا ہو جائے گا۔"

"بس اپنی بیویوں کے پیچھے لگے ہیں، تیرے تایا سے کہا ہے وہ سمجھائیں گے انہیں۔ چھوٹی سی تو تھی تو۔ غلطی ہو گئی اور سزا بھی کتنی بھگتی تو نے۔ خون کے رشتوں میں جینا مرنا بھی کبھی ختم ہوا ہے۔" یہ کہہ کر انہوں نے اون سلائی اٹھالی۔

"تمثیلہ کا سنا وہ خوش ہے اپنے گھر میں۔ سمعیہ تو جب سے پچھلا ہوا ہے آئی ہی نہیں۔"

ریشم نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ "اگلے ہفتے آئیں شاید دونوں، اباجی (سسر) کی برسی ہے نا۔"

"یہ دیکھ سال کے بچے کا بنا رہی ہوں میں۔" گلابی رنگ کا فراک انہوں نے ریشم کے آگے کیا۔ "ثروت کی بیٹی کا اور تانیہ کا ایک جیسا بناؤں گی۔ اس سال سردیوں میں آئے شاید وہ۔ دونوں بہنیں پہنیں گی تو جڑواں لگیں گی۔" ریشم کی نم آنکھوں نے فراک کو دیکھا تو بچیوں کا تصور کر کے مسکرا دی۔

تائی نے بنتے ہوئے گھر ادھیڑنا شروع کر دیے۔ "ہائے گنتی ہی بھول گئی۔" پھر دوبارہ بننا شروع کر دیے۔

کوئی دس منٹ بعد انہیں اندازہ ہوا کہ پچھلی قطار میں انہوں نے دو گھر ہی چھوڑ دیے تھے۔ وہ پھر ادھیڑنے لگیں۔ "نظر ہی ساتھ نہیں دیتی میرا۔ ورنہ اپنے بچوں کے لیے شاپر بھر بھر سویٹر بناؤں میں۔"

"چھوڑیں تائی! کیوں اتنی محنت کر رہی ہیں۔"

مجھے بتائیں میں ثروت باجی، تارا باجی کے بچوں کے لیے سویٹر خرید لاؤں گی۔"

"ریشم محنت ہی تو ہے۔ ایک یہی تو ہے جو انسان کے بس میں ہے۔"

"ماما! یہ کیا ہے۔" پاکیزہ اور مشال دوڑتی ہوئی اس کے پاس آئیں۔ "یہ دیکھیں، نانی کے درخت سے گرا ہے۔"

ریشم نے اتنی عجیب بات سنی تو ہاتھ آگے بڑھایا۔

واقعی چھوٹا سا انڈا تھا۔ تائی نے بھی غور سے دیکھا۔

"انڈا نہیں ہے یہ کویا ہے۔"

"یہ کیا ہوتا ہے تائی؟"

"اس سے ریشم بنتا ہے اس کے اندر کیڑا ہے۔"

"او......" دونوں بچیاں جھرجھری لے کر پیچھے ہٹیں۔ ریشم نے بھی فوراً سے اسے زمین پہ گرا دیا۔

"لو۔ ساری کی ساری جھلیاں ہی ہیں۔ ایسے نہیں باہر آتا یہ۔" تائی ہنسنے لگیں۔

"ہائے......" کچھ سوچ کر انہوں نے ریشم کی طرف دیکھا۔

"تجھے پتا ہے ریشم کے کیڑے اور مکڑی میں فرق "نیت" کا ہوتا ہے۔ مکڑی جان لینے کے لیے، شکار کرنے کے لیے جالا بنتی ہے اور سب سے ناپائیدار گھر بنتی ہے۔ ریشم کا کیڑا اپنی ارتقاء اپنی افزائش کے لیے جال بنتا ہے اور کیسا شاندار گھر بنتا ہے۔ جان لڑا دیتا ہے اپنی لیکن دنیا کو کیسا ملائم، کیسا نایاب تحفہ دے کر جاتا ہے۔

اپنی نیت صاف کر لے۔ بس اپنی بچیوں پہ محنت کر، دیکھنا یہ کیسے تیری آنکھوں کی ٹھنڈک بنیں گی۔"

وہ پھر سے سلائیاں پکڑ کر ادھیڑ کر نئے گھر بننے لگ گئیں۔ ریشم نے انہیں دیکھا، بہت غور سے دیکھا اور پھر اس نے بھی جان لڑا دی اور زندگی کی ڈگر کی سلائیاں پکڑ لیں، خانے بننے شروع کر دیے۔ جہاں گنتی بھول جاتی تو ادھیڑ کر پھر شروع ہو جاتی۔ بڑی کڑی نظر رکھی تھی بیٹیوں پہ۔ لیکن اگر نظر چوک جاتی تو ادھیڑ کر رکھ دیتی، بیٹیوں کو بھی اور خانوں بھی۔ کس بیٹی کو کتنا کسنا ہے اس نے تائی سے سیکھا تھا۔ اون کو اور بیٹیوں کی شخصیت کو ایک خاص زاویے ایک خاص تناؤ سے بنا تھا انہوں نے۔ نہ تو ان کے سویٹروں میں جھول تھے نہ ہی بیٹیوں میں۔

☆☆☆

ریشم نے پاکیزہ کو دیکھا جو چائے کی ٹرے اٹھا کر باہر جا رہی تھی۔ ریشم نے فخر سے اپنی بیٹی کو دیکھا۔ پاکیزہ نے چائے رکھی۔ آج تو اس کے پاؤں بھی زمین پہ نہیں ٹک رہے تھے۔ صبح سے ہی مبارکباد دینے والوں کا تانتا بندھا تھا۔ ابھی بھی پھپھیاں آئی ہوئی تھیں۔

"پھپھو یہ کروکیٹس لیں، میں نے بنائے ہیں۔" پاکیزہ نے پلیٹ چھوٹی پھپھو کے آگے کی۔

"دادو آپ کی چائے میں چینی نہیں ہے۔"

پھر کپ دادی کے ہاتھ میں دیا۔

آج تو نصیبوں والا دن چڑھا تھا۔ دادی نے پہلی بار پوری دلی آمادگی سے پوتی کو گلے لگایا تھا، اسے پیار کیا تھا۔

ریشم نے دل میں اپنے رب کا شکر ادا کیا پھر اس کی نظریں خاقان کی نظروں سے ٹکرائیں۔ ان آنکھوں میں بھی خوشی اور فخر نمایاں تھا۔

جب صبح وہ گزٹ چیک کرنے جا رہا تھا تو کتنا سنجیدہ سا تھا۔ گو کہ پتا تھا کہ بیٹی لائق ہے لیکن اتنی لائق ہے یہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔

علاقے کے دو گورنمنٹ اسکولوں اور تین پرائیوٹ اسکولوں میں سب سے زیادہ نمبر اس کی بیٹی نے لیے تھے۔ اسکول میں تو ٹاپ کیا ہی تھا۔ بورڈ میں بھی دسویں پوزیشن لی تھی۔

محلے والوں نے تو اسی وقت مٹھائی کا مطالبہ کر دیا۔

بس تبھی سے مہمانوں سے گھر بھرا ہوا تھا۔

پاکیزہ بہت خوش تھی کیونکہ آج باپ کی آنکھوں میں غصہ نہیں تھا بلکہ وہ سب کو فخر سے بتا رہا تھا کہ اس کی بیٹی اس کا مان، اس کا فخر ہے۔

اسی وقت ریشم کے منجھلے بھائی، بھابھی بھی آ گئے۔ ایک کمی تھی جو پوری ہو گئی۔

پاکیزہ کی مٹھی ایک بار پھر سے گرم ہو چکی تھی۔ اس نے وہ پیسے بھی ماں کو جا کر دے دیے۔ اس کی ممانی کی نظروں نے اس کا پیچھا کیا تھا۔

"خاقان بھائی! یہ مٹھائی میں پاکیزہ کی کامیابی کی خوشی میں نہیں لائی۔" خاقان اور ریشم کے ساتھ سب ہی متوجہ ہو گئے۔

"میں تو اپنی بیٹی مانگنے آئی ہوں اور اسی مٹھائی سے منہ میٹھا کر کے جاؤں گی۔ بھرے مجمعے میں بڑے مان سے کہہ رہی ہوں۔"

سب ایک دوسرے کی شکلیں دیکھنے لگے۔ کسی کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ ریشم نے خاقان کو دیکھا۔ کیسے دونوں میاں بیوی کی سانسیں اٹکی رہتی تھیں بیٹیوں کی شادی کا سوچ کر۔ کتنی مشکل سے اس گھر کی بیٹیاں بیاہی گئی تھیں۔ کیسے کیسے طعنے سنے تھے انہوں نے۔

جیسے بھی خاقان کے ابا تہجد میں دعائیں مانگتے تھے۔ ریشم گواہ تھی، خاقان کی بھی دعا مانگتے ہوئے ہچکی بندھ جاتی تھی۔ ریشم کی دعائیں بھی ایسی ہی ہوتی تھیں جو بویا تھا اسے کاٹنے کی ہمت اب نہیں تھی۔ بلکہ وہ تو کاٹ ہی رہے تھے۔ پچھلے سترہ سالوں سے۔

ریشم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ خاقان کی آنکھوں میں بھی اقرار کا عندیہ پا کر وہ تو خوشی سے ہی جھوم اٹھی۔

"اماں اجازت ہے؟" خاقان نے ماں کی طرف دیکھا۔

"گھر کا بچہ ہے۔ کیسا لائق پڑھا لکھا۔ اللہ آسانیاں پیدا کرے۔"

اماں کا یہ کہنا تھا کہ ریشم کی بھابھی نے خود ہی ڈبا کھولا اور سب کا منہ میٹھا کروا دیا۔

خوشیوں بھری وہ شام اس گھر میں ٹھہر سی گئی تھی۔

اور پھر کتنے ہی پہر کتنے ہی دن کتنے ہی مہینے وہ گھڑی ٹھہری ہی رہی۔ تب تک جب تک پاکیزہ رخصت نہیں ہو گئی۔

☆☆☆

اللہ نے اسے ایک پری عطا کی تھی۔ جسے اس نے پاؤں پاؤں چلنا سکھایا۔ جس کی توتلی زبان کو اس نے فصاحت سکھائی۔ جس کے سفید پروں کو اس نے سلیقے، قابلیت اور ہنرمندی کے رنگوں سے سجایا۔ پھر محبت کا تاج اس کے سر پہ رکھ کر اس کی پیشانی چومی۔ لیکن پھر وہ ڈر گئی کہ کہیں وہ پری اڑ نہ جائے۔ اور اُس کا ڈر اُس کی پری کو کھا گیا۔ اُس نے پری کے پر باندھ دیے۔ اسے اڑنے کے ہنر سے ناآشنا کر دیا۔ بس اُس کا خوف اس کی پری کا زنداں بن گیا۔

"ماما! میں کیا کروں، میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ میرا ہر ہنر میرا ہر کمال ان سب کی نظروں میں بے کمال ہے۔ میرا ہر عمل قابلِ اعتراض ہے۔ ان کی بات ہی یہاں سے شروع ہوتی ہے کہ "جیسی ماں ویسی بیٹی" وہ....." اب فون پہ پاکیزہ کی ہچکیاں گونج رہی تھیں۔ ریشم کو پتا تھا وہ کون سا جملہ ہے جو اس کی بیٹی ادا کرنے سے جھجک رہی ہے۔

گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی کی بیٹی تھی وہ۔ اسے زمانہ کیسے بخش سکتا تھا۔

ہم سمجھتے ہیں کہ وقت بڑا مرہم ہے۔ ٹھیک ہے بالکل ٹھیک ہے۔ ہم سمجھتے ہیں وقت کے ساتھ ساتھ دنیا والے بھول جاتے ہیں۔ نہیں یہ غلط ہے بالکل غلط۔ دنیا والوں کی یادداشت اس دو مونہے سانپ جیسی ہے جو کنڈلی مارے بیٹھا ہوتا ہے جیسے ہی موقع ملے ڈس لیتا ہے۔

پاکیزہ کی ہچکیاں فون پہ گونج رہی تھیں اور ریشم کے بین اس کے دل میں ہی دم توڑ رہے تھے۔

اگر وہ خود اپنی پری کو اڑنا سکھاتی تو کیوں کر ممکن تھا کہ وہ بہک جاتی۔ قدم اٹھانا بھی تو سکھایا تھا

قدم تو نہیں بھٹکے تھے۔

☆☆☆

ہر دوسرے تیسرے دن اسے ایسے ہی فون موصول ہوتے تھے۔ ارحم بھابھی کا اکلوتا بیٹا تھا۔ انہیں ایک سگھڑ محبت کرنے والی دبو لڑکی بطور بہو چاہیے تھی۔ سولہ سالہ پاکیزہ ان کے معیار پہ پوری اتری تھی۔ تب ہی تو انہوں نے ایک دو سال کا وقت بھی نہیں دیا تھا۔ جھٹ پٹ شادی کی تھی۔

"ماما! ارحم کو ذرا ذرا سی بات پہ غصہ آجاتا ہے۔ میں کیا کروں۔ پہلے تو سب کو میرے ہاتھ کا کھانا بہت پسند تھا اب کسی کو اچھا نہیں لگتا۔"

کبھی کہتی "میری طبیعت بھی ٹھیک نہیں رہتی۔ اتنا بڑا گھر ہے ممانی نے کام والی بھی نکال دی۔ اماں کسی کو مجھ پہ ترس کیوں نہیں آتا۔"

ریشم کے دل پہ برچھیاں چلتی تھیں۔

خاقان گو کہ ایک سخت باپ تھا لیکن بیٹیوں میں اس کی جان تھی۔ وہ بھی سب جانتا تھا لیکن خاموش تھا۔ اب تہجد پڑھنے بیٹھتا تو فجر تک سجدے میں ہی گرا رہتا۔ یہ کیسی خار دار فصل تھی جسے بونے میں تو لمحے لگے تھے لیکن کاٹنے پہ آئے تو کٹتی ہی نہیں تھی۔ برس ہا برس گزر گئے، ایک حصہ کاٹتے تھے تو دوسرا سر کو آتا تھا۔ دونوں کو یقین ہو گیا تھا کہ جب تک سانسیں ہیں تب تک ان کے مقدر میں کانٹے ہی لکھے ہیں۔

ریشم خاقان کو امید سے دیکھتی۔ لیکن جب وہ بولا تو بس اتنا کہا کہ......

"اسے کہو۔ وہیں گزارا کرے۔ یہاں واپس آنے کے بارے میں مت سوچے۔ میرے کندھوں میں اور جھکنے کی سکت نہیں ہے۔ میں بس اس کے لیے دعا ہی کر سکتا ہوں۔"

اور پھر وہ وقت آگیا جب ریشم نے اپنی پری کو جادو کی چھڑی دینے کا فیصلہ کیا۔ "صبر" کی چھڑی۔ جو مفاہمت اور امن کے ستاروں سے سجی تھی۔

اب وہ فون پہ روتی دھوتی نہیں تھی۔ اس نے پاکیزہ کے بھی سبھی آنسو پونچھ دیے تھے۔ اب وہ اسے مشورے دیتی تھی۔ اسے وہ گر سکھا رہی تھی جو کبھی تائی، تارا باجی اور ثروت باجی کو سکھایا کرتی تھیں۔

اس نے اپنی پری کے کچلے پروں کو محبت سے اکٹھا کیا۔ اور فیصلہ کیا کہ وہ ان ریشمی پنکھوں کو اڑنا بھی سکھائے گی۔ اپنی بیٹیوں کے حق کے لیے آواز اٹھانا بھی سکھائے گی اور معاشرے میں سر اٹھا کر چلنے، اپنے حق کے لیے لڑنے کی آزادی بھی دے گی۔

اس نے مشال اور تانیہ کے پروں کو محبت سے سجایا پھر ان ریشمی پروں میں سلیقے، قرینے اور ہنر کے رنگ بھرے۔ محبت کا تاج ان کے سروں پہ رکھ کر ماتھے پہ بوسہ دیا اور پھر ان ریشمی زرتار آنچل جیسے پروں کو کھول دیا۔ انہیں پھڑ پھڑانے دیا۔ ان کے رنگوں کو ہوا کے دوش پہ پکا ہونے دیا۔ ان کے نگینوں سے سجے سروں کو شان سے اٹھنا سکھایا۔

خود اعتمادی کی چھڑی ان کے ہاتھوں میں پکڑا کر اللہ کا نام لے کر اس کی امان میں دے کر دنیا کے سپرد کر دیا اور پھر دنیا نے دیکھا، ریشم کی پریوں کی اڑان کو۔ وہ پریاں جن پہ دنیا رشک کرتی ہے، جن کی مثالیں دی جاتی ہیں۔ جو کبھی تندیٔ باد مخالف کے آگے گر بھی جائیں تو نازک پروں میں اڑان بھر کر پھر سے اڑنے لگتی ہیں۔

اس نشیب و فراز کی وادی...... جسے دنیا کہتے ہیں۔ وہ اس میں گرتی ہیں، چوٹ کھاتی ہیں، سنبھلتی ہیں لیکن ہار نہیں مانتی ہیں کیونکہ انہوں نے ماں باپ کا سر جھکنے نہیں دینا۔ ان کے والدین کے رعشہ زدہ زخمی ہاتھوں نے خار دار فصل بالآخر کاٹ ہی لی ہے۔ اب اس زمین پہ ریشمی آنچلوں جیسی فصل لہلہاتی ہے۔ خاقان بڑی محبت سے اپنی ریشم کو دیکھتا ہے جس کے آنچل نے اسے قید کر لیا تھا اور ریشم سجدہ شکر بجالاتی ہے کہ دیر سے ہی سہی لیکن اس نے صحیح رنگوں کا انتخاب کیا تھا۔

ہمارے رشتے

طاہرہ فردوس عبداللہ

”بھابھی! آپ کا سوٹ تو بہت اچھا لگ رہا ہے۔“ نادیہ نے نوشین بھابھی کے سوٹ کی تعریف کی تو میں نے بھی ستائشی انداز میں گردن ہلادی۔

”ہاں یہ پرنٹ تو مجھے خود بھی بہت پسند آیا تھا۔ سامہ میں بڑے اچھے پرنٹ آتے ہیں لان کے سوٹوں میں۔ میں تو ہمیشہ وہیں سے لیتی ہوں۔ کافی ورائٹی ہوتی ہے پھر قیمتیں بھی مناسب ہوتی ہیں۔“ بھابھی کے پاس تفصیلی جواب موجود تھا۔ حالانکہ نادیہ نے ’کہاں سے لیا؟، کتنے کا لیا؟ جیسا کوئی سوال بھی نہیں کیا تھا۔

”اچھا آپ سامہ سے لیتی ہیں۔ میرا تو جانا ہی نہیں ہوتا مارکیٹ۔ شہزاد اتنے مصروف رہتے ہیں۔ ساری گرمیاں یوں ہی نکل جاتی ہیں۔“ نادیہ نے بھی یوں ہی بات برائے بات کی۔

اس ساری گفتگو میں میری حیثیت ایک خاموش تماشائی کی سی تھی، جو میں نے خوش دلی سے خود منتخب کی تھی۔

”ہاں اپنے کاروبار میں تو انسان مصروف ہوتا ہی ہے۔ نو سے پانچ والی نوکری تو ہے نہیں۔ تم یہاں آیا کرو تو چلی جایا کرو بازار۔“ بھابھی نے نادیہ کا مسئلہ حل کر کے ہی رہنا تھا۔

”ارے بھابھی! بچے کہاں جانے دیں گے مجھے۔ وہ طوفان مچائیں گے۔ آپ لوگ پریشان ہوجائیں گی خواہ مخواہ۔“ گویا میکے آکر بازار نہ جانا نادیہ کا وہ احسان تھا جس پر مجھے اور بھابھی کو شکر ادا کرنا چاہیے۔ میں مسکرا کر رہ گئی۔

”ہاں واقعی یہ تو ہے۔ بچے بڑا ستاتے ہیں۔ ذرا چین سے نہیں بیٹھتے۔ میں خود جب امی کے ہاں جاتی ہوں، صرف تب ہی بازار جاتی ہوں۔ وہ بھی اس لیے کہ سنیعہ اور سدرہ ہوتی ہیں تو بچوں کو سنبھال لیتی ہیں۔“ شاید کہنے کا مقصد یہ تھا کہ میں

اس قابل بھی نہیں کہ ذرا سا ان کے بچوں کو دیکھ لوں۔ میں ایک دفعہ پھر مسکرا دی۔

''بھابھی! آپ تو سامہ جاتی ہی ہیں نا۔ ایک دو سوٹ میرے لیے بھی لا دیجیے گا۔ پرنٹ تو ویسے بھی آپ اتنے اچھے پسند کرتی ہیں۔'' نادیہ کا تو گویا مسئلہ ہی حل ہو گیا تھا۔

''ہاں چلو۔ اب کی بار جاؤں گی تو لا دوں گی۔'' بھابھی نے بھی نند کی محبت میں ہامی بھر لی۔ پھر یہ ہوا کہ وہ سوٹ لے آئیں۔ پرنٹ واقعی شان دار تھا۔ نادیہ کو بے حد پسند آیا۔ بھابھی خوش کہ نند نے شرف قبولیت بخش دیا۔ بھائی، بھابھی سے خوش کہ ان کی بیوی ان کی بہن کا اتنا خیال رکھتی ہے اور ساس صاحبہ بیٹے سے خوش کہ وہ بہنوں کا کتنا خیال کرتا ہے۔ اب اتنے خوش گوار ماحول میں بھابھی، نادیہ سے بھلا پیسوں کی بات کیسے کرتیں۔

''تم بھی نادیہ کا ایک آدھ جوڑا بنا دیا کرو۔'' پروفیسر صاحب نے اپنی بیوی ہونے کے ناتے مجھے بھی تلقین کی۔

''ہاں دینا تو چاہیے۔ آپ لے آیئے گا، میں دے دوں گی۔'' میں نے ہلکے پھلکے انداز میں جواب دیا۔ یہ بلا میں اپنے سر کیوں لیتی جبکہ اس کے نتائج کا مجھے اچھی طرح اندازہ تھا۔

☆☆☆

اگلے ہفتے نادیہ نے فون کر کے بھابھی سے کہا۔

''بھابھی یقین کریں۔ شہزاد کو بہت پسند آیا سوٹ۔ کہہ رہے تھے دو سوٹ اور منگوا لو۔ میرے لائے ہوئے پرنٹ تو تمہیں پسند ہی نہیں آتے۔ میں نے کہا، ہاں بھابھی سے کہہ دوں گی۔ وہ تو جاتی ہی ہیں، لا دیں گی۔

بس میں نے اسی لیے فون کیا تھا کہ آپ سے کہہ دوں۔ باقی سب خیریت ہے۔ عروبہ کی طبیعت کیسی ہے؟ امی بتا رہی تھیں، بخار ہو گیا تھا......'' پھر چند ادھر اُدھر کی باتیں کر کے نادیہ نے فون رکھ دیا گیا۔

بھابھی بے چاری بری طرح پھنس گئیں۔ میاں سے پیسے کیسے مانگتیں۔ وہ تو ساری تنخواہ ان کے ہاتھ پہ رکھتے تھے۔ ٹال بھی نہیں سکتی تھیں کہ نادیہ کی ہر دوسرے دن اپنی امی سے فون پر بات ہوتی تھی اور وہ یہ بات بھابھی کو یاد دلانا نہیں بھولتی تھیں۔ صاف منع کیسے کرتیں؟ محض ہفتہ بھر پہلے اپنے لیے سسرال میں پیدا کردہ خوش گوار ماحول مہینہ بھر تو باقی رہنا چاہیے تھا۔

بھابھی کی امی کا گھر سامہ کے سامنے والے فلیٹوں میں تھا۔ جمعہ کو بچوں کا اسکول کا ہاف ڈے ہوتا تھا اور بھائی جمعہ کی نماز کے بعد ہی آفس جاتے تھے۔ اس لیے تقریباً ہر جمعہ کو بھائی، بھابھی کو میکے چھوڑ دیتے۔ ہفتے کی دوپہر تک وہ واپس آ جاتیں۔ شادی کے فوراً بعد سے یہی معمول تھا۔

اس جمعہ کو بھابھی نہیں گئیں۔

''خواہ مخواہ میں جاؤں گی اور کپڑے نہیں آئیں گے تو امی کا موڈ خراب ہو جائے گا۔ اگلے جمعہ کو جاؤں گی پھر آ کر کہہ دوں گی کہ پرنٹ اچھے نہیں تھے۔'' سبزی بناتے ہوئے بھابھی نے بڑبڑانے والے انداز میں مجھے اپنا منصوبہ بتایا۔ میں خاموش رہی۔ میری خاموشی سے انہوں نے نہ جانے کیا اخذ کیا کہ فوراً وضاحت دینے لگیں۔

''میں جھوٹ کب بولتی ہوں مگر تمہیں تو پتا ہے آج کل ہاتھ کتنا تنگ ہے۔ پچھلے ہفتے ہی نادیہ کو ایک ہزار کا سوٹ دیا ہے۔ اب اگلے مہینے بچوں کے یونی فام بنانے ہیں۔ نادیہ تو پتا نہیں کب پیسے لوٹائے؟'' آخری جملہ سوال نہیں، خدشہ تھا۔ اس لیے اس بار بھی میں خاموش رہی اور چونکہ سبزی بن گئی تھی تو ٹرے لے کر سیدھی کچن میں چلی آئی۔

☆☆☆

''شہزاد تو کہہ رہے تھے کہ بری بات ہے۔ بلاوجہ اپنی بھابھی کو تنگ مت کرو۔ آج کے دور میں اپنے ہی کاموں سے فرصت نہیں ملتی۔ دوسروں کے کام بھلا کون کرے لیکن میں نے ان سے کہا کہ جی نہیں۔ بھابھی ایسی نہیں ہیں۔ اگر انہیں اپنا کام نہ بھی ہوا تو صرف میرا کام کرنے ہی مارکیٹ چلی جائیں گی۔ ویسے بھی ان کا میکہ سامنے کے بالکل سامنے ہے۔'' رات کے کھانے پر سب کی موجودگی میں نادیہ کو شہزاد کی بات اچانک یاد آئی۔

''چار دن پہلے تو شہزاد کہہ رہا تھا کہ اپنی بھابھی سے سوٹ منگوالو۔ نادیہ، پہلے سوچ لو کہ شہزاد نے وہ بات نہیں کہی تھی یا یہ بات نہیں کہی ہے۔'' میں یہ بات صرف سوچ سکتی تھی۔ اس لیے سوچ کر رہ گئی۔

پھر بھابھی میکے گئیں تو حسب منصوبہ یہی کہا کہ پرنٹ اچھے نہیں تھے۔ پسند نہیں آئے۔ امی کے ذریعے نادیہ کو دو گھنٹے کے اندر اندر معلوم ہو گیا۔

''ارے بھابھی! اب آپ اتنی تنقیدی نظر سے کپڑے پسند کریں گی تو کہاں سے کوئی سوٹ پسند آئے گا۔ اتنی گرمی ہے۔ اپنے کپڑے تو مجھ سے بالکل نہیں پہنے جا رہے۔ شہزاد کو تو بالکل پہچان نہیں ہے۔ مکس لان اٹھا لاتے ہیں۔ اس میں ریشمی کپڑوں سے زیادہ گرمی لگتی ہے۔ اب آپ جائیں تو لے آیئے گا۔ جیسے بھی ملیں۔ بس گزارا ہی تو کرنا ہے۔ اور آپ سنائیں امی کی طرف سب خیریت ہے۔ سنیعہ کا کہیں رشتہ ہوا؟'' بھابھی نے غائب دماغی سے ہوں ہاں کر کے فون رکھ دیا۔ مجھے بتایا۔ میں بھلا کیا تبصرہ کرتی۔

اگلے جمعہ کو بھابھی پھر میکے نہیں گئیں۔ ساس کے استفسار پر کہہ دیا کہ امی کو پڑوس کی شادی میں جانا ہے تو میرے جانے کا فائدہ نہیں۔ ساس صاحبہ خاموش ہو گئیں۔

لیکن وقت ٹالنے سے مشکل تو نہیں ٹلتی —

اگلے جمعہ کو جانے سے پہلے جی کڑا کر کے ساس سے کہہ دیا۔

''امی! وہ نادیہ کے کپڑے لانے ہیں نا تو پیسے دے دیں۔''

''میرے پاس کہاں ہیں پیسے۔ علیم سے لے لو۔ جہاں اتنے خرچے ہوتے ہیں، وہاں بہن کے لیے ہزار دو ہزار نکالنے میں کیا ہو جائے گا۔'' آخری بات سنانے کے لیے تھی۔

علیم بھائی کے پاس پیسے کہاں سے ہوتے۔ الٹا بھابھی کے مانگنے پر بھائی نے پتا نہیں کیا کہا کہ اچھا خاصا جھگڑا ہو گیا۔ بھائی گھر سے نکل گئے۔ بھابھی منہ لپیٹ کر پڑ گئیں۔ ساس صاحبہ الگ اکھڑی اکھڑی۔ مہینے کے شروع میں نند کو دیے جانے والے جوڑے کا اثر مہینہ بھر بھی نہیں رہا تھا۔

چار گھنٹے بعد فون کر کے نادیہ نے بھی اپنا حصہ ڈالا۔

''توبہ بھابھی! کیا میں پیسے نہیں دیتی؟ ایسی بھی کیا بے اعتباری۔ رشتوں سے زیادہ پیسے اہم ہوتے ہیں کیا؟'' بھابھی بے چاری چپ۔ نا کہیں تو مشکل۔ ہاں کہیں تو مشکل۔

ہفتہ بھر بھائی کا موڈ خراب رہا۔ بھابھی بے چاری الجھی الجھی۔ بچے الگ نظر انداز ہوتے رہے۔ مہینے بھر کی کشمکش کا انجام مجھے مہینہ بھر پہلے ہی پتا تھا۔ مگر ایک تو میری شادی کو ہی چھ مہینے ہوئے تھے۔ پھر وہ شاعر نے بھی تو شاید جوائنٹ فیملی سسٹم ہی کے لیے کہا ہے

فغاں کہ مجھ غریب کو حیات کا یہ حکم ہے
سمجھ ہر ایک راز کو مگر فریب کھائے جا

☆☆☆

سوٹ کا قصہ تمام ہوئے مہینہ بھر ہوا تھا کہ بڑی نند کینیڈا سے آ گئیں۔ خوش گفتار، خوش لباس۔

پیسے اور تے، دونوں لحاظ سے بڑی تھیں، لہٰذا ویسا ہی دبدبہ اور رعب ادب۔ خیر سے امید سے تھیں اور اسی سلسلے میں پاکستان آئی تھیں۔

میں نے تو انہیں دیکھا ہی پہلی دفعہ تھا۔ ہماری شادی پر وہ چند وجوہات کی بنا پر نہیں آسکیں۔ کم از کم بھابھی نے مجھے یہی بتایا تھا۔ چند وجوہات کا مطلب انہیں بھی معلوم نہیں ہوگا۔

مجھ سے تو پہلی ملاقات تھی۔ ظاہر ہے میں ان کو بہت اچھی لگی اور وہ مجھے بہت اچھی لگیں۔

بھابھی سے دو چار سال ہی بڑی تھیں۔ بھابھی بھی مجھے نادیہ کے مقابلے۔ انجم باجی سے زیادہ بے تکلف لگیں۔ دس پندرہ دن تو ملنے ملانے اور دعوتوں میں گزر گئے۔

''نوشین! تمہاری اسکن کتنی رف ہو رہی ہے۔ فیشل ویشل کرانا چھوڑ دیا کیا؟'' اس دن اچانک انجم باجی کو بھابھی کے چہرے کی بے رونقی نظر آگئی۔

''بس باجی! آپ کو تو پتا ہے۔ جیسے جیسے بچے بڑے ہو رہے ہیں، لگتا ہے مسائل بھی بڑے ہو رہے ہیں۔ ایک جھنجٹ سے نکلو، دوسرا مسئلہ سر پر کھڑا ہوتا ہے۔ اسے سلجھاؤ تو تیسری پریشانی سامنے ہوتی ہے۔ اخراجات بڑھ رہے ہیں۔ مہنگائی بڑھ رہی ہے۔ آمدنی وہیں رکی ہوئی ہے۔ میں نے نوکری کرنے کا سوچا مگر پھر بچے نظر انداز ہوتے ہیں۔ اتنی فکروں اور الجھنوں میں چہرہ کہاں سے اچھا ہوگا۔'' مہنگائی پر بولنے کے لیے تو بھابھی کو موقع چاہیے تھا۔

''ہاں صحیح کہہ رہی ہو۔ بچوں کے مسائل تو لگتا ہے بچوں کے ساتھ ساتھ بڑے ہو رہے ہیں۔ مہنگائی تو ہر جگہ ہی بڑھ رہی ہے۔ ان کے کاروبار میں بھی مسئلے چل رہے تھے پچھلے دنوں۔ میں نے کہا زیور بیچ کر پیسہ کاروبار میں لگا دیں۔ کاروبار ہوگا تو زیور اور بن جائے گا۔ پہلے تو نہیں مانے لیکن پھر بھی کیا۔ سونے کا کیا ہے اور آجائے گا۔''

''ہاں یہ تو ہے۔'' بھابھی نے بھی اتفاق کیا۔ میں نے بھی۔ مگر میں فی الحال کسی گنتی میں نہیں تھی۔

''نوشین! میری مانو تو تم بھی اپنا زیور بیچ کر کسی کاروبار میں لگا دو۔ آمدنی بڑھے گی تو زیور اور بن جائے گا۔'' انجم باجی کی اگلی بات پر بھابھی تو بھابھی، میں بھی ہک دک رہ گئی۔ بھابھی کے پاس سونا تھا ہی کتنا کہ وہ اسے بیچ کر کسی کاروبار میں لگاتیں۔ کہاں انجم باجی کے شوہر کا کئی شہروں میں پھیلا ہوا کاروبار اور ان کا بے تحاشا زیور اور کہاں بھابھی کا دس تولے سونا۔

پھر پیسہ کسی چھوٹے موٹے کاروبار میں لگ بھی جاتا تو اس کی قلیل آمدنی سے زیور کہاں سے بنتا جبکہ سونے کی قیمت میں عمومی مہنگائی کی نسبت کئی گنا اضافہ ہو رہا تھا۔ علیم بھائی کی تین بچیاں تھیں اور بچیاں بڑے ہوتے کتنی دیر لگتی ہے۔

انجم باجی کا مشورہ سرسری سہی، اس کی نامعقولیت اتنی زیادہ تھی کہ میں تو رہتی ہی چپ تھی، بھابھی بھی چپکی رہ گئیں۔

یوں فی الوقت بات آئی گئی ہوگی۔

☆☆☆

''نوشین، اپنا زیور الماری سے نکالو تو میری چوڑیاں بھی نکال لینا۔ اچھا ہے ساری چیزیں ساتھ ہی بک جائیں گی۔'' ساس کا حکمِ شاہی اگلی صبح ناشتے پر ہی جاری ہوگیا۔

''جی!'' بھابھی بے چاری ناسمجھی کے عالم میں بولیں۔

جب بھابھی کی 'جی' کے باوجود ناشتہ کرتے کسی کے اطمینان میں کوئی فرق نہیں آیا تو بھابھی نے چیخ کر کہا۔

''امی مگر زیور کس لیے بیچنا ہے؟''

''ارے نوشین! کل ہی تو تم نے بات ہوئی

ہے۔'' انجم باجی کے لہجے میں معصومیت بھری حیرانی تھی۔ اتنا کھرا لہجہ تھا کہ مجھے لگا شاید واقعی بات ہوئی تھی۔

''باجی! میری تو آپ سے ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔'' بھابھی کا لہجہ ازخود تیز ہو گیا۔

''کیا مطلب ہے؟ میں جھوٹ کہہ رہی ہوں۔ کل ہی تو بات ہوئی ہے تم سے۔ فرح! تم بتاؤ۔ تمہارے سامنے ہی تو بات ہوئی تھی۔'' تو گویا گنتی میں آنے کے بجائے میں سیدھا نشانے پر آ گئی تھی۔

پانی کا گلاس لبوں سے لگاتے ہوئے میں نے چند لمحوں میں فیصلہ کر لیا۔

''نہیں باجی! ایسی تو کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔'' میں نے اطمینان بھرے لہجے میں باجی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

اس جواب کی امید بھابھی کو تو شاید ہو، باجی کو قطعی نہیں تھی۔ انجم باجی پہلے تو گڑبڑائیں، پھر رونا شروع ہو گئیں۔

''میں جھوٹ کیوں بولوں گی۔ مجھے کیا ملے گا جھوٹ بول کر۔ تم لوگوں کے فائدے کے لیے سوچا اور صلہ یہ ملا کہ مجھے ہی جھوٹا کہہ رہی ہو۔''

''ظاہر ہے جب ایسی کوئی بات ہوئی ہی نہیں تو میں کیسے مان لوں۔ ویسے بھی وہ زیور میرا ذاتی ہے۔ میری مرضی میں اسے بیچوں یا نہ بیچوں۔'' بھابھی ایک دم تیز تیز بولتے ہوئے کمرے میں چلی گئیں۔ جب انسان چھوٹی چھوٹی پریشانیاں برداشت کرتا رہتا ہے تو ایک وقت آتا ہے کہ ضرورت سے زیادہ ردعمل ظاہر کر دیتا ہے اور پھر اس کا نقصان بھی سب سے زیادہ اس کی اپنی ذات کو ہوتا ہے۔

ہمارے میاں بھی کچھ بول رہے تھے۔ علیم بھائی تو تھے ہی غصے کے تیز۔ ساس صاحبہ بیٹی کو خاموش کروا رہی تھیں۔ بھابھی کمرے کا دروازہ بند کیے یقیناً رو رہی تھیں۔ بچے سراسیمہ کھڑے تھے۔

اس ساری صورت حال میں میں نے نہ میاں کو خاموش کرانے کی کوشش کی، نہ بھائی کو، نہ ساس کو، نہ نند کو، نہ بھاوج کو، نہ ہی بچوں کو ہٹانے کی کوشش کی۔

چپ چاپ ناشتے کے برتن سمیٹ کر اطمینان سے انہیں دھویا۔ دوپہر کے کھانے میں مسور کی دال چڑھائی۔ ساتھ پودینے کی چٹنی بنالی کہ صرف مجھے پسند تھی۔ ہری مرچیں تلیں۔ روٹیاں ڈالیں۔ کھانا لگایا۔ ساس صاحبہ، انجم باجی اور بھابھی کو خود بلانے گئی۔ حسب توقع کوئی نہیں آیا۔ سکون سے کھانا کھایا۔ چائے پی۔ پھر اپنے کمرے میں لیٹ کر پرانے ڈائجسٹوں میں سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر اپنی پسندیدہ مصنفہ کی رومانوی سی کہانی پڑھی اور سو گئی۔

☆☆☆

عصر کے بعد انجم باجی اور میری ساس کسی عزیز کے ہاں تعزیت کرنے گئیں تو بھابھی میرے پاس آ گئیں۔

''فرح! تم بتاؤ۔ میرا کیا قصور تھا۔ انجم باجی کو پتا نہیں کیا ہو گیا تھا۔ ایسی تو کوئی بات ہی نہیں ہوئی تھی۔'' بھابھی اب تک صبح والی بات کا غم منا رہی تھیں۔

''چھوڑیں بھابھی، کوئی اور بات کرتے ہیں۔'' یہ کہنے کے بجائے مجھے لگا، مجھے بھابھی سے بات کر ہی لینا چاہیے۔

''دیکھیں بھابھی! برا مت مانیے گا۔ لیکن قصور آپ کا اپنا ہے۔ میں نے بہت دفعہ سوچا آپ سے بات کروں مگر پھر کچھ سوچ کر خاموش ہو گئی۔

بھابھی مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں جب لڑکی سسرال جاتی ہے تو سمجھتی ہے کہ خدمت اور آگے پیچھے پھرنے سے وہ سب کا دل جیت لے گی۔ سب کو خوش رکھے گی۔ سب اس کے نام کی مالا جپیں گے۔ لیکن نہ تو وہ ہر کسی کو خوش رکھ پاتی ہے، نہ کسی کا دل جیت پاتی ہے۔ تو وہ ایسے ہی افسردہ اور پریشان رہتی ہے جیسے آپ۔''

''لیکن فرح! میں نے نادیہ اور انجم باجی کو ہمیشہ اپنی بہنوں کی طرح......''

میں نے بھابھی کی بات کاٹ دی۔

''ہمارے ہاں لڑکی یہ سب دعوے لے کر سسرال آتی ہے کہ نند کو بہن سمجھے گی، ساس کو ماں کا مقام دے گی۔ دیور کو بھائیوں کی طرح رکھے گی۔ لیکن بھابھی! نند، نند ہوتی ہے۔ ساس، ساس اور دیور، دیور۔ نادیہ کو آپ نے اس کی فرمائش پر سوٹ لا دیا۔ اس کی جگہ آپ کی سگی بہن ہوتی تو آپ منہ کھول کر اس سے پیسے مانگ لیتیں۔ پھر اس نے آپ سے مزید دو جوڑوں کی فرمائش کر دی۔

آپ مہینہ بھر ادھیڑ بن میں رہیں مگر اس کو منع نہیں کر سکیں۔ آپ کی سگی بہن ہوتی تو کیا تب بھی آپ اسے منع نہ کر پاتیں؟ انجم باجی کے سامنے بھی آپ ہر وقت اپنے دکھڑے روتی رہتی تھیں۔ انہوں نے جو کیا، وہ آپ کو بھی معلوم ہے، مجھے بھی۔ آپ کی سگی بہن ہوتی تو کیا وہ کرتی؟ پھر آپ کی ساس کی جگہ آپ کی امی ہوتیں تو کیا ان کا رد عمل یہی ہوتا؟

اگر یہ حقیقت شادی کے فوراً بعد قبول کر لی جائے تو زندگی آسان ہو جاتی ہے۔ نادیہ نے آپ کے سوٹ کی تعریف کی، آپ مسکرا کر چپ ہو جاتیں۔ انجم باجی کو اگر آپ ہنس کر ٹال دیتیں تو نہ ان باتوں کا اتنا بتنگڑ بنتا نہ ہی گھر کا ماحول خراب ہوتا۔ سب سے بڑی بات آپ خود پُرسکون رہتیں۔''

''تم تو اچھی خاصی مقررہ ہو بھئی۔'' بھابھی نے مسکراتے ہوئے حیرانی ظاہر کی۔

''ارے مجھے آپ میرے میکے میں دیکھتیں۔ صبح و شام تقریریں کرتی تھی۔ لیکن مجھے معلوم ہے یہاں تقریریں کرنے سے بات تو کون مانے گا، الٹا باتیں بننا شروع ہو جائیں گی۔ بڑبولی اور منہ پھٹ کے القابات مل جائیں گے۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''صحیح کہہ رہی ہو۔'' بھابھی فوراً بولیں۔ ''لیکن پھر میرے سامنے کیوں تقریر کر رہی ہو؟''

مجھے پتا تھا بھابھی یہ سوال ضرور پوچھیں گی۔ اس سوال کے پردے میں جو سوال انہوں نے کیا تھا، میں وہ بھی سمجھ گئی تھی۔

''دیکھیں بھئی، صبح تو میں نے اس لیے آپ کا ساتھ دیا تھا کہ آج میں آپ کی بات کو جھٹلا کر نند کو خوش کرتی۔ کل اپنی بات کو جھٹلا کر اپنی ذات کی بھی نفی کرنا پڑتی۔ زندگی میں رشتوں کو ان کی صحیح جگہ پر رکھنا بہت ضروری ہوتا ہے۔ یہ جو کہتے ہیں نا کہ رشتے نبھانے آنے چاہئیں، اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ہم ہر وقت دوسروں کو خوش کرنے میں لگے رہیں۔ اس کا مطلب ہوتا ہے رشتوں کی پرکھ اور حساب سے ان کو لے کر چلنا۔'' پہلی دفعہ تو بات کرنے کا موقع ملا تھا، میں کیوں ہاتھ سے جانے دیتی۔

''لیکن ہمارا دین تو صلہ رحمی کا حکم دیتا ہے۔'' بھابھی معترض ہوئیں۔

''بھابھی! برا مت مانیے گا۔ لیکن ہم صلہ رحمی کی نیت سے نہیں، اچھا کہلانے کی نیت سے سسرال میں یہ ساری نیکیاں کر رہے ہوتے ہیں۔ اسی لیے انجام یہ ہوتا ہے کہ سامنے نیکی کر کے گھنٹوں، پہروں اور دنوں الجھتے اور کڑھتے رہتے ہیں۔''

''ٹھیک کہہ رہی ہو۔'' بھابھی شرمندہ لہجے میں خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ بولیں۔ ''تم اتنی چھوٹی ہو، پھر بھی اتنی سمجھ ہے۔''

''میں اپنی بڑی بہن کو بھی یہی سمجھاتی ہوں تو وہ کہتی ہے کہ فرح، تم نے تو لگتا ہے سسرالیات میں پی ایچ ڈی کیا ہوا ہے۔'' میں نے ہنستے ہوئے خوش دلی سے کہا۔ بھابھی بھی سادہ سے انداز میں ہنس دیں۔

WITH
COLORLOCK
TECHNOLOGY TM
BLACK ROSE
ColorSupreme
HAIR COLOR
DEEP NOURISHING EFFECTS
AVAILABLE IN 10 DIFFERENT SHADES
BLACK ROSE
COLOR EXPERTS!
www.blackrosecosmetics.com

صدف ریحان گیلانی

میں اور تم

مکمل ناول

وادی کا حسن آج پورے جوبن پر تھا۔ سرما کی پہلی برف باری شروع ہو چکی تھی اور چونکہ اس برف باری کی اطلاع محکمہ موسمیات کے طفیل پہلے ہی مل چکی تھی، سو بے شمار منچلے کشاں کشاں کھنچے چلے آئے تھے۔ ان کے ریسٹ ہاؤس کے تمام کمروں کی بکنگ چار دن پہلے ہی ہو چکی تھی۔

ریسٹ ہاؤس کا ڈائننگ ہال اس وقت کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ بھانت بھانت کی بولیاں، رنگ رنگ کے لوگ، برتنوں کی کھڑکھڑاہٹ، قہقہے اور کھلکھلاہٹ، بے فکر، خوش باش لوگ۔ صبح تک سرسبز نظر آنے والی وادی اب اجلی سفید چادر تلے چھپتی چلی جا رہی تھی۔ یوں جیسے زندگی پر موت چھا جائے اور کیسے عجیب تھے یہ لوگ جو اتنا سفر کر کے صرف یہ ایک نظارہ کرنے یہاں تک آئے تھے۔

یک لخت وہ اس سارے ماحول سے بے زار ہوا تھا۔ باہر گرتی برف، اندر بکھری رونق سب ایک دم سے ناقابل برداشت ہونے لگا تو وہ اٹھ آیا۔ کمرے میں آتے ہی کوٹ اتار کر پرے پھینکا، ٹائی یوں ڈھیلی کی گویا وہ اس کا دم گھونٹ رہی ہو۔ لپک کر کھڑکی بھی کھول لی، برفیلی ہوا جیسے اسی انتظار میں تھی دھڑلے سے اندر گھس آئی۔ دلبر اس کے پیچھے ہی آیا تھا، وہ کھلے پٹ کے ساتھ سر ٹکائے کھڑا تھا۔

''صاحب! آپ کے لیے کھانا لے آؤں۔''

وہ پوچھ رہا تھا، اس نے مڑ کر دیکھا۔

''ہاں۔ کھانا لے آؤ، لیکن مجھے بھوک نہیں ہے وہ کھانا تم اپنے لیے لے جانا۔'' اور اسے کیا چاہیے تھا بھلا، گھر میں تو آج پھر وہی دال سبزی بنی ہوگی۔ صاحب کی آفر نے اس کے مرجھائے چہرے کو ایک دم کھلا کھلا کر دیا۔

''ٹھیک ہے، جیسا آپ کا مرضی اور موسم کا پہلا برف باری ہے۔ یہ ہوا فوراً بیمار کر دیتا ہے، کھڑکی بند کر لو صاحب! دیکھو تو کمرا ایک دم کیسے ٹھنڈا ہو گیا اور آپ نے کوٹ بھی اتار دیا۔ اللہ کا واسطہ ایسا بے احتیاطی مت کرو، آپ نہیں جانتا اس

سردی کو، بڑا ظالم ہوتا ہے یہ۔ ایک بار آپ کو پکڑ لے گا نا تو سارا سیزن کھوں کھوں کرتے گزرے گا۔" دلبر تھا تو پندرہ سال کا مگر باتیں بوڑھوں والی کرتا تھا۔ اس کی فکر مندی ہونٹوں پر مجروح سی مسکراہٹ لے آئی تھی اور جسے دیکھتے ہی وہ جھٹ برا مان گیا۔

"آپ اماری بات کو مذاق سمجھتا ہے، ام پر یقین نہیں تو بھلے اس علاقے کے کسی بھی آدمی سے پوچھ لو۔ آپ کا یہ شہر والا سردی نہیں ہے صاحب! یہ پہاڑوں والا سردی ہے اور جیسا ادھر کا پہاڑ سخت ہوتا ویسا ہی ادھر کا موسم بھی سخت ہوتا۔ ایک بار جان کو لگ جائے تو جلدی پیچھا نہیں چھوڑتا۔ امارا مورے (ماں) کو بھی کچھ سال پہلے ٹھنڈ لگ گیا تھا، اب وہ ہر سردی میں بیمار ہو جاتا ہے اور امارا نیا (دادی) اس کو باتیں سناتا کہ وہ کام سے بچنے کے واسطے ایسا کرتا۔ اللہ نا کرے آپ کو اگر سردی لگ گیا تو ادھر تو کوئی ڈاکٹر بھی اچھا نہیں ہے، بہت مسئلہ ہو جائے گا۔"

"اچھا ٹھیک ہے، اب تم جاؤ اپنا کام کرو۔" وہ پہلے ہی بے زار تھا، اس پر دلبر خان کی باتیں، اس نے چڑ کر کہا اور اس نے جیسے سنا ہی نہیں تھا وہ آتش دان میں لکڑیاں رکھنے لگا۔

"ارے اب یہ کیا کر رہے ہو دلبر! مجھے اس سردی سے تو کوئی بیماری لگے یا نا لگے لیکن اس لکڑیوں کے کثیف دھوئیں سے ضرور کوئی بیماری لگ جائے گی۔ کل بھی سارا وقت کمرے سے بو آتی رہی، میرا تو دم گھٹ رہا تھا۔ چھوڑو —— بلکہ ایسا کرو یہ سب لکڑیاں سمیٹو اور اپنے گھر لے جاؤ۔ تمہارے گھر میں زیادہ ضرورت ہے ان کی، مورے کے کمرے میں جلا دینا اور ہاں، اب روز جتنی لکڑیاں میرے حصے کی ہوا کریں گی سب لے جایا کرنا۔ مجھے نیند آ رہی ہے، کوئی ڈسٹرب نہ کرے پلیز بلکہ تم بہرام صاحب کو بھی بتاتے جانا کہ میں اپنے روم میں ہوں۔" اس نے پھر کھلی کھڑکی میں منہ دے لیا تھا۔ دلبر نے لکڑیاں اٹھائیں اور باہر کا رخ کیا، دس منٹ بعد وہ پھر آیا تھا اور صاحب کو جوں کا توں وہیں کھڑے دیکھ کر پہلے سے زیادہ کپکپا گیا۔

"آپ کھانا نہیں کھا رہے صاحب تو یہ کافی ضرور پی لیں۔ میں نے خود بنایا ہے آپ کے لیے۔" اور اس نے سر ہلا دیا۔ واپس پلٹتا دلبر سوچ رہا تھا کہ صاحب سے اس دوا کا نام لازمی پوچھنا ہے جس کو کھا کر انہیں سردی نہیں لگتا۔ پھر وہ اپنی مورے کو بھی وہ دوا دے گا۔ وہ نیا کی جلی کٹی باتوں سے ہمیشہ کے لیے بچ جائے گی۔ وہ کھڑکی سے ہٹ کر ایزی چیئر پر آ بیٹھا تھا۔ کافی کا مگ اٹھایا، کافی سے دھوئیں کے مرغولے اٹھ رہے تھے اور اس گرما گرم مگ کو ہاتھ میں لیتے ہی جیسے کوئی در وا ہو گیا۔ جس سے مختلف آوازیں آ رہی تھیں، کوئی چیخ رہا تھا، کوئی بول رہا تھا۔

"اللہ......اللہ......میں یہ منظر دیکھنے سے پہلے مر کیوں نہیں گیا۔ بے حیا، بے غیرت...... ننگ خاندان......تُو تو سانپ سے بھی بدتر نکلا۔ اپنوں کو ہی ڈس لیا، ارے چور بھی چوری کرنے نکلتا ہے تو اپنا محلہ چھوڑ دیتا اور ایک تُو...... مار دیا تُو نے مجھے...... ہم سب کو مار دیا۔" تڑاخ تڑاخ لاٹھی برس رہی تھی، ان بوڑھے ہاتھوں میں ایسا زور آ گیا تھا کہ جوان ہاتھ انہیں روکنے کی سکت ہی کھو بیٹھے یا شاید انہیں سکتہ ہو گیا تھا یا پھر وہ ٹوٹ گئے تھے۔

وہ لمحے ہی ایسے کرب ناک تھے کہ ہر چیز اپنے محور سے ہٹ گئی تھی۔ جسم کی موت اچھی ہوتی ہے، سب واقف تو ہوتے ہیں اور گلنے سڑنے سے پہلے جا کر دفنا آتے ہیں لیکن یہ روح کی موت کیسی بری ہوتی ہے نا......نہ کوئی اسے مرتے دیکھ سکتا ہے اور نہ اس سے اٹھتے تعفن کو محسوس کر سکتا ہے۔ اسے تو بس وہی برداشت کرے جس کے اندر لاش پڑی ہو۔

یہ کیسا عذاب تھا جس نے اسے گھیر رکھا تھا۔ وہ خود ہی شدید متنفر تھا۔ بے بسی سی بے بسی تھی، لگتا تھا لاٹھی اب بھی کوڑے کی طرح برس رہی ہے۔ تڑپ کر کافی کا مگ ہی کھینچ مارا، اک چھناکے کے ساتھ

کھڑکی کا شیشہ چکنا چور ہوا تھا اور چند قدم دور گئے دلبر کے کانوں نے صاف سنا تھا۔ وہ ٹھٹک کر وہیں رک گیا، یہ شیشہ کتنی بار ٹوٹا تھا۔ اسے گنتی کی ساتھ ساتھ اب یہ فکر لاحق تھی کہ برف باری نے تمام راستے بند کردیے تو کاریگر کو کیسے بلوایا جائے گا اور شیشہ نہیں ہوگا تو کمرے کا ٹمپریچر......

"اووو ہووو......" پہلے کم سردی تھی کہ اسے اور کپکپی چھوٹنے لگی۔

☆☆☆

ابھی سیڑھی کے پہلے قدمچے پر پاؤں رکھا ہی تھا کہ نیچے سے آتی قہقہوں کی بے ہنگم آوازوں نے اسے وہیں جامد کردیا۔ ناگواری کی اک لہر تھی جس نے پورے دماغ میں ایک چکر کاٹا، ماتھا شکن آلود ہوا تھا، یعنی آج پھر اس کی بے تکی سہیلیوں کا ٹولہ گھر میں گھس آیا تھا اور اپنی فطرت سے مجبور اب وہ ذرا ذرا سی بات پر اونچے اونچے قہقہے لگا رہی تھیں۔ چلو وہ تو مہمان تھیں لیکن اس لڑکی کی عقل کو کیا ہوا ہے؟ پچھلی بار بھی کہا تھا۔

"دیکھو! اگر تم اپنی ازلی بے وقوفی کی وجہ سے سہیلیاں ڈھنگ کی نہیں بنا سکیں تو ان بے ڈھنگی لڑکیوں کو کم از کم ڈھنگ سے ہنسنا ہی سکھا دو۔ جب وہ ہنستی ہیں نا تو ایمان سے ایسا لگتا ہے کئی چڑیلیں مل کر بین ڈال رہی ہوں۔ اُف...... مارے وحشت کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں، الویں آس پڑوس میں کسی کمزور اعصاب کے مالک کو ہارٹ اٹیک ہوگیا تو؟ کسی معصوم جان کا گناہ سر لوگی اپنے؟"

اور تب وہ ازل کی بے وقوف پلکیں پٹپٹاتی اسے دیکھے گئی تھی اور وہ حسب سابق اسی خوش فہمی میں رہ گیا تھا کہ بات سمجھ میں آگئی ہے، لیکن کسی بھی بات کو ایک بار سمجھانے پر وہ پہلے اپنی انیس سالہ زندگی میں کبھی سمجھی تھی جو اب سمجھ جاتی۔ اس کے "چول پن" کا اپنا ہی ریکارڈ ٹوٹ جاتا۔

"اُف...... مطلب پچھلی بار کی تادیب کا کوئی اثر نہیں لیا اس لڑکی نے۔ کچھ زیادہ ہی من مانیاں نہیں کرنے لگی۔ اب یہ ان چڑیلوں کو کس کی اجازت سے بلایا ہے اس نے، حد ہوگئی بدتمیزی کی۔ علاج کرنا ہی پڑے گا اب تو، چند دن ڈھیل کیا دے دی یہ سر پر ہی چڑھ گئی ہے۔"

غصے میں پیچ و تاب کھاتا دھڑ دھڑ کرتا وہ جس انداز سے سیڑھیاں اُترا، وہ سب ہنسنا چھوڑ کر ادھر دیکھنے لگیں۔ اس نے بھی دیکھا اور لال بھبوکا چہرے پر نظر جاتے ہی سٹی گم ہوئی (ایں...... یہ گھر پر ہی تھے...... اوہ میرے اللہ) پھیلے ہونٹ یک لخت سمٹے۔

گزشتہ کلاس وہ بھولی نہیں تھی بلکہ وہ تو بچپن سے لے کر اب تک کی کوئی بھی "کلاس" نہیں بھولی تھی اور نہ ہی آخری سانس تک بھول سکتی تھی۔ اتنا سخت ٹیچر تو اسکول سے لے کر کالج تک بھی کوئی نہ ملا تھا جتنا کہ اللہ نے اس کے لیے گھر کے اندر ہی انتظام کر رکھا تھا۔

وہ چاہے لاکھ احتیاط کا دامن تھامے رکھنے کی کوشش کرتی، لیکن قسمت ہی ایسی دغاباز تھی کہ وہ ہر بار عین موقع پر دھر لی جاتی۔ جیسا کہ اب۔ اس کا اندازہ تو یہ تھا کہ وہ گھر پر نہیں ہے، آج کل وہ انسٹیٹیوٹ جارہا تھا جہاں سے شام ڈھلے واپسی ہوتی، تو کیا آج وہ نہیں گیا تھا؟

"اف...... مارے گئے، اس طرف تو دھیان ہی نہیں گیا۔ یہ نینا کی بچی کے الٹے سیدھے مشورے ایک دن ضرور مروائیں گے، یا اللہ بس آج بچالے۔"

اس کا بھی کبوتر کا سا حال تھا اس وقت، جو سمجھتا ہے آنکھیں بند کرلینے سے مصیبت دور ہوجائے گی اور مصیبت نے اسے بری طرح گھورا تھا۔ اگر بس چلتا تو آنکھوں سے ہی بھسم کر ڈالتا، اس نے تو اتنی ضرورت بھی نہیں سمجھی تھی کہ اس کی سہیلیوں کی خدمت میں سلام ہی عرض کردیتا لیکن اس کی سہیلیاں ایسی بے ادب تھوڑا ہی تھیں، سب نے

اسے ہیلو کہنے میں اک دوجے سے سبقت لے جانے کی بے اختیار کوشش کی تھی اور وہ ایسا بے مروت کہ کسی کی طرف بھی نظر کیے بنا پاس سے گزر گیا۔

''ہائے ہائے...... کیا ہوا ہے، ایسی بھی کیا جلدی پڑی ہے۔ کدھر کی تیاری ہے، گھر سے نکلتے وقت زادراہ لے کر جاتے ہیں، اگر ہمارے سلام کا جواب دے دیتے تو دس نیکیاں تو مل ہی جاتیں۔'' نینا بولے بنا نہ رہ سکی جبکہ اس نے بازو پکڑ کر جھنجوڑا بھی۔

''سلام کا جواب نہ دینا انتہائی بدتہذیبی ہے۔ توبہ توبہ...... بہت روڈ ہے تمہارا کزن۔'' تانیہ نے دروازے کی طرف منہ کر کے تبصرہ کیا، یعنی کہنا بیٹی کو اور سنانا بہو کو۔

''خدا جب حسن دیتا ہے، نزاکت آ ہی جاتی ہے۔'' رمشا نے اپنے لیئر کٹ بالوں کو اک جھٹکا دیا۔ وہ منہ کھولے دیکھتی رہ گئی' کہتی بھی تو کیا ہوا۔ سب ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھیں۔ اس کے ایسے رویے نے کتنا شرمندہ کروایا تھا۔ گھر آئے مہمانوں سے کوئی ایسا سلوک کرتا ہے کیا؟ وہ تو بھلا ہو نینا کا جس نے اس کا خوب اچھا تعارف کروا رکھا تھا۔ رمشا اور تانیہ کو بھی علم تھا وہ کیسا بدمزاج ہے اور وہ سب سنتا اور کھولتا بائیک کو تیزی سے گیٹ سے نکال کر لے گیا تھا۔

''خیر تو ہے میاں صاحب زادے؟ کہاں جا رہے ہو، بہت جلدی میں لگ رہے ہو۔'' ابا جی لاٹھی ٹیکتے سامنے سے چلے آ رہے تھے اور ابھی سلام اس کی نوک زباں پر ہی تھا کہ اندر سے آتے اک اور بے ہنگم قہقہے نے اسے ہونٹ بھینچنے پر مجبور کر دیا۔ چہرے پر چھائی برہمی مزید بڑھی تھی، ابا جی نے پہلے گیٹ کی جانب دیکھا، پھر اسے۔

''کوئی بات نہیں یار! مت گھبرایا کرو، بچی ہے۔ اداس ہو جاتی ہے تو سہیلیاں اکٹھی کر کے ہنس بول لیتی ہے۔ اب ماں تو اس کی نہیں ہے یہاں، میں بھی نہیں ٹوکتا۔ کہیں دل نہ برا کرے، پتا تو ہے اس کا، بات بات پر تو آنسو نکل آتے ہیں اور مجھ سے اس کا رونا برداشت نہیں ہوتا پھر کچھ ہی دن ہیں آجائے گی زینب تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم ریلیکس رہو، جاؤ اللہ کی امان۔''

وہ منہ سے کچھ نہیں بولا تھا مگر وہ سب سمجھ گئے، پیار سے شانہ تھپکا۔ اس نے سارا غصہ بائیک کو کک لگاتے اتارا اور زن سے لے اڑا۔ ابا جی زیر لب دعائیں پڑھتے آ رہے تھے، انہیں دیکھ کر سب، بی بی بچیاں، بنی اٹھ کھڑی ہوئیں، کورس میں سلام کیا گیا۔

''جیتی رہو، شام ہو رہی ہے بچیو! اس وقت درختوں تلے نہیں بیٹھتے۔ چلو سب اندر جاؤ اور عنیزہ بیٹا! سویرا سے کہو، میری چائے لے آئے۔''

''سویرا کے ہاتھ کی چائے تو آپ روز ہی پیتے ہیں ابا جی! آج ہم بنائیں آپ کے لیے چائے؟'' نینا بڑی سلیقہ شعار بن رہی تھی، انہوں نے مسکرا کر اس کا سر تھپکا۔

''ہاں کیوں نہیں، ضرور پیوں گا۔ آج یہ تجربہ بھی سہی۔''

''تجربہ...... ہائے اللہ، کتنے نائس ہیں ابا جی آپ۔'' رمشا نے ٹھٹا لگایا کہ باقی بھی اک بار پھر زور سے ہنس پڑیں اور انہوں نے دہلتے ہوئے اعتراف کیا کہ وہ ٹھیک ہی چڑتا ہے ان لڑکیوں کی ہنسی سے، یہ تو سچ مچ کسی کا بھی تراہ نکال سکتی ہیں۔

☆☆☆

''میرے سیاں جی سے آج میں نے بریک اپ کر لیا۔'' فریج کا جائزہ لیتی تانیہ خوب لہک لہک کر گنگنا رہی تھی۔

''اسے کہتے ہیں، جدید زمانے کے جدید تقاضے یعنی بریک اپ کی اطلاع بھی اب گا کر دی جاتی ہے۔ ہائے داوے کب ہوا یہ خوش گوار سانحہ؟'' دودھ کا برتن چولہے پر رکھتی رمشا پوچھ رہی تھی۔

''آپ کی معلومات میں اضافہ کے لیے بتا دوں کہ فی الحال تو یہ سانحہ وقوع پذیر نہیں ہوا، مگر جو حالات چل رہے ہیں ان کی روشنی میں امید واثق

ہے کہ جلد ہی ایسا کچھ ہو جائے گا۔"

چاکلیٹ کیک پیس برآمد ہو ہی گیا تھا، وہ پلیٹ اور دیگر لوازمات لیے میز پر آ بیٹھی۔

"حالات کیا چل رہے ہیں ذرا ان پر بھی روشنی ڈالیں گی آپ؟" چپس چباتی نینا کی طرف سے سوال آیا۔

"ہک ہاہ..... حالات کا تو پوچھو ہی مت، بہت برے رخ تک پہنچ چکے ہیں۔ جیسے ضرورت سے زیادہ پانی برتن کے بھر جانے پر چھلک کر گر جاتا ہے، بالکل ایسے ہی ضرورت سے زیادہ محبت بھی دل بھر کر بہنے لگتی ہے۔"

"ایں..... یہ کیا خلیل جبران کا قول ہے؟" نینا نے نین پھیلائے۔

"نہیں، یہ قول یقیناً فیثا غوث کا ہوگا۔" پانی گرم ہو چکا تھا، پتی جھونکتے رمشا نے اپنی رائے پیش کی۔

"بوتھ آر رونگ..... یہ قول نہ خلیل جبران کا ہے اور نہ ہی فیثا غوث کا بلکہ یہ تو تانیہ ابرار کا وہ قیمتی قول ہے جو انہوں نے ابھی ارشاد فرمایا ہے اور یہ ضرور اک دن سنہری روشنائی سے لکھا جائے گا۔ بہتر ہوگا کہ تم لوگ جلدی سے کاپی پین پکڑ کر اسے نوٹ کر لو۔" تانیہ کا لہجہ اتراہٹ سے لبریز تھا۔

"کر لیں گے نوٹ، پہلے تم حالات بتاؤ۔" نینا نے اپنے آگے پڑی خالی پلیٹ پرے کرتے اس کے کیک کی طرف ہاتھ بڑھایا، جو مزید آگے کھسک گیا، وہ برا سا منہ بنا کر رہ گئی۔

"جیسا کہ تم لوگ بھی جانتی ہو کہ ہمارے فائنل ایگزام سر پر چڑھتے چلے آ رہے ہیں اور جو ہماری گزشتہ کارگزاریاں رہ چکی ہیں ان کی رو سے اب ہمیں کافی سے زیادہ محنت کی ضرورت ہے، سو ان سب عوامل کو دیکھتے ہوئے بابا کی طرف سے حکم نامہ آیا ہے کہ ہر طرح کی فضول ایکٹیویٹیز ترک کر دی جائیں۔ جس میں سیل فون سرفہرست ہے، جو کچھ ہی روز میں بندی سے لے لیا جائے گا تو میں نے

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

کتاب کا نام	مصنفہ	قیمت
شہر دل کے دروازے	شازیہ چوہدری	500/-
تیرے نام کی شہرت	شازیہ چوہدری	250/-
ہم سفر	فرحت اشتیاق	400/-
بن روئے آنسو	فرحت اشتیاق	250/-
جاں جان سے پیارا	فرحت اشتیاق	500/-
دل دادلیں	فرح بخاری	350/-
استی کا آہنگ	فرح بخاری	300/-
وہ پگلی سی دیوانی سی	آسیہ سلیم قریشی	400/-
آرزو گھر آئی	آسیہ سلیم قریشی	400/-
ایمان، امید اور محبت	عمیرہ احمد	200/-
لاحاصل	عمیرہ احمد	180/-
امر بیل	عمیرہ احمد	450/-
اک دیا جلائے رکھنا	ماہا ملک	300/-
جو چلے تو جاں سے گزر گئے	ماہا ملک	120/-
میرے خواب ریزہ ریزہ	ماہا ملک	300/-
موسم تھا بے قرار	فریدہ اشفاق	300/-
دل اسے ڈھونڈ لایا ہے	آسیہ رزاقی	300/-
زندگی اک روشنی	رخسانہ نگار عدنان	500/-
میری سانس کے ہم سفر	زہرہ ممتاز	180/-
پھلاں دے رنگ کالے	فائزہ افتخار	180/-
میری جنت	نور بانو محبوب	250/-
جنون	شوکت احمد الطاف	150/-
اے وقت گواہی دے	راحت جبیں	350/-
شام آرزو	ایم سلطانہ فخر	300/-
رنگ، خوشبو، ہوا، بادل	افشاں آفریدی	400/-
آئینوں کا شہر	فائزہ افتخار	400/-
بڑا آدمی	نسیم سحر قریشی	300/-
میرے خواب لوٹا دو	نگہت عبداللہ	400/-

[redacted]

سوچا کہ کسی بے چارے محبت کے مارے کو تڑپا کر گناہ کمانے سے بہتر ہے کہ اسے اس چنگل سے آزاد کردوں۔ ویسے بھی جواب اس غریب کی حالت ہو چکی ہے اور جو وہ عشقیہ ڈائیلاگ جھاڑ جھاڑ کر میری کرنا چاہ رہا تھا، وہ سب ناقابل برداشت ہوتا جارہا ہے میرے لیے۔ مجھے تو اپنی فکر پڑ گئی ہے اگر چند دن اور اس کی محبت بھری باتیں سنتی رہی تو مجھے ڈر ہے میں بھی اس آفت ناگہانی میں مبتلا نہ ہو جاؤں۔"

جیسا اطمینان اس کے لہجے میں تھا، اس سے کہیں بڑھ کر چہرے پر چھایا تھا۔ جبکہ عنیزہ نے منہ اٹھا کر بغور اسے دیکھا۔

"واہ کیا کہنے، کتنی سمجھ دار ہو گئی ہے یہ بچی۔" نینا نے بے اختیار سراہا۔

"ویسے یار بڑا اچھا "شغل" لگا ہوا تھا، میری مانو تو ابھی یہ چیپٹر کلوز مت کرو، سچی میں بہت ہی مزے کی باتیں کرتا ہے وہ تمہارا عاشق۔ تم جتنے دن آف لائن رہو گی، اتنے دن کے لیے اسے مشورہ دو کہ وہ کچھ لکھنا شروع کردے سچ میں نہایت بہترین رومانی ناول لکھ سکتا ہے وہ۔" رمشا نے چٹخارا لیتے ہوئے رائے پیش کی۔

"ہاں واقعی لکھ تو سکتا ہے اور ناول بھی ایسے جو تہلکہ مچادیں۔ اُف توبہ...... اور ایسے ایسے مکالمے جو کانوں سے دھواں نکال دیں۔ میں تو باز آئی ایسی عاشقی سے، لاحول پڑھنے کو دل کرتا ہے اب، ویسے تمہیں اگر اس کی باتیں اتنی ہی پسند ہیں تو بھئی اب تم لگالیا کرو اس سے گپ شپ۔" تانیہ نے اسے کھلی آفر دی۔

"ارے نہیں بھئی، تم تو اب فیڈ اپ ہوئی ہو، میں کب کی ہو چکی۔ یہ پردے کے پیچھے والے عاشق کچھ زیادہ ہی سچے اور پکے ہوتے ہیں۔ "سب کہہ دو" ان کا من پسند فقرہ ہے، ذرا دید لحاظ نہیں ہوتا ان میں۔ بس محبت کے ڈونگرے برسائے چلے جاتے ہیں، مجھے تو معاف رکھو۔"

پیالیوں میں چائے چھانتی وہ بے زاری سے کہہ رہی تھی۔ نینا اور تانیہ ہاتھ پر ہاتھ مارتی ہنس دیں اور چپ چاپ ان کی گفتگو سنتی عنیزہ کی کان کی لوئیں تک سرخ ہو چکی تھیں۔ اس کا چہرہ دیکھ کر نینا بول پڑی۔

"بہت ہی بے شرم لڑکیاں ہو تم دونوں، یہ کس قسم کی گفت و شنید کر رہی ہو؟ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ اگر تم لوگوں کا کہا کوئی ایک بھی لفظ "ہٹلر کے بچے" کے کان میں پڑ گیا تو سمجھو قیامت آجائے گی۔"

"ہٹلر کا بچہ......؟" تانیہ اور رمشا ایک آواز میں متحیر سی بولیں، جبکہ عنیزہ نے اسے گھورا تھا۔

"ہاں ہٹلر کا بچہ...... تم لوگ اس ہستی کے غصے سے ابھی واقف نہیں ہو۔ نہ تم لوگوں نے اسے گرجتے برستے دیکھا ہے، اس لیے اتنے مزے سے فضول گوسپ میں مشغول ہو۔ اگر اس نے کچھ سن لیا تو یقین کرو، اٹھا کر گھر سے باہر پھینک دی جاؤ گی۔" نینا نہایت رازدارانہ لہجے میں انہیں مطلع کر رہی تھی۔

"اوہو...... پر یہ موصوف ہیں کون؟" وہ جاننے کو بے چین تھیں۔

"کیوں عنیزہ! بتادوں انہیں؟" وہ شرارت سے مسکراتی اس سے پوچھ رہی تھی، جو اَن سنی کرتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں ابا جی کو چائے دے آؤں، ٹھنڈی ہو رہی ہے۔"

"ہاں اب بتاؤ۔" اس کے جاتے ہی وہ دونوں قریب کھسک آئیں۔

"بہت ہی ناقص یادداشت ہے تم دونوں کی، ابھی باہر ہی تو ملی ہو ان حضرت سے۔" نینا نے ان پر "درفٹے منہ" والی نظر ڈالی۔

"ہیں کیا ابا جی؟" دونوں نے اک دوجے کو دیکھا اور نینا نے بھنّا کر انہیں۔

"ابا جی کی بچیوں...... ابا جی سے پہلے کس سے ملے تھے ہم لوگ؟"

''ہیں...... وہ ڈیشنگ؟'' ان کا ''ہیں'' چیخ سے مشابہ تھا۔

''ہاں وہ ڈیشنگ، جس کا بس نہیں چلتا عنیزہ بے چاری کو ڈھشوں ڈھشوں کردے، اتنی معصوم سی ہماری سہیلی۔ قسم سے حوصلہ ہے اس کا جو ایسے بدلحاظ کزن کو برداشت کرتی ہے، ابھی دیکھا تھا نا تم لوگوں نے بھی۔ ذرا مینرز نہیں ہیں اسے، کیسے منہ پھلا کر گزرا ہمارے پاس سے۔ مت پوچھو جو یہاں پر میں دیکھ رہی ہوں، میں تو سمجھتی تھی عنیزہ کی فطرت ہی ایسی دبو سی ہے لیکن یہ تو اب پتا چلا کہ اس بے چاری کو سانس بھی کھل کر نہیں لینے دیا جاتا۔ ہزار طرح کی تو پابندیاں ہیں اس پر، زیادہ دوستیاں نہیں بنانی۔ کسی سہیلی کے گھر نہیں جانا، کسی کو گھر نہیں بلانا' یہ تو اتفاق ہوا کہ پھپھو، انکل کے ایکسیڈنٹ کا سنتے ہی دبئی چلی گئیں اور مجھے مما نے اس کی پریشانی کے خیال سے یہاں بھیج دیا۔ سیل فون تک تو اس کے پاس نہیں، حالانکہ اس کے بابا نے بھیجا تھا اس کے لیے لیکن اس ہٹلر کے بچے نے اٹھا کر اپنے کسی دوست کو گفٹ کر دیا۔ یہ کہہ کر کہ گھر میں فون ہے تو اسے علیحدہ فون کی کیا ضرورت...... اف...... میرے ساتھ کوئی ایسا کرے نا تو میں اس کی گردن ہی دبا دوں اور ایک یہ ہماری عنیزہ صاحبہ ہیں، الٹا اس سے ڈر کر رہتی ہے۔ وہ اتنا رعب جماتا ہے اس پر کہ حد نہیں اور یہ ایسی بے وقوف کہ اس کے سامنے چوں نہیں کرتی۔ اس کی حالت دیکھ کر تو میں نے بھی ارادہ کرلیا ہے۔ اب تب تک یہاں سے نہیں جاؤں گی جب تک اسے سدھار نہ لوں۔'' نینا کی آنکھوں میں اک عزم نظر آ رہا تھا۔

''بالکل...... اگر ایسی صورت حال ہے تو ہمیں ضرور عنیزہ کو سمجھانا چاہیے۔ وہ کیوں اتنا ڈرتی ہے اس سے اور اپنا سیل فون بھی دے دیا، وہ تو اس کے بابا نے دبئی سے بھیجا تھا۔ کتنا زبردست ہوگا نا یار! بالکل پاگل ہے یہ عنیزہ تو۔'' اتنی دکھی تو یقیناً عنیزہ بھی نہیں ہوئی ہوگی جتنا اس وقت وہ دونوں ہو رہی تھیں۔

''پاگل سی پاگل...... مگر میں نے بھی اب اس کا علاج کر کے ہی دم لینا ہے، یہ ہٹلر کا بچہ سمجھتا کیا ہے اپنے آپ کو۔ اگر عنیزہ اس کی کزن ہے تو میں بھی عنیزہ کی کزن ہوں۔ اس نے بگاڑ کر رکھ دیا ہے اس کی شخصیت کو، اب دیکھنا میں کیسا سدھارتی ہوں۔'' نینا دانت کچکچا رہی تھی، یوں جیسے وہ منہ میں رکھا ہو، تانیہ اور رمشا نے اس کے شانے تھپکے۔

☆☆☆

لاؤنج میں آتے ہی پہلے قدم پر لگا کہ جیسے وہ لق و دق صحرا میں آ گئی ہو۔ اسے ایسا کیوں لگا تھا؟ جب اس امر پر غور کیا تو اس کے حلق سے نکلنے والا ''امی......'' چیخ جیسا ہی تھا۔

''خیر تو ہے؟ یہ کیا طریقہ ہے، نا سلام نہ دعا آتے ہی شور...... سامنے ہی تو بیٹھی ہوں میں۔ اتنا زور سے چلانے کی کیا ضرورت تھی۔'' یاسمین کو اس کا انداز ذرا نہ بھایا، فوراً لتے لیے۔

''یہ...... یہ کیا کیا آپ نے؟'' وہ چاروں اور دیکھتی بدحواس سی پوچھ رہی تھی۔

''کیا مطلب؟ کیا کر دیا ہے میں نے؟'' انہوں نے بھی ادھر اُدھر دیکھا، پر کچھ سمجھ نہ آیا۔

''یہ...... یہ پورے لاؤنج کی کیا حالت کر ڈالی ہے، کیوں اتارے یہ سب پردے اور کور وغیرہ؟ ابھی لاسٹ سنڈے ہی تو سب دھویا تھا میں نے، اب پھر کیا ضرورت آن پڑی اور کیسے دھویا ہے ان کو؟''

''لو یہ کیا سوال ہے بھئی، جیسے سب کپڑے دھلتے ہیں ویسے ہی دھویا ہے اور یہ لاسٹ سنڈے کی بھی خوب کہی۔ پورا ہفتہ ہونے کو آ گیا اب تو، دو بار تو آندھی آ چکی، ہر طرف گرد و غبار بھرا ہوا تھا۔ پردے بھی بڑے ہی میلے لگ رہے تھے مجھے، میں نے نازیہ سے اتروائے اور مشین میں دھلوا دیے۔ غیاث بھائی اور بھابھی کتنے سالوں بعد وطن لوٹے ہیں، کل رات کے کھانے پر بلا رہی ہوں انہیں۔''

بے اختیار جی چاہا کہ وہ اپنے بال نوچ لے۔

کوئی تین ماہ پہلے عید پر پورے گھر کے پردے وغیرہ بنائے گئے تھے۔ ہر بار شاپنگ امی ہی کیا کرتی تھیں' اس بار بابا کے ساتھ وہ ضد کرکے گئی تھی اور جی بھر کے عمدہ اور پسندیدہ شاپنگ کی، بابا نے بھی نہ ٹوکا، وہ ان ہی کی تو ہم مزاج تھی، بلکہ ان کے ہی مشورے سے لاؤنج کے سب سے بہترین اور مہنگے اسٹف کے پردے لیے گئے۔ جن کے لیے شاپ کیپر نے اسے خاص ہدایات دی تھیں کہ ان کی عمر بڑھانے کے لیے ضروری ہے کہ آپ انہیں ہمیشہ مشین کے بجائے ہاتھ سے دھوئیں اور دھوپ میں تو ہرگز خشک نہ کریں، لاسٹ سنڈے بھی اس کی صفائی پسند ماں نے شور مچا رکھا تھا تو اس نے جی کڑا کرتے ہوئے پہلی بار بڑے پیار سے ان پردوں کو دھویا تھا کہ آج پھر ان کی شامت بلا دی گئی۔ اگر وہ ان پردوں کی اصل قیمت انہیں بتا دیتی تو شاید وہ انہیں عمر بھر دھونے کی غلطی نہ کرتیں اور اتنی بے دردی سے تو ہرگز نہیں۔

دھڑ دھڑ کرتی وہ اوپر پہنچی تھی، ستم زدہ پردوں کو تاروں سے اتار کر یوں بانہوں میں سمیٹا جیسے برسوں بعد بچھڑے محبوب ملتے ہیں۔ انہیں ٹٹول ٹٹول کر دیکھا، کہ کہیں ظالم زمانے نے کوئی زخم تو نہیں دے دیے، لیکن صد شکر کہ بچت ہی رہی تھی، آوازوں نے توجہ کھینچ لی۔ اب یہاں تک آ گئی تھی تو لگے ہاتھوں یہ کام بھی کرلیا جائے۔ یہ ہی سوچ کر پردے احتیاط سے اک طرف رکھے اور اسٹول پر چڑھ کر دیوار پر ہتھیلیاں جماتی اگلی چھت پر کود گئی۔ اسے دیکھتے ہی اک شور مچ گیا تھا، بھوک سے بے قرار پرندے قفس کی جالیوں پر چونچیں مارنے لگے۔

''ہیلو ڈیئر برڈز...... کیسے ہو تم سب؟ کیسا گزرا آج کا دن۔ سوری میں صبح نہیں آ سکی، نازیہ کو بھیج دیا تھا۔ وہ کھانا دے گئی تھی نا اور لگتا ہے سب کو اس وقت بھی خوب بھوک لگی ہے۔ ملتا ہے ابھی سب کو کھانا ملتا ہے بھئی...... آرام سے کھانا، ٹھیک ہے۔ چلو میں ابھی لے کر آئی تم سب کی من پسند ڈش۔''

پنجرے کی سائڈ پر پڑے باکس میں سے اس نے مٹھیاں بھر بھر کر باجرہ ڈالا، رنگ برنگے طوطے اور چڑیاں لپک کر چگنے لگے۔ وہ کچھ لمحے بڑے پیار سے ان سب کو دیکھتی رہی، پھر خالی پیالے میں پانی بھر کر اٹھی تو عجیب سا احساس ہونے پر پیچھے دیکھا اور پتھر کی ہوگئی۔ نیچے جاتی سیڑھیوں کے پاس سینے پر بازو باندھے کھڑا یقینی طور پر وہ منصب زمان مروت ہی تھا۔ اس کا بھوت نہیں (کیونکہ بھوت کی مسکراہٹ ایسی دلکش نہیں ہوتی) اس کا سانس گم ہوا تھا، دل دھڑکنا ہی بھول گیا، حسب سابق۔

''آپ کو دیکھ کر جس طرح ان سب نے ری ایکٹ کیا، اس سے لگتا ہے آپ ان کا کافی سے زیادہ خیال رکھتی رہی ہیں۔ نیا جان خواہ مخواہ پریشان ہوتی رہیں وہاں، ان کو تو فکر میں نیند ہی نہیں آتی تھی۔ صبح اٹھتے ہی پہلا خیال ان سب کا ہوتا تھا، پتا نہیں ان کے چڑیاں، توتوں نے ابھی تک کچھ کھایا پیا بھی ہے یا بھوکے ہوں گے۔ جبکہ گل مینا روز ان کو تسلی دیتی تھی کہ جس کے ذمے آپ ان سب کو چھوڑ کر آئی ہیں وہ اپنی جان سے بڑھ کر ان کی کیئر کر رہی ہوگی، یعنی گل مینا بالکل ٹھیک کہہ رہی تھی۔ بہت شکریہ آپ ان کو باقاعدہ وقت دیتی رہیں۔''

وہ ممنون ہو رہا تھا اور وہ خائف کہ وہ اسے چھپ کر ان سے گپیں لگاتے دیکھ رہا تھا، یہ کوئی طریقہ ہوتا ہے؟ ''تراہ'' ہی نکال دیا تھا ایک پل کے لیے۔

''آپ کب آئے، ابھی کل ہی تو میری بات ہوئی ہے مینو سے، اس نے تو بتایا ہی نہیں۔''

اسے گل مینا پر بھی غصہ آیا۔ کیا تھا اگر بتا دیتی وہ اس وقت کی شرمندگی سے تو بچ جاتی (اور اس ننھے منے ہارٹ اٹیک سے بھی)۔

''صرف میں ہی نہیں نیا جان بھی واپس آ چکی ہیں، ان کا تو دل ہی نہیں لگ رہا تھا وہاں، انہیں تو بس اپنے ان بچوں کی فکر تھی۔''

''کمال ہے، کیا نیا جان کو مجھ پر یقین نہیں تھا۔'' اسے خاصا صدمہ ہوا اس اطلاع سے، منصب

نے شانے اُچکا دیے۔
''جا کر پوچھ لیں ان سے، میں کیا کہہ سکتا ہوں۔'' اور وہ سیڑھیاں اتر آئی تھی۔
''ارے آؤ...... آؤ سویرا بیٹی! کیسی ہو؟'' نیا جان نے خوش دلی سے خیر مقدم کیا، اس کا منہ پھولا ہوا تھا۔
''میں ٹھیک ہوں اور آپ کے سب پرندے بھی بالکل ٹھیک ہیں۔ جیسے آپ تاکید کر کے گئی تھیں، ویسے ہی ان کا دھیان رکھتی رہی ہوں۔ آپ چاہیں تو ابھی چل کر ان سب کو دیکھ لیں، کل کلاں کو کوئی گلہ نہ کیجیے گا مجھ سے۔ سب ویسے ہی ہٹے کٹے اور موٹے تازے ہیں، کاش کہ وہ سب بول سکتے تو میں ان سے کہتی کہ آپ کو بتا دیں جو روّیہ میں نے ان کے ساتھ رکھا تھا۔'' نیا جان نے حیران ہو کر اسے تڑتڑ بولتے دیکھا اور مسکرا دیں۔
''مڑے وہ کیسے بولے گا وہ تو بے زبان جانور ہیں اور مجھے تم پر بھروسا تھا تب ہی تو حوالے کر کے گئی تھی۔ خان صاحب کا خبر ہے، ہم کو وہ ہر آدھے گھنٹے بعد خود تو اٹھ کر کچھ کھا سکتے ہیں لیکن کسی اور کو جا کر کھلانا مصیبت ہوگا ان کے لیے اور ادھر آؤ۔ دیکھو ہم کیا لایا تمہارے لیے، زرمینا اور گل مینا نے بھی چیزیں بھیجی ہیں تمہارے واسطے۔''
اور جب انہوں نے دونوں میناؤں کا دیا ہوا مینا بازار اس کے سامنے لگایا تو وہ سب غصہ بھول بھال گئی۔ کشمیری کڑھائی کا بہترین سوٹ، ہاتھ سے کشیدہ کاری کر کے بنایا گیا بیگ، بادام کا حلوہ، خشک میوے اور بہت کچھ۔'' وہ دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔
''اور تم نے جو ذمہ داری نبھائی یہ تحفہ میری طرف سے اس بات پر۔'' انہوں نے سب سے آخر میں شیشوں کے کام سے مزین بھاری چادر اس کی گود میں رکھی، اس کی تو آنکھیں ہی کھل گئیں دیکھ کر، شیشوں سے منعکس ہوتی روشنی نے پورا کمرہ ہی جگمگا ڈالا تھا۔
''اوہ...... اٹس بیوٹی فل...... یہ اتنی زبردست چادر میرے لیے۔ اُف...... نیا جان آپ کا تحفہ تو سب سے بڑھ کر ہے، بہت شکریہ۔''
''شکریہ کس بات کا، مائیں بچوں کے لیے چیزیں لایا ہی کرتی ہیں اور تم تو میری بہت پیاری بیٹی ہو۔'' انہوں نے اسے ساتھ لگا کر ماتھا چوم لیا، ان کی اتنی محبت پر وہ نہال ہو گئی۔
''نیا جان میں بھی آپ کا بچہ ہوں، کچھ میرے کھانے پینے کی فکر بھی کر لیں۔ اتنی لمبی ڈرائیو کی ہے، اب تو شدید تھکن کے ساتھ بھوک بھی لگ رہی ہے۔'' مسکراہٹ دبائے یہ نظارہ دیکھتا منصب زمان دروازے میں کھڑا تھا، نیا جان جلدی سے اٹھیں۔
''ہاں...... ہاں بچے! تمہاری فکر کیوں نہیں ہوگی، بس تم ہاتھ دھو لو۔ دو منٹ لگتا ہے کھانا گرم ہونے میں۔''
''اتنا سفر کر کے آئی ہیں نیا جان! آپ بھی تھک گئی ہوں گی، آپ بیٹھ جائیں، کھانا میں گرم کر لیتی ہوں۔'' سب چیزیں ایک طرف کرتی وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔
''اوہ بچے، اللہ خوش رکھے، جیتی رہو۔'' نیا جان خود بے حد تھکی ہوئی تھیں، اتنا طویل سفر کر کے آئی تھیں، جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ ان میں اب ہلنے کی بھی ہمت نہ تھی، انہوں نے اطمینان سے اسے جاتے دیکھا۔ جانتی تھیں وہ ابھی لپک جھپک میز لگا دے گی، منصب بھی اسے جاتے دیکھتا اندر آ گیا۔ وہ مسکرا دیں اور ان کی یہ مسکراہٹ بے وجہ نہیں تھی۔
''بابا جان کا فون آیا تھا، میں نے ان کو بتا دیا ہے کہ ہم گھر پہنچ چکے ہیں۔'' وہ ان کے پاس آ بیٹھا۔
''بہنوں کو بھی فون کر دو، انہیں بھی فکر ہوگی بلکہ زرمینے کا نمبر ملا کر دو مجھے، میں بات کروں اس سے۔''
''آرام سے کال کر لیجیے گا، پہلے کھانا

کھالیں۔'' وہ صوفے کی بیک سے سر ٹکاتا نیم دراز سا ہو گیا۔

''بہت تھک گیا ہے میرا بچہ!''

نیا جان نے پیار سے اس کے بالوں میں انگلیاں چلائیں اور اس میں کچھ شک نہ تھا، وہ سچ میں بے حد تھکا ہوا تھا لیکن وہ کچھ دیر پہلے کی بات تھی۔ اب تو وہ تازہ دم تھا، ساری تھکن تو اس کی صورت دیکھتے ہی اتر گئی تھی۔ پورے دس دن اس کی دید کے بنا گزارے تھے اور کیسے گزارے تھے یہ دن؟ یہ تو کوئی اس کے دل سے پوچھتا، ایک ایک پل صدیوں پر محیط تھا گو بابا تو اب بھی چاہ رہے تھے وہ کچھ دن اور ان کے ساتھ گزاریں۔

گل مینا کے پہلا بیٹا ہوا تھا، نیا جان تو اس کی طبیعت خراب ہونے کا سن کر رخت سفر باندھ بیٹھی تھیں۔ پھر منے کا دھوم دھام سے عقیقہ کیا گیا، وہ تو اب بھی نہیں آنا چاہ رہی تھیں مگر وہی ان کو وہم میں ڈالے رہا تھا کہ سویرا یونی جاتی ہے، وہ کہاں ان کے پرندوں کا خیال رکھتی ہوگی۔ اس سے پہلے کہ ان معصوموں کے بھوکے پیاسے مرنے کی خبر آئے، انہیں واپسی کا رستہ ناپ لینا چاہیے۔

''لالہ! ویسے یہ کوئی اچھی بات نہیں آپ جب بھی نیا جان کے پاس بیٹھتے ہیں، میری سہیلی کی برائیاں کرتے ہیں۔'' گل مینا نے سختی سے نوٹس لیا تھا۔

''میں نے کب کوئی برائی کی؟ میں نے تو صرف اتنا کہا کہ وہ اپنی پڑھائی میں مصروف ہوتی ہے، اب اس میں کچھ جھوٹ ہے تو بتاؤ؟''

وہ جھٹ معصوم بن گیا، وہ مسکرا دی۔ اس کی سہیلی کی برائیاں کرتے ہوئے لالہ کی آنکھیں کیسے چمکتی ہیں، خوب جانتی تھی وہ۔

''نہیں مڑے ویسے! یہ کہتا تو ٹھیک ہے۔'' نیا جان انتہائی سادہ مزاج، اس کی باتوں میں آجاتیں۔ وہ مسکراہٹ دباتا اٹھ جاتا، گل مینا دور تک گھورتی۔

وہ دونوں بہنیں سب سمجھ رہی تھیں اور ایک دن انہوں نے نیا جان کو بھی سمجھا دیا تھا۔ انہیں اور کیا چاہیے تھا اگر یہ اس کی خوشی تھی تو وہ بھلا کیا اعتراض کرتیں۔

''اب یہ نہ ہو کہ آپ وہاں پہنچتے ہی پوتے کا رشتہ لے جائیں، کچھ دن صبر کرلیجیے گا۔ ہم سب پوری تیاری کے ساتھ آئیں گے۔ ایک ہی تو لالہ ہے ہمارا، سو سو ارمان ہیں دل میں اور ہاں سویرا سے تو بھول کر بھی بات نہ کیجیے گا۔ سرپرائز دیں گے اسے، خوب مزا آئے گا۔''

گل مینا تصور کی آنکھ سے نظارہ کرتی لطف لے رہی تھی، اگر وہ لالہ کی آنکھوں کے رنگ پہچان گئی تھی تو سہیلی کے دل کی پہیلی بھی بوجھ گئی تھی۔

''اب یہ سرپرائز کیا بلا ہوتی ہے۔'' نیا جان سب کا منہ تک رہی تھیں۔

''سب اچانک جا کر بتائیں گے نا نیا جان۔'' زرمینا نے آسان لفظوں میں سمجھایا۔

''تو اگر میں بتا دوں گی تو کیا حرج ہو جائے گی۔'' نیا جان کو ان کی بات کچھ خاص پسند نہیں آئی تھی، وہ کیسے اتنا صبر کریں گی۔ سویرا تو ہر دوسرے دن ان کے پاس آتی تھی۔ گل مینا نے اس سے وعدہ لیا ہوا تھا کہ وہ نیا جان اور داجی کا خیال رکھے گی اور وہ پورے خلوص سے اس سے کیا عہد نبھا رہی تھی۔

''سویرا سے کہتی ہوں۔ کھانا گرم کر لیا ہے تو چائے کا پانی رکھ دے۔'' نیا جان کہتی باہر کو چل دیں، وہ آنکھیں موندے من چاہے رنگ دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

دروازے پر ہوتی دستک پر انہوں نے کتاب سے نظر اٹھائی' وہ ٹرے اٹھائے اندر آ رہا تھا۔

''ارے بھئی آؤ جوان، آج کیا لے کر آئے ہو بوڑھے دادا کے لیے ہوں...... خوشبو تو بہت اچھی آ رہی ہے۔ لگتا ہے کچھ خاص ہے۔'' کتاب سائڈ ٹیبل پر رکھتے انہوں نے ایک لمبا سانس کھینچتے کہا۔

''بوڑھے دادا ہوں گے میرے دشمنوں کے'
آپ تو میرے ینگ اینڈ گریس فل سے ابا جی ہیں اور آپ بالکل ٹھیک بوجھے۔ بہت خاص ڈشز لایا ہوں آپ کے لیے، آج امی نے آپ کے فیورٹ مٹن کوفتے بنائے ہیں اور میری فرمائش پر چائنیز ویجی ٹیبل رائس۔ سویرا نے بینگن کا رائتہ اور فروٹ سیلڈ بنایا تھا، جب اتنے مزے کا کھانا دیکھا تو دل نہ مانا کہ اکیلے کھالوں، آپ نے ابھی کھانا تو نہیں کھایا نا۔''

''نہیں، تمہارے آنے سے پہلے تک کھانے کا موڈ نہیں تھا لیکن اب لگتا ہے موڈ بن گیا ہے۔'' وہ ٹانگوں پر پڑا کمبل ہٹاتے اٹھے۔

''اور یہ میرے آنے سے پہلے موڈ کیوں نہیں تھا؟''

''آج دوپہر میں خان صاحب کی طرف چلا گیا تھا اور تمہیں تو پتا ہے ان کا، وہ کھلانے کے معاملے میں ذرا احتیاط نہیں برتتے، پھر کچھ باداموں کا حلوہ بھابھی نے اتنا اچھا بنایا تھا کہ میں ضرورت سے زیادہ ہی کھا گیا۔ اب طبیعت بھاری محسوس ہوری تھی، سوچا تھوڑا پرہیز کرلوں۔ عنیزہ بھی آئی تھی کھانے کا پوچھنے۔ میں نے منع کر دیا۔''

''اوہ...... تو یہ کوئی اچھی بات نہیں، آپ سے کتنی بار کہا ہے ابا جی! خان صاحب کی طرف جاتے ہیں تو خدارا کھانے پینے کے معاملے میں احتیاط برتا کریں۔ آئی تھنک اب مجھے پہلے آپ کی شوگر چیک کرنا ہوگی۔'' میثم نے پریشانی سے کہتے ٹرے بیڈ پر رکھی اور سائڈ ٹیبل کی دراز کھولی۔ اس کے ہاتھ میں گلوکو میٹر تھا جس سے ان کی جان جاتی تھی۔

''اوہ نہیں...... رکھو پرے اسے، نارمل ہے میری شوگر، کہہ تو رہا ہوں، کھائی ہے دوا بھی۔''

''اچھا اچھا اب کھانا کھاؤ، بھئی واہ کمال ہے بہت مزے کے کوفتے بنے ہیں۔'' انہوں نے مزید چمچہ بھر کر ڈالا، میثم نے ڈونگا اٹھا کر ان کی پہنچ سے دور کر دیا، ابا جی نے اسے گھورا پھر دونوں دادا پوتا ہنس دیے۔

''اور سناؤ، کیسی جارہی ہے تمہاری پڑھائی اور کوچنگ۔''

''اے ون، یہ سب آپ کی دعائیں......''
ابھی بات اس کے منہ میں تھی کہ لاؤنج سے ٹی وی کا فل والیوم گونجنے لگا۔ کوئی انڈین سوپ تھا، وہی مشہور زمانہ ہولناک میوزک، ڈھائیں ڈھائیں ڈھشوں ڈھشوں...... کان پھاڑتا، دل دہلاتا، اس نے کھانے سے ہاتھ روک کر سامنے والی دیوار کو یوں گھورا جیسے پار کا منظر سامنے ہو۔

''اُف...... اتنی آواز...... کیا کان خراب ہوگئے ہیں جو اتنا والیوم کھول لیا ہے۔ ایسا پہلے تو کبھی نہیں ہوا اس گھر میں۔ اور یہ انڈین ڈراما دیکھ کون رہا ہے، حد ہے بدتمیزی کی۔'' وہ بری طرح تپ اٹھا۔

''کھانا کھاؤ یار! مت ہائپر ہوا کرو ایک دم، کوئی بات نہیں۔ بچیاں ہیں، کر لینے دو انجوائے۔ سارا دن میں ایک دو گھنٹے ہی تو ملتے ہیں انہیں بھی تفریح کے، پھر نینا بیٹی مہمان ہے اگر ہم بات بات پر ٹوکیں گے تو وہ کیا سوچے گی ہمارے بارے میں۔ عنیزہ کا اس کے ساتھ دل لگا رہتا ہے ورنہ تو پتا ہے نا، کیسے بولائی بولائی سی پھرتی ہے وہ۔''

''بولائی ہوئی تو پیدائشی ہے آپ کی پوتی، یہ کوئی نیا قصہ نہیں اور میں بتا رہا ہوں میری برداشت سے باہر ہے یہ نینا نامی لڑکی۔ مجھے اس کا یہاں عنیزہ کے ساتھ رہنا بالکل اچھا نہیں لگ رہا۔ اب یہ آواز سن رہے ہیں نا آپ، یہ کوئی طریقہ ہے۔ عجیب مزاج کی ہے یہ لڑکی، ہر وقت فضول گوسپ، بے مقصد ہنسی ٹھٹھول...... مجھے تو ڈر ہے اگر چار دن اور عنیزہ اس کے ساتھ رہی تو کہیں اسے بھی یہ جراثیم نہ لگ جائیں۔'' مارے طیش کے اس کا چہرہ لال ہو رہا تھا۔

''اونہوں...... کسی کے لیے اتنے برے گمان نہیں رکھتے، اچھی بچی ہے وہ اور پھر اس عمر میں

بچیوں کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔ ہنستی کھلکھلاتی خوش کن بہار جیسی۔ گھر کی رونق تو بیٹیوں کی چہکاروں سے ہی ہوتی ہے، ایک یہ میری پوتیاں ہیں۔ سچ پوچھو تو نینا بیٹی کو دیکھ کر مجھے احساس ہونے لگا ہے کہ میری دونوں پوتیاں دنیا سے نرالی ہیں۔ ایک زمانے بھر کی پڑھاکو، دوسری جی بھر کے سیدھی۔ اس بے چاری کو تو ہم سب نے ایسا پروں میں چھپا کر رکھا ہے کہ وہ تو سانس بھی پوچھ پوچھ کر لیتی ہے، اب اس کی سہیلیاں کیسی کھلکھلاتی پھرتی ہیں، ان سب کے درمیان اسے دیکھو تو لگتا نہیں کہ یہ ان ہی کی ہم عمر ہے۔ اپنے چہرے کی سنجیدگی کے باعث ان سب میں سمجھدار لگتی ہے، میں تو کل اسے دیکھ کر پریشان ہی ہو گیا۔ میں نے تو کہہ دیا ہے زینب سے، وہ کوئی فکر نہ کرے۔ تین ماہ کا ویزا ہے اس کا، چاہے تو تین ماہ کا اور بڑھوا لے، سہیل کو اس وقت ضرورت ہے اس کی، وہ رہے وہاں۔ خدمت کرے میاں کی، جب تک وہ بالکل صحت یاب نہیں ہو جاتا، وہ واپسی کا سوچے بھی مت۔ ارے بھئی اس عرصہ میں میری بچی بھی کچھ زندگی کے رنگ ڈھنگ سیکھ لے گی۔"

وہ مطمئن سے کہہ رہے تھے اور وہ متحیر سا انہیں تک رہا تھا یعنی جن پتوں پر تکیہ تھا وہی ہوا دینے لگے۔ اسے ان سے اس رویئے کی امید نہیں تھی وہ چپ چاپ برتن سمیٹ کر اٹھ گیا۔

"عنیزہ سے سبز قہوہ کا کہتے جانا۔" کمرے سے نکلتے اس نے سنا تھا۔

لاؤنج میں جس طرح دم سادھے وہ میک اپ سے لتھڑے خرانٹ چہرے والی اداکارہ کی ادائیں دیکھ رہی تھیں، اس نے اس کے اندر جلتی آنچ اور بڑھا دی۔

"عنیزہ۔" وہ پکارا نہیں بلکہ دھاڑا تھا۔

"جی۔" وہ بے چاری صوفے سے یوں اچھلی گویا نیچے اسپرنگ نکل آئے ہوں، رنگ فق ہوا تھا۔ اس کے ماتھے کے بل ہمیشہ سے جان ہوا کر دیتے تھے اس کی۔

"ادھر آؤ۔" حکم دیتا وہ کچن کی جانب جا چکا تھا، وہ فوراً اٹھی تھی، نینا نے ناگواری سے اسے جاتے دیکھا اور منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا کر رہ گئی۔

"جی۔" وہ تابع دار ماتحت کی طرح سر جھکائے اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ میثم نے سرتا پا دیکھا۔

"ابھی تمہاری اتنی عمر تو نہیں کہ آلۂ سماعت کی ضرورت پڑنے لگے۔"

"جی؟" وہ قطعاً نہیں سمجھی۔

"کیا جی...... جی کر رہی ہو، ادھر قریب ہی حکیم انبالوی کا مطب ہے، کل پہلی فرصت میں اپنی سہیلی کو ساتھ لے جا کر دونوں اپنے کانوں کی صفائی کرواؤ۔ غضب خدا کا، یہ آواز سن رہی ہو تم، مجھے یقین ہے باقی محلہ بھی فیض یاب رہا ہوگا۔ کبھی اس سے پہلے اتنا شور ہوا ہے یہاں؟ کیا ہو گیا ہے تمہیں، ساری تمیز اور تہذیب بھولتی جا رہی ہو۔ ابا جی بیمار آدمی ہیں، کیا وہ ڈسٹرب نہیں ہو رہے ہوں گے، وہ مارے مروت کے کچھ نہ کہیں لیکن تمہیں اس بات کا احساس ہونا چاہیے۔"

"سوری...... میں ابھی جا کر والیوم کم کر دیتی ہوں۔"

"اور یہ چینل کون سا دیکھا جا رہا ہے، کیا دوسرے سارے چینل بلاک ہو چکے ہیں۔" وہ پوچھ رہا تھا۔

"مم...... میں تو نہیں دیکھ رہی۔" وہ صاف انکاری ہو گئی۔

"ہاں ابھی دیکھا تھا میں نے، تم تسبیح پڑھ رہی تھیں۔" اس نے دانت کچکچائے، عنیزہ کی ٹھوڑی گردن میں جا گھسی۔

"وہ تمہاری مہمان ہے، اس گھر کے طور طریقے نہیں جانتی۔ اسے بتانا تمہارا فرض ہے۔ اسے اپنے انداز سے رکھو نہ کہ اس کے رنگ میں رنگ جاؤ۔ اگر چچی جان کی پریشانی کا خیال نہ ہوتا تو میں ضرور ان سے تمہاری شکایت لگاتا۔ انہیں بتاتا

کہ ان کی لاڈلی آج کل اپنی اسٹڈیز سے زیادہ فالتو سرگرمیوں پر دھیان دے رہی ہے، میزبانیاں نبھانے میں لگی ہے۔ وہ تمہاری پڑھائی کی ذمہ داری مجھ پر ڈال کر گئی ہیں، آکر مجھ سے ہی سوال کریں گی نا اور نیکسٹ ویک سے ٹیسٹ شروع ہیں تمہارے، کیسی تیاری ہے؟' وہ پوچھ رہا تھا۔

''اچھی ہے۔'' وہ اپنے پیروں پر نظر جمائے ہوئے تھی۔

''اباجی کے لیے اچھا سا سبز قہوہ بناؤ، وہ انتظار کر رہے ہیں۔''

وہ لمبا چوڑا ہدایت نامہ دے کر چلتا بنا، اس کے جانے کے بعد عنیزہ نے یوں سانس لیا تھا جیسے بند کمرے سے نکل کر کھلی فضا میں آئی ہو۔ اس کے ٹلنے سے جان میں جان آئی تھی، یہ کوئی آج کا قصہ نہیں تھا وہ بچپن سے ہی یہی سب سہتی آرہی تھی۔ بہت چھوٹی سی تھی، اسے دھندلا سا یاد تھا، مما اسے اسکول لے کر گئی تھیں اور وہ رو رو کر ان کی ٹانگوں سے چپکی جارہی تھی، قریب ہی کھڑا میثم اسے بری طرح گھور رہا تھا کیونکہ کچھ فاصلے پر کھڑے اس کے کلاس فیلو اس تماشے سے محظوظ ہوتے خوب ہنس رہے تھے اور پھر اسے ایک دم غصہ آیا تھا۔

''آپ جائیں چچی جان! میں اسے اس کی کلاس میں چھوڑ آتا ہوں۔'' وہ اس کا بازو دبوچے ہوئے تھا۔

''ہاں، لے جاؤ، اس کی ٹیچر کے حوالے کرنا اور ہاں بریک میں بھی اس کی خبر لے لینا۔ لنچ کروا دینا اسے، چھٹی کے وقت بھی دھیان سے ساتھ لے کر اسکول سے نکلنا اور عنیزہ بیٹا! آپ بھی بھائی کا انتظار کرنا۔ اکیلے اسکول سے باہر مت آنا، سمجھیں۔'' چچی نے دونوں کو سمجھایا۔ ان کی سونپی گئی ذمہ داری اور اعتماد نے آٹھ سالہ میثم کو ایک دم ہی ساٹھ سالہ کر دیا۔

''آپ بالکل فکر نہ کریں، میں ہوں نا۔ میں خیال رکھوں گا اس کا، چلو عنیزہ!'' اس کے رونے چلانے کی پروا نہ کرتے ہوئے وہ کھینچتا اسکول کے اندر لے گیا، بریک میں بھی وہ اسپیشل خبر گیری کرتا۔

''سارا لنچ ختم کرو، خبردار جو کسی اور بچے کو دیا۔ میں دیکھ رہا ہوں تمہیں، جب تک کھا نہیں لو گی میں جاؤں گا نہیں۔'' وہ سر پر مسلط رہتا، گھر آکر بھی عنیزہ کا اس سے بچنا مشکل تھا۔ چچی نے اس کا ہوم ورک اسی کے ذمہ لگا دیا تھا، وہ گھر بھر کی لاڈلی تھی۔ کوئی اسے پھول کی چھڑی سے بھی چھونے نہ دیتا، یہ ہی وجہ تھی وہ ان کے قابو میں نہ آتی، اک میثم تھا جو پڑھنے بیٹھتا تو اس کا بیگ بھی اٹھا لاتا۔

''آرام سے آکر ہوم ورک کرو۔ نہیں تو میں کل ٹیچر سے کمپلین کروں گا تمہاری۔'' وہ اس کی کمزوری سے واقف تھا۔

ٹیچر کومل صرف نام کی ہی کومل تھی ورنہ بچوں کو کس طرح سدھارا جاتا ہے' یہ خوب اچھی طرح جانتی تھی وہ۔ عنیزہ کا بھی اس کے نام سے دم نکلتا تھا، وہ جھٹ سے آکر بیٹھ جاتی۔

چچی کو میثم پر پیار آتا جس نے انہیں بے فکر کر رکھا تھا اور پھر یہ سب لازم و ملزوم ہوتا گیا۔ کم عمری سے اس کے لیے بڑا بننے والا میثم جیسے ہر معاملے میں اس کا بڑا بن بیٹھا۔ ہر ہر بات پر روک ٹوک، مین میکھ نکالنا تو جیسے فرض تھا اس پر۔ کیا کرنا ہے، کیا پڑھنا ہے، کہاں جانا ہے، ہر موقعے پر اس کا مشورہ کیا بلکہ اسی کا کہا پورا ہونے لگا۔ کچھ اس کی تربیت ہی ایسی ہو گئی تھی کہ اس کے سامنے سب صلاحیتیں صفر بٹا صفر ہو جاتیں۔ وہ سارا اعتماد کھو بیٹھتی، وہ بھی کیا کرتی' اس نے شروع سے رعب ہی ایسے جما رکھا تھا۔

اب بھی گم صم سی قہوہ بنا کر اباجی کو دے آئی اور اس کی ہدایت کے مطابق لاؤنج میں بیٹھنے کے بجائے سیدھا کمرے کا رخ کیا، نینا اس کا انتظار کر کر کے ادھر آئی تو حیران رہ گئی۔

''تم یہاں ہو، میں اتنی دیر سے تمہارے انتظار میں سوکھ رہی ہوں' میں سمجھی تم ابھی تک اباجی کے روم

میں ہو۔ بھئی مجھ سے تو بزرگوں کے پاس زیادہ نہیں بیٹھا جاتا، عادت ہوتی ہے ان کی، یوں ہی نصیحتیں کرنے لگتے ہیں۔ تمہارا ہی حوصلہ ہے جو اتنے سکون سے برداشت کر لیتی ہو۔ چلو دادا جان کی حد تک تو ٹھیک ہے لیکن یہ جو دادا گیر کے سامنے تمہاری بولتی بند ہوتی ہے نا، سچ میں بہت غصہ آتا ہے مجھے تم پر۔ یہ بھلا کوئی طریقہ ہے، اس وقت جس طرح تم اس کھڑوس کی ایک ہی آواز پر اٹھ کر گئیں نا تو پتا ہے مجھے کیا فیل ہوا۔" وہ بولتے بولتے رکی، وہ جو خود کو کتاب میں گم ظاہر کر رہی تھی، بے اختیار سر اٹھا کر دیکھنے لگی۔

"مجھے یوں لگا کہ جیسے وہ انتہائی سخت قسم کا شوہر ہے اور تم ایک مظلوم بیوی، ایمان سے یار! بالکل ایسا ہی سین تھا۔" نینا ہنس رہی تھی، عنیزہ نے سخت برا مانتے ہوئے ہاتھ میں پکڑی کتاب سے اس کے سر کا نشانہ لیا۔

"فالتو بکواس بہت زیادہ آتی ہے تمہیں، بڑے بھائی ہیں وہ میرے۔" اس کا چہرہ غصے سے دہک اٹھا تھا، نینا کی ہنسی مزید بڑھی، بہ مشکل کنٹرول کرتے ہوئے بولی۔

"ہاں ہاں، سارے کزنز پہلے بہن بھائی ہی ہوتے ہیں، وہ بھی تمہارے بھائی جان (جان پر خاص زور تھا) ہیں اور یہ ہی تو المیہ ہے ہمارے معاشرے کا، خاندان کے وہ بزرگ جو لڑکی کو بچپن سے تربیت دیتے ہیں کہ بڑا بھائی ہے، خبردار نام نہیں لینا، ادب کرو، بھائی جان اور جب لڑکی عادی ہوجاتی ہے تو وہ ہی لوگ اس "جان" کو پکڑ کر "جانو" بنا دیتے ہیں۔ تم بھی بچ کے رہنا، کہیں ایسا نہ ہو کہ......"

اور اس کے رخساروں کی لالی گیرو برابر ہوگئی۔ غصے سے برا حال، اس سے پہلے کہ وہ کوئی اور انتقامی کارروائی کرتی کہ فون کی گھنٹی نے دھیان بٹا دیا۔ دبئی سے مما کی کال تھی، جو ہمیشہ کی طرح اس کے لیے فکر مند ہو رہی تھیں اور ان کی تاکیدیں...... اف، تھیں نا ٹینشن کی چچی، انہیں بھی بس اس کی پڑھائی کی ٹینشن تھی، وہ جلد ہی بے زار ہوگئی۔

"بابا سے بات کروائیں میری، اب ان کی طبیعت کیسی ہے؟"

اس نے اکتا کر کہا، اس کے بابا دبئی کی ایک آئل کمپنی میں کام کرتے تھے، وہ بہت چھوٹی تھی جب وہ اسے اور مما کو بھی وہیں لے گئے تھے لیکن اسے وہاں کی فضا راس نہیں آئی تھی، وہ اتنی بیمار پڑی کہ جان کے لالے پڑ گئے۔

"کہا بھی تھا مت لے کر جاؤ اسے، کھلے گھر میں رہنے کی عادی ہے بچی، یہاں سب کے ساتھ دل لگا ہوا ہے اس کا، وہاں کے بند کمروں میں اکیلی رہتی ہے وہ، جہاں سارا دن ماں کے علاوہ اور کسی اپنے کی صورت نظر نہ آئے اسے۔"

وہ اپنی اماں جی کی لاڈو رانی تھی، وہ بھی اس کے بنا اداس ہوگئی تھیں۔ اس کی بیماری کی خبر سنی تو بیٹے کے خوب لتے لیے۔ اس کی حالت دیکھتے ہوئے انہوں نے بھی یہ ہی بہتر سمجھا کہ اسے واپس پاکستان بھیج دیں، اب سال میں ایک بار بابا یہاں کا چکر لگا لیتے اور ایک بار وہ اور مما ان کے پاس چلی جاتیں۔

کچھ روز پہلے بابا کو اچانک انجائنا کا اٹیک ہوا تھا، مما تو اتنی بدحواس ہوئیں کہ اگلے ہی دن رخت سفر باندھ لیا، تب ماموں اس کی پریشانی کے خیال سے نینا کو یہاں چھوڑ گئے۔ مما نے سنا تو وہ بھی مطمئن ہوگئیں۔ آج بہت دن بعد بابا کی آواز میں نقاہت نہیں تھی، یہ ہی وجہ ہے کہ وہ دیر تک ان سے بات کرتی رہی۔

☆☆☆

"ماشاء اللہ...... اتنا کیوٹ گڈا ہے مینو! سچی میرا دل کر رہا ہے میں ابھی اڑ کر اس کے پاس آجاؤں اور ڈھیر ساری پاریاں کروں۔" آج کل مینا نے اپنے بیٹے کی تصویریں واٹس ایپ کی تھیں، جنہیں دیکھتے ہی اس نے جھٹ کال ملائی، کل مینا اس کی دیوانگی پر ہنس رہی تھی۔

''مجھے اندازہ ہے، تم اس کے دیدار کے لیے کتنی بے چین ہو۔ بس تھوڑے دن کی بات ہے تم خوب پیار کرنا اسے، میں، زرمینا اور مورے آئیں گے کراچی۔''

''اچھا، گڈ...... میں پھر آج ہی سے تمہارا انتظار شروع کر دیتی ہوں۔''

''کرلو شروع، اجازت ہے اور سناؤ پڑھائی کیسی جا رہی ہے تمہاری اور امتحان کب تک ہیں؟'' وہ پوچھ رہی تھی۔

''پڑھائی بہترین جا رہی ہے اور بس اب ایگزام میں کچھ ہی ٹائم رہ گیا ہے، تمہاری دعائیں چاہئیں۔''

''ہاں...... ہاں کیوں نہیں۔ بہت دعائیں تمہارے لیے۔ پوری توجہ سے اب اپنی پڑھائی کرو اور سنو زیادہ نیا جان کی طرف جانے کی ضرورت نہیں۔''

''کیوں؟'' اس نے گل مینا کی بات درمیان میں قطع کرتے ہوئے بے تابی سے پوچھا۔

''ارے میری جان! تمہیں پتا ہے ان کا، یوں ہی پکڑ کر کسی نہ کسی کام میں لگا دیتی ہیں۔ تمہارا یہ وقت بہت قیمتی ہے، تم بس اب سارا وقت اپنی اسٹڈیز کو دو۔''

وہ کہہ رہی تھی (جب کہ اسے دھڑکا کوئی اور تھا، نیا جان کی بے صبری طبیعت کا رتی بھر بھروسا نہ تھا اسے۔ ان کے سرپرائز کی ایسی کی تیسی کر سکتی تھیں وہ، سو حفظ ماتقدم کے طور پر اسے ہدایات جاری کر رہی تھی) اور اس کا دل جیسے اس ہدایت پر غوطہ کھا گیا۔

''کیسی باتیں کر رہی ہو مینو! نیا جان کا کام کرنا تو مجھے اچھا لگتا ہے، اتنا پیار کرتی ہیں وہ مجھ سے، اسی بہانے میں انہیں دیکھ بھی لیتی ہوں اور پھر تم ہی نے وعدہ لیا تھا مجھ سے اور اب......''

''ہاں نا اور اب میں ہی کہہ رہی ہوں، مجھے تمہاری پڑھائی کی بھی تو فکر ہے نا بھئی۔ امتحان ہو جائیں پھر چاہے ہمیشہ کے لیے ان کے پاس جا کر انہیں دیکھتی رہنا۔ اچھا میرا جازل خان رو رہا ہے، پھر بات ہوگی۔'' گل مینا عجلت میں کہتی کال ڈراپ کر گئی۔

''تیرا بھلا ہو جائے مینو کی بچی، مشکل میں ہی ڈال دیا ہے مجھے۔ نیا جان کی طرف نہ جاؤں، ہائے اللہ......''

فون بیڈ پر اچھال کر کھڑی ہوئی، سامنے ہی آئینے میں اپنے عکس سے نظر جا ملی، جس کے چہرے پر صاف لکھا تھا کہ یہ امتحان تو اس امتحان سے بھی زیادہ مشکل ہوگا۔

☆☆☆

''انکل حامد کی کال آئی تھی، کہہ رہے تھے وین خراب ہوگئی ہے۔ اس لیے لینے نہیں آسکوں گا۔''

''ہیں...... تو اب ہم جائیں گے کیسے؟'' وہ تو کب سے گیٹ کے پاس ٹہل رہی تھی، نینا کتابیں سنبھالتی اب اندر سے نکلی وہ بھی اس ہولناک خبر کے ساتھ۔

''کوئی مشکل نہیں، مین روڈ تک پیدل مارچ کرنا پڑے گا۔ آگے کوئی نہ کوئی بندوبست ہو جائے گا۔'' نینا بے فکر تھی۔

''ٹھہرو، میں ابا جی سے کہتی ہوں وہ ہمارے ساتھ چلتے ہیں۔'' وہ سدا کی ڈرپوک، کبھی اکیلے باہر نکلی نہیں تھی، واپس اندر کی طرف کو مڑنے لگی کہ نینا نے بازو سے پکڑ کر روک لیا۔

''اوہ خدا کا واسطہ ہے عنیزہ سہیل! اب بڑی ہو جاؤ، یہ دو فرلانگ پر تو مین روڈ ہے، اس پر بھی تم ابا جی کا سہارا لو گی۔ یعنی اتنی بڑی نینا مقصود نظر نہیں آ رہی تمہیں اور ابا جی جتنی دیر میں لاٹھی ٹیکتے خراماں خراماں چلیں گے، تب تک تو آف ٹائم ہو جائے گا، چلو آگے چلو۔'' اس نے گیٹ کی جانب دھکیلا۔

''بڑوں کے لیے بولتے ہوئے بندہ تھوڑی سی احتیاط کر لیتا ہے، ابا جی ہیں وہ میرے۔'' اسے برا لگا تھا۔

''اچھا جی۔ آئندہ دھیان رکھوں گی، ایک

آپ کے ابا جی ہیں اور ایک آپ کے بھائی جان...... ہے نا۔'' نینا کی آنکھوں میں شرارت ہلکورے لے رہی تھی، وہ گیٹ سے نکل آئی تھیں۔ عنیزہ بس اسے گھور کر رہ گئی' برابر کے گیٹ سے چمچماتی کرولا باہر آ رہی تھی' نینا نے اس کی کلائی دبوچ لی۔

''اُف...... یار کیا ماسٹر پیس رہتا ہے تمہارے پڑوس میں۔ آؤ اس سے لفٹ لیتے ہیں۔'' اور وہ کچھ کہنے کی کوشش میں فقط پھڑپھڑا کر رہ گئی، اتنی نوبت ہی نہ آنے دی اس نے، کھینچتی ہوئی لے گئی۔

''پلیز پلیز...... اسٹاپ، آج ہماری وین نہیں آئی، ہمیں یونی تک ڈراپ کر دیں گے؟'' منصب نے بریک پر پاؤں رکھا، یونی اس کے سراسر مخالف روٹ پر تھی، وہ صفاچٹ انکار کر دیتا اس لڑکی کو اگر ساتھ میں عنیزہ نہ ہوتی۔ ایک تو وہ داجی کے پرانے دوست کی پوتی تھی، دوسرے سویرا کی کزن، اس نے سر ہلا کر گاڑی کا پچھلا دروازہ ان لاک کر دیا۔

بہت تیز ہے ہیرو! نینا نے اس کے کان میں سرگوشی کی پھر منصب سے کہنے لگی۔

''عنیزہ! تم آگے بیٹھ جاؤ، ہم دونوں پیچھے بیٹھیں گی تو لگے گا یہ ہمارے شوفر ہیں۔''

اس کی بات پر منصب نے مسکراتے ہوئے اگلا دروازہ کھول دیا۔ اب وہ کیا کرتی، ویسے بھی کسی کے سامنے اس کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے۔ دل ہی دل میں اسے برا بھلا کہتے آگے سیٹ پر بیٹھنا پڑا۔

جب منصب ٹرن لے رہا تھا اس وقت میثم بائیک گیٹ سے نکال رہا تھا' سرسری نظر ڈالی تھی گاڑی پر، روز تو منصب اکیلا ہوتا ہے آج کوئی تھا اس کے ساتھ اور اگلے پل جھما کا سا ہوا، کوئی تھا نہیں بلکہ کوئی تھی اور وہ بھی عنیزہ......

''ارے نہیں، مجھے یوں ہی مغالطہ ہوا ہے، وہ کیسے ہو سکتی ہے۔ وہ تو وین پر گئی ہوگی۔'' وہ سر جھٹک کر اپنی راہ ہو لیا۔

یونی پہنچنے تک حسب روایات نینا کی زبان چلتی رہی تھی' منصب سے وہ ادھر اُدھر کی ہانکتی رہی۔ منزل پر پہنچ کر زور و شور سے شکریہ ادا کیا گیا، اس کے بعد سے عنیزہ کی شامت آ گئی تھی، جواب وقت بے وقت منصب نامہ سننے پر مجبور تھی۔

☆☆☆

اس گھر کی پرانی روایت تھی کہ چھٹی کا دن سب ساتھ گزارتے تھے اور شروع ہی سے یہ رونق اوپری پورشن میں یعنی خلیل صاحب کی طرف لگا کرتی۔ اب

سہیل تو نہیں تھے یہاں، بہت پہلے غم روزگار نہیں ان سب سے دور لے گیا تھا، ان کے پیچھے بھاوج اور بھتیجی کا خیال رکھنا ان کی اخلاقی ذمہ داری بنتی تھی جس سے وہ کبھی غافل نہ ہوئے تھے۔ عام دنوں میں سب کی اپنی اپنی مصروفیات ہوتی تھیں' اکثر ایک دوسرے کی خیریت پوچھنے کا وقت بھی نہ ہوتا، ابا جی بھی بار بار سیڑھیاں چڑھنے سے گریز کرتے، مگر اس دن صبح ناشتے سے لے کے رات کے کھانے تک کا وقت سب ادھر ہی ہوتے، یوں سب اک دوجے کے حال سے واقف بھی ہو جاتے اور دن بھی اچھا گزر جاتا۔

ابھی سب نے مل کر بہترین ناشتا کیا تھا، موسم کے تیور کچھ دنوں سے بہت تیزی کے ساتھ بدلے تھے۔ اچھی خاصی خنکی تھی فضا میں، ابا جی، خلیل صاحب اور یاسمین تو ہلکی نرم سی دھوپ میں ٹیرس پر جا بیٹھے، میثم کے ایم بی اے کے فائنل سمسٹر بس چند دنوں میں شروع ہونے والے تھے۔ آج کل وہ کتابوں میں سر دیے پایا جاتا (اس لیے عنیزہ کی طرف راوی چین ہی چین لکھ رہا تھا) وہ اپنے کمرے کا رخ کر گیا تھا، ان لڑکیوں نے دسترخوان سمیٹا اور اب کچن میں گپیں لگا رہی تھیں، پلان ہو رہا تھا کہ چائے بنانے کے بعد کیرم کی بازی ہوگی، سویرا نے سب کے لیے چائے بنائی، عنیزہ نے کپ ترتیب سے رکھے۔

"یہ ٹرے ہوگئی ابا جی، ابو اور امی کی چائے کی۔ یہ کپ میثم بھائی کا اور یہ ٹرے ہماری، اب یہ سرو کون کرے گا۔" سویرا بتانے کے بعد پوچھ رہی تھی۔

"لاؤ، یہ کپ میں دے آتی ہوں، باقی یہ تم دونوں پکڑلو۔" نینا نے ہاتھ بڑھایا۔

"ارے..... نہیں، یہ کپ میں دے آتی ہوں، ابا جی، تایا اور تائی جی کو تم چائے دے آؤ اور سویرا تم ہماری ٹرے لے کر لاؤنج میں پہنچو۔ ہم بھی وہیں آرہے ہیں۔" عنیزہ نے نینا کا ہاتھ لگنے سے پہلے ہی کپ پکڑلیا (وہ اچھی طرح جانتی تھی نینا تو جیسے چڑ ہے میثم کی اگر وہ چائے دینے چلی جاتی تو شاید وہ سویرا کو تو کچھ نہ کہتا لیکن اس کی شامت ضرور لے آتا) نینا نے بھنویں اچکاتے ہوئے ٹرے تھام لی، تینوں آگے پیچھے کچن سے نکلیں۔

"لیس کم آن۔" اس کی دستک کے جواب میں آواز آئی تھی، دروازہ ادھ کھلا ہی تھا جسے کچھ اور وا کرتی وہ دھیمے قدموں سے اندر چلی آئی۔ میثم نے لیپ ٹاپ کی اسکرین سے نظریں ہٹا کر دیکھا، کھڑکی کے پردے برابر تھے۔ لائٹ بھی آف تھی صرف لیپ ٹاپ کی اسکرین روشن تھی جس کی وجہ سے کمرے میں ملگجا سا اجالا پھیلا تھا۔ جس میں زرد اور سرخ رنگ کے لباس میں سجی سجی چل کر آتی لڑکی نے یک دم اس ناکافی اجالے کو بڑھا کر دگنا کردیا۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اور میثم کی اک ہی زاویے پر ساکت۔ وقت کی نبضیں رک گئی تھیں، ہر شے جامد، بس اک عکس باقی تھا اور سب ہوا میں تحلیل۔

"چائے۔" اس نے کپ ٹیبل پر رکھا، وہ گویا ہوش میں آیا، نظر اسکرین پر ٹکائی، وہ کپ رکھ کر پلٹ رہی تھی۔

"میں بزی ہوں آج کل، میں نے نہیں پوچھا تو تم نے بھی بتانا ضروری نہیں سمجھا کہ اسٹڈیز کیسی جارہی ہیں تمہاری؟" وہ خود کو سنبھال چکا تھا، وہ ان ہی قدموں پر ٹھہر گئی۔

"اچھی جارہی ہیں۔"

"ٹیسٹ کیسے ہوئے تھے؟"

"ٹھیک ہوئے تھے۔"

"میں مزید کچھ دن بے حد بزی ہوں، تمہیں خود ہی اپنی اسٹڈیز پر توجہ دینا ہوگی لیکن یاد رہے جیسے ہی فراغت ملی۔ میں گزشتہ ساری رپورٹ لوں گا تم سے۔"

عنیزہ نے تابع داری سے سرہلادیا اور جانے لگی۔

"میں نے کہا جانے کو؟" وہ بے قراری سے کہہ گیا، وہ وہیں بت بن گئی۔

"میرے بیڈ پر کتاب رکھی ہے، وہ لے کر آؤ۔" اب روکنے کا کوئی تو جواز بنانا ہی تھا، اس نے فوری حکم کی تعمیل کی۔

"کمرے کی لائٹ آن کرو۔" اگلا آرڈر جاری ہوا، وہ بھی لپک کر پورا کیا۔

"چائے میں چینی کتنے چمچے ڈالی تھی؟" روشن کمرہ، چمکتا چہرہ اور جگمگاتی نظر۔ اک الگ سوال اور شکر اس نے سویرا کو ڈالتے دیکھ لیا تھا، جھٹ بتایا۔

"ایک چمچہ۔"

"زیادہ ہے، میرے لیے تازہ بنا کر لاؤ اور شوگر ہاف ٹی اسپون سے زیادہ نہ ڈالنا اور ہاں......"

وہ جاتے جاتے رکی (یا اللہ اب کیا رہ گیا)۔

"کچن میں جانے سے پہلے کیا کام کرنا چاہیے؟" اور وہ کچن میں جاتی تھی، کام بھی کرتی تھی لیکن اس پل ذہن بالکل خالی ہوگیا، پہلے کیا کرتے ہیں؟

"اُف......" وہ سوچ میں پڑی تھی۔

"کاش کہ دادی اماں زندہ ہوتیں، تو کچھ تو میرا بوجھ ہلکا ہوتا۔ ہر کام سے پہلے مجھے ان کی اس نالائق پوتی کی دادی اماں بننا پڑتا ہے۔ بے وقوف لڑکی آئندہ یاد رکھنا، کچن میں جانے سے پہلے کھلے بال باندھ لیتے ہیں، آئی سمجھ۔ اب جاؤ فوراً، چائے لے کر آؤ۔ تمہاری یہ کم عقلی سر میں درد کردیتی ہے میرے۔" وہ جانے کیوں جھنجلا سا گیا تھا، وہ اس

سے زیادہ تلملاتی ہوئی کمرے سے نکلی۔

"پتا نہیں کیا مصیبت ہے، جتنی بھی کوشش کرلوں، ان کے عتاب سے نہیں بچ سکتی۔ اب اتنا کس کر تو دوپٹا لے رکھا ہے لیکن پھر بھی جان گئے کہ بال کھلے ہیں میرے، بالکل چیل کی نظر پائی ہے، توبہ ہے۔"

"تمہاری چائے پڑے پڑے ٹھنڈی ہوگئی، ہم الگ انتظار میں سوکھ رہے ہیں اور تم چائے پلا کر آئی ہو جبکہ تمہیں صرف چائے دینے کے لیے بھیجا تھا۔" نینا نے بغور اس کے سرخ پڑتے عارض دیکھتے تبصرہ کیا، وہ چپ چاپ گزرنے لگی۔

"ارے اب کچن میں کیوں جارہی ہو، یہیں رکھ دو کپ، پھر سمیٹ لیں گے سارے برتن۔ آجاؤ اب گیم شروع کرتے ہیں۔" سویرا بولی۔

"اس کپ میں میٹھا زیادہ ہے، چائے بنانی ہے مجھے۔ تم لوگ کھیلو، میں آتی ہوں ابھی۔"

"ارے بھائی بھی حد کرتے ہیں، کب میٹھا زیادہ ہے، ایک چمچہ تو ڈالا تھا میں نے۔" سویرا جھنجلائی۔ عنیزہ کچن میں جاچکی تھی۔ نینا نے گویا لفظ چبائے۔

"آج شوگر ہائی ہوگی نا، اس لیے میٹھا زیادہ لگا ہوگا۔"

"شوگر ہائی...... اللہ رحم کرے، ایسا تو کوئی مسئلہ نہیں۔ بس بھائی بھی نا، اچھا چلو عنیزہ کے آنے تک ہم ایک گیم کھیل لیتے ہیں۔" اب اس کے سامنے وہ بھائی کی شان میں کیا بیان دیتی، سر جھٹک کر گوٹیوں کو ترتیب دینے لگی۔ کچھ دیر میں عنیزہ بھی آملی۔ وہ دونوں محتاط ہی تھیں لیکن میثم بھنایا ہوا باہر آیا تھا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے، آرام سے نہیں کھیلا جاسکتا۔ عنیزہ! تمہیں معلوم ہے میں اندر کیا کر رہا ہوں، پھر بھی طوفان بدتمیزی مچا رکھا ہے۔ حد ہوتی ہے کسی بات کی، اگر آرام سے نہیں کھیل سکتے تم لوگ، تو نیچے چلے جاؤ، اب مجھے آواز نہ آئے کسی کی۔"

یعنی وہ واشگاف الفاظ میں انہیں وہاں سے نکل جانے کا اشارہ دے گیا تھا۔

نینا نے تو اتنا برا مانا کہ سب چھوڑ چھاڑ سیڑھیوں کی جانب لپکی۔ "ارے ارے" کرتی سویرا اس کے پیچھے...... اور دھواں تو اس کے اندر بھی بھر گیا تھا۔ مانا کہ ان کی آواز اونچی ہوگئی ہوگی، وہ ڈسٹرب ہوا ہوگا لیکن یہی بات وہ ان سے آرام سے بھی تو کہہ سکتا تھا۔ ضروری ہے کہ وہ اس لہجے میں ہی بولے۔ چلو ان کا نہیں تو کم از کم مہمان کا ہی خیال کرلیتا۔

نینا تو پہلے ہی سہیلیوں میں اسے ہٹلر کا بچہ مشہور کرچکی تھی اور اس واقعے کے بعد تو کچھ شک نہیں ہٹلر کا باپ ہی بنادے۔ اس کا کچھ نہیں جاتا — سبکی تو اسے ہی اٹھانا پڑتی نا۔ اب تو عجیب عجیب مذاق کرنے لگی تھیں وہ سب، صرف اس کے رویے کی وجہ سے۔

گوٹیاں اک دوجے سے چھین جھپٹ کرتے کب دوپٹا سر سے گلے میں آگیا، پتا ہی نہ چلا۔ وہ بے دھیان سی، سیڑھیوں کی طرف رخ کرگئی۔ میثم ابھی کمرے کے دروازے میں ہی کھڑا تھا۔ اس کے لانبے بال پشت پر بکھرے تھے، جسے دیکھ کر غصہ دوچند ہوا۔ وہ پھر کچھ کہنے آرہا تھا کہ اسے ہتھیلی سے گال پونچھتے دیکھ کر وہیں ٹھہر گیا۔ ہاتھ میں کتاب تھی، جسے اپنے ہی سر پر مار کر طیش اتارا گیا۔ اب وہ ڈھنگ سے کچھ نہیں پڑھ سکے گا یہ تو طے تھا۔

☆☆☆

پہلے لاؤنج کے منقش دروازے کو بند کیا گیا پھر پردے برابر کردیے گئے۔ اس کے بعد ٹی وی کی آواز تیز کی اور دھپ سے اس کے پاس آبیٹھی۔

"یہ تمہارا گھر ہے، تم یہاں جیسے مرضی چاہے رہو۔ کسی مائی کے لال کی ہمت نہیں ہونی چاہیے تمہیں کچھ کہے۔ اگر کسی کو تکلیف ہے تو وہ دروازہ پار کرکے دکھائے۔ یہ سب تمہاری اس دبو فطرت کا

قصور ہے اور اس سے بڑھ کر پھپھو کی تربیت اور سلوک کا، جو وہ تمہارے ساتھ روا رکھے ہوئی ہیں۔ شروع سے انہوں نے اس بھوتنے کو تمہارے سر پر کسی اودبلاؤ کی طرح مسلط کیے رکھا اور جتنا وہ اسے تم پر فوقیت دیتی ہیں، سچ پوچھو تو مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہ اس فتنہ مزاج آدمی کو ساری زندگی کے لیے تمہارے ساتھ نتھی نہ کر دیں۔''

نینا اس کے زانو پر ہاتھ رکھے کہہ رہی تھی۔ وہ سر جھکائے سن رہی تھی کہ اس بات پر جھٹکے سے گردن اٹھائی۔ (دل دھک دھک کرنے لگا تھا۔ دھڑک تو پہلے بھی رہا تھا مگر بے آواز۔ اب کچھ بول رہا تھا مگر کیا؟ یہ وہ خود سمجھنے سے قاصر تھی)۔

''اور کچھ خبر ہے تمہیں، سویرا کا رشتہ آیا ہے۔ اس کے اٹلی والے ماموں کے بیٹے کا۔''

''ہیں کب؟ اور تمہیں کیسے پتا، کیا سویرا نے بتایا؟'' وہ ایک لحہ قبل کی کیفیت بھول بھال سیدھی ہو بیٹھی۔ نینا نے ناک چڑھائی۔

''سویرا کیا بتاتی بھلا مجھے، میں نے خود سنا ہے۔ صبح جب سب کے لیے چائے لے کر گئی تو تمہاری تائی امی، ابا جی سے مشورہ مانگ رہی تھیں۔''

''ہیں...... اور تم نے اسی وقت آ کر ہمیں کیوں نہیں بتایا۔ تم کیسے ہضم کر گئیں ایسی خوشی کی بات۔ یار اسی وقت بتاتیں، ہم مل کر سویرا کو تنگ کرتے۔''

''ہونہہ...... تنگ کرتے، چھوڑو پرے۔'' نینا نے الٹا ہاتھ مارا۔

''اور کس بات کی خوشی؟ تم رہنا۔ سدا بے وقوف۔ تمہیں کیا ضرورت ہے لڈیاں ڈالنے کی، میں تو صبح سے اس فکر میں پڑی ہوں اگر تو سویرا بیاہ کر اٹلی چلی گئی تو پیچھے تمہارا کیا بنے گا؟''

''کیا مطلب؟'' عنیزہ نے الجھ کر اسے دیکھا، اس کی بات سر سے گزر گئی تھی۔

''مطلب یہ میری بھولی سہیلی کہ وہ تو ایک اچھے ماحول، اچھے ملک، اچھے لڑکے سے بیاہ دی جائے گی۔ پیچھے رہ جائے گا تمہارے پاس یہ جذباتی خاندان اور سب سے بڑھ کر ابا جی، جنہیں تم سے کچھ زیادہ ہی پیار ہے اور یقیناً اکلوتا پوتا بھی انہیں بے حد عزیز ہوگا۔ تو سوچو ایک پوتی کے جانے کے بعد وہ ہرگز نہیں چاہیں گے کہ دوسری بھی ان سے دور چلی جائے۔ وہ ضرور اسے اپنے پاس ہی رکھیں گے، تم لکھ کر رکھ لو میری یہ بات۔ سویرا کا رشتہ طے ہوتے ہی تمہاری شامت بھی آنے والی ہے اور میرا مشورہ ہے کہ اس جنگجو سے شادی کرنے کی بجائے تو سوسائیڈ کر لو تو بہتر ہے ورنہ دوسری صورت میں بھی وہ کوہ قاف کا دیو تمہارے خون کا آخری قطرہ بھی نچوڑ کر پی جائے گا۔

مجھے تو کوئی سائیکی پرابلم لگتا ہے اس کے ساتھ، اس قدر بدتمیز اور بے حس انسان ہے وہ، ہمیشہ تمہاری عزت نفس پر حملہ کرتا ہے اور مجھے تو تم پر حیرت ہے، کیسے چپ چاپ سہہ جاتی ہو۔ قسم سے میرا اگر کوئی ایسا کزن ہوتا اور مجھ سے ایسا سلوک کرتا تو میں تو اک منٹ سے پہلے اس کی گردن دبا دیتی۔ اب بھی وقت ہے، تھوڑی سی سمجھ دار ہو جاؤ، اگر زندہ رہنا چاہتی ہو تو......'' نینا جوش جذبات میں میثم کو بے شمار القابات سے نوازتی بولے چلی گئی۔

''پتا نہیں کیا ہو گیا ہے تمہیں، کیا انٹ شنٹ بک رہی ہو۔'' عنیزہ کے رخسار تپ اٹھے۔

''تم کو تو انٹ شنٹ بکنے کا موقع بھی نہیں ملے گا بیٹا جی! جب اس سائیکو کے پلے بندھ جاؤ گی، جو آج تمہاری عزت نہیں کرتا۔ بات بات پر جھاڑ کر رکھ دیتا ہے، سوچو اگر اس کے ساتھ شرعی رشتہ بن گیا تو کیا حال کرے گا تمہارا۔''

نینا نے اسے ڈرانے میں کوئی کسر نہ چھوڑنے کا تہیہ کر لیا تھا گویا۔ وہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ بروقت بہانہ بھی سوجھ گیا۔

''میں دیکھوں ذرا، پتا نہیں ابا جی نے دوالی

ہے یا نہیں۔"
"سمجھ داری کی اگر کوئی دوا ملے تو چٹکی بھر خود بھی پھانک لینا۔" نینا نے پیچھے سے ہانک لگائی تھی، وہ ان سنی کر گئی۔

☆☆☆

"دھت تیرے کی، ارے کل تو تانیہ کی برتھ ڈے ہے۔ یاد ہے اس نے میری برتھ ڈے پر سرپرائز پارٹی دی تھی، اُف...... اگر اب میں نے اسے کوئی تحفہ نہ دیا تو وہ خفا ہو جائے گی۔"
نینا کو بیٹھے بیٹھے اچانک یاد آیا تھا اور اس نے مارکیٹ جانے کی رٹ لگا دی تھی۔
ابا جی گھر پر نہیں تھے اس نے بڑی رد و کد کی لیکن وہ نینا ہی کیا جو بات سے پھر جائے۔ وہ بھاگ کر تائی امی کو بتا کر ان سے اجازت بھی لے آئی۔
گھر سے نکلتے ہوئے اندازہ بھی نہیں تھا کہ ہلکے ہلکے بادل اگلے ایک گھنٹے میں سرمئی سے سیاہ ہو جائیں گے۔ جب تک وہ مطلوبہ خریداری کر کے مال سے باہر نکلیں، رم جھم شروع ہو چکی تھی۔
"اوہ یہ کیا...... اب گھر کیسے جائیں گے۔" عنیزہ کے حواس اڑنے کو تھے۔
"گھر کون سا اتنا دور ہے، چلے جائیں گے۔ تم موسم دیکھو کتنا زبردست ہو گیا ہے۔ آؤ آئس کریم کھاتے ہیں تب تک بارش بھی رک جائے گی۔" نینا پھر اندر مڑ گئی، چار و ناچار اسے بھی پیچھے جانا پڑا لیکن پریشانی ایسی تھی کہ آئس کریم بھی اچھی نہیں لگ رہی تھی۔
"ارے کچھ نہیں ہوتا' بہ حفاظت گھر واپس لے جاؤں گی تمہیں، گھبراؤ مت میری بے بی۔ تسلی رکھو۔ میں ہوں نا تمہارے ساتھ۔ ویسے اللہ بھلا کرے ان لوگوں کا جنہوں نے بالکل ہی "کاکی" بنا کر رکھ دیا ہے تمہیں۔ اتنا بڑا قد جانے کیسے نکال لیا تم نے، اگر ان لوگوں کا بس چلتا تو تمہیں کسی ڈبے میں پیک کر کے رکھتے۔" نینا اور اسے سنانے کا کوئی موقع جانے دے ایسا تو ہو نہیں سکتا تھا۔
وہ اسے فقط کڑے تیوروں سے گھور کر رہ گئی۔
اور وہ تو شاید اگلے کئی گھنٹے موسم انجوائے کر سکتی تھی مگر اس کی حالت دیکھتے ہوئے اٹھنا پڑا۔ کن من اب بھی ہو رہی تھی۔ وہ بچتی بچاتی ایک شیڈ تلے آ کھڑی ہوئیں کہ نینا کی نظر سامنے تیزی سے آتے منصب زمان پر پڑی۔
"ارے وہ دیکھو ہینڈسم پڑوسی! اسے کہتے ہیں غیبی امداد، تم خواہ مخواہ پریشان ہو رہی تھیں، چلو آؤ۔" نینا نے اس کی کلائی پکڑی اور کھینچتی ہوئی اس طرف ہولی۔
"ہیلو...... ہیلو!" اس کی پکار پر وہ پلٹا اور ان دونوں کو دیکھ کر بے اختیار رک گیا۔
"ارے اتنی بارش میں آپ لوگ ادھر کیا کر رہی ہیں؟"
"بس کچھ ضروری شاپنگ کے لیے نکلے تھے تب اندازہ نہیں تھا کہ موسم ایک دم سے اتنا خراب ہو جائے گا۔ اچھا ہوا آپ مل گئے، ورنہ تو ایسے وقت میں ٹیکسی والے چار چکروں کا کرایہ مانگ لیتے ہیں، سچ میں اب تو پرس میں اتنے پیسے بھی نہیں بچے تھے کہ ہم......"
"یہ لیں چابی، آپ گاڑی میں بیٹھیں، میں بس دو چار منٹ میں آتا ہوں۔" نینا کا ارادہ تو داستان امیر حمزہ سنانے کا تھا شاید، اس نے جھٹ سے چابی نکال کر ان کے حوالے کی اور اندر بڑھ گیا۔
"واہ بھئی، بڑا دیالو آدمی ہے۔ کتنے آرام سے چابی پکڑا دی، ہائے کاش مجھے ڈرائیونگ آتی تو میں اس کی شاندار گاڑی لے کر فرار ہو جاتی۔" کار کا دروازہ کھولتے ہوئے وہ حسرت بھرے لہجے میں کہہ رہی تھی، عنیزہ نے پچھلا دروازہ کھولا۔
"ویسے کیا ہیں موصوف؟ ٹھاٹ باٹ تو بڑے زبردست ہیں جناب کے۔" نینا گاڑی کا اندر سے جائزہ لے رہی تھی۔

"اپنے داجی کا ہی ڈرائی فروٹ کا کاروبار سنبھالتے ہیں' داجی تو بہت عرصے سے یہاں رہ رہے ہیں۔ منصب بھائی اور نیا جان کو کچھ ہی عرصہ ہوا ہے یہاں آئے، وہ بھی داجی بیمار رہنے لگے تھے، تب منصب بھائی کی تعلیم بھی مکمل ہوگئی تھی، تو گلگت سے یہاں آگئے۔ سنا ہے وہاں بھی ان کا وسیع کاروبار ہے، جو وہاں ان کے بابا سنبھالتے ہیں۔" عنیزہ کو جتنی معلومات تھیں، اس کے گوش گزار کیں' نینا نے آنکھیں پھیلاتے سر ہلایا۔

"یعنی تگڑی آسامی ہے، موصوف صرف صورت کے ہی شہزادے نہیں، نصیب کے بھی شہزادے ہیں اور یہ کیا تم ہر کسی کو بھائی بھائی پکارنے لگتی ہو۔ اگر پھپھو نے تمہارے لیے بھائی کا انتظام نہیں کیا تھا تو اب کیا تم سارے زمانے سے بدلہ لو گی۔" نینا نے فوراً نوٹس لیا۔

"تم سے تو بات کرنا ہی فضول ہے۔" عنیزہ تپ اٹھی۔

"لڑکی! اب بھی وقت ہے، عقل کرلو تھوڑی سی، ورنہ پچھتانے کا موقع بھی نہیں ملے گا۔ ایسا ہیرو میرے پڑوس میں ہوتا نا تو کب کا ہتھیا چکی ہوتی اور تم اب تک ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی ہو۔ کمال ہے یار!" نینا کہاں باز آنے والی تھی۔ اسے ہی کان لپیٹنے پڑے۔ شکر ہے منصب نے زیادہ وقت نہیں لگایا تھا، اب اس کی تو جان چھوٹ گئی لیکن وہ بے چارہ قابو میں آگیا اس کی بے سروپا باتوں کا بڑے تحمل سے سارے راستے جواب دیتا رہا۔ بارش اب تڑاتڑ برس رہی تھی، منصب گاڑی اپنے کھلے گیٹ سے اندر لے گیا۔ سامنے ہی کوریڈور کے شیڈ تلے داجی اور اباجی شطرنج کی بازی جمائے بیٹھے تھے، پاس ہی لوازمات سے بھری ٹرالی پڑی تھی۔

"ہائے اللہ اباجی....." عنیزہ کا تو انہیں دیکھتے ہی رنگ فق ہوگیا، کچھ ایسی ہی حالت ان کی بھی ہوئی ان دونوں کو گاڑی سے اترتا دیکھ کر۔ وہ تو نینا نے انہیں صورت حال سمجھائی لیکن وہ جو پہلے داجی کے ساتھ چہک رہے تھے اب بالکل چپ سے ہوگئے۔ یقیناً انہیں ان کا اس وقت گھر سے باہر جانا اچھا نہیں لگا تھا۔

"جب تک بارش رکتی ہے تب تک آپ نیا جان کے ساتھ گپ شپ لگائیں۔" منصب کے کہتے ہی انہوں نے اندر کی جانب رخ کیا تھا، نیا جان انہیں دیکھ کر بے حد خوش ہوئیں۔ گلے لگا کر ماتھا چوما۔

"شکر ہے بچے! آج تم نے بھی شکل دکھایا، اپنے بابا کی بتاؤ اب کیسی صحت ہے۔ ماں کب آئے گا تمہارا، ارے اداس ہوجاتی ہوگی، آجایا کرو بھی میرے پاس اور وہ سویرا کدھر مصروف ہوتا ہے' بڑے دن ہوئے اس نے بھی چکر نہیں لگایا۔ صورت کو ترس گئی اس کے، میرے تو سارے پرندے بھی اداس ہوگئے اس کے بنا، جب کا ہم گلگت سے آیا ہے اس کے بعد اس نے چکر ہی نہیں لگایا۔" نیا جان عادتاً ایک ہی سانس میں کہتی چلی گئیں۔

نینا نے اسے جتلاتی نگاہ سے دیکھا، جتنی دیر وہ وہاں بیٹھیں ان کی ہر بات میں سویرا کا ذکر ضرور تھا،

حساب دل رہنے دو

نبیلہ عزیز

قیمت -/400 روپے

منگوانے کا پتہ:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37، اردو بازار، کراچی

فون نمبر: 32735021

وہ تو چڑ کر کہہ ہی گئی۔
''سویرا نے آپ کو بتایا نہیں اس کا رشتہ طے ہوگیا ہے اٹلی والے ماموں کی طرف۔'' اور انہیں اگلی بات بھول گئی۔
''ہوسکتا ہے اب وہ اپنے جہیز کی تیاری میں مشغول ہوگئی ہو، اس لیے آپ کے پاس آنے کا ٹائم نہ ملتا ہو۔ ویسے آپ کا پیغام دے دیں گے ہم اسے۔'' اس نے نیا جان کو تسلی دی تھی لیکن ان کے چہرے کا بدلا رنگ بھی ان سے مخفی نہ رہا تھا۔ بارش رک گئی تھی۔ ابا جی کے ساتھ گھر آئیں تو یاسمین ٹہل رہی تھیں۔
''ارے کہاں رہ گئی تھیں لڑکیو! میرا تو مارے پریشانی کے دم نکل رہا تھا۔''
''بہو! آئندہ وقت اور موسم دیکھ کر بچیوں کو کہیں جانے کی اجازت دینا۔''
ابا جی سنجیدگی سے کہتے ہوئے آگے بڑھ گئے اور ہکا بکا سی یاسمین یہ بھی نہ کہہ سکیں کہ ان سے اجازت لی کس نے تھی۔ انہیں تو بس بتایا گیا تھا۔ اسی وقت باہر سے آتے میثم نے انہیں وہاں بت بنے دیکھا تو وجہ پوچھی اور وہ مارے غصے کے سب کہہ گئیں مگر پھر کہہ کر پچھتائیں کیونکہ بہ مشکل تمام اسے قابو کیا ورنہ وہ تو اسی وقت ان دونوں کی طبیعت صاف کرنے کے موڈ میں تھا۔

☆☆☆

''کیا بات ہے آپ نے رات کھانا بھی ٹھیک سے نہیں کھایا، اب ناشتے کے لیے بھی نہیں آئیں؟'' منصب کف کے بٹن بند کرتا آرہا تھا۔
''کچھ نہیں بس ویسے ہی طبیعت کچھ سست ہورہی تھی، تم تیار ہوگئے خیر سے، ماشاء اللہ..... اللہ نظر بد سے بچائے۔''
وہ ان کے پاس ہی بیڈ کے کنارے پر ٹک گیا، انہوں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر محبت سے چوم لیا۔

انہیں اپنا یہ بچہ سب بچوں سے زیادہ پیارا تھا اور اس کی خوشیوں کی تو وہ کب سے منتظر تھیں۔ خاندان کی کئی لڑکیاں ان کے دھیان میں تھیں لیکن جب گل اور زرمینا نے سویرا کے لیے اس کی مرضی بتائی تو وہ اسی پر خوش ہوگئیں، اس کی اپنی ماں تو تھی نہیں، بہت چھوٹا سا تھا جب وہ آنکھیں موند گئی تھی۔ ان کے بیٹے کو تو پھر دوسری بیوی مل گئی اور اولاد بھی لیکن وہ اس کی نیا (دادی) بھی تھیں اور ماں بھی۔ وہ شروع سے ہی ان کے بے حد قریب رہا تھا۔ اس کی خوشی میں ہی ان کا سکون تھا لیکن رات نینا سے جو سنا ان کا سب سکون ختم ہوگیا تھا۔ انہیں اس لمحے سے خوف آرہا تھا جب منصب کو یہ خبر ملے گی، کیا وہ دیکھ سکیں گی اس کی آنکھوں کی بجھتی جوت، اس کی دل فریب مسکراہٹ کی موت نہیں...... یہ سب سوچ کر ہی ان کے دل پر آرے چل رہے تھے۔
''نیا جان!'' وہ گم صم سی تھیں۔ منصب نے شانہ ہلایا۔
''کیا ہوا ہے، کیا سوچ رہی ہیں۔ اگر طبیعت زیادہ خراب ہے تو میں ابھی ڈاکٹر قریشی کو لے آتا ہوں۔'' وہ ان کی چپ سے فکر مند ہوا۔
''نہیں...... ڈاکٹر کی ضرورت نہیں، بس ویسے ہی طبیعت کچھ اداس ہے۔ تم ایسا کرو گل مینے سے میری بات کرواؤ، کتنے دن ہوگئے۔ اس کے شہزادے کی خیر خیریت نہیں پوچھی۔'' اور منصب نے فوراً نمبر ملایا۔
''اچھا پھر زرمینے سے بات کروادو۔'' اور دوسرا نمبر ملا کر سیل انہیں دے دیا۔
''تم جاؤ، ناشتہ کرو، میں ٹھہر کے کرلوں گی ناشتا۔ جب بھوک لگے گی، میری فکر نہ کر میرا بچہ! میں ٹھیک ہوں بالکل۔'' اور وہ سر ہلا کر باہر کو چل دیا، سمجھ گیا کہ وہ اس کے سامنے بات نہیں کرنا چاہ رہیں اور ایسی کیا بات ہے، فطری تجسس تو تھا ہی جس نے باہر ہی قدم جکڑ لیے، وہ زرمینا کے لتے لے رہی تھیں۔
''مجھے منع کیا کہ سویرا سے کوئی بات نہ کروں،

بہت شوق تھا تم لوگ کا۔ وہ دیتا ہے سپ...... سپرائی......" انہیں غصے میں لفظ بھول گیا، زرمینا نے جھٹ مشکل آسان کی۔

"اوئے ہاں...... وہی وہی...... کم بخت جو بھی ہوتا ہے۔ کتنا اچھا ہوتا جو میں اس بچی کے کان میں بات ڈال دیتی یا اس کی ماں سے جا کر رشتہ مانگ لیتی، پر تم دونوں نے روکا مجھے۔ آگ لگے تم لوگ کے سرپرائز کو، آؤ اب دوا کرو۔ سویرا کا رشتہ پکا کر دیا اس کی ماں نے بھائی کے گھر۔" ان کا لہجہ بھیگ گیا تھا۔ زرمینا کو دھچکا لگا اور جو اس پر بیتی......؟

بس ایسا ہی لگا تھا کہ جیسے کسی سرسبز کھیت میں آگ لگی ہو، دھواں ہی دھواں بھر گیا تھا ہر طرف۔ وہ کھڑے کھڑے ریت کا بت بن گیا۔

☆☆☆

"آہا...... بڑے مزے مزے کی خوشبوئیں آرہی ہیں، کیا بنایا ہے آج۔" وہ دور سے ہی لمبا سانس کھینچتی، کچن میں آئی تھی۔

"تمہارا فیورٹ مچھلی پلاؤ بنایا ہے اور ریشمی کباب۔" یاسمین سلاد کی ڈش کو آخری ٹچ دے رہی تھیں۔

"ارے واہ...... پھر تو مزا آگیا، ویسے خیال کس طرح آگیا آپ کو میری پسند کا۔ ہمیشہ اپنے بیٹے کی، میاں کی فرمائش پوری کرتی رہی ہیں آپ تو۔" وہ جوش میں کہہ گئی تھی پھر انہیں ادھر اُدھر کوئی چیز تلاشتے دیکھ کر ہاتھ اٹھا دیے۔

"اولاد ہوتی ہی ناشکری ہے، ماں اپنا کلیجہ بھی کھلا دے پھر بھی انہیں کمی ہی لگتی ہے۔ سب کی پسند کا خیال رکھتی ہوں اور تمہاری کوئی فرمائش کب ٹالی ہے میں نے؟ ابھی ایک دو دن پہلے تم نے تذکرہ کیا تھا اور آج میں نے بنالیا اور پھر بھی میری لاڈو شکوہ کر رہی ہے۔" انہیں تو غصہ ہی آگیا۔

"اوہ مائی سویٹ مام! لو یو سو مچ۔" اس نے ہنستے ہوئے ان کے گلے میں بازو حمائل کیے۔

"ارے پرے ہٹو، یہ ڈرامے بازیاں کسی اور ماں کے ساتھ جا کے کرنا۔"

"ہائیں...... کسی اور کون سی ماں...... کیا آپ کے علاوہ بھی کوئی ہے؟ ابو نے بھی بتایا ہی نہیں۔" اس کی حیرت دوچند تھی، اس بار یاسمین نے چمچ میں چمچ اٹھالیا۔

"توبہ ہے تم لوگوں سے، بات ہی پکڑ لیتے ہو اور میثم کو دیکھو، آگیا ہے، تو میں کھانا لگاؤں۔"

"آپ کرتی رہیے گا بھائی کا انتظار، پہلے مجھے کھانا دے دیں، بہت بھوک لگی ہے پھر میں کچھ دیر ریسٹ کروں گی۔ اس کے بعد کل کے ٹیسٹ کی تیاری کرنا ہے۔" وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی تو انہیں اس کے لیے کھانا لگانا پڑا اور وہ بڑی رغبت سے کھا رہی تھی، جب انہیں یاد آیا تھا۔

"کھانا کھالو تو پھر ذرا نیا جان کی خیر خبر تو لے کر آؤ۔ فیروزہ (کام والی) آئی تھی، وہ بتا رہی تھی ان کی طبیعت کچھ اچھی نہیں۔ کل سے منہ سر لپیٹے پڑی ہیں، اب میثم اور تمہارے ابو کا کچھ پتا نہیں کس وقت آجائیں۔ میں نہیں جا سکتی، تم چلی جاؤ اور مچھلی پلاؤ انہیں بھی بہت مرغوب ہے، ہوسکتا ہے یہی شوق سے کھالیں۔ ایک تو بہو اور پوتیاں ان کی اتنی دور ہیں، جلدی کوئی پاس۔ آ بھی نہیں سکتا، بھلا کام والیاں اس طرح کیئر کر سکتی ہیں۔ بوڑھی جان ہیں، مجھے تو فکر لگ گئی سن کر۔" وہ پریشان ہو رہی تھیں۔

سویرا کے حلق میں نوالہ اٹک گیا۔ کتنے دن ہوئے جب گل مینا سے بات ہوئی، وہ ادھر جا ہی نہ سکی۔ اسے مینو پر غصہ آیا، کچھ بھی تھا وہ کبھی نہ کبھی وقت نکال کر ان سے مل آتی تھی، ان کا دل بھی بہلا رہتا تھا۔ مینو نے اسے بھی منع کر دیا، اپنا تو اس نے فون بھی بند کر رکھا تھا اور وہ خود اس سے بڑی بے وقوف جو اتنی دور بیٹھے ایسی تابعداری کر رہی تھی، وہ سخت بے چین ہوگئی، کہاں کی بھوک، اس نے ہاتھ کھینچ لیا۔

"آپ ان کے لیے کھانا نکالیں، میں ابھی دے آتی ہوں۔" وہ نیپکن سے ہاتھ پونچھتے ہوئے

بولی۔

"تم کھانا تو کھاؤ ٹھیک سے۔"

"کھالیا میں نے، تھوڑی سی بھوک رکھ لی ہے، نیا جان کے ساتھ کھالوں گی۔ اس طرح وہ خوش ہو جائیں گی۔" یاسمین نے سر ہلا دیا۔

لان سے لے کر لاؤنج تک ویران پڑا تھا۔ داجی اس وقت اکثر گھر میں ہوتے تھے، لگتا تھا آج وہ نہیں آئے، وہ محتاط سے قدم اٹھاتی ہوئی آگے بڑھ آئی۔ ارادہ نیا جان کے بیڈروم میں جانے کا ہی تھا کہ برابر والے کمرے کے کھلے دروازے سے منصب باہر آیا تھا۔

سادہ شلوار قمیص میں رف سا حلیہ۔ بکھرے بال، بڑھی شیو، دونوں کی نظر ملی تو ٹھٹک کر اپنی اپنی جگہ تھم گئے۔ الگ الگ تاثرات، اس نے کتنے دن بعد دیکھا تھا، ترسی ہوئی نگاہ، بے تاب سی اس کے چہرے پر ہی ٹھہر گئی اور وہ اس سے ہی نہیں سارے زمانے سے خفا لگ رہا تھا۔ یوں دیکھا جیسے پہچانتا نہ ہو، نکھرے نکھرے سے چہرے والی سویرا خلیل کبھی ایسی اجنبی نہیں لگی تھی جیسی آج...... وہ بھی گم صم دیکھ رہا تھا، کچھ دیر بعد وہ سنبھلی۔

"السلام علیکم! کیسے ہیں آپ؟ امی نے نیا جان کے لیے کھانا بھجوایا ہے، ان کی طبیعت کیسی ہے؟"

"میں جیسا بھی ہوں آپ کو اس سے مطلب؟ نیا جان آرام کر رہی ہیں۔ یہ سب رکھ دو یہیں، آنٹی سے شکریہ کہہ دینا۔" ایک تو آج اس کی صورت کچھ بدلی بدلی سی لگ رہی تھی، اس پر مزاج بھی سوا نیزے پر، سویرا کو فکر لگ گئی۔ اللہ جانے نیا جان کی طبیعت کس قدر ناساز ہے۔ جھٹ میز پر ٹرے رکھی۔

"اگر نیا جان سو نہیں رہیں تو میں ان سے مل لوں؟" اس نے تو انتہائی نرمی سے پوچھا تھا لیکن ادھر سے گویا لٹھ کھینچ کر ماری گئی۔

"میں نے پہلے ہی کہا ہے وہ آرام کر رہی ہیں، کیا سنا نہیں؟"

"اوہ خدا...... منصب زمان مروت اور ایسا لہجہ و انداز......" اسے تو کتنی ہی دیر نہ اپنے کانوں پر یقین آیا نہ آنکھوں پر۔ وہ کڑے تیوروں سے گھورتا واپس پلٹ گیا تھا۔ اس کے انداز نے کم دکھ دیا تھا کہ اس پر انداز نظر نے رہی سہی کسر بھی نکال دی، اس کی تو جیسے روح نکلنے کو تھی۔

ٹانگیں بے دم ہو رہی تھیں اور قبل اس کے کہ بے جان ہی ہو جاتیں۔ اس نے پلٹنے کو غنیمت جانا تھا۔ لڑکھڑاتے قدموں اور ہتھیلیوں سے گال رگڑتی وہ واپس آئی تھی۔ لان میں جھولے پر بیٹھی نینا نے بغور دیکھا اور پھر چٹخارے لے لے کر عنیزہ کو بھی بتایا۔

☆☆☆

نینا کی کسی کزن کی منگنی تھی۔ اسے تیاری کرنا تھی۔ کچھ شاپنگ، پارلر پھر اس کا ارادہ تھا وہاں رہنے کا۔ وہ اسے بھی ساتھ چلنے کے لیے مجبور کر رہی تھی۔ میثم کو خبر ہوئی تو اس نے کھٹ سے چچی جان کو کال کر کے صورت حال سمجھا دی۔

"تھوڑا ٹائم تو رہ گیا تھا ان کے امتحانات میں۔ اب اگر پورا ایک ہفتہ وہ فالتو کے فنکشن میں نکال دے گی تو اس کی پڑھائی کا ٹھیک ٹھاک حرج ہو جائے گا۔" یہ ہی وجہ تھی جب اس نے ابا جی سے اجازت چاہی تو انہوں نے کھٹ سے انکار کر دیا۔ ان کے سامنے اصرار کرنے کی تو اس کی ہمت نہ تھی۔

نینا نے بڑے مان سے پھپھو کو کال ملائی، پوری امید تھی، یہاں سے انکار نہیں ہوگا لیکن ادھر سے جب پوری تفصیل دہرانے کے بعد صاف منع کر دیا گیا تو وہ بھڑک ہی گئی۔

"دیکھا...... دیکھا تم نے...... تمہارے پل پل کی رپورٹ ہوتی ہے وہاں، تمہارے ہر ہر کام پر نظر رکھی جاتی ہے۔ یو آر سو لکی یار! بہت بڑے خیر خواہ ہیں بھئی۔ تمہارے اس دنیا میں اور ایسے ویل وشر جو دراصل تمہیں ان کتابوں میں ہی دفنا کر مار دینا چاہتے ہیں۔ نہ تم اپنی مرضی سے کہیں جا سکتی ہو نہ آ سکتی ہو، نہ عام لڑکیوں کی طرح کسی خوشی پر حق سمجھتے

ہیں یہ تمہارا۔ انہیں تو بس سارے حکم تم پر لاگو کرنا آتے ہیں، ساری پابندیاں انہیں تمہارے وقت ہی یاد آتی ہیں۔ بات بات پر انویسٹی گیشن کی جاتی ہے تو تمہاری۔

ارے لڑکی ابھی بھی تمہاری آنکھیں نہ کھلیں تو تف ہے تمہاری عقل پر۔ اب بھی تم ان ہی کی مانو تو پھر میری یہ بات بھی مان لو کہ تمہارے دن نہیں پھرنے کے، اسی قید خانے میں سڑو گی تمام عمر، نہیں ملنے کی خلاصی تمہیں۔

اس دن بھری دوپہر میں دیکھا تھا نا اپنی آنکھوں سے، کہاں سے آ رہی تھی وہ تمہاری پڑھاکو کزن، جس کی مثالیں دے دے کر جینا حرام کیا جاتا ہے تمہارا اور جس کے لیے تمہاری اپنی اماں جان کا فرمان عالی شان ہے کہ وہ نہایت سمجھ دار اور سلجھی ہوئی بچی ہے اور وہ سلجھی ہوئی بچی جب چاہے دیواریں پھلانگ کر پڑوسیوں کے گھر میں گھس جاتی ہے، اسے کوئی روکنے ٹوکنے، پوچھ تاچھ کرنے والا نہیں۔ وہ نیا جان کی غیر موجودگی میں ان کے پرندے سنبھال سکتی ہے۔

ارے بھئی اب کسی کو کیا پتا وہ ان کے پرندے سنبھال رہی تھی یا ان کا جوان جہاں پوتا اور دیکھا تھا نا، کیسے وہ بڑھیا بار بار نام لے رہی تھی اس کا۔ مجھے تو لگتا ہے اس چلتر نے پوتے کے ساتھ ساتھ دادی کو بھی خوب قابو کر رکھا ہے۔

ایک تم ہو...... جسے یہ تک خبر نہیں کہ برابر والے گھر میں کتنے افراد خانہ رہتے ہیں، بس اسی بھول پن میں ماری جاؤ گی کسی دن۔ یہ لوگ چٹنی بنا کر کھا جائیں گے تمہاری اور ڈکار بھی نہیں لیں گے۔ تمہارے ابا وہاں کما کما کر درہموں کے ڈھیر تمہارے لیے ہی لگا رہے ہیں نا، اب ایسی لکشمی کو کوئی اور کہیں جانے دیتا ہے بھلا۔ مجھے ان سب کے رویے سمجھ میں آ گئے ہیں جبکہ چند دن ہی ہوئے ہیں مجھے یہاں رہتے ہوئے اور تمہاری تو عمر بیت گئی ان سب کے درمیان اور افسوس کسی کو نہ پہچان سکیں نہ تم اور نہ میری

الف لیلہ
ہزار داستانیں

دلچسپ اور خوبصورت داستانیں جنہیں پڑھ کر بچے ہیری پوٹر کو بھول جائیں گے، ایسی داستانیں جنہیں بڑے بھی پڑھ کر لطف اندوز ہوں گے

کتاب بذریعہ رجسٹری منگوائیں
-/300 روپے کا ڈسکاؤنٹ حاصل کریں
فی کتاب -/1200 روپے
ڈسکاؤنٹ -/300 روپے
آج ہی -/950 روپے
منی آڈر ارسال فرمائیں

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے
مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

بھولی پھپھو جان۔ ارے اب بھی مہلت ہے تمہارے پاس، بچ سکتی ہو ان کے ہر جال سے جو وقت پر ان کی چال سمجھ جاؤ تو......" نینا کے اندر تو جیسے زہر بھرا تھا اور وہ اسے بھی نیل و نیل کر دینا چاہتی تھی۔ انتہائی بے دردی سے کہتی چلی گئی اور آج تو وہ بھی نہ اسے گھور سکی نہ ہی کسی لفظ پر ٹوکا۔

سچ ہی تو کہہ رہی تھی وہ، اس پر ہی سارے اصول لاگو ہوتے تھے۔ سویرا مزے سے کہیں بھی آ جا سکتی تھی۔ اس کا بھی تو دل چاہتا تھا اپنی مرضی کرنے کا۔ کہیں جانے کا، کیا حرج تھا اگر وہ نینا کے ساتھ ایک آدھ دن کے لیے چلی جاتی۔ انجوائے کر لیتی مگر نہ جی، اس کا تو پی ایچ ڈی ادھورا نہ رہ جاتا۔ حد کرتی ہیں مما بھی اور ان سے زیادہ وہ جو شاید اسے خوش دیکھنا ہی نہیں چاہتا۔

آج پہلی بار اس کے اندر بدگمانی کی لہر نے سر اٹھایا تھا۔ قطرہ قطرہ گرتا پانی پتھر میں شگاف ڈال سکتا ہے تو بوند بوند ٹپکتے کڑوے لفظ بھی تاثیر چھوڑ سکتے ہیں۔ شاید کہ نیناں اور بھی بہت کچھ کہتی کہ دروازے میں نمودار ہوتے لال بھبوکا چہرے نے اس کا رنگ فق کر ڈالا۔ اس کی ساکت ہوئی نظر کے تعاقب میں ہی اس نے پلٹ کر دیکھا اور بالکل نہ گھبرائی۔ اگر وہ سب سن چکا تھا تو یہ تو اور بھی اچھی بات تھی، وہ لاپروائی سے بیگ شانے پر ڈالتی، اٹھ کھڑی ہوئی۔

"چلو ٹھیک ہے پھر، ملتے ہیں آفٹر فیوڈیز، میں کال کرتی رہوں گی۔ ویسے میں کال نہ بھی کروں تو تمہیں کوئی فرق تو نہیں پڑے گا۔ یہاں ہیں بہت سے لوگ تمہارا خیال رکھنے والے اور تمہارے لیے تو وہی کافی ہیں، او کے بائے۔"

وہ یوں ہی اٹھی گردن سے اس کے برابر سے نکلتی چلی گئی۔

میثم اسے کھا جانے والی نظر سے دیکھ رہا تھا، وہ کچھ بولا کیوں نہیں، یہ بھید تو اگلے ہی پل کھل گیا جب ابا جی ہولے ہولے چلتے، اس کے پیچھے سے آگے آئے۔

"اب وہیں کیوں رک گئے، یہ سب چیزیں یہیں رکھ دو بھئی، میں اپنی عنیزہ بیٹی کے لیے لے کر آیا ہوں۔ کہیں تم اپنی ماں کے پاس لے جاؤ۔"

وہ خوش گوار لہجے میں کہہ رہے تھے اور باہر سے تو وہ خوش گپیاں کرتے ہی آ رہے تھے مگر اب اس نے جس طرح سے سب تھیلے صوفے پر اچھالے اور واپس پلٹا، وہ حیران ہی رہ گئے۔

"ہائیں...... اسے کیا ہوا، ارے ایسا بھی کیا کہہ دیا میں نے...... میثم ادھر آؤ...... میثم!" وہ آوازیں ہی دیتے رہ گئے۔ وہ تو یوں گیا جیسے بندوق سے گولی' عنیزہ بھی رخ پھیرے ان تھیلوں پر جھک گئی، مبادا وہ اس کا اڑا رنگ دیکھ کر کچھ پوچھ لیں۔

☆☆☆

ایک نظر نہیں بھاتی تھی اسے وہ لڑکی، پہلے ہی وہ اپنی نا قابل برداشت حرکتوں کی وجہ سے اس کی نظر سے گر چکی تھی۔ کئی بار وہ خواہ مخواہ فری ہونے کی کوشش کر چکی تھی۔ اگر اس کا مزاج اور طرح کا ہوتا تو وہ ضرور اس کی پذیرائی کرتا، جتنے دن وہ یہاں تھی، کچھ وہ بھی اپنے وقت کو رنگین کر لیتا مگر نہیں، اسے سخت چڑ تھی اس قسم کی لڑکیوں سے جو اپنے وقار کا خیال نہیں رکھتیں۔ اپنی بے وقوفیوں سے خود اپنی ذات کو ارزاں کرتی ہیں۔ اس کی ایسی کئی بدتمیزیوں کو وہ صرف اس لیے نظر انداز کر گیا تھا کہ وہ گھر میں مہمان تھی اور وہ بھی چچی جان کی۔ اگر وہ اس کے اپنے ننھیال سے ہوتی تو وہ اسے کب کا دوڑا چکا ہوتا لیکن مجبوری تھی۔ وہ ابا جی کو بھی اب کیا بتاتا، سو کڑوا گھونٹ پی لیا تھا۔

ہاں وہ عنیزہ کے لیے پہلے سے زیادہ پوزیسیو ہو گیا تھا، پہلے سے زیادہ دھیان رکھتا۔ اس لڑکی کے جو اطوار تھے وہ کسی صورت غفلت نہیں برت سکتا تھا لیکن کہیں نہ کہیں غفلت ہو گئی تھی۔ اسے جو ڈر تھا سامنے آ کر رہا تھا اس روز منصب کی گاڑی میں جو اسے عنیزہ کا دھوکا تھا وہ بھی دھوکا نہیں حقیقت تھی پھر وہ اس شام خراب موسم میں مارکیٹ جانا اور بھلا پہلے

کبھی کی تھی اس نے ایسی جرأت، وہ تو ہر وقت، ہر کام میں اسی کی طرف دیکھنے کی عادی تھی۔ جب بھی کوئی کام ہوتا وہ ہی تو ہوتا تھا جو اس کا سایہ بن جاتا اور اب...... یہ سب خرابیاں اس لڑکی کے آنے کے بعد سے ہو رہی تھیں۔ وہی تھی جو اس کے دماغ میں خناس بھر رہی تھی اور اس کی بکواس...... اف...... جیسے تپتی بھٹی میں دانے بھنتے ہیں، بالکل ایسے ہی اس کے اندر چیخ پیخ ہو رہی تھی۔

اگر اس وقت ہاتھ خالی ہوتے تو کچھ شک نہیں کہ وہ اس بدتمیز لڑکی کا منہ نوچ لیتا یا پھر اباجی اس کے پیچھے نہ آرہے ہوتے تو وہ ضرور اسی وقت حساب کتاب کرتا۔ ایسا ہی غصہ آیا تھا اسے، اس کی بکواس اتنی ہی ناقابل برداشت تھی۔ ایک ایک لفظ جلتی ہوئی چنگاری کی طرح دامن سے لپٹا تھا۔ تپش تھی کہ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

وہ کیسے کیسے الزام رکھ رہی تھی ان پر، کیا وہ چاچو کے کمائے درہموں کی وجہ سے عنیزہ سے پیار کرتا ہے۔ اُف لاحول ولاقوۃ...... اور وہ سویرا پر کیا بہتان باندھ رہی تھی، اوہ میرے اللہ...... اگر وہ اس قسم کی بکواس کہیں اور جا کر بھی کر دے تو وہ کیا بگاڑ لیں گے اس کا۔

''عنیزہ کیوں سن رہی تھی چپ چاپ، اس نے منع کیوں نہیں کیا اسے...... وہ کیوں سن رہی تھی۔ ایسے سر جھکا کر جیسے کہ وہ کوئی سچی کہانی سنا رہی ہو...... اف......'' وہ کمرے کے ایک کونے سے دوسرے تک یوں گھوم رہا تھا، جیسے کہ فرش پر جلتے انگارے بچھے ہوں، جب سویرا کھانے کے لیے بلانے آئی تو وہ اس پر چلا اٹھا۔

''نہیں ہے بھوک مجھے، دفع ہو جاؤ یہاں سے۔'' وہ بے چاری ہکا بکا بگٹٹ الٹے پیروں دوڑی۔ اس کا اترا منہ دیکھ کر یاسمین نے فقط اتنا ہی پوچھا۔

''کیا ہوا؟''

اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ ''بھائی ایسے رُوڈ پہلے تو کبھی نہیں ہوئے تھے۔ ایسا غصہ، ایسے جھڑکنا۔'' سب ان سے کہہ دیا۔

ان کا رخ اس کے کمرے کی طرف تھا اور وہ انہیں بھی کیا بتاتا کہ کیا ہوا ہے بس سر درد کا بہانہ کر کے کمرا بند ہو گیا۔ وہ سب کچھ سہ گیا تھا، نینا کی بے ہودگیاں بھی، لیکن عنیزہ کی چپ...... یہ تو ہرگز قابل قبول نہیں تھی۔ وہ اس وقت سے کھول رہا تھا تھا۔ آخر کب تک سلگتا اور اسی لیے تو غصہ حرام قرار دیا گیا ہے کیونکہ جب غصے کا الاؤ ایک بار بھڑک جائے تو پھر وہ سب کچھ اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے، سارے حواس سلب کرتا اور تمام قرار چھین کر صرف اور صرف اضطراب کی راکھ دامن میں چھوڑ جاتا ہے۔ وہ جس پل مارے طیش کے سیڑھیاں اترتا نیچے آیا، ذہن کے کسی حصے میں نہ تھا کہ اگلے چند لمحوں میں کیسا آزار مقدر ہونے والا ہے۔

مارے پریشانی کے نیند اس کی آنکھوں سے بھی تو دور تھی۔ بستر میں تو گویا کانٹے اُگ آئے تھے۔ آنکھوں کی پتلیوں پر ایک ہی عکس ثبت ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ تیغ صفت نظر تو گویا سینے میں گڑ گئی تھی۔ وہ سب سن چکا ہے اور اب شامت ضرور آئے گی، اسے یقین تھا لیکن اتنی جلدی...... یہ تو گمان بھی نہ تھا، وہ اٹھ کر باہر آ گئی تھی۔

ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ یقیناً سب سو رہے تھے۔ وہ کچن میں چلی آئی اور وہ تو نہایت آرام سے بنا کھٹکا کیے اپنے لیے چائے بنا کر واپس کمرے کے دروازے تک آئی تھی کہ طوفان کی رفتار سے آتے میثم نے بنا کچھ کہے اس کی کلائی دبوچ لی۔

ڈری ہوئی تو وہ پہلے ہی تھی، اس افتاد پر بے اختیار حلق سے چیخ نکلی، میثم نے گھبرا کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھنا چاہا۔ کپ اس کی ہاتھ سے چھوٹا، گرم چائے ہاتھ اور پاؤں جلا گئی تھی، میثم کا غصہ پل میں کافور ہوا، اس کے ہاتھ میں گرم چائے کا کپ ہے غصہ میں وہ دیکھ ہی کہاں پایا تھا۔

بے چینی کے مارے اس کا ہاتھ پکڑنا چاہا لیکن

ایک تو تکلیف دوسرا اس کے متوقع رویے کا خوف، وہ چیختی چلی گئی۔ میثم نے بوکھلا کر ایک تھپڑ جڑ دیا اور اپنے کمرے سے افتاں وخیزاں باہر آتے اباجی کے لیے یہ منظر گویا قیامت کا منظر تھا۔

آدھی رات کا وقت، عنیزہ کے کمرے کا دروازہ جس میں وہ چلاتی اور میثم سے ہاتھ چھڑاتی ہوئی اور پھر میثم کا اس کو تھپڑ مارنا، وہ گال پر ہاتھ رکھے اندر کو پلٹی تھی کہ اسے پکڑنے کی کوشش میں دوپٹا میثم کے ہاتھ میں جھولتا رہ گیا۔ بالکل ایسے ہی جیسے پھندے کی رسی اور جوان کے گلے کے گرد لپٹ گئی تھی۔ کئی بار جو آنکھیں دیکھ رہی ہوتی ہیں ان کا وہی مطلب نہیں ہوتا جو ذہن سمجھا رہا ہوتا ہے۔ کچھ منظروں کا بھید نگاہ فوراً نہیں جان پاتی، ان کا محرک جاننے میں تھوڑا وقت لگتا ہے اور کون جانتا ہے اس وقت تک۔ انسان تو پہلی سانس سے ہی بے صبرا ہے، تب ہی تو خسارے میں ہے، انہیں ابھی اس پل کی بے صبری لے دوبی۔ بے اختیار ان کے دل نے صدا بلند کی تھی۔

''ہائے! کاش اس منظر کو دیکھنے سے پہلے مر کیوں نہ گئے۔'' بس پھر ان کی آنکھوں کے سامنے عنیزہ کے سرخ رخسار رہ گئے تھے۔ میثم کا وجود اک پتلے میں ڈھل گیا جس پر ان کی لاٹھی تابڑ توڑ برس رہی تھی۔

☆☆☆

پے درپے کلہاڑے کے وار موٹے تنے پر برس رہے تھے۔ ہر وار کاری تھا۔ ہر بار اک نیا نشان ثبت ہوتا۔ جو دونوں حصوں میں دراڑ بنتا جا رہا تھا۔ وہ اک جنون کے عالم میں ضرب پر ضرب لگا رہا تھا، جیسے انہیں جدا کر کے ہی دم لے گا، دور سے دلبر خان دوڑتا آ رہا تھا۔

''صاحب...... میثا صاحب!'' اور صاحب نے ناچار ہاتھ روک کر اسے دیکھا بلکہ گھورا۔

''کیا آفت آئی ہے، جو ایسے چلاتے آ رہے ہو۔'' پھولی سانس کے ساتھ کہتے ہوئے اس نے کلہاڑا ایک طرف پھینکا اور ماتھے سے بہتا پسینہ آستین سے پوچھا۔ اچھی خاصی ٹھنڈ تھی، لیکن کچھ مشقت اور کچھ ہیجان تھا جس نے اس سرد دوپہر کو بھی گرما کی چلچلاتی دوپہر میں بدل ڈالا تھا۔ کبھی کبھی تو اس کا بس نہ چلتا راہ میں آئی ہر چیز کو ٹھوکروں سے اڑا دے۔ سب کچھ تہس نہس کر دے، سب بکھیر کر رکھ دے جیسے وہ اندر سے ٹوٹ کر رہ گیا تھا۔

''کیوں...... آپ کیوں کر رہا تھا کام، یہ آپ کے کرنے کا نہیں صاحب! آپ کے ہاتھ میں چھالے پڑ جائے گا۔ آپ کو تکلیف ہوگا۔'' دلبر خان نے بے قراری سے اس کا ہاتھ پکڑ کر جائزہ لیا، کہیں سچ میں کوئی چھالا نہ بن گیا ہو اور وہ اس کی حرکت پر مسکرا دیا۔

اب اسے کیسے سمجھاتا کہ جو چھالے اس کے اندر پڑے ہیں، ان کے سامنے ان چھوٹے موٹے چھالوں کی کیا اوقات۔ اس کا تو پور پور زخمی تھا، بھلا ایسے معمولی زخم اس کا کیا بگاڑیں گے۔

''تم مجھے خیر سے ڈھونڈ رہے تھے؟'' اس نے پوچھا۔

''اوہ...... ہاں، وہ میں آپ کے کمرے میں صفائی کرنے گیا تھا، وہاں یہ آپ کا فون بج رہا تھا۔ جتنا دیر ام کام کیا، اس فون نے اتنی دیر میں امارا کان پکا دیا۔ آپ دیکھو کس کا فون ہے، لگتا کسی کو ضروری بات کرنا ہے آپ سے۔'' دلبر نے جیب سے سیل نکال کر اس کی جانب بڑھایا، اس نے کال لاک چیک کیا، چھتیس کالز تھیں اور اتنا حوصلہ صرف ایک ہی ہستی کا تھا ہونٹوں پر مبہم سی مسکان لیے وہ اک طرف کو چل دیا۔

''جی فرمایئے، آج کیسے یاد کیا؟'' اور اس کی آواز سنتے ہی ادھر بہت دیر کا رکا زبانی سیلاب بہہ نکلا۔ اس نے سیل کان سے دور کر لیا، جب تک تندو تیز ریلے کا زور کم ہوتا وہ تب تک سر نیہوڑائے پیروں تلے پتے روندتا اور پتھروں کو ٹھوکروں سے اڑائے چلتا جا رہا تھا۔

☆☆☆

ایک جگہ مل کر بیٹھے تو انہیں کئی دن گزر گئے تھے۔ ابا جی اپنے کمرے میں بند رہتے یا چپکے سے کہیں نکل جاتے تو سارا دن واپسی کا راستہ یاد نہ آتا۔ خلیل صاحب کے آفس میں بے شمار کام بڑھ گیا تھا، وہ رات گئے لوٹتے اور پھر منہ اندھیرے تیاری۔ سویرا پہلے بھی اس طرح کتابوں میں گم نہیں رہتی تھی جیسا کہ اب، اور رہ گئی عنیزہ...... تو وہ پہلے کون سا چہکتی پھرتی تھی کہ اب اس کا گونگا پن کسی پر آشکار ہوتا۔

سب اسے قصوروار مان لیتے۔ چاہے ساری دنیا آکر گواہی دیتی۔ لیکن ایک ماں کا دل تو جو ماننے پر آمادہ ہی نہ ہوتا تھا۔ وہ اور بہت سی خطائیں کرسکتا تھا۔ مگر کوئی ایسی خطا...... نہیں...... نہیں...... وہ ایسا بالکل نہیں کرسکتا۔ وہ ان کی اولاد تھا وہ اسے اچھی طرح جانتی تھیں۔ وہ اس دن سے تڑپ رہی تھیں وہ تو ایسا گیا کہ گھر کا راستہ ہی بھول گیا۔ وہ اسے ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گئی تھیں۔ وہ تو ایسے چھپ گیا تھا۔ جیسے سچ میں گناہ گار ہو۔ اس نے تو ان کا بھی خیال نہیں کیا تھا۔ اس نے تو کسی کا بھی خیال نہیں کیا تھا۔ اس دکھ نے انہیں ادھ موا کرڈالا تھا۔ سب بے حس ہوچکے تھے لیکن وہ کس طرح اپنے دل کو پتھر کرتیں۔ وہ تو کھلی ہوا میں سانس لینے کے لیے ٹیرس پر آئی تھیں۔ کہ لان کے ایک کونے میں گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی عنیزہ پر نظر پڑتے ہی ان کا دل جلتے توے پر جا پڑا۔ سہیل اور زینب کی چند دنوں تک واپسی متوقع تھی۔ وہ تو اب اس کا سامنا نہیں کرتی تھیں۔ دیور اور دیورانی کو کیا منہ دکھائیں گی۔ بس اس سوچ نے ایسا دامن پکڑا کہ نڈھال ہوگئیں۔ سویرا انہیں کھانے کے لیے بلانے آئی تو اکھڑے اکھڑے سانس لیتے دیکھ کر گھبرا گئی۔

''امی...... امی...... کیا ہوا آپ کو......'' وہ بے تابی سے ان کے ہاتھ مسلنے لگی۔ یاسمین کو بولنے میں سخت دقت ہو رہی تھی۔ وہ پانی لینے دوڑی۔ واپس آئی تو انہیں بے ہوش پایا۔

''اوہ میرے اللہ...... امی...... امی...... پلیز آنکھیں کھولیں......''

اس کے اپنے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ خلیل صاحب تو صبح ہی کہہ گئے تھے کہ وہ کسی ضروری کام سے شہر سے باہر جا رہے تھے۔ ابا جی کو اس نے خود کچھ دیر پہلے جاتے دیکھا تھا۔ اب کیا ہوسکتا تھا علاوہ اس کے کہ وہ کسی اور سے مدد لیتی۔ وہ اٹھ کر سرپٹ بھاگی۔ نیا جان لٹھ لیے فیروزہ سے صفائی کروا رہی تھیں۔ جب وہ حواس باختہ سی ان تک پہنچی۔

''ارے سویرا بچے کیسا ہو تم۔ آج تو بہت دن بعد چکر لگایا۔ اور...... اور سب خیر ہے نا تم رو تا کیوں ہے۔'' وہ تو خوش ہو کر اس کی طرف آئی تھیں کہ اس کے بھیگے رخسار پریشان کر گئے۔ اس نے بمشکل آنسو روکتے سب حال کہہ سنایا۔

''فیروزہ! سب کام چھوڑ کر تم جلدی سے سویرا کے ساتھ جاؤ اور بچے تم بالکل پریشان مت ہونا۔ میں ابھی منصب کو فون کرتا ہے۔ وہ ڈاکٹر کو لے کر آئے گا۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔ گھبرانا مت شاباش۔'' انہوں نے اسے گلے لگا کر تسلی دی۔ فیروزہ اس کے ساتھ چلی آئی تھی۔ اور کچھ ہی دیر میں منصب کے ساتھ ڈاکٹر بھی آگیا تھا۔ یاسمین کی طبیعت اب قدرے بہتر تھی۔ مسلسل ڈپریشن سے ان کا بی پی شوٹ کر گیا تھا۔ ڈاکٹر نے دواؤں اور احتیاط کی لمبی لسٹ بتائی تھی۔ جسے منصب نے پورے دھیان سے نوٹ کیا۔ اسے تو رونے سے فرصت نہ تھی۔ نیا جان نے اسے یوں گلے لگا رکھا تھا۔ جیسے کسی چھوٹے سے بچے کو خود میں سمیٹ رکھا ہو۔ وہ مسلسل اسے حوصلہ دے رہی تھیں۔ ابھی تک وہ اس خوف زدہ کرتے لمحے کے حصار میں تھی۔ یاسمین نے تو آج جان ہی نکال دی تھی اس کی، اگر خدانخواستہ انہیں کچھ ہوجاتا تو...... منصب ڈاکٹر کے ساتھ ہی چلا گیا تھا۔

''جاؤ۔ ماں کے لیے اچھا سا یخنی بناؤ۔ میں اس کے پاس ہوں۔ اب اس کا فکر مت کرو۔'' نیا

جان نے اسے کچن میں بھیج دیا۔ مقصد اس کا دھیان بٹانا تھا۔ اس کا دماغ مختلف سمتوں میں گردش کر رہا تھا۔ ماں اس حال کو کیوں پہنچی۔ جب اس نہج پر سوچ کی سوئی رکی تو شدت سے دل چاہا کہیں سے بھائی کو لا کر ان کے قدموں میں ڈال دے۔ اس روز قیامت کے بعد سے وہ سب عذاب کی بھٹی میں جل میں رہے تھے۔ آنسو تھے کہ رکتے ہی نہ تھے۔ اذیت سی اذیت تھی۔ منصب میڈیسن لے کر آیا تھا۔

''آپ یہ پرس کرپشن دیکھ لیجیے گا۔ دوا کس وقت اور کتنی مقدار میں دینا ہے۔ اس پر تمام تفصیل درج ہے۔'' اس نے لفافہ ٹیبل پر رکھا تھا۔

''آپ نے کیوں زحمت کی میں نے ابا جی کو کال کی ہے وہ بس آتے ہی ہوں گے۔'' اس کا چہرہ ہی نہیں آواز بھی بھیگی ہوئی تھی۔ منصب نے شا کی نظر اٹھائی۔

''اور ابا جی کے آتے ہی آپ انہیں واپس مارکیٹ بھیج دیتیں۔ بہت خوب۔'' اس نے جیسے اس کی عقل کو داد دی تھی۔ وہ سر جھکا گئی۔

''آپ اگر اسی طرح روتی رہیں گی تو آنٹی کا خیال کیسے رکھیں گی۔ وہ اس وقت بیمار ہیں۔ پہلے ہی کافی پریشان ہیں۔ اس پر آپ کی یہ روتی صورت انہیں مزید دکھ دے گی۔ پلیز بی بریو۔'' وہ مدہم لہجے میں کہہ رہا تھا۔

''امی کی تو صرف ایک ہی پریشانی ہے اور وہ ہے میثم بھائی کی گمشدگی۔ ہم سب تو ان کے لیے فکر مند ہیں ہی۔ لیکن امی نے تو ان کی فکر میں خود کو بیمار کر لیا ہے۔ کتنے دن ہو گئے انہیں گھر سے گئے۔ پتا نہیں کہاں ہوں گے وہ۔ اور کس حال میں؟'' آنسو رکتے تو کیا اس کی ہمدردی پا کر کچھ اور بہہ نکلے۔

''آپ انہیں سمجھائیں کہ وہ میثم کے لیے بالکل ٹینشن نہ لیں۔ وہ جہاں بھی ہوگا۔ خیریت سے ہوگا۔ اور اللہ نے چاہا تو جلد گھر آ جائے گا۔ بلکہ میں خود کوشش کروں گا اسے واپس لانے کی۔ بس آپ آنٹی کو سنبھالیں۔ ان کا خیال رکھیں اور......''

''آ...... آپ جانتے ہیں میثا بھائی کہاں ہیں؟'' اس کی بات قطع کرتی وہ بے تابی سے بول اٹھی۔ منصب جو صرف یاسمین اور اس کی حالت دیکھ کر تسلی دے رہا تھا۔ اس کے سوال پر اک لمحے کو گڑبڑا گیا۔ پھر جیسے کچھ سوچ کر بولا۔

''نہیں، مجھے علم نہیں ہے کہ وہ کہاں ہے لیکن میں اسے ڈھونڈنے کی کوشش......''

''دیکھیں پلیز، میرے ساتھ غلط بیانی مت کیجیے گا۔ اگر آپ ذرا سا بھی جانتے ہیں۔ میثا بھائی کے متعلق تو بتا دیں۔ ہم سب بہت مشکل میں ہیں اس وقت ان کا یوں چھپنا ان کے لیے ہی ٹھیک نہیں۔ ان کا سامنے آنا بہت ضروری ہے۔''

وہ پھر بے تابانہ بول پڑی تھی منصب نے ہونٹ بھینچ کر اک گہرا سانس لیا۔ وہ بالکل چپ ہو گیا تھا یوں جیسے کسی سوچ میں ہو اور وہ اس کا تذبذب بھانپ گئی تھی۔ وہ بتانا چاہ رہا تھا اور بتا نہیں پا رہا تھا۔ وہ سخت مضطرب بے اختیار کہہ گئی۔

''کہاں ہیں میثا بھائی۔ جو بھی سچ ہے بتا دیں پلیز منصب! دیکھیں آپ کو میری قسم......''

اور شاید زماں و مکاں کی گردشیں تھم گئی تھیں۔ لمحہ موجود ہر منظر پر چھا گیا تھا، ساعتیں منجمد ہو گئیں بصارتیں ساکت، منصب تو بت بنا ہی وہ خود بھی موم کے پتلے میں ڈھل گئی۔ وہ انجانے میں کیا کہہ گئی تھی۔ وہ خود سمجھ نہیں پائی تھی اور جب شعور بیدار ہوا تو جھٹ نظریں چرا لیں۔ مارے خفت کے گال دہک اٹھے تھے۔ دل ایسے دھڑک رہا تھا کہ وہ شور اپنے کانوں سے سن رہی تھی۔ منصب نے اس کے رنگ بدلتے رخسار بڑے دھیان سے دیکھے تھے۔ اب تو کسی ردوکد کی گنجائش تھی ہی نہیں۔ وہ اس قسم کے بدلے سارے زمانے سے کیے وعدے توڑ سکتا تھا۔ چاہے پھر کتنے ہی کفارے کیوں نہ بھرنا پڑتے۔

☆☆☆

''چھوٹا سا ہے یہ بچہ اور مجھے سارا دن ایسے آگے لگائے رکھتا ہے کہ کبھی کبھی شمریز بھی اپنی ہی اولاد سے جیلس ہونے لگتے ہیں۔ قسم سے پوچھو

مت۔ کیا حال ہو گیا میرا۔ کئی کئی دن گزر جاتے ہیں نیا سے بات کیے۔ اکثر لالہ ہی کال کر کے حال احوال پوچھ لیتے ہیں آج بھی انہوں نے ہی فون کیا تو نیا نے آنٹی کا بتایا۔ اب کیسی ہے ان کی طبیعت؟" گل مینا پوچھ رہی تھی۔

"ہمم...... اللہ کا شکر ہے، اب پہلے سے کافی بہتر ہیں۔"

"چلو شکر ہے اللہ کا...... اور یہ میثم لالہ کا کیا مسئلہ ہے۔ نیا جان بتا رہی تھیں کہ وہ کسی بات پر خفا ہو کر گھر سے چلے گئے ہیں۔ آنٹی نے ان کے جانے کا بھی صدمہ لیا ہے۔ سب خیر تو ہے نا۔" اور اک گل مینا ہی تھی جسے وہ شریک حال کر سکتی تھی۔ بلا تردد سارا مسئلہ کہہ سنایا۔ وہ سن کر حق دق۔

"اللہ...... اللہ...... نہیں سویرا! ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ میثم لالہ ایسا نہیں کر سکتے۔ وہ تو عنیزہ کا اتنا خیال رکھتے ہیں۔"

"یہی تو دکھ ہے ہم سب کو۔ وہ تو اس کا اتنا خیال رکھتے رہے ہیں۔ ہمیشہ مجھ سے زیادہ انہوں نے اس کی کیئر کی ہے۔ میری تو ان سے لڑائی ہی یہی رہا کرتی تھی۔ کہ وہ اسے مجھ پر فوقیت دیتے ہیں۔ لیکن اس روز جو اباجی نے دیکھا...... اف...... ہم سب تو جیسے اس دکھ سے ہی مر جائیں گے مینو۔" وہ رو دینے کو تھی۔

"نا...... نا...... ایسے نہیں کہتے۔ اللہ کرے گا سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم پریشان مت ہو۔ میثم لالہ ہیں کہاں۔ پھر کچھ پتا چلا ان کا؟" وہ پوچھ رہی تھی۔

"ہاں، پتا چل گیا ہے۔ وہ وادی شوگران میں ہیں اور منصب پہلے دن سے جانتے تھے۔ بلکہ وہ انہیں خود چھوڑ کر آئے تھے وہاں۔ پہلے تو مجھے بے حد غصہ آیا ان پر۔ جب انہوں نے بتایا۔ جی چاہ رہا تھا۔ خوب لڑوں ان سے۔ کتنا اچھا ہوتا وہ ہمیں اس روز ہی بتا دیتے۔ امی اس حال کو تو نہ پہنچتیں۔ لیکن ان کا بھی کیا قصور۔ انہوں نے تو میثا بھائی سے وعدہ کا پاس رکھا۔ وہ تو شاید اب بھی نہ بتاتے۔ اس دن میں نے ہی مجبور کیا تو......" وہ بروقت یاد آ گیا کیسے مجبور کیا تھا تو بے ساختہ زبان دانتوں میں داب لی۔ گل مینا نے اس کا یکدم چپ ہونا پوری طرح محسوس کیا تھا۔

"لالہ کو مجبور کیا تھا...... کیسے۔" وہ پوچھ رہی تھی

"کچھ نہیں۔ میں تو بس ایسے ہی بات کر رہی تھی۔ تم سناؤ، کب آ رہی ہو۔ میں نے تمہارے گڈے کو دیکھنا ہے۔ سچ بہت دل چاہتا ہے اسے گود میں لے کر پیار کرنے کو۔" گل مینا نے اک آہ بھری۔

"میں نے تو آنا تھا۔ مورے، زرمینا اور میں ہم تو خود پتا نہیں کیا کیا پلان کر رہے تھے۔ مگر سب پروگرام چوپٹ ہو گیا۔ کیا کرنا ہے اب آ کر۔"

"کیا مطلب...... کیا پروگرام۔"

"میرا تو اس دن کا ایسا دل ٹوٹا۔ مارے دکھ کے تمہیں فون بھی نہیں کیا۔ وہ تو تم نے کال کر لی تو میں بات کر رہی ہوں۔ ورنہ سچ پوچھو تو میں سخت ناراض ہوں تم سے۔ مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی۔ مجھے تو لگتا تھا تم کو لالہ کے دل کی سب خبر ہے لیکن افسوس...... سچ سویرا! تم نے بہت دل دکھایا ہے ہم سب کا۔ نیا جان نے تو بات دل پر ہی لے لی تھی بڑی مشکل سے سمجھایا انہیں۔ ورنہ تو وہ بضد تھیں کہ ایک بار ضرور آنٹی سے بات کریں گی۔ لالہ میں ان کی جان ہے۔ ان کی ہر خوشی پورا کرنا فرض سمجھتی ہیں خود پر۔ وہ تو اس وقت ہی ایسے بے تاب ہو گئی تھیں جب انہیں لالہ کی خواہش کا بتایا ان کا تو بس نہیں چل رہا تھا کہ اسی پل کراچی جائیں اور لالہ کے لیے تمہارا ہاتھ مانگیں۔ لیکن بس قسمت کا پھیر ہم نے ہی انہیں روک دیا۔ مجھے ہی شوق چڑھا تھا کہ اس خوشی کو خوب دھوم دھام سے منائیں گے۔ کیا خبر تھی اس کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔ اس سے پہلے ہی تمہارا رشتہ طے ہو جائے گا۔ تم تو اتنی بدتمیز ہو، تم نے مجھے بتانا بھی غیر ضروری سمجھا۔"

گل مینا تو بندوق کی طرح جو تڑ تڑ شروع ہوئی تو اسے کم ہوتے حواس قابو کر کے کہنا پڑا۔

"ایک منٹ...... ایک منٹ...... رکو تو سہی۔ یہ کیا بولتی چلی جا رہی ہو۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں

آرہا۔ کس کا رشتہ...... کس کی بات؟"
"ہاں تم تو اب یہی کہو گی نا...... تم نے تو مجھ سے بھی اس بات کو چھپایا۔ کتنی بار بات ہوئی ہماری اور تم نے تذکرہ تک نہیں کیا۔ ٹھیک ہے وہ لوگ تمہارے خاندان کے ہیں۔ ماموں کا بیٹا ہے وہ تمہارا لیکن ایک بات یاد رکھنا، وہ چاہے اٹلی میں رہتا ہو یا فرانس میں، میرے لالہ جیسا ہرگز بھی نہیں ہوگا وہ۔"
اس کے لہجے میں خفگی بھری تھی۔ جبکہ اس کے اعصاب جھنجھنا اٹھے۔ خاندان، ماموں کا بیٹا، اٹلی، فرانس، اور پھر لالہ......اور جیسے کوئی الجھی گتھی ہاتھ آ گئی تھی۔
"تم شاید یہ سمجھ رہی ہو کہ میرا رشتہ ماموں کے بیٹے سے طے ہوگیا ہے۔ اوہ گاڈ مینو! یہ ہمارے گھر کی بات تم تک کیسے پہنچی۔ تم سب سے پہلے تو یہ بتاؤ مجھے۔"
"کیسے پہنچی تھی۔ تمہارے گھر کے لوگوں سے ہی خبر ملی۔ عنیزہ اور اس کی کزن آئی تھیں ایک دن نیا جان کے پاس۔ انہوں نے ہی بتایا تھا۔"
گل مینا کے اگلے لفظوں نے اس گتھی کا سرا بھی ہاتھ میں دے دیا۔ ان دونوں نے اس بات کو اپنی مرضی کا رنگ دے کر نیا جان کو کیوں بتایا اس پر تو بعد میں بھی حیران ہوا جا سکتا تھا۔ لیکن وہ کیوں اتنا تپ رہی ہے۔ یہ خیال ہی دل کو گدگدانے لگا۔ بے اختیار ہنسی چھلی گئی۔ ادھر اس بے موقع ہنسی پر کافی برا مانا گیا۔
"تم ہنس رہی ہو اور ادھر میرا غصے سے برا حال ہے۔ آج تو فون کرلیا۔ مجھ سے پیٹم لالہ اور پھر آنٹی کی طبیعت کا سن کر رہا نہیں گیا۔ اللہ تمہیں بہت خوشیاں دے۔ تم جہاں رہو خوش رہو۔ میں دعا ضرور کروں گی تمہارے لیے مگر......"
"اوہ اللہ کی بندی سانس تو لے لو۔ اپنی ہی کہے جا رہی ہو تب سے۔ کچھ میری بھی سنو گی یا نہیں۔" وہ ملکہ جذبات کہیں فون رکھ ہی نہ دے۔ اس لیے ہنسی پر قابو پانے کی سعی کی۔
"پھوٹو۔" گل مینا نے بادل ناخواستہ اجازت مرحمت فرمائی۔
"قصہ یہ ہے غیاث ماموں کے بیٹے کا رشتہ آیا تھا میرے لیے۔ امی تو راضی ہی تھیں۔ ابو نے بھی کوئی خاص اعتراض نہیں اٹھایا تھا۔ لیکن اللہ بھلا کرے ابا جی کا انہوں نے عجیب ہی شرط رکھ دی ماموں کے آگے۔ کہ اگر تو ان کا بیٹا پاکستان سیٹل ہوسکتا ہے تو وہ اس رشتے پر راضی ہیں۔ ورنہ وہ اپنی پوتی کو اتنی دور نہیں بھیج سکتے اور ماموں جنہوں نے اتنی محنت کے بعد بچوں کو وہاں سیٹ کیا۔ وہ صرف بھانجی کی خاطر بیٹے کا مستقبل داؤ پر نہیں لگا سکتے تھے۔ سو یہ کہانی تو اس روز ہی اپنے انجام کو پہنچ گئی تھی۔"
"ہیں سچ......" گل مینا ساری خفگی بھول بھال بے اندازہ خوش ہوگئی۔
"کمال ہے بھئی۔ تم تو خوب دکھری ٹائپ کی سہلی ہو۔ ادھر میرا رشتہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔ میں تو خواب میں اٹلی کی سیر بھی کر آئی تھی اور تم ہو کہ......"
"بدتمیز...... تجھے کراتی ہوں میں اٹلی کی سیر......" گل مینا چیخی تھی۔ وہ ایک بار پھر ہنس دی۔
☆☆☆
"کیا ہوا ہے تمہیں۔ یہ شکل کیوں بیماروں والی بنا رکھی ہے۔ لگتا ہے دل نہیں لگا میرے بغیر۔ ارے بھئی۔ میں کچھ دنوں کے لیے گئی تھی۔ اب واپس آ گئی ہوں۔ خوش ہو جاؤ۔ اور تانیہ بتا رہی تھی تم یونی بھی نہیں جا رہیں۔ سب ٹھیک تو ہے نا۔ تم جیسی پڑھاکو بچی اور ایسی لاپروائی۔ کیا ہٹلر کے بچے نے خیر خبر لینا چھوڑ دی تمہاری یا میری باتوں نے اثر دکھایا۔ بہادر ہوگئی ہو اب" نینا پوچھ رہی تھی۔ جبکہ اس کے ماتھے پر ایک لکیر ابھری۔ پہلے فرش کو گھور رہی تھی اب نظر کا زاویہ گھوم کر اس پر جا ٹکا۔
"اوہو! تم ایسی چپ کیوں ہو۔ کچھ بول کیوں نہیں رہیں۔ ہوا کیا ہے؟"
نینا کو اس کی حالت نے حیران کیا تو انداز نظر نے پریشان کر دیا اور پھر جس طرح وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور بنا کچھ کہے چل دی، وہ کچن کی جانب گئی تھی اور چند ہی لمحوں میں واپس آ گئی۔

''مجھے کچھ کام ہے۔تم کولڈ ڈرنک پی کر جانا۔''
اس کے ہاتھ میں چھوٹی ٹرے بھی جس میں ایک گلاس جو اس نے ٹیبل پر پٹاخ سے رکھا اور اب رخ اپنے روم کی طرف تھا۔ نینا ہکا بکا جاتے دیکھتی رہی۔ یہ تو کھلم کھلا اسے جانے کا کہہ دیا گیا تھا۔ اب اس سے بڑھ کر وہ کیا عزت افزائی کرواتی اک جھٹکے سے اٹھی اور دروازہ پار کر گئی اور اندر وہ دروازے سے کمر ٹکائے رو رہی تھی۔ نہ یہ نینا کم بخت اس روز اتنی بکواس کرتی اور نہ اتنا کچھ ہوتا۔

''اُفف...... میثم کہاں ہیں آپ۔ پلیز سوری! اس دن مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوئی...... واپس آجائیں...... پلیززز......'' اب اس کا ہر دن یونہی اسے پکار پکار کر معافیاں مانگتے گزر رہا تھا۔

''بھئی واہ...... مزا آگیا...... بہت مزے کا سوپ بنایا ہے میری بیٹی نے۔'' سہیل صاحب ہر چمچ پر واہ واہ کر رہے تھے۔

''شکریہ بابا......'' عنیزہ مسکرادی۔ جب سے بابا واپس آئے تھے وہ پھر کبھی کبھار ہنس بول لیتی تھی نہیں تو لگتا تھا وہ سب بھول چکی ہے۔

''اور میں نے جو کباب کی فرمائش کی تھی وہ کہاں ہیں؟''

''بس کر دیں سہیل! جب سے آپ یہاں آئے ہیں اچھی خاصی بد پرہیزی کر چکے ہیں۔ بھول گئے ہیں ڈاکٹر نے کیا تاکید کی تھی؟ زینب نے انہیں یاد دلانا چاہا تھا۔

''بھئی۔ مجھے تو اندازہ ہی نہیں تھا۔ میری گڑیا اتنی سگھڑ ہو گئی ہے۔ ایسے مزے مزے کے کھانے بنانا سیکھ گئی ہے۔ اب اس کے ہاتھ کے بنے کھانوں سے تو میں دور نہیں رہ سکوں گا۔ تم تو خود دراصل اب ہو گئی ہو کاہل۔ جب بھی کوئی فرمائش کی۔ تم نے ڈاکٹر کی تاکیدوں کی آڑ لے کر مجھے کئی کئی گھنٹے بھوکا رکھا۔ پتا ہے عنیزہ بیٹا یہ تمہاری ماں کیا کیا ظلم کرتی رہی ہے۔ میرے ساتھ......

وہ اب اسے اپنی مظلومیت کے کئی من گھڑت قصے سنا رہے تھے جو وہ ان کے آنے کے بعد سے کوئی پچاسیوں بار پہلے بھی سن چکی تھی۔ وہ ٹھوڑی تلے مٹھی ٹکائے پورے دھیان سے سن رہی تھی۔ زینب نے باپ بیٹی پر ایک کینہ توز نظر ڈالی اور اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''ارے! اب تم کہاں چلیں۔'' ان کے اٹھنے کا انہوں نے فوراً نوٹس لیا تھا۔

''آپ کو تو میرے گناہ جھاڑنے سے فرصت نہیں ہے۔ میں یاسمین بھابھی کی پاس چلی جاتی ہوں۔ سویرا آئی تھی تو بتا رہی تھی۔ سر میں درد ہے ان کے۔ ایک تو ان کی طبیعت پوچھ لوں گی۔ دوسرے میثم کا بھی پتا کروں، ایک ہفتہ ہونے کو آیا ہمیں آئے ہوئے اور اب تک وہ ملا ہی نہیں ہم سے۔ آخر ایسی بھی کیا پڑھائی۔ کہ وہ ہم سے ملنے تک نہیں آسکا۔ فون بھی بند کر رکھا ہے اس نے اپنا۔''

''بھئی بتا تو رہی تھیں بھابھی، فائنل ایگزیم ہیں اس کے آج کل میں ہی میں آجائے گا بچہ۔ تسلی سے دے لے امتحان'' وہ بے فکر تھے۔

''یہ تو پہلی بار ہی سن رہی ہوں میں۔ میثم نے اس سے پہلے تو کبھی یوں دوستوں کے ساتھ کمبائن اسٹڈی نہیں کی۔ وہ تو ہمیشہ سے خود محنت کر کے نوٹس بنانے کا عادی ہے۔ اور ایسا لاپروا تو وہ کبھی بھی نہیں رہا۔ اس کا فون تو کبھی اس روز بند نہیں ہوا کہ جس روز اس کا پیپر ہو۔ اور اب کتنے دن ہو گئے اس کا سیل پاور آف پر ہی مل رہا ہے۔ اس نے کچھ چیزیں کہی تھیں مجھ سے۔ وہ لے کر آئی ہوں اور وہ خود ہے کہ غائب، عجیب ہے یہ لڑکا بھی۔'' وہ جھنجھلائی سی کہتے ہوئے چلی گئیں۔ عنیزہ نے بلا ضرورت گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے جوڑ لیا۔

''ویسے کہہ تو ٹھیک ہی رہی ہے تمہاری ماں۔ میثم کو تو میں بھی مس کر رہا ہوں۔ میں وہاں تھا تو روز پلان بنتا تھا کہ چاچو جب آپ آئیں گے تو ہم یہ کریں گے۔ وہ کریں گے۔ اور اب مجھے آئے بھی اتنے دن

ہو گئے' اس نے ملنا تو دور ایک کال تک نہیں کی مجھے۔''

سہیل صاحب کا دھیان پیالے کی طرف تھا۔ وہ بے دھیانی میں خالی گلاس کو پکڑ بیٹھی تھی۔ بوکھلا کر جلدی سے ٹیبل پر رکھنا چاہا تو ہاتھ سے سرک گیا۔ لپک کر پکڑا۔

''اوہو...... بیٹا دھیان سے اور اب چلو جلدی سے جاؤ۔ میرے لیے کباب گرم کر لاؤ۔ اس سے پہلے کہ وہ ہٹلر کی رشتے دار واپس آ جائے۔''

وہ محتاط سے اس جانب دیکھتے کہہ رہے تھے۔ جدھر زینب گئی تھیں۔ شکر ہے انہوں نے اسے نہیں دیکھا تھا۔ وگرنہ یک دم سفید پڑتے رنگ کا وہ کیا سبب بتاتی۔ اسے تو اٹھنے کا بہانہ مل گیا تھا۔ واپسی پر اس کے پلو میں کتنے موتی چھپ گئے تھے۔ یہ وہ خود بھی نہیں جانتی تھی۔

☆☆☆

کمرے میں ناکافی روشنی نے سارے ماحول کو پراسرار سا بنا رکھا تھا۔ اس پر دبیز چپ کی تہہ پر دروازے پر ہوتی دستک نے سلوٹ ڈالی تو وہ چونک سے گئے۔ سوچوں کے الجھے ریشم سے خود کو چھڑاتے ہوئے۔

''کون ہے بھئی۔ آجاؤ'' اور دروازہ کھلتے ہی ملگجی سی روشنی آنے والی سے پہلے کمرے میں کسی شرارتی بچے کی طرح گھس آئی تھی۔ انہوں نے بے اختیار آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا۔ سہیل صاحب نے لائٹ آن کر دی۔

''خیریت اباجی! کمرے میں اندھیرا کیوں کر رکھا ہے۔ میں تو آپ کے لیے بہت مزے کی چیز لے کر آیا تھا۔ عنیزہ نے قیمہ میکرونی بنایا تھا میری فرمائش پر، اکیلے کھانے کو دل نہیں کیا۔ سوچا باپ بیٹا مل کر کھاتے ہیں۔ لیکن لگتا ہے آپ تو سونے کی تیاری میں ہیں۔''

وہ ان کے قریب ہی بیڈ پر آ بیٹھے۔ اباجی نے چونک کر انہیں دیکھا۔ یہی انداز، یہی ادا، یوں جیسے کوئی دن پلٹ آیا تھا۔ ان کے سینے پر یاد کا تازیانہ لگا۔ ان کے چہرے پر اک اور چہرہ ابھر آیا تھا۔ وہ ٹھہر ہوئے کئی ثانیے دیکھتے چلے گئے۔ جس پر سہیل صاحب نے گھبرا کر ان کا شانہ ہلایا۔

''اباجی...... کیا بات ہے۔ ایسے کیا دیکھ رہے ہیں؟ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟ آپ نے دوا لی؟'' اور وہ جیسے ہوش میں آئے تھے۔

''ہاں...... ہاں طبیعت ٹھیک ہے میری۔ دوا ابھی لے لوں گا۔ تم بتاؤ کیا کہہ رہے تھے۔'' انہوں نے پیر سمیٹ کر ان کے بیٹھنے کے لیے جگہ بنائی۔

''وہ کون سی دوا ہے جو آپ کھانے سے پہلے لیتے ہیں۔'' ٹرے بیڈ پر رکھ کر انہوں نے سائیڈ ٹیبل کی دراز کھول لی تھی۔ جس پر ان کا بگڑا موڈ اور بگڑ گیا۔

''یہ تم سب کو میری دوا کی فکر کیوں پڑی رہتی ہے۔ جو بھی آتا ہے۔ دوا ہی کیوں کھلانا چاہتا ہے۔ تم لوگوں کو اور کوئی کام نہیں ہے دنیا میں۔ کچھ نہیں ہونے لگا مجھے۔ اچھا بھلا ہٹا کٹا ہوں۔ مرنا ہوتا تو اس دن ہی مر جاتا۔ لیکن زندہ بچ گیا ہوں تو سمجھ لو کہ ابھی کچھ دن اور سر پر ہوں تم سب کے۔'' اور سہیل صاحب ششدر۔ تڑپ کر انہیں دیکھا۔

''اللہ نہ کرے اباجی...... کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ اللہ آپ کا سایہ ہمارے سروں پر تا قیامت قائم رکھے۔ اچھا چلیں۔ آپ دوا نہیں کھانا چاہ رہے تو مت کھائیں۔ لیکن فار گاڈ سیک غصہ تو مت کھائیں نا۔ مجھے بتائیں کیا ہوا ہے۔ کس بات پر موڈ آف ہے آپ کا؟''

وہ ان کے پاس بیٹھ گئے۔ ایک بازو ان کے شانے پر پھیلایا اور دوسرے ہاتھ سے ان کے سرخ پڑتے گال سہلائے اور انہوں نے بڑی مشکل سے سینے سے ابلتے سمندر کو قابو کیا۔ ورنہ تو جی چاہ رہا تھا۔ پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔ دل پر ایسا کاری زخم لگا تھا کہ پل پل اٹھتی ٹیسیں بے حال کر دیتیں۔

''اچھا...... اچھا میں سمجھ گیا۔ آپ کس بات سے پریشان ہیں۔'' سہیل صاحب کو یک لخت جیسے

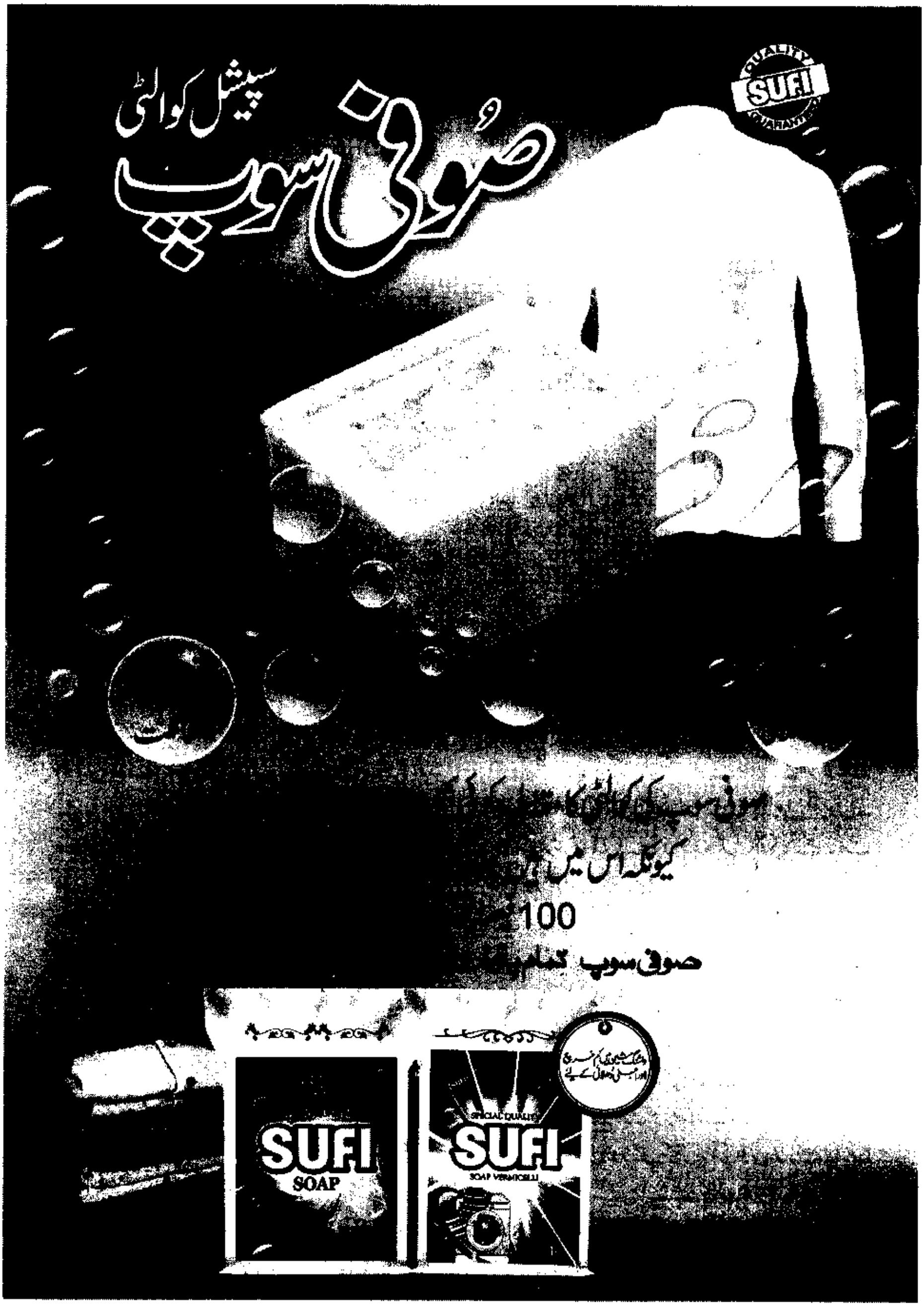

SUFI
سپیشل کوالٹی
صوفی سوپ
کیونکہ اس میں
100
صوفی سوپ
SUFI
SOAP
SPECIAL QUALITY
SUFI
SOAP VERMICELLI

کچھ یاد آیا تھا۔ اور انہوں نے بے اختیار گھبرا کر ان کی صورت دیکھی۔

''کس...... کس بات پر......''

''میں آپ کا بیٹا ہوں ابا جی...... آپ کیا سمجھتے ہیں۔ آپ بتائیں گے نہیں تو کیا میں جان نہیں پاؤں گا۔ میں آپ کی پریشانی کی وجہ خوب اچھی طرح سے سمجھ گیا ہوں۔'' اور ان کا دم لبوں پر آ ٹکا۔ جبکہ وہ اپنی دھن میں کہے جا رہے تھے۔

''ہمارے بچے اب خیر سے بڑے ہو چکے ہیں۔ اپنی اپنی تعلیم مکمل کرنے کو ہیں۔ اب یہی وقت ہے کہ ہم ان کے مستقبل کے فیصلے کریں اور میرا اللہ سب بہتر کرنے والا ہے۔ ان کے لیے ضرور بہترین ہوگا۔ آپ ٹینشن کیوں لے رہے ہیں؟ میں آپ کے جذبات سمجھ رہا ہوں۔ میں خود حیران ہوں۔ چھوٹی چھوٹی سی تھیں سویرا اور عنیزہ جب یہ گڑیوں سے کھیلا کرتی تھیں اور دیکھتے ہی دیکھتے کیسے بڑی ہو گئیں۔ وقت دبے پاؤں گزر گیا ہے کہ آج ہماری پیاری بیٹی سویرا کے لیے خان صاحب کے پوتے کا رشتہ آیا ہے اور یہ وقت یقیناً ہر ماں باپ کے لیے بڑا کٹھن ہوتا ہے۔ بیٹی کا مقدر کیا ہے، یہ تو وہ نہیں جانتے لیکن انہیں اس کے لیے فیصلہ کرنا ہوتا ہے۔ اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق۔ آپ تو خان صاحب کو اک عرصے سے جانتے ہیں۔ اچھے سلجھے ہوئے لوگ ہیں۔ منصب بھی بے حد اچھا لڑکا ہے۔ جب سے میں آیا ہوں کئی بار آ چکا ہے میری خیریت پوچھنے۔ باہر بھی ایک بار ملا ہے، بہت اچھے طریقے سے ملتا ہے۔ میرا تو خیال ہے کچھ ایسی سوچ بچار کی ضرورت نہیں ہے۔''

ابا جی نے آنکھیں موند کر اک گہری سانس لی۔ ان کا رکا سانس بحال ہوا تھا۔ سوچ بچار کی تو واقعی ضرورت نہیں رہی تھی کیونکہ وہ تو فیصلہ کیے بیٹھے تھے۔ بس اب سب کو آگاہ کرنا ہی باقی تھا۔ انہوں نے بیٹے کی طرف دیکھا۔

''بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔ خان صاحب بہت اچھے آدمی ہیں۔ اعلا حسب نسب ہے۔ منصب بھی بے حد نیک اطوار لڑکا ہے۔ ہماری خوش نصیبی ہے کہ وہ ہماری بچی کے لیے پیغام لے کر آئے۔ لیکن میرا ارادہ کچھ اور ہے۔ سویرا بیٹی کی مجھے اتنی فکر نہیں ہے کیونکہ بہو کے اٹلی والے بھائی نے بھی اپنے بیٹے کے لیے پیام دیا تھا۔ ہم انہیں ہاں کہلوا دیتے ہیں اور میں خان صاحب سے بات کرتا ہوں۔ عنیزہ بیٹی کا رشتہ ہم منصب سے طے کر دیتے ہیں۔ یوں ہم ایک ساتھ دونوں بچیوں کے فرض سے سبک دوش ہو جائیں گے۔''

وہ نہایت اطمینان سے کہہ رہے تھے۔ جبکہ سہیل صاحب نے حد درجے حیران ہو کر انہیں دیکھا۔

''یہ...... یہ...... کیا کہہ رہے ہیں ابا جی۔ ہم ایسا کیوں کریں گے۔ بھابھی نے تو بتایا تھا کہ انہیں انکار کر دیا گیا ہے یہ کہہ کر ہم سویرا کو اتنی دور نہیں بھیج سکتے۔ اور اب جبکہ اللہ کی کرم نوازی سے اس کے لیے ایک بہتر رشتہ آیا ہے تو آپ...... نہیں...... نہیں ابا جی! میں ایسا ہرگز نہیں کروں گا۔ پھر وہ لوگ ہماری سویرا کے لیے سوالی بن کر آئے ہیں۔ ہم کیسے اپنے منہ سے عنیزہ کا نام لے دیں اور پھر مجھے اور زینب کو اس کی فکر ہے ہی نہیں۔ میثم جو ہے ہمارے گھر کا بچہ۔ اس کے ہوتے میں بیٹی کو گھر سے باہر کیوں بھیجوں۔ ساری زندگی اس سے دور رہ کر گزاری ہے۔ اب یہی خواہش ہے کہ وہ میرے پاس رہے اور اس کے لیے اس سے بہتر کیا ہوگا کہ......''

''چپ کر جاؤ۔ تمہاری کیا خواہش ہے مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں۔ ضروری نہیں ہے کہ ہم جو چاہیں وہ پورا بھی ہو۔ اس خواہش کو یہیں دفن کر دو تو اچھا ہے۔ وہ کسی بھی طرح ہماری بیٹی کے لائق نہیں ہے اور کیوں؟ یہ مت پوچھنا اب مجھ سے۔ میں تمہارا باپ ہوں سہیل اور میں بہتر جانتا ہوں کہ مجھے کیا کرنا ہے اور بدقسمتی سے جب تک زندہ ہوں۔ تم لوگوں کی بھلائی سوچتا رہوں گا۔ ہاں جب مر مرا جاؤں گا تو پھر کرتے رہنا من مانیاں۔'' وہ تڑخ کر بولے تھے۔

"اللہ نہ کرے ابا جی! کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ اللہ آپ کو۔"

"بس کر دو دو سہیل ...... مت دو مجھے زندگی کی دعائیں۔ بہت جی لیا میں نے۔ اب مزید جینے کی تمنا نہیں ہے۔ اب تو بس یہ فکر ہے کہ میری معصوم بچی عنیزہ اپنے گھر کی ہو جائے، پھر شاید میں بھی سکون کی نیند سو سکوں گا۔ اور تمہیں کوئی بھی ٹینشن لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ہوں نا۔ میں خود بات کروں گا خان صاحب سے اور مجھے یقین ہے کہ وہ میری بات سمجھ جائیں گے، اب جاؤ۔ آرام کرنے دو مجھے اور ہاں جاتے ہوئے بتی بجھا دینا۔ روشنی سے وحشت ہوتی ہے مجھے۔"

وہ منہ پھیرے چادر درست کرنے لگے۔ سہیل صاحب آتے وقت تو بہت مطمئن تھے اور اب واپسی کے لیے قدم موڑے تو آج پتا چلا کہ پاؤں من من بھر کے کیسے ہو جاتے ہیں۔ دروازہ بند ہونے کی آواز پر انہوں نے چادر پرے سرکائی۔ بہت دیر کے رُکے ہوئے آنسو بہہ نکلے تھے۔

☆☆☆

کھلے گیٹ سے اندر آتی گاڑی کو دیکھتے ہی اس نے جھٹ پلو سے گال رگڑ ڈالے۔ ساتھ والی چیئر پر بیٹھی گل مینا سیدھی ہوئی۔

"اوئے ...... یہ تو لالہ کی کار ہے۔ وہ ضرور ادھر ہی آئیں گے۔ اب تم خود کو سنبھالو۔ ایک دم سے پریشان نہیں کرنا ہے انہیں۔"

اس نے ہدایت نامہ جاری کیا اور اس نے تابع داری سے سر بھی ہلایا۔ لیکن جب تک وہ اس طرف آتا کچھ اور آنسو بھی پلکوں کی باڑھ سے پھسل آئے۔ جنہیں رخ پھیرے بے دردی سے جھٹک ڈالا اور گل مینا کا اندازہ بالکل ٹھیک تھا وہ انہیں دیکھ کر ادھر ہی آیا تھا۔ اس نے چہرے پر خیر مقدمی مسکان سجائی۔ لہجے میں زبردستی کی خوش گواری بھرے اس سے حال احوال لینے لگی اور وہ اس سے بات تو کر رہا تھا لیکن سارا دھیان اس رخ پھیرے بیٹھی دشمن جاں کی طرف تھا۔ جیسے آج کتنے دن بعد ادھر دیکھ رہا تھا۔ اس کی تو ساری تھکن اتر گئی تھی۔ جانتا تھا اس کے مزاج کو وہ اس سے بے تکلف تو کبھی بھی نہیں ہوئی تھی۔ پھر ان دنوں ـــ جو سلسلہ چل رہا تھا اگر وہ شرما کر رخ پھیر گئی تھی۔ تو اسے اچھا لگا تھا۔ لیکن سبز آنکھوں میں مچلتی شوخی و شرارت بھلا ہونٹوں پر کیسے قفل لگاتی۔ وہ بے اختیار اسے چھیڑنے کے لیے کہہ گیا۔

"اور یہ کچھ لوگوں کو کیا ہوا ہے۔ دیکھتے ہی منہ پھیر لیا۔ نہ سلام نہ دعا۔ کیا ساری تمیز بھلا دی ہے۔"

مینا نے اسے گھورا، وہ اطمینان سے کرسی کھینچتا بیٹھ گیا۔ ان دونوں کے سامنے رکھی ٹیبل پر چائے اور دیگر لوازمات بھی تھے۔ لیکن صاف دکھ رہا تھا کہ کسی بھی چیز کو ابھی تک چھوا نہیں گیا۔ چائے کی اوپری سطح بتا رہی تھی کہ وہ اس ناقدری پر ٹھنڈی پڑ چکی ہے۔

"اوہو...... لگتا ہے کوئی بہت ضروری ٹاپک چل رہا تھا تم لوگوں کے درمیان۔ کھانے پینے کا ہی ہوش نہیں۔" اس نے ایک بسکٹ اٹھا کر منہ میں ڈالا۔ اور مینا اسے ٹالنے کو بول اٹھی۔

"وہ ...... لالہ مورے یاد کر رہی تھیں آپ کو۔ ابھی پوچھ رہی تھیں آپ کا۔ آپ جا کر ان کی بات سن لیں......"

"اچھا ...... اچھا سن لیتا ہوں ان کی بات۔ نہیں کھاتا تمہارے یہ بسکٹ۔ چلا جاتا ہوں یہاں سے، لیکن مہربانی ہو گی ایک گلاس پانی لے آؤ میرے لیے۔ بہت پیاس لگی ہے۔ حلق میں کانٹے پڑ رہے ہیں۔" اب وہ کیا کہتی، چار و نا چار اٹھنا پڑا۔ اس کے جاتے ہی وہ سخت چڑے ہوئے انداز میں بولا۔

"میری شکل وہی ہے پہلے والی۔ جسے تم چوری چوری دیکھا کرتی تھیں۔ اور سمجھتی تھیں کہ مجھے پتا نہیں چلتا۔ جبکہ میں بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ یہ تو میں بہت نرم دل ہوں جو تمہاری مشکل آسان کرنے کا خیال آ گیا۔ بھئی اب تو تم پورے اعتماد سے دیکھ سکتی ہو مجھے۔ اب کسی بات کا ڈر نہیں ہے۔ میں اب بھی ویسا خوب صورت ہوں۔"

اور ہونا تو یہ چاہیے تھا اس شوخی پر وہ ہنس دیتی۔لیکن وہ تو سسکیاں بھر رہی تھی۔ بہت دیر سے خود پر باندھا ہوا بند اک دم ہی ٹوٹا تھا۔ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپائے وہ بری طرح روتی ہوئی اس کے بھی ہاتھ پاؤں پھلا گئی۔

''سویرا...... سویرا...... کیوں رو رہی ہو۔ کیا ہوا ہے...... خدا کے لیے مت روؤ...... اوئے کچھ تو بتاؤ مجھے۔ سویرا میرا دل بند ہو جائے گا۔ پلیز...... آنٹی کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا...... سب خیریت ہے نا۔''

''سب ٹھیک ہے لالہ بس ایک گڑبڑ ہو گئی ہے اور یہ کیا بتائے گی۔ یہ تو جب سے آئی ہے اسے رونے سے فرصت نہیں۔ میں آپ کو بتاتی ہوں۔''

اب یہ بات چھپنے والی تو تھی نہیں اب یا تب اسے علم ہو ہی جانا تھا اور جو پریشانی آ گئی تھی اس سے نبٹنے کا کوئی حل بھی نکالنا تھا۔ سو گل مینا نے مناسب الفاظ کا چناؤ کرتے اسے سب بتا دیا۔ سن کر وہ بھی یونہی سناٹے میں آ گیا تھا جیسے کچھ دیر قبل وہ خود گم صم ہوئی تھی۔ لیکن اس نے جلد ہی خود کو سنبھالا۔

''وہاٹ ربش...... ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ ایسا سوچ بھی کیسے سکتے ہیں۔ اگر انہیں عنیزہ کی اتنی فکر ہے تو اس کے لیے کوئی اور رشتہ ڈھونڈ لیں۔ میں نے ان سے سویرا کا ہاتھ مانگا ہے اور......''

''لیکن لالہ! سویرا کا رشتہ تو وہ اس کے ماموں کے......'' گل مینا کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی اس نے ہاتھ اٹھا کر اسے چپ کروا دیا۔ چہرہ مارے ضبط کے اک دم ہی لال ہوا تھا۔ سویرا کی ہچکی بندھی ہوئی تھی۔ اک بے بس سی نظر اس پر ڈالی۔

''تم اسے پانی پلاؤ، اور سمجھاؤ۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ رونے سے مسئلے حل نہیں ہوتے۔ میں بات کرتا ہوں داجی سے۔'' وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا واپس کار کی جانب گیا۔ کچھ ہی لمحوں میں ٹائر چنگھاڑتے ہوئے پیچھے کو پھسلے تھے۔

''یا الٰہی خیر......'' گل مینا نے بے اختیار سینے پر ہاتھ رکھا پھر اسے گھورا۔

''تم سے کہا بھی تھا سنبھالو خود کو۔ کر دیا نا لالہ کو آتے ہی پریشان۔ اب اتنے غصے میں نکلا ہے۔ یا اللہ اسے تیری ہی امان میں دیا۔'' وہ سر پر پلو ڈالے خیر مانگ رہی تھی۔ اسے بھی رونا دھونا بھول کر اک نئی فکر لگ گئی۔

☆☆☆

''اوئے خو چہ اگر آج تم نے چالاکی دکھایا نا تو ام تمہارا سر توڑ دے گا۔ پورا دل سے کام کرو۔''

دلبر نے تلملا کر کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ دور سے کسی کو تیز تیز اس طرف آتے دیکھ کر رک گیا۔ ہاتھ کا چھجا بنا کر بغور دیکھا اور اک نعرہ مستانہ بلند کیا۔

''اے...... یہ تو اپنا منصب زمان صاحب ہے۔ بخیر راغلے......'' اس سے پھر کسی وقت نبٹنے کا سوچتا وہ دوڑ کر اس جانب بڑھا۔

''کہاں ہے وہ تمہارا کھڑوس صاحب......؟'' منصب نے گویا لفظ چبائے تھے۔ دلبر نے الجھ کر دیکھا۔

''اس نام کا تو کوئی صاحب نہیں امارا......'' منصب نے اسے ایک ہاتھ سے پیچھے کیا اور اسی رفتار سے آگے بڑھ گیا۔ دور اک درخت کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑے میثم کو اس نے دیکھ لیا تھا اور وہاں اس طرف جاتے وہ کٹی لکڑیوں کے ڈھیر سے اک موٹے ڈنڈے کو اٹھانا نہیں بھولا تھا۔ اس کے پیچھے آتے دلبر نے اس کی حرکت دیکھی تھی۔ لیکن وہ قطعاً اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ اس کا ارادہ کیا ہے۔ وہ تو جب چند قدموں کے بعد اس نے نشانہ باندھ کر میثم کی طرف لکڑی اچھالی تب خبر ہوئی۔ وہ تو اس ڈنڈے کا بھلا ہو جو اپنے وزن کے باعث آدھے راستے میں ہی دھپ سے پتھروں پر جا گرا۔ اس نے رک کر ایک اور ہتھیار چنا۔ اب کی دلبر سے رہا نہ گیا۔

''یہ...... یہ کیا کرتا ہے صاحب......''

''اوئے خانہ خراب دیکھتی کیا اے پکڑو......'' دلبر پاس سے چیختا ہوا گزرا وہ بھی دوڑ پڑا۔

دونوں نے اس کے بازو جا دبوچے۔

''اوئے اوئے...... پیچھے ہٹ جاؤ۔ چھوڑ دو۔'' میثم اوٹ سے نکل کر بھاگتا آیا۔ دونوں کے پیچھے ہٹتے ہی منصب نے جھپٹ کر میثم کا گریبان پکڑا اور دو چار زور دار جھٹکے دے ڈالے۔ ساتھ ساتھ وہ پشتو میں کچھ بول بھی رہا تھا۔ جسے سن کر دلبر اور گلفام نے پھٹی آنکھوں سے اک دوجے کو دیکھا۔

میثم نے اتنے ہی اطمینان سے اس کے ہاتھ پکڑے۔ اب یہ اور بات کہ اسے اتنے مہینے ہو گئے تھے اس پہاڑی علاقے میں رہتے، ابھی اس کی جو تواضع ہوئی تھی وہ خوب سمجھ گیا تھا۔ لیکن جو کر رہا تھا اگر وہ اس سے زیادہ بھی کر دیتا تو وہ برا نہ مانتا۔ کیونکہ اتنی دور تک آنے والا ضرور کسی خاص وجہ سے یہاں تک آیا تھا۔ اس نے گلے سے لٹکی پانی کی بوتل اتار کر اس کی طرف بڑھائی۔ اور بازو سے پکڑے ایک طرف لے گیا۔ منصب اب بھی بولے جا رہا تھا۔

''دلبر، گلفام...... جلدی سے جاؤ، صاحب کے لیے کھانے کا بندوبست کرو۔'' اس نے دور سے ہی آواز لگا کر ان دونوں کو وہاں سے دوڑایا تھا۔

''تم کھاؤ کھانا۔ میں تو تمہاری بوٹیاں کھانے آیا ہوں یہاں۔'' منصب کا بس نہ چلتا تھا اسے کچا چبا جائے۔

''اوخرا......'' (کھاؤ) میثم نے بلا تامل اپنا ہاتھ اس کے منہ کے آگے کر دیا۔ اور اس کا منہ کھلا...... اس کا ہاتھ کھانے کے لیے نہیں بلکہ اسے پشتو کا لفظ بولتے سن کر۔ اور اگلے ہی پل وہ منہ پھیر گیا۔ میثم کو اس کی کھسیاہٹ مزا دے گئی۔

''اور سناؤ کیسا رہا سفر؟ سب کیسے ہیں...... داجی، نیاجان!'' اس سے آگے کسی کا حال پوچھنے کی زبان میں سکت ہی نہیں تھی۔ وہ تلملا تا مڑا۔

''تمہیں کسی سے کیا۔ کوئی جیے یا مرے۔ تم تو خود کو ان پہاڑیوں میں گم کر چکے ہو۔ بس اتنا ہی کافی ہے۔ کتنی کالز کیں میں نے۔ مگر تمہارا فون ہی نہیں ملتا۔ اتنے بزی تو پرائم منسٹر بھی نہیں رہتے ہوں گے جس قدر مصروف تم ہو گئے ہو یہاں آ کر۔'' وہ بے طرح سلگا تھا۔ اس کا رخ ہنوز ادھر ہی تھا۔ فوری وضاحت پیش کی۔

''سوری...... فون ٹوٹ گیا تھا۔''

''اور میں نے کتنے میسجز کیے۔ کیا وہ بھی تم تک نہیں پہنچے۔'' وہ چیخ پڑا۔

''ملے ہیں۔ سب پیغام ملے ہیں۔ لیکن کس لیے کرتا تمہیں کال۔ نہیں دل چاہا میرا تم پھر مجھے ایک وہی کہانی سناتے۔ امی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ابو شکل سے بیمار لگنے لگے ہیں۔ اباجی کے کندھے اور جھک گئے ہیں۔ سویرا رو رو کر پاگل ہو گئی ہے...... اُس اُف...... تنگ آ گیا ہوں میں یہ سب سن سن کر۔ اچھا تھا تم مجھے اس دن ہی مرنے دیتے۔ ان سب نے بے اعتباری کی آگ میں جھلسا کر مارا ہی تھا مجھے۔ تم بھی مر جانے دیتے۔ کیوں راہ میں آئے تھے میری۔ کیوں بچایا تھا مجھے۔ اب میں روز ایک نئی موت مرتا ہوں۔ جتنا میں ان بے حس لوگوں کو بھلانا چاہتا ہوں۔ تم اتنا ہی مجھے ان کی یاد دلاتے ہو۔ اسی لیے توڑ دیا تھا اس مصیبت کو جس کے ذریعے صور پھونکتے تھے تم۔ اب بھی تمہاری اپنی کوئی بات ہے تو کر سکتے ہو۔ باقی کوئی فالتو کا قصہ سنانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ قطعیت سے کہتا چند قدم دور چلا گیا۔

منصب نے ہونٹ بھینچ کر اسے دیکھا اور ایک پتھر اٹھا کر پوری قوت سے کئی گز پرے اچھال دیا۔

''یقیناً تم نے مجھے مارنے کی نیت سے اٹھایا ہوگا۔ پھر ارادہ کیوں بدل دیا۔ مار دیتے۔ تمہاری مہربانی سے دنیا سے ایک بدنما کہانی ختم ہو جاتی۔'' میثم پلٹا تو چہرے پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔

''مار دوں گا، ضرور مار دوں گا۔ اگر تم نے اپنا دماغ ٹھیک نہ کیا تو۔ خود تو یہاں چھپ کر سکون سے بیٹھے ہو۔ اور وہاں تمہاری بلا میرے گلے ڈالی جا رہی ہے۔ اور میں اسے بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ قصہ پاک کر دوں گا اس کا بھی۔ سمجھتے کیا ہو تم۔ میرے ساتھ تو وہ ہوا ہے کہ نیکی برباد گناہ لازم۔ میری طرف

سے جاتے بھاڑ میں۔ مرجاتے چاہے۔ اب میں تو نہ مر رہا ہوتا۔ حد ہوگئی ہے۔'' اس نے مارے طیش کے اک اور پتھر اٹھایا۔ اور وہی عمل کیا۔ میثم نے پانی کی بوتل کا ڈھکن کھول کر اس کے آگے کردیا۔

''لو پانی پیو۔'' اور منصب نے کینہ توز نظروں سے گھورتے بوتل پکڑلی۔ اور اگلے پل اس نے بوتل ہونٹوں سے لگانے کے بجائے سارا پانی اس کے سر پر انڈیل دیا۔ یخ بستہ ہوائیں اور سرد پانی۔ میثم بے چارہ سی بھی نہ کرسکا۔

''اب یقیناً تمہارا دماغ ٹھنڈا ہوگیا ہوگا۔ اور بے فکر رہو، کوئی فالتو کا قصہ نہیں ہے میرے پاس۔ میں بھی کوئی زمانے بھر کا فارغ آدمی نہیں ہوں جو تمہاری فکر میں گھلتا پھروں۔ سو بکھیڑے ہیں میرے بھی۔ بات اگر میری اپنی ذات کی نہ ہوتی تو میں کبھی سفر نہ کرتا یہاں تک۔ اور خبردار جو تم نے کوئی بکواس کی۔ چپ چاپ سنتے چلے جاؤ۔''

منصب شروع ہوگیا۔ نہ کوما، نہ فل اسٹاپ۔ الف سے بے تک تمام ماجرا کہہ سنایا۔ وہ پہلے ہی تاکید نہ کرتا تو بھی وہ کچھ بولنے جوگا بچا کہاں تھا۔ لبوں پر تو قفل پڑ گئے تھے۔ نظر پراسرار سرمئی پہاڑیوں پر ٹکی تھی۔ وہ بھی جیسے ان ہی کی طرح ہوگیا تھا۔ ساکت...... جامد...... بے حس...... وہ جتنا بھی بھاگ لیتا۔ چھپ جاتا مگر وہ لمحے اس کا دامن چھوڑتے ہی نہ تھے۔ کسی زہریلے ناگ کی طرح لپٹے تھے۔ پل پل ڈستے۔ رگوں سے لہو نچوڑ لیتے۔

وہ سب اس کے اپنے تھے۔ اور افسوس کیسے اپنے تھے جنہوں نے اسے توڑتے ایک پل نہیں لگایا تھا۔ ہاں ٹھیک ہے اس سے غلطی ہوئی اسے بھی غصہ اتارنے کے لیے رات کا وہ پہر نہیں چننا چاہیے تھا۔ جہاں کئی گھنٹے جل سلگ کر گزارے تھے، وہاں کچھ اور وقت نہیں گزار سکتا تھا۔ باز پرس دن کے اجالے میں بھی کی جاسکتی تھی۔ اور اس نے کیا ہی کیا تھا۔ بازو ہی تو پکڑا تھا اس کا...... اُف۔

''نہیں...... کبھی نہیں...... تمام عمر نہیں...... نہیں معاف کروں گا اسے۔ کیا اسے اعتبار نہیں تھا مجھ پر......؟ وہ ایسا سمجھتی ہے مجھے۔ کیا وہ مجھے جانتی نہیں تھی۔ بچپن سے ساتھ تھے ہم۔ اور اس نے بے اعتبار کرتے اک لمحہ نہ لگایا۔ کیا وہ ذرا نہ جانتی تھی مجھے۔ میرے احساسات کو۔ میں تو اسے گرم ہواؤں سے بھی بچاتا آیا تھا اور ...... اور اس نے کیا کیا میرے ساتھ...... اس نے کیوں کیا ایسا...... کیوں...... اندر سے کرچی کرچی کردیا مجھے۔ ختم کرڈالا میرا وجود۔ اب تو بھربھری مٹی کے سوا اور کچھ نہیں۔ سب کی نظروں سے گرادیا مجھے۔ ماردیا مجھے......''

اس کی آنکھیں لہو رنگ ہورہی تھیں۔ سینے کے اندر ایسی آگ جل رہی تھی جیسے کوئی الاؤ بھڑک اٹھا ہو۔ کچھ دیر پہلے منصب پتھر اچھال رہا تھا اب اس کے ہاتھ ان پتھروں کے پیچھے پڑ گئے تھے۔ وہ اٹھ کر اک طرف ہوگیا اچھا تھا۔ وہ اندر بھرا غبار اک بار خوب اچھی طرح نکال ہی لے۔

☆☆☆

کتنا وقت بیتا اس نے تو خود کو کمرے تک ہی محدود کرلیا تھا۔ کتنے ہی دن یونی نہ گئی۔ ہر چیز سے بےزار وہ اپنی ہی ذات کے قلعے میں محصور ہوکر رہ گئی تھی۔ وہ تو سہیل اور زینب کے آنے سے اتنا ہوا کہ وہ اپنے کمرے سے نکل کر گھر میں چلتی پھرتی نظر آنے لگی۔ کبھی کبھار بات بھی کرلیتی۔ پھیکی سی مسکان بھی کسی پل چہرے پر چھب دکھلا جاتی۔ یہی شکر تھا کہ اس نے خود کو سنبھال لیا تھا۔ ورنہ وہ تو بہو اور بیٹے کے سامنے نظر نہ اٹھاتے وہ تو انہیں ہی اس کا خیال رکھنے کو کہہ گئے تھے اور کیسی ستم ظریفی تھی کہ وہ اپنے ہی گھر میں غیر محفوظ ٹھہری تھی۔ اف...... جب جب بھی وہ گزری رات دھیان کے پردے پر لہراتی ان کا خون کھولتا پانی بن جاتا۔

کاش کوئی ایسی ترکیب ہوتی کہ وہ اس بدنما لمحے کو زندگی کے ورق سے کھرچ سکتے۔ اپنے ذہن ودل پر آسیب بن کر چمٹ جانے والے اس درد کو کسی جھاڑ پھونک سے دور کرسکتے۔ ایسا کیا کرتے کہ

روح اس بھیانک پل کے شکنجے سے آزاد ہو جاتی۔ بس ایک ہی دعا تھی' وہ آنکھیں بند ہونے سے پہلے اپنی لاڈلی عنیزہ کو دل کی پوری آمادگی کے ساتھ کھل کر ہنستے دیکھ لیں۔ اس کی آنکھ میں ٹھہرے گونگے آنسو ان کے زخموں پر نمکین قطروں کی طرح گرتے تھے۔

آج کتنے دن بعد انہوں نے اسے اپنے کمرے میں دیکھا تھا۔ وہ نماز عشاء ادا کر کے مسجد سے لوٹے تو وہ صوفے پر دونوں پاؤں اوپر رکھے گھٹنوں پر سر ٹکائے بیٹھی تھی۔ آہٹ پر چہرہ اٹھایا اور انہیں دیکھ کر جھٹ پاؤں نیچے اتارے۔

''ارے...... ارے بیٹھی رہو۔ کیوں اٹھ کھڑی ہوئیں۔''

''وہ...... وہ میں پوچھنے آئی تھی کہ آپ کو کسی کی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے اباجی؟'' وہ یوں بولی گویا بھول گئی ہو کیا کہنا تھا۔

''نہیں میرے بچے! مجھے کسی چیز کی طلب نہیں ہے۔ شام میں خان صاحب کی طرف چائے کے ساتھ کافی کچھ کھا لیا تھا۔ اب بس دوا کھاؤں گا۔ اور کھڑی کیوں ہو۔ بیٹھ جاؤ۔ یونی تو جا رہی ہو نا۔ پڑھائی کیسی چل رہی ہے تمہاری۔''

اس نے جواب میں فقط سر ہلا دیا۔ انہوں نے ٹوپی اور تسبیح سائڈ ٹیبل پر رکھی۔ جیب سے چیزیں نکال کر دراز میں ڈالیں۔ تکیہ جھاڑ کر سیدھا کیا اور بیڈ پر بیٹھتے اسے دیکھا وہ جوں کی توں کھڑی تھی۔

''ادھر آؤ میرے پاس۔ کیا بات ہے کچھ کہنا چاہتی ہو؟'' اور یہ ان کے لہجے کا اثر تھا یا وہ اتنی زود رنج ہو رہی تھی کہ جانے کب کے سنبھالے آنسو ان کے صرف اتنا پوچھنے پر ہی رخساروں پر قطار در قطار لڑھکتے چلے آئے۔ وہ کانپتے قدموں سے ان کے قریب آ بیٹھی تھی۔ انہوں نے سخت بے چین ہو کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

''میں پہلے ہی بڑی اذیت میں ہوں۔ مجھے اور مت الجھاؤ بیٹا۔ کیا ہوا۔ کیوں پریشان ہو۔ کیوں رو رہی ہو میری جان!''

''اباجی...... اباجی...... ایسا نہ کریں پلیز۔ میں اپنی بے وقوفی کی پہلے ہی بڑی سزا بھگت رہی ہوں اور سزا نہ تجویز کریں میرے لیے۔ منصب بھائی کا رشتہ سویرا کے لیے آیا ہے۔ آپ داجی کو اس کے لیے ہاں کر دیں۔ میں مر کر بھی منصب بھائی سے شادی نہیں کر سکتی۔ مجھے بس ایک بار معافی دلوا دیں۔ مجھے معاف کر دیں اباجی! میں بہت ڈر گئی تھی۔ وہ اتنے غصے میں تھے کہ مجھے لگا وہ ابھی میری گردن دبوچ لیں گے۔ مجھے ان کے غصے سے بہت ڈر لگتا ہے۔

اباجی! وہ ایسے نہیں ہیں۔ میں جانتی ہوں ان کا ارادہ غلط نہیں تھا۔ لیکن بہت کچھ غلط ہو گیا۔ وہ تو انہوں نے نینا کی ساری بکواس سن لی تھی۔ اس لیے اتنے شدید غصے میں تھے۔ وہ باتیں ہی ایسی کر رہی تھی۔ بیٹا بھائی کا کوئی قصور نہیں ہے۔ ان کی کوئی غلطی نہیں ہے سب میری غلطی ہے...... سارا میرا قصور ہے...... مجھے ایسے نہیں ڈرنا چاہیے تھا لیکن میں کیا کرتی...... بیٹا بھائی ایسے بالکل نہیں ہیں۔ آپ تو جانتے ہیں انہیں اباجی...... پھر آپ نے کیوں سمجھا ایسا...... کیوں مارا انہیں۔ پتا نہیں کہاں چلے گئے ہیں وہ اب تک واپس کیوں نہیں آئے۔ میں مر جاؤں گی۔ میں اس گلٹ سے مر جاؤں گی۔ وہ گھر آ جاتے، مجھے مار لیتے، اپنا غصہ نکال لیتے۔ لیکن یوں سب کو چھوڑ کر کیوں چلے گئے۔ مجھ سے کیوں ہوئی ایسی بھول۔ پلیز اباجی انہیں ڈھونڈیں نا۔ آپ کو اللہ کا واسطہ......''

وہ زار و زار روتی بے ربط بولتی دونوں ہاتھ ان کے سامنے جوڑے ہوئی تھی اور وہ پتھر ہو گئے۔ وہ اسے یوں دیکھ رہے تھے جیسے پہلی بار دیکھ رہے ہوں۔ یا پہچان بھول گئے ہوں۔ وہ کہہ رہی ہے کہ اس سے بھول ہوئی۔ لیکن نہیں شاید بھول تو ان سے ہوئی تھی۔ وہ تو اتنی عمر گزار چکے تھے۔ تو کیا ساری عمر رائیگاں گئی تھی۔ وہ بوڑھے ہوئے تھے تو کیا سٹھیا بھی گئے تھے۔ وہ اپنے ہی ہاتھوں کے پالے کو بنا جرم کے سزا دے بیٹھے تھے اور ایسے مطمئن جیسے بہت بڑا کمال کر دیا ہو۔ ان کے ـــ چار اطراف شائیں شائیں

ہو رہی تھی۔ تیز جھکڑ چل رہے تھے۔ سب کچھ گڈ مڈ ہونے لگا۔ انہیں کچھ بھول رہا تھا کچھ یاد آ رہا تھا۔

''ہاں...... ہاں میں ہی کوتاہ بین ہو گیا تھا...... یا اللہ...... یہ کیسا جرم سرزد ہو گیا۔ اف ...... میرے خدا...... وہ کیسا چپ ہو گیا تھا۔ کوئی وضاحت، کوئی صفائی تک نہ دی تھی اور ...... اور میں نے اسے کچھ بولنے کا موقعہ ہی کب دیا۔ پوچھا تو ہوتا اس سے کچھ تو بولنے دیا ہوتا۔ عدالت ملزم کو ایک موقعہ تو دیتی ہے۔ میں ایسا بدحواس ہوا کہ بس فیصلہ ہی سنا دیا۔ ہائے میرا بچہ پتا نہیں کہاں کہاں کی ٹھوکریں کھا رہا ہو گا۔ یا اللہ کہاں ہو گا وہ......'' ان کے پاس روتی بلکتی پوتی کی تسلی کے لیے ایک حرف نہیں تھا۔ وہ تو صرف ڈر گئی تھی اور اب وہ پورے اندر سے مر گئے تھے۔ کیا اتنا ہی جانتے تھے وہ اسے۔ اتنا ہی اعتبار تھا اس پر۔ وہ اذیت کی کھائی میں اوندھے منہ جا پڑے تھے تو اس پر کیا بیتی ہو گی جس نے ملزم ہو کر ایسی سخت سزا جھیلی۔ کیا وہ اک پیشی کا حق دار بھی نہ تھا۔

''اوہ...... میرے بچے...... معاف کر دینا مجھے۔ وہ دونوں ہاتھوں میں سر تھامے بیٹھے تھے اور ان کا سفید دامن بھیگتا جا رہا تھا۔

☆☆☆

''صبح پیاری ایک کام آپڑا ہے تم سے......'' روشن لفظ اسکرین پر جگمگا رہے تھے۔ سویرا کے لبوں پر اک چمکیلی سی مسکان آ ٹھہری۔ چاہتوں کا مان بھرا رنگ اس کی آنکھوں سے چھلک رہا تھا۔ محبت حسن نکھارنے میں ہر نسخے ہر ٹوٹکے کو پیچھے چھوڑ دیتی ہے۔ آج کل اس کی سہیلیاں بھی بے اختیار پوچھ لیتیں۔

''کون سی پروڈکٹ یوز کرنے لگی ہو۔ سچ میں تمہارا تو رنگ روپ اور سنور گیا ہے۔'' اور وہ کھلکھلا کر ہنس دیتی۔ اب ہر کسی کو راز کی باتیں تو نہیں بتاتے ہیں۔ وہ بھی کیوں بتاتی کہ اس کے لیے دنیا کی بہترین پروڈکٹ منصب زمان مروت ہے۔ جس کے اپنا ہونے کے احساس نے ہی اسے سرتا پا بدل کر رکھ دیا ہے۔ زندگی ضرور اس پر مہربان تھی جو ایسا دلربا اور دلکش ہمدم ملا تھا۔

''سویرا! تم سب کے لیے رہو گی۔ میری تو تم صبح ہو۔ صبح زندگی...... صبح آرزو...... صبح جاوداں...... صبح بہاراں...... صبح تمنا...... صبح......'' وہ اور بھی جانے کیا کیا بولتا اس کی ساعتوں میں رس گھول رہا تھا۔ وہ قل قل کرتی ہنسے گئی۔

''اللہ...... اللہ...... کون کہہ سکتا ہے منصب زمان خشک پھلوں کا کاروبار کرتے ہیں۔ آپ کا لب ولہجہ تو آپ کو تازہ پھولوں کا بیوپاری بتا رہا ہے۔ آپ کے انداز تو کسی شاعر کے سے ہیں۔ ایسا کلام...... ایسا ردیف وقافیہ۔''

''یہ کلام کی سمجھ تو آ گئی۔ لیکن یہ ردیف اور قافیہ کیا تمہاری سہیلیاں ہیں۔'' ادھر معصومیت کی انتہا تھی۔ وہ ہنس ہنس کے دوہری ہو گئی۔ وہ ایسی ہی شگفتہ باتیں کرتا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر کلیاں کھلی رہتیں۔ اب جو کام آپڑا تھا۔ ضرور وہ بھی کچھ انوکھا ہی ہو گا۔ اور اس کے جوابی ٹیکسٹ ''جی فرمائیں'' کے بعد عقدہ کھلا۔

''نیا خان کل گلگت جا رہی ہیں۔ ان کے لاڈلے پوتے کی منگنی ہوئی ہے نا۔ تو سب خاندان والوں کا منہ میٹھا کرنا چاہتی ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ وہ اس خوشی کی مٹھائی اپنے ہاتھوں سے بانٹیں۔ لیکن ایک مسئلہ ہے۔ وہ چلی جائیں گی تو ان کے پرندوں کا خیال کون رکھے گا۔ کیا تم سنبھالو گی؟''

''لیں، بھلا یہ بھی کوئی مسئلہ ہے۔ پہلے بھی تو سنبھالے تھے میں نے۔ اب بھی پورا خیال رکھوں گی ان سے کہیں، بے فکر ہو کر جائیں۔'' اس نے مکمل اعتماد سے ٹائپ کیا۔

''اوہ۔ تھینک یو۔ تم کتنی اچھی ہو صبح۔ لیکن ایک اور بھی مسئلہ ہے۔ اس بار ان کا پوتا ان کے ساتھ نہیں جا رہا۔ کیا تم اس کا بھی اتنا ہی خیال رکھو گی؟''

''بالکل...... یہ بھی کوئی مسئلہ نہیں۔ بشرطیکہ پوتے صاحب بھی ان پرندوں کے ساتھ ان کے پنجرے میں ہوں تو......'' اور اس بار کسی حرف کے

بجائے کھلی آنکھوں والی ایک شکل آئی تھی۔

''اب دیکھیں نا۔ میں تو یونی جاتی ہوں۔ میں پچھلی بار بھی ان کی کیئر ٹھیک سے نہ کر سکی تھی۔ نیا جان کو وہاں کسی دشمن جاں نے فکر میں ہی ڈالے رکھا تھا کہ کہیں ان کے لولی برڈز بھوک پیاس سے نہ بلکتے ہوں۔ تو اس بار وہ ڈبل ذمہ داری میرے ناتواں شانوں پر ڈال کر جانا چاہ رہی ہیں تو بہتر حل یہی ہوگا کہ وہ اپنے پوتے کو بھی ان کے ساتھ ہی بند کر جائیں تاکہ ایک تو ان کا بھی آسانی سے خیال رکھا جا سکے اور دوسرا یہ کہ وہ خود اپنی آنکھوں سے میری کارکردگی بھی ملاحظہ کر سکیں۔'' اور اس کے ایسے مفصل جواب نے منصب کو خوب ہی ہنسایا تھا۔ یعنی وہ ایسی بھی بے خبر نہیں تھی۔ اس کا جوابی ٹیکسٹ آیا۔

''نیا جان کے پوتے کو اپنی محبت کے جال میں پھانس لیا ہے محترمہ آپ نے، اب اس معصوم کو پرندوں کے پنجرے میں بھی ڈالنا چاہتی ہیں تو وہ آپ کی خوشی کے لیے اس پر بھی تیار ہے۔'' اور اب وہ کیا کہتی اس ''معصوم'' نے تو بولتی ہی بند کر دی تھی۔ گال گلال ہو گئے۔ یوں ہی مسکراتے ہوئے نگاہ اٹھائی۔ سامنے ہی عنیزہ کھڑی تھی۔ جو اسے عجب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ کیا تھا اس کے انداز میں اور اس کے چہرے پر اب بھی وہی تاثرات کیوں تھے جو گزشتہ دنوں میں جیسے اس کے نقوش کا حصہ بن گئے تھے۔ ارے اب تو کوئی پریشانی نہ رہی تھی سب مسئلے حل ہو گئے تھے۔ اب تو اسے بھی ہنستا مسکراتا نظر آنا چاہیے۔ آخر کو اس کی بھی تو منگنی ہوئی تھی۔

ہاں...... ہاں آپ سب بالکل ٹھیک سمجھتے......

☆☆☆

منصب نے تو اس کا پیچھا لے لیا تھا کہ وہ اب سارا غصہ بھول بھال واپس چلے۔ لیکن اس نے کورا جواب دے دیا۔

''یہ کوئی ایشو نہیں ہے جو تم یہاں تک سفر کر کے آئے ہو۔ تم عنیزہ کے لیے صاف انکار کہلواؤ۔ بس معاملہ ختم۔''

''اچھا...... اوہ کتنا آسان حل بتایا آپ نے، میرا کند دماغ تو اس طرف گیا ہی نہیں تھا۔ میں بدعقل خواہ مخواہ اتنا سفر کر کے یہاں تک آ گیا۔ مجھے اتنے پیغام دینے کے بجائے بس ایک مشورہ مانگ لینا چاہیے تھا تم سے۔ اوہ...... کتنا بے وقوف ہوں نا میں بھی سچ میں۔ چلو ٹھیک ہے، میں انہیں انکار کر دیتا ہوں۔ میری طرف سے تو بات ختم ہو جائے گی۔ لیکن اگر انہوں نے آناً فاناً اس کا رشتہ اٹھا کر کسی اور سے طے کر دیا تو......''

''ہاں تو کر دیں...... وہ ان کی پوتی ہے اور پورا حق رکھتے ہیں وہ۔'' وہ کھڑکی سے باہر دیکھتا کہہ رہا تھا۔ منصب نے اک جھٹکے سے اس کا رخ اپنی طرف کیا۔

''اب یہی جملہ ذرا اک بار میری آنکھوں میں دیکھ کر کہو۔'' اور وہ اس سے کہیں بڑے جھٹکے سے شانہ چھڑاتا منہ موڑ گیا۔

منصب ہنس ہنس کے بے حال ہونے لگا۔ وہ تلملاتا اس پر ہاتھ میں آئی ہر چیز اچھال رہا تھا۔ اور اسی رات جب منصب مایوس ہو کر اکیلے ہی واپسی کی تیاری کر رہا تھا کہ اس کے سیل پر کال آئی تھی۔ منصب کچھ نہیں بول رہا تھا بلکہ اس نے سیل کان سے ہٹا کر اس کا اسپیکر آن کر دیا۔

''منصب میرے بچے دیکھو مجھ سے جھوٹ نہ بولنا۔ مجھے سویرا نے بتا دیا ہے کہ تم جانتے ہو میثم کہاں ہے۔ دیکھو...... دیکھو مجھے بس ایک بار اس کے پاس لے چلو۔ مجھ سے بہت بڑی غلطی ہو گئی۔ بوڑھا ہوں نا...... پاگل ہو گیا تھا۔ میرا میثم تو میرا اپنا ہے نا وہ کوئی خطا نہیں کر سکتا۔ میں اس سے معافی مانگ لوں گا۔ میں اس کے سامنے ہاتھ جوڑ لوں گا۔ بس ایک بار...... مجھے اس کے پاس لے چلو۔ بس ایک بار...... منصب......'' ابا جی زارو قطار روتے اس کی منت کر رہے تھے۔ میثم اس سے زیادہ نہیں سن سکتا تھا۔ اس کے ہاتھ سے فون جھپٹ کر پرے پھینک دیا اور بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ آخر کار پیمانۂ صبر چھلک ہی گیا تھا۔ منصب نے بھی تسلی نہ دی۔ کھل کر رونے دیا۔

''سچ...... سچ میرا اتنا مہنگا آئی فون...... خبیث......اسکریچ ڈال دیے اس پر۔'' منصب فون کا جائزہ لیتا دانت کچکچا رہا تھا۔

''مرو نہیں...... نیا لے دوں گا۔'' وہ آستین سے آنسو پونچھتا اٹھا۔ اب وہ الماری سے بیگ نکال رہا تھا۔

''اور وہ جو پہلے تو نے توڑا؟''

''وہ بھی لے دوں گا۔''

''اور وہ جو میں نے اتنا خرچا کیا تجھ پر۔ تجھے یہاں لایا۔ پھر چار بار تیرے پیچھے تیری خیر خبر لینے آیا اور وہ......''

''بے فکر رہ، سارے ہرجانے بھر دوں گا۔'' وہ بیگ بند کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ منصب مطمئن ہو گیا پھر وہ کچھ دیر بعد بولا تھا۔

''خان! تیری بے وقوفی کے قصے تو بہت سن رکھے تھے میں نے۔ لیکن تیری کمینگی سے پہلی بار واقف ہوا ہوں۔ سچ بتا، تُو پہلے سے ہی اتنا کمینہ تھا یا اب ہو گیا ہے۔ چل خیر' پہلے سے ہے یا اب ہو گیا ہے مجھے اس سے کیا لینا دینا۔ مجھے تو یہ خیال آ رہا ہے۔ اچھا ہوا تیری اصلیت مجھ پر وقت پر ہی ظاہر ہو گئی۔ اب کم از کم اباجی کو سمجھانا آسان ہو جائے گا۔ یوں بھی بہت پیار کرتے ہیں وہ اپنی پوتیوں سے۔''

اور اس کی بات کا مطلب کیا ہے جب سمجھا تھا تو کمرے کی ہر چیز اب میثم کے سر کا نشانہ لے رہی تھی۔ اور ان کے لیے چائے لے کر آنے والا دلبر خان خود سے کہہ رہا تھا۔

''دواڑ و یو شوانت لوانے دی۔''

(دونوں ہی ایک جیسے پاگل ہیں)

☆☆☆

''ارے عنیزہ! کھڑی کیوں ہو آؤ بیٹھو۔'' سویرا نے خوش دلی سے خیر مقدم کیا۔ وہ تھکن سے انداز سے چلتی پاس آ بیٹھی۔

''کیا بات ہے، طبیعت ٹھیک ہے تمہاری۔'' سویرا کو اس کے چہرے کی بے رونقی نے پریشان کیا۔

اس نے اثبات میں گردن ہلاتے یونہی بالوں پر ہاتھ پھیرا تو نظر اس کی خالی انگلی پر جا پڑی۔ یاسمین نے اپنی سب سے مہنگی اور دلکش ڈیزائن والی انگوٹھی بہو کو پہنائی تھی۔ جو سویرا کو بے حد پسند تھی اور ماں سے لینے کا ارادہ بھی تھا۔ لیکن اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی انہوں نے وہ اپنی اکلوتی بہو کو پہنا دی تھی۔ جو اب اس کے ہاتھ میں نہیں تھی۔ اس کا تشویش زدہ ہونا فطری تھا۔ بے اختیار پوچھا۔

''تمہاری رنگ کہاں ہے، کیوں اتار رکھی ہے تم نے۔ چلو جلدی سے لے کر آؤ۔ ابھی امی کی نظر تمہارے ہاتھ پر پڑی تو خفا ہوں گی۔ پتا ہے نا ان اولڈ خواتین کی تو ہم پرستیوں کا۔ مجھے تو نیا جان نے اس دن اچھا خاصا لیکچر پلایا تھا اس بابت۔ اگر رنگ ڈھیلی بھی ہے تو اس کا بھی حل ہے میرے پاس۔ وہ رنگ ایک دو بار امی سے لے کر میں نے بھی پہنی تھی۔ تب انہوں نے ہی بتایا تھا کہ اس کو دھاگہ باندھ لو تو سائز فٹ ہو جائے گا۔ تم لے کر آؤ۔ میں سمجھاتی ہوں۔''

اور اس کی اتنی طویل بات کا کوئی بھی جواب دینے کے بجائے جس تیزی سے اس کے نین کٹورے بھرے تھے۔ انہوں نے سویرا کی تشویش میں کئی گنا اضافہ کر دیا۔

''عنیزہ! کیا ہوا ہے۔ تم مجھے کچھ پریشان لگ رہی ہو۔ بات کیا ہے بتاؤ مجھے۔ ارے کہیں وہ رنگ ادھر ادھر تو نہیں کر بیٹھی ہو۔'' اور اس کے ہاتھوں تو نہ جانے کیا کیا ادھر ادھر ہو گیا تھا۔ وہ اکیلے بوجھ اٹھاتے اٹھاتے تھک گئی تھی، اس لیے تو ایک ہمدرد ملتے ہی جھرنے کی مانند بہنے لگی۔ اور جو انکشاف کیا۔ اس نے سویرا کا دماغ سنسنا ڈالا۔

''م...... مگر کیوں...... ایسا کیوں کیا بھائی نے۔ یعنی انہوں نے منگنی کے وقت جب تمہیں انگوٹھی پہنائی گئی۔ اسی پل کسی کی نظر میں آئے بغیر تمہاری انگلی سے رنگ واپس نکال لی...... مگر کیوں...... انہوں نے تو اباجی سے کہا تھا کہ وہ ہر بات بھلا کر تمہیں اپنائیں گے۔ پھر...... ایسا کیسے

کر سکتے ہیں وہ...... اوہ مائے گاڈ......" وہ سر پکڑ کر رہ گئی تھی اور اس کے آنسو رو کے نہ رکتے تھے۔

وہ تو سمجھتی تھی اس کا یوں چپ چاپ بڑوں کے فیصلے پر سر جھکا دینا ہر خطا کی عام معافی ہے۔ اس کا تو دم روم اس کی محبتوں سے مہک رہا تھا۔ سرتاپا سرشاری کی ٹھنڈی پھوار میں تھی۔ کہ میثم نے عین اس پل جب یمین بڑے چاؤ سے اسے انگوٹھی پہنا کر سب سے مبارک باد وصول کر رہی تھیں اور وہ چپکے چپکے رخساروں تک کھینچے گئے دوپٹے کے اندر مسکرائے جا رہی تھی۔ کہ ہاتھ بھر فاصلہ رکھے بیٹھے میثم کا ہاتھ اس کی گود میں رکھے ہاتھوں پر آیا تھا۔ اس کا دل اچھل کر حلق میں آن پھنسا اور قبل اس کے کہ وہ اس کے ہاتھوں کے نرمی بھرے لمس کو محسوس کرتی کہ اس نے ڈھیلی سی انگوٹھی پل ساعت میں کھینچ کر اس کا دم بھی ساتھ ہی کھینچ لیا۔ وہ بیٹھے بیٹھے پتھر کی ہوگئی تھی۔ کیوں اس کے ساتھ ہی کیوں سویرا کو ہر وقت چپکے چپکے مسکاتے دیکھ کر اسے اپنے خسارے زیادہ ستانے لگتے تھے۔ یہی وجہ تھی آج خود پر اختیار نہ رہا۔ سویرا ملال میں گھری اسے روتے دیکھتی رہی۔ بھائی پر تو خوب ہی غصہ آیا تھا اسے اور ذری نکالنے کو اسے کال ملائی تھی۔ وہ ادھر مزے سے پاؤں جھلاتا سنے گیا۔

"بڑوں نے اپنی خواہش پوری کی۔ اسے سب نے میرے سر منڈھ دیا۔ میں نے کوئی اعتراض کیا؟ نہیں نا؟ تو جب میں نے کسی دکھ کا رولا نہیں ڈالا نہ پہلے نہ اب۔ تو اسے بھی چاہیے حوصلہ رکھے۔ بجائے اس کے کہ اس کے ساتھ مل کر رونے لگو۔ سمجھاؤ اسے۔ جو بویا جاتا ہے۔ وہی کاٹنا بھی پڑتا ہے۔ اس کی خطاؤں کی لسٹ پہلے ہی بہت طویل تھی کہ اب اس نے چارج شیٹ میں اپنی بے وفائی کی وجہ سے اور اضافہ کرلیا ہے۔ آج تو تم نے اس کی حمایت کرنے کی غلطی کر دی ہے۔ آئندہ میرے معاملات میں بولنے کی کوشش نہ کرنا۔ بس اپنے معاملات تک محدود رہو۔ انڈر اسٹینڈ......"

وہ نہایت کھردرے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ سویرا کی سٹی گم ہوئی۔ وہ بے چاری تو گونگی ہی ہوگئی تھی۔ دوسری طرف اس کی گنگناہٹیں تیز سے تیز تر ہوتی گئیں۔

☆☆☆

ابھی پو پوری طرح نہیں پھٹی تھی۔ صبح نو کا جامنی سا اجالا ہر طرف پھیل رہا تھا۔ خنکی بھری مخصوص ہوا اٹھلاتی پھر رہی تھی۔ اک سکوت سا فضا میں سمایا ہوا تھا۔ ہمیشہ جاتے وقت کو پکڑنے والی عنیزہ کچھ عرصے سے منہ اندھیرے ہی نماز فجر ادا کرنے لگی تھی۔ اس کے بعد دعا اور اذکار کے لیے لان میں لگے جھولے پر آبیٹھتی۔ اک نئے امیدوں بھرے دن کا ابتدائیہ اس کی اداسیوں میں گھری روح کو بھی ایک آس کی ڈور پکڑا جاتا۔ جب پہلے سب بگڑ گیا تھا تو تب بھی صرف وہی تھا سننے والا۔ اسی نے بیچ بھنور سے نکالا تھا۔ وہ آنکھیں موندے اپنے دھیان میں تھی۔ کہ کوئی چپکے سے پاس آبیٹھا۔ جھولے کی خفیف سی چرخ چوں پر اس نے پلکیں اٹھائیں۔ اور اپنے قریب تر چہرے کو دیکھ کر ابھی جنبش بھی نہ کرسکی تھی کہ اس نے احتیاطاً ایک ہاتھ لبوں پر جما دیا۔

"آج اگر تم نے چیخنے کی غلطی کی نا تو یہیں گردن دبا دوں گا......" اگر وہ گردن دبانے کی دھمکی نہ بھی دیتا تب بھی وہ کچھ کہنے کے قابل ہی کہاں رہی تھی۔ اسے یوں اچانک سامنے دیکھ کر اس کے حواس تو ویسے ہی مختل ہو چلے تھے۔ اس پر اس کا جارحانہ انداز دم نکالنے کو کافی تھا۔ وہ یوں گھور رہا تھا۔ جیسے برسوں پرانے جانی دشمن کو دیکھ رہا ہو۔ اس کی زبان گنگ ہوئی تھی۔ دل کی رفتار مدھم۔ بس اک آنسو تھے جو ہوش قائم رکھے ہوئے تھے۔ لمحوں میں رخسار تر بتر ہوئے تھے۔ وہ بڑبڑاتا نظر پھیر گیا۔

"اسٹوپڈ...... نان سینس......" اس عزت افزائی پر کچھ اور موتی لڑھکتے چلے آئے۔ وہ جانے کچھ اور بھی کہہ رہا تھا۔ اب کے سماعت بند اور بصارت دھندلا گئی تھی۔

"س...... سوری...... بہت دیر بعد گلے میں اٹکتے نمکین گولے کو بصد مشکل نکلتے کہنا چاہا...... وہ

بھڑکتا پلٹا۔
''شٹ اپ...... اگلے کو جیتے جی جہنم میں اتار کے ہلکے سے منہ سے کہہ دو سوری۔ واہ...... کتنا بے ہودہ مذاق ہے نا...... یعنی حد ہوگئی۔ کوئی اپنی جان سے جائے اور تم جیسے لوگ سوری کہہ کر سمجھ لیں کہ ہر جرم سے بری الذمہ ہوگئے۔ بس پھر کہانی ختم۔ نہیں عنیزہ سہیل صاحبہ کہانیاں کبھی اس طرح سے ختم نہیں ہوتیں۔ تمہارے نام کا پہلا حرف عین اگر ہٹادیا جائے تو پیچھے بچتا ہے۔ نیزہ اور خدا جانتا ہے کہ اب تمہارا نام میرے دل پر ایک نیزے کی طرح ہی گڑا ہے۔ سخت بے چین کرتا۔ اذیت دیتا۔ اک مستقل درد، جسے میں نے جان بوجھ کر مول لیا ہے۔'' وہ سانس لینے کو رکا اور اس نے موقع غنیمت جانتے جلدی سے اپنی صفائی دینا چاہی۔

''آپ...... آپ بہت غصے میں تھے۔ م...... میں ڈر گئی تھی۔''

''واہ...... واہ کیا خوب بہانا تراشا ہے عنیزہ سہیل نے۔ تم ڈر گئیں...... اور میں مرگیا۔ بے موت۔ کیا تمہیں اتنا ہی اعتبار تھا مجھ پر؟ بس اتنا ہی جانتی تھیں مجھے۔ جو بچپن سے لے کر اس وقت تک تمہارا سایہ بنا رہا ہو اس سے تم ڈر گئیں۔ اور ایسا کہ اسے مارنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ جبکہ تم یہ اچھی طرح جانتی تھیں کہ مجھے کس بات پر غصہ تھا۔ اس روز جو بکواس وہ لڑکی کر رہی تھی اور اس پر جو خاموشی تمہارے لبوں پر تھی۔ کیا اس پر غصہ کرنے کا بھی حق نہیں تھا میرا۔ یعنی اس سے تو یہی ظاہر ہوتا کہ تم اس کی باتوں سے متفق تھیں۔ میں کہتا رہا تھا اباجی سے کہ اس کا آپ کی پوتی کے ساتھ رہنا ٹھیک نہیں۔ یہ ضرور بگاڑے گی اسے۔ مگر انہوں نے بھی میری بات کو ذرا برابر اہمیت نہ دی۔ مجھے کبھی اچھی نہیں لگی تھی وہ تمہاری پیاری سہیلی۔ جس کے چھچھورے رویے زہر لگتے تھے۔ جس نے یہاں آتے ہی مجھے اپنی اداؤں کے جال میں پھانسنا چاہا جب میں کسی طور قابو نہ آیا تو اس نے نئی چال چلی اور تمہیں ہم سے متنفر کرنا شروع کردیا۔''

(یہ ایک بالکل نئی اطلاع تھی اس کے لیے'' نیز اس حد تک دشمنی کررہی ہے۔ یہ تو اس کے وہم و گمان میں بھی نا تھا...... اُفف...... ہمدردی کی آڑ میں ایسا کڑا وار۔؟ وہ پوری آنکھیں کھولے اسے دیکھ رہی تھی وہ سامنے دیکھتا بول رہا تھا

''اور مجھے اس پر تو جو غصہ تھا سو تھا لیکن اس کی ہر بری بھلی پر تمہاری چپ۔ نہیں برداشت ہوئی تھی۔ میں کیا تم سے کوئی سوال بھی نہ کرتا۔ لیکن مجھے کیا پتا تھا میری ایک جسارت کا تم ایسا جواب دوگی۔ وہ وقت...... اباجی کی مار سے زیادہ ان کے وہ لفظ۔ اف...... نہیں...... نہیں بھولے گی مجھے وہ تکلیف۔ اس رات جب میں گھر سے نکلا تو رنج اور غصہ میں پاگل ہو رہا تھا۔ کچھ شک نہیں کہ جس طرح اندھا دھند سڑک پر بھاگ رہا تھا کسی گاڑی کے نیچے کچلا جاتا۔ وہ تو منصب نے مجھ دیکھ لیا۔ زندگی باقی تھی جو معمولی سا زخمی ہو کر بچ گیا۔ میں اتنا بدحواس ہو رہا تھا کہ اس کا احسان ماننے کے بجائے الٹا اس سے خوب لڑا۔ حتیٰ کہ اسے مارا۔ یا شاید میرے کانوں میں تمہاری اس فضول سہیلی کی بکواس بھری تھی۔ جو مجھے منصب سے بھی بدگمان کر رہی تھی۔ لیکن جس طرح اس نے مجھے ٹریٹ کیا۔ سنبھالا اور سمجھایا۔ پھر اس پر ہی بس نہیں بلکہ میری حالت دیکھتے ہوئے وہ مجھے یہاں سے دور لے گیا اور تب تک سائے کی طرح میرے ساتھ رہا جب تک میں نے خود کو سنبھال نہیں لیا۔ پھر آہستہ آہستہ میرا جسم تو ٹھیک ہو ہی گیا لیکن وہ روح کیسے زندہ ہوتی جسے فقط تمہاری چیخوں نے مار دیا تھا۔ تم روتی ہوگی۔ پریشان بھی ہوئی ہوگی۔ لیکن مجھ پر بیتے اس عذاب کی ایک ٹیس بھی نہیں سہہ سکتیں۔ جس سے میں گزر کر آیا ہوں۔ کتنا نقصان ہوا میرا۔ میں تخمینہ لگانے بیٹھوں تو صدیاں گزر جائیں۔ اور حساب پورا نہ ہو۔ مجھے سب اپنوں سے اتنا عرصہ دور رہنا پڑا۔ امی، ابو سویرا، اباجی اور...... (وہ تم...... کہتے کہتے رکا اک نظ

نیر بہاتی لڑکی کو دیکھا اور پھر سے نگاہ پھیر لی) کتنی اچھی تیاری تھی میری۔ چند دن میں ہی تو ایگزام تھے۔ کہ پھر...... اب کیا میں بالکل ویسے ہی پڑھ سکوں گا۔ ویسی تیاری ہو سکے گی میری۔ نہیں ہرگز نہیں۔ خالی ہو گیا ہے میرا دماغ۔ اب کیسے سمیٹوں گا میں خود کو۔ تم نے میرا سب اعتماد چھین لیا۔ بے کار کر دیا مجھے۔ ناکارہ کر دیا۔ نیزہ بی بی۔" اس کے لہجے سے ہی نہیں آنکھوں سے بھی گرم لپٹیں نکل رہی تھیں جو عنیزہ کے وجود کو موم کے جیسے پگھلا رہی تھیں۔ وہ اپنی جگہ یہ بالکل سچا تھا۔ وہ اس کی جلی کٹی چپ چاپ سن رہی تھیں۔

"اباجی کی تو بہت دیرینہ خواہش تھی اپنی کم عقل پوتی کو میرے پلے باندھنے کی۔ یہ اپنے بچپن سے جانتا ہوں میں اور ایک بار ان ہی سے سن کر بس یونہی میرا دل بھی ان کا ہمنوا ہو گیا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے نا۔ ان کی بے وقوف سی لاڈلی کو ان کے سمجھ دار اور حوصلہ مند پوتے کے علاوہ اور کوئی برداشت نہیں کر سکے گا۔ لیکن میں تمہاری بدتمیزی کبھی نہیں بھول سکتا۔ نہ ہی مجھے تم سے اب کوئی انسیت ہے۔ اب یہ انگوٹھی میرے ہاتھ میں ہے اور اسے پہننے یا نہ پہننے کا فیصلہ تمہارے ہاتھ میں۔ چاہو تو اٹھا لو اور اگر نہیں چاہتی ہو تو خود اٹھ کر چلی جاؤ۔ میری طرف سے تم پر کوئی زبردستی نہیں۔"

میثم نے گیند اس کے کورٹ میں ڈال دی تھی۔ اس کے چہرے کے عین سامنے ہاتھ کیا۔ ہتھیلی پر انگوٹھی دھری تھی۔ اسے اختیار دے کر وہ خود منہ پھیرے بیٹھا تھا۔ عنیزہ کو کسی طور پر یقین نہیں آ رہا تھا یہ وہی میثم ہے۔ وہی میثم جسے وہ بچپن سے جانتی تھی۔ وہ تو ایسا کٹھور اور سنگدل نہ تھا۔ وہ تو ہمیشہ اس کے لیے آسانیاں تلاشتا آیا تھا۔ کم سنی سے اس کی انگلی پکڑے اپنا ایسا عادی بنا لیا تھا کہ پھر وہ ہر معاملے میں اسی کی طرف دیکھتی۔ اور وہ بنا کہے ہی سب سمجھ بھی لیتا اور سلجھا بھی دیتا۔ یوں تو وہ اس سے نہایت سخت گیر استاد سا رویہ اپنائے رکھتا تھا۔ لیکن وہ یہ بھی خوب جانتی تھی۔ اس کے اندر کی تمام نرمیاں بھی اسی کے لیے ہیں۔ کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جو لفظوں کی محتاج نہیں ہوتیں۔ وہ زبان پر نہ بھی آئیں۔ لیکن آنکھوں اور لہجوں سے عیاں ہوتی اپنا آپ بتا جاتی ہیں۔ میثم نے کبھی اس سے نہیں کہا تھا۔ "تم مجھے اچھی لگتی ہو" وہ تو ہمیشہ اسے اس کی ذات کی خامیاں ہی جتاتا آیا تھا۔ لیکن اتنا وہ بہت اچھی طرح سمجھتی تھی کہ جو لوگ بُرے لگتے ہوں۔ پھر دن رات ان کی فکر میں ہلکان نہیں ہوا کرتے۔ نہ ہی رک رک کر انہیں دیکھتے ہیں اور نہ ہی ذرا ذرا سی بات پر حق جتانے کو خفگیاں دکھاتے ہیں۔ اگر وہ اذیت جھیل کر آیا تھا تو سکون سے وہ بھی کب رہی تھی۔ ہاں مانا کہ اس سے غلطی ہوئی اور وہ بھی بہت بڑی۔ مگر وہ پورے دل سے معافی مانگ تو رہی تھی اب کیا وہ جان لے گا اس کی۔ اتنی سزا دے کر بھی جفا جو کا دل نہیں بھرا تو چلو اور سہی۔" بے دردی سے گال رگڑ کر اس نے خود کو مضبوط ظاہر کرتے گردن اٹھائی۔ فیصلے کبھی بھی جھکی گردن کے ساتھ نہیں ہوتے۔ جھکے شانوں سے صرف بوجھ اٹھائے جاتے ہیں۔

وہ اسے کتنا ہی بدھو سمجھتا یا کہتا ہو۔ مگر اتنا علم تھا اسے۔ اک بھیگی نظر اس اکڑو پر ڈالی۔ جو ہتھیلی کھولے رخ موڑے بیٹھا تھا۔ جی کڑا کر کے ہاتھ بڑھایا۔ مگر یہ کیا اس کے انگوٹھی اٹھانے سے پہلے ہی وہ مٹھی بند کر گیا۔ ساتھ ہی عنیزہ کا دل بھی۔ ناسمجھی سے اسے دیکھا۔ وہ تیکھے چتون لیے اسی کی جانب متوجہ تھا۔

"یہ بڑوں کی خواہش تھی۔ جس پر مجھے سر جھکانا پڑا۔ لیکن اپنی زندگی کے لیے کچھ میرے بھی تو ارمان تھے نا۔ اس روز حسرت ہی رہ گئی۔ خیال تھا اباجی کہیں گے۔ چلو بچو پہناؤ اک دوجے کے ہاتھ میں رنگ۔ مگر اچھی ہوئی میرے ساتھ۔ انہوں نے میرے ہاتھ میں پہنا دی اور امی نے تمہارے۔ میں تو دیکھتا کا دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس بے تکے پن پر اس قدر غصہ آیا کہ حد نہیں۔ اسی غصے میں تمہارے ہاتھ سے رنگ اتار لی۔ سوچا تھا جب سب ادھر ادھر

ہو جائیں گے تو اپنا شوق پورا کرلوں گا۔ مگر اس کی بھی نوبت نہیں آئی۔ دلبر کے داجی بیمار تھے۔ اس کی کال آئی تو لپک جھپک جانا پڑا۔ وہاں جا کر خیال آیا کہ جانے میری اس حرکت کا تم نے کیا مطلب لیا ہوگا۔ پھر خود کو تسلی دی کہ کوئی بات نہیں۔ اس کی وجہ سے میں نے اتنے عرصے کی بیگار کاٹی ہے۔ اگر چار دن وہ فکر کرلے گی تو کوئی مضائقہ نہیں۔ ان مہینوں میں اتنے کھڑکی کے شیشے اور چائے، کافی کے مگ توڑے ہیں۔ اور ہر جانے تنخواہ میں سے بھرے ہیں چلو کچھ وہ بھی توڑ کے دیکھے اور ہائے ری حسرت تم نے کیا توڑنا ہے سوائے میری تمناؤں کی کمر کے۔ اس نالائق لڑکی کے ساتھ بیٹھ کے ڈرامے تو بڑے دیکھے جاتے تھے۔ ان ڈراموں سے اتنا بھی نہ سیکھا کہ جب ہیرو رنگ پیش کرتا ہے تو ہیروئن کیا کرتی ہے؟"

وہ سخت برے تیوروں سے پوچھ رہا تھا۔ اور ہیروئن بے چاری ہونق...... ہمیشہ کی طرح جس پر اسے مزید تاؤ آیا۔

"نہیں ٹھیک ہوسکتیں تم ...... واللہ ...... کوئی علاج نہیں ہوسکتا تمہارا۔ تم خالی دماغ ہو اور رہوگی۔ بلکہ کوئی شک نہیں کہ اپنے ساتھ ساتھ مجھے بھی پاگل کر ڈالو اف ...... میرے اللہ کب سدھرے گی یہ احمق لڑکی ......" وہ جھنجلایا سا سر اٹھائے دہائی دے رہا تھا۔ (اور احمق کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب بھلا کیا خطا سرزد ہوگئی تھی اس سے)

"اف ...... اب کیسے سمجھاؤں میں تمہیں۔ ایسے لمحوں میں لڑکی کئی وقت کے بھوکوں کی طرح انگوٹھی اٹھانے کو نہیں لپکتی۔ بلکہ اک ادا سے اپنا ہاتھ ہیرو کے آگے کردیتی ہے۔ بالکل ایسے (عملی مظاہرہ کرکے دکھایا گیا اور ہیروئن ہک دک ......) تاکہ وہ خود اسے رنگ پہنائے۔ اب آیا کچھ عقل شریف میں۔ چلو ہاتھ ادھر لاؤ۔" اور اس کے پتھر بنے بت نے کیا ہاتھ بڑھانا تھا وہی پکڑنے لگا کہ......

"کٹ ...... کٹ ...... کٹ" سویرا دھڑ دھڑ سیڑھیاں اترتی نیچے آرہی تھی۔

"اتنے اہم موقعے پر ایک کلک نہ ہو تو مزا نہیں آئے گا اور یہ ذرا ٹھیک سے بیٹھیں۔ یوں ہاتھ پکڑیں۔ پرفیکٹ۔ ...... بس اب ڈالیں رنگ ...... اور یہ لیں جی ...... کلک ...... کلک ...... کلک" سویرا کے اندر اس پل کوئی ماہر کیمرہ وومین گھس آئی تھی۔ وہ ہدایات دیتی گئی اور عمل کرتا گیا اور وہ ...... اس کی پلکوں سے پانی کی چادر ہٹتی تو دیکھتی نا کہ اپنا ارمان پورا کرتے پل کیسی جگمگاہٹ تھی موصوف کے چہرے پر جو اگلی ہی ساعت میں پھر موڈ بدلے اسے یاددہانی کروا رہا تھا۔

"زندگی صرف ایک بار ملتی ہے اور ایسے لمحے بھی۔ میں نے تو جسٹ اپنا شوق پورا کیا ہے۔ اس سے تم ہرگز یہ مت سمجھ لینا کہ میں تمہاری کوئی خطا بھول گیا ہوں۔ عنقریب گن گن کر بدلے لوں گا تم سے۔"

"افوہ ...... عنیزہ اب تو بس کردو ...... بلیوی۔ تمہاری ایک بھی پک ٹھیک نہیں ہے۔ تھوڑا سا تو مسکرا دو یار! اور بھائی پلیز یہ ڈائیلاگز پھر کبھی پر اٹھا رکھیں۔ ابھی اس کے آنسو ہی پونچھ دیں۔"

اور جس کے ہاتھ میں کیمرہ ہوتا ہے۔ سب اس کے تابعدار ہوجاتے ہیں۔ یہ گر کی بات آج ہی عنیزہ کو پتا چلی تھی۔ قبل اس کے کہ تیشم کی انگلیاں اس کے رخساروں سے موتی چنتیں، وہ قدرے دور ہو گئی۔ (جب وہ کوئی خطا نہیں بھولا تھا۔ تو اسے بھی ضرورت نہیں تھی نام نہاد ہمدردیوں کی) وہ اب ان ہی انگلیوں پر کچھ گن رہا تھا۔

"اب یہ کیا تسبیح کررہے ہیں۔" سویرا پوچھ رہی تھی۔

"خطا نمبروں میں ایک اور خطا کا اضافہ۔ میرے پاس پورا ریکارڈ ہے ان محترمہ کی خطاؤں کا۔ جو انہوں نے میرے حضور کی ہیں۔ ابھی بھی تم نے دیکھا نا کیسے ہاتھ جھٹکا اس نے میرا۔" تیغ صفت نظریں اس پر گڑی تھیں۔

"ہاتھ کب جھٹکا اس نے۔ وہ تو تھوڑا پیچھے ہوئی ہے۔ اب ایسی بھی گپ نہ ماریں بھائی۔ آپ بھی نا ...... اینڈ پلیز بس کردیں اب۔ وہ تو پہلے ہی رو رو کے

ہلکان ہوئی پڑی ہے۔اب اور تنگ نہ کریں۔‘‘ سویرا کو اس کے ہچکیاں لیتے وجود پر ترس آیا تھا۔
’’تنگ ......بس تنگ ...... میں اب بس تنگ نہیں کروں گا۔ میں تو اب جینا دوبھر کردوں گا۔
اس نے سمجھا کیا ہے مجھے۔اس نے پرے کیا میرا ہاتھ۔اس کی جرأت کیسے ہوئی۔اس بدتمیزی کا جلد ہی خمیازہ بھگتنا پڑے گا اسے‘‘ وہ پھوں پھاں کرتا اٹھا اور سیڑھیاں پھلانگ گیا۔سویرا سر جھٹکتی اس کے پاس آبیٹھی۔
’’اُفوہ......اُف یار......بس بھی کردو اب۔کیا تمہیں پتا نہیں ہے بھائی کے مزاج کا۔ وہ صرف ستا رہے ہیں تمہیں۔جس دن تم بہادر ہوکر ان کے سامنے ڈٹ گئیں نا۔اسی دن ان کی تمام نوٹنکی ٹھس ہوجائے گی اور یہ دیکھو جسٹ اپنا شوق پورا کرنے والوں کی آنکھیں کیسے چمک رہی ہیں اور چہرے کے ایکسپریشنز۔اُف......لگتا ہے دنیا فتح کیے بیٹھے ہیں۔ بدلہ لینے والوں کی شکلیں ایسی ہوتی ہیں بھلا۔تم خود بتاؤ۔‘‘
اور اس کے انداز جان نکال رہے تھے تو یہ سب کیا تھا۔ پھر۔مجال ہے جو لبوں سے مسکراہٹ جدا ہوئی ہو۔اور آنکھیں تو پورے سو واٹ کا بلب ہوں گویا...... عنیزہ نے اسے دیکھا۔ اس نے مسکراتے شانہ تھپتھپایا۔
’’یہ رونے دھونے والے سین اب پرانے ہوچکے۔اگر وہ سیر ہیں تو تم سوا سیر ہوجاؤ۔ پھر دیکھنا کیسے مزے سے گزرتی ہے زندگی۔‘‘
ایک مخلصانہ مشورے سے نواز کر وہ آگے بڑھ گئی۔اس نے بھی ہتھیلیوں سے گال صاف کیے۔ اب اس کے سامنے ہرگز نہیں رونا۔ساتھ ہی یہ عزم صمیم بھی کر ڈالا۔ اک گہرا سانس بھرتی اٹھی تو نظر سامنے ٹیرس پر جا پڑی۔ وہ سینے پر ہاتھ باندھے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ بظاہر تو کڑے تیور۔ ماتھا بلوں والے پراٹھے جیسا۔
اسے جانے کا سوجھی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتی رہی اور پھر...... پھر شرارت سے منہ چڑا کر اندر کو بھاگ لی۔ میثم کو ایک جھٹکا تو ضرور لگا۔ لیکن صرف اک ساعت کو۔اگلے پل وہ بے اختیار مسکرا اٹھا۔
اپنے کمرے میں جا کر دم لیتے اس کی شکل کا تصور کرتے۔ بھی بے تحاشا ہنسے جارہی تھی اور سویرا نے ان کی پک منصب کو فاورڈ کی تھی، نیچے لکھا تھا۔
’’کتنے اچھے لگ رہے ہیں نا دونوں پتا ہے کیا میری بھی بڑی خواہش تھی۔انگیجمنٹ رنگ آپ میری انگلی میں ڈالتے۔مگر ہک ہاہ۔حسرت ہی رہ گئی میری تو۔
’’اُفوہ ...... اللہ نہ کرے کیوں کوئی حسرت رہے تمہاری۔تمہارے سارے شوق پورے کرنے کو یہ خادم ہے نا...... بس کچھ دن ٹھہر جاؤ۔تمہارے سب سنگھار اپنے ہاتھ سے کیا کروں گا۔ انگوٹھی، چوڑی، بندے، پائل، کاجل، لالی، لپ اسٹک، مسکارا اور...... کیا ہوتا ہے یار...... چلو باقی تم بتاتی جانا۔کافی چیزوں کے نام ابھی مجھے نہیں آتے۔ بٹ ڈونٹ وری۔ڈرائنگ اور کلرنگ میں کلاس میں ہمیشہ سو فیصد مارکس لیتا تھا میں۔سو کوئی کمی نہیں رہنے دیا کروں گا۔ اس طرف سے تو بالکل بے فکر ہوجاؤ تم۔‘‘
وہاں سے محبت بھرا جواب آیا تھا۔اور بجائے خوش ہونے کے وہ شاکڈ ہوگئی تھی۔
ڈرائنگ اور کلرنگ میں سو فیصد مارکس لینے والا جب اس کا سنگھار کرے گا تو کیا صورت ہوسکتی ہے؟ اپنی متوقع شامت کا تصور کوئی اتنا بھی دلکش نہ تھا۔ مگر کیا کرتی کہ وہ آنے والا نظارا ابھی سے آنکھوں کے سامنے لہرانے لگا تھا اور پھر وہ خیال علاوہ ہنسی کے اور کیا تحفہ دیتا۔سو وہ بھی ہنسنے لگی اور ہنستی ہی چلی گئی۔

مت اس خواب کے پیچھے بھاگو

بھولی لڑکی!
مت اس خواب کے پیچھے بھاگو
پتھر بن کر رہ جاؤ گی
تیز بہت ہے وقت کا دریا
تم بھی اس میں بہہ جاؤ گی
یہ نشتر جیسی رسوائی
بولو کیسے سہہ پاؤ گی
کیا بچوں جیسی باتوں سے
تم سب کو بہلا سکتی ہو!
کیا تم اپنے من کی منطق
دُنیا کو سمجھا سکتی ہو؟
خوابوں جیسی باتیں کر کے
کیا تعبیریں پا سکتی ہو؟
باپ کی شفقت، ماں کی ممتا
کیا سچ مچ ٹھکرا سکتی ہو؟
جس گھر میں پروان چڑھیں تم
اس کو چھوڑ کے آ سکتی ہو؟
ایسی باتیں ناممکن ہیں
بس تم اپنی تنہائی میں
ہجر کے گیت ہی گا سکتی ہو!

اعتبار ساجد

خیر سے رات اپنے گھر لوٹی
پھر رہی تھی وہ در بدر لوٹی

وسعتیں آسمان کی چھو آئی
زندگی ہو کے معتبر لوٹی

تھک گئی ہوا مسافت سے
ختم کر کے بڑا سفر لوٹی

ہاں ضروری تھا گھر سے جانا بھی
اپنی چادر سنبھال کر لوٹی

کچھ ادھورے سوال باقی ہیں
آنکھ اب بھی ہے منتظر لوٹی

خوف تھا کھڑکیوں میں بیٹھا ہوا
بند کر کے وہ سارے در لوٹی

نہ ہو شیطان میری جنّت میں
یہ دُعا بھی وہ مانگ کر لوٹی

ڈاکٹر عزیزہ انجم

آنکھوں میں جو بات ہو گئی ہے
اک شرحِ حیات ہو گئی ہے

مدت سے خبر ملی نہ دل کی
شاید کوئی بات ہو گئی ہے

اس دور میں زندگی بشر کی
بیمار کی رات ہو گئی ہے

جیتی ہوئی بازیٔ محبت
کھیلا ہوں تو مات ہو گئی ہے

وہ چاہیں تو وقت بھی بدل جائے
جب آئے ہیں رات ہو گئی ہے

ایک ایک صفت فراقؔ اس کی
دیکھا ہے تو ذات ہو گئی ہے۔

فراق گورکھپوری

نہیں کہ سایۂ دیوار دیکھتا ہوں میں
ہر ایک قید کے اس پار دیکھتا ہوں میں

کسی کے مرتبہ و جاہ سے نہیں مطلب
عمل میں عظمتِ کردار دیکھتا ہوں میں

ہنر نے آئینہ سازوں کے جس کو چھین لیا
وہ عکس بھی سرِ بازار دیکھتا ہوں میں

ہے تیرے ذہن پہ چھائی ہوئی عجیب بہار
نمو کو صورتِ اشعار دیکھتا ہوں میں

کوئی نمود و نمائش مجھے نہیں درکار
خود اپنے فن کو ہی شہکار دیکھتا ہوں میں

سبھی خموش ہیں اس بزم میں مگر فیضانؔ
تمہی میں جرأتِ اظہار دیکھتا ہوں میں

فیضان سروری

شگفتہ جاہ

رنگ رنگ پھول

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت ابوقتادہؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سُنا۔

"جس کو یہ بات پسند ہو کہ اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کی بے چینیوں سے نجات دے تو اسے چاہیے کہ وہ تنگ دست کو مہلت دے یا اس سے (قرض) معاف ہی کر دے۔"

(مسلم)

فائدہ:۔ اس کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ قرض کی ادائی میں مزید مہلت دے دے، یعنی مطالبے کو مؤخر کر دے، دوسرے معنی ہیں، اس کی تکلیف کو دُور کر دے یا یہ کہ اپنے پاس سے اسے اتنی رقم دے دے کہ جس سے وہ اپنا قرض ادا کر دے۔ بہر حال یہ ہمدردانہ رویہ قیامت کے روز انسان کو قیامت کی بے چینیوں سے بچائے گا جہاں ہر شخص بے چین اور مضطرب ہوگا۔

شہادت کی فضیلت،

تاریخ اسلامی کا عظیم سربراہ قربت کے رشتوں میں ریشم کی طرح نرم تھا۔ اپنے بھائی زید بن خطاب کی شہادت کے بعد کہا کرتے تھے۔

"بادِ صبا چلتی ہے تو زید کی خوشبو لیے آتی ہے۔ دل کے زخم تازہ ہو جاتے ہیں اور قرار و سکون لُٹ جاتا ہے۔"

قسم بن نویرہ نے اپنے بھائی کا دردناک مرثیہ لکھا۔ جب اس کی مدینہ آمد پر عمر فاروقؓ سے ملاقات ہوئی تو آپؓ نے کہا۔

"اگر میں تیری طرح شاعر ہوتا تو تیری طرح اپنے بھائی کا دردناک مرثیہ لکھتا۔"

نویرہ نے کہا: "امیرالمومنین! اگر میرا بھائی اللہ کی راہ میں اس طرح مارا جاتا جیسے آپ کا بھائی شہید ہوا تو مجھے کوئی غم نہ ہوتا اور میں اس کے لیے مرثیہ نہ کہتا۔"

یہ سن کر حضرت عمر فاروقؓ نے کہا۔

"مجھ سے بہت سے لوگوں نے میرے بھائی کی تعزیت کی مگر تجھ سے بہتر تعزیت کرنے والا کوئی میرے پاس نہ آیا۔"

تنہائی،

تم تنہا ہو اور وقت کے دل شکن لمحات تمہارے سینے کے محسوسات کو پامال کر رہے ہیں تو کیا ہوا، تم اس دُنیا میں تنہا ہی آئے، تنہا ہی جاؤ گے تو پھر تنہائی سے کیوں گھبراتے ہو۔

(خلیل جبران)

اقوالِ دانش،

- میں بھول چکا ہوں کہ میں آخری بار کب رویا تھا۔ اس لیے نہیں کہ میری زندگی میں دُکھ، تکالیف اور مصائب نہیں رہے، بلکہ اس لیے کہ میں نے جان لیا ہے کہ جنگیں مسلسل جدوجہد سے جیتی جاتی ہیں آنسوؤں سے نہیں۔ اور ہمارے عہد کی ہر زندگی کسی طور بھی ایک جنگ سے کم نہیں۔

(لیون ٹرانسکی)

- اگر تم کسی قوم کو جنگ کے بغیر فتح کرنا چاہتے ہو تو اسے احساس کمتری کا شکار بنا دو۔ وہ ہمیشہ تمہاری غلام رہے گی۔

(میکالے)

- جس شخص نے کبھی کوئی غلطی نہیں کی، اس نے کبھی کچھ نیا کرنے کی کوشش بھی نہیں کی ہوگی۔

(البرٹ آئن اسٹائن)

صدف شناد، شاہ پور

نقص،

انگلش کے لیکچرار نے طالب علموں کو بتایا۔
"انگریزی کا نہایت ممتاز اور مشہور شاعر ملٹن نابینا تھا۔"
دوسرے روز لیکچرار صاحب نے جاننا چاہا کہ ان کے اسٹوڈنٹس نے یہ بات یاد رکھی ہے یا نہیں۔
چنانچہ انہوں نے پوچھا۔
"کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ ملٹن کی شخصیت میں کیا خرابی تھی؟"
"یہی کہ وہ شاعر تھا۔"

انتظامات،

ایک خاتون اپنے شوہر کو تصویر ٹانگنے کی ہدایت کرتے ہوئے بولیں۔
"سنیے! ہتھوڑی الماری میں رکھی ہے۔ کیلیں میز کی دراز میں ہیں اور مرہم پٹی کا سامان ساتھ والی الماری میں رکھا ہوا ہے۔"

اقصیٰ ناصر۔ کراچی

ہم بھی یہاں کے تھے،

جون ایلیا جب ہندوستان گئے تو وہاں کے لوگوں کے لیے یہ شعر پڑھا۔

ہم آندھیوں کے بن میں کسی کارواں کے تھے
جانے کہاں سے آئے ہیں جانے کہاں کے تھے
مل کر تپاک سے نہ ہمیں کیجیے اداس
خاطر نہ کیجیے، کبھی ہم بھی یہاں کے تھے

عذاب سے نجات کس کو ملے گی،

بعض مرتبہ اللہ کسی قوم کو آفات میں مبتلا کر کے بھی عذاب کا مزا چکھاتا ہے اور اس عذاب سے بچنے کا واحد راستہ سورہ الاعراف کی ایک سو پینسٹھویں آیت میں واضح طور پر بتا دیا ہے۔

"اور جب ان میں سے ایک گروہ نے کہا "تم ایسے لوگوں کو کیوں نصیحت کرتے ہو جنہیں اللہ ہلاک کرنے والا ہے یا انہیں عذاب دینے والا ہے۔ بہت سخت عذاب" انہوں نے جواب دیا "تمہارے رب کے سامنے عذر کرنے کے لیے کہ شاید وہ ڈر جائیں۔ پھر وہ اس بات کو بھول گئے۔ جس کی انہیں نصیحت کی گئی تھی۔ تو ہم نے ان کو بچا لیا جو برائی سے منع کرتے تھے۔ اور باقی سب لوگوں کو جو ظالم تھے ان کی نافرمانی پر سخت عذاب پر پکڑ لیا۔"

یعنی اس بستی میں تین قسم کے لوگ تھے۔ ایک وہ جو دیدہ دلیری سے اللہ کے احکام کی خلاف ورزی کرتے تھے۔ دوسرے وہ جو خود تو خلاف ورزی نہیں کرتے تھے۔ مگر اس خلاف ورزی کو خاموشی سے بیٹھ کر دیکھتے تھے۔ اور منع کرنے والوں سے کہتے تھے "ان کم بختوں کو نصیحت کرنے سے کیا حاصل؟"

تیسرا گروہ وہ تھا جو غیرت ایمانی سے معمور تھا اور انہیں برائی سے روکتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے دونوں گروہوں کو غرق کر دیا۔ ان کو بھی جو گناہ پر خاموش تھے کہ اللہ کے نزدیک ایسی خاموشی بھی گناہ ہے اور ان کو بچا لیا جو برائی سے روکتے تھے۔

سید الانبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کلیہ عذاب کو اپنی ایک حدیث میں واضح کیا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جبرائیل علیہ السلام کو چند بستیوں پر عذاب نازل کرنے کو کہا۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے کہا۔

"ان میں سے ایک بستی میں ایک شخص ایسا بھی ہے جس نے پلک جھپکنے جتنا عرصہ بھی گناہ میں صرف نہیں کیا۔"

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"وہ خود تو زاہد و پرہیزگار تھا لیکن میرے احکام کی کھلم کھلا خلاف ورزی ہو رہی تھی۔ لیکن اس کے چہرے کا رنگ کبھی میری عزت کی وجہ سے متغیر نہیں ہوا۔ سب سے پہلے اسے زمین پر پٹخو اور پھر پوری بستی کو اس پر الٹا دو۔"

اللہ تعالیٰ کے حکم کی کھلم کھلا بغاوت اور نافرمانی پر خاموش رہنے پر اللہ کی ناراضی کا یہ عالم ہے اور عذاب کی سختی کی یہ کیفیت ہے۔

(از حرف راز)

الکھ نگری،

سیانے کہتے ہیں اتنے اجلے نہ ہو کہ دوسرے میلے نظر آئیں۔

(ممتاز مفتی)

حقیقت،

کسی کو پانے کے لیے ہماری ساری خوبیاں بھی کم پڑ جاتی ہیں ...!
مگر کھونے کے لیے ایک خامی ہی کافی ہوتی ہے۔

ناپسندیدہ،

فیکٹری میں ایک سپروائزر نے کچھ عرصہ کام کرنے کے بعد محسوس کیا کہ ورکر اسے پسند نہیں کرتے۔ ایک روز اس نے ایک ورکر کو علیحدگی میں بلایا اور اس سلسلے میں اسے کریدنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔
"کیا بات ہے لوگ مجھے پسند کیوں نہیں کرتے؟ اس سے پہلے میں جس کارخانے میں کام کرتا تھا، وہاں ورکر مجھے اتنا پسند کرتے تھے کہ جب میں نے وہاں سے نوکری چھوڑی تو انہوں نے مجھے بہت شاندار فیئر ویل پارٹی دی اور تحفے کے طور پر ایک ٹی سیٹ پیش کیا۔"
"صرف ٹی سیٹ؟" ورکر نے حیرانی سے کہا۔
"سر! جس دن آپ یہاں سے نوکری چھوڑ کر جائیں گے، آپ کو اس سے بڑی فیئر ویل پارٹی دیں گے اور تحفے میں ڈنر سیٹ دیں گے۔"

حمزہ، اقراء۔ کراچی

کرکٹ،

جاہلوں کا ذکر نہیں، بڑے بڑوں کو ہم نے اس خوش فہمی میں مبتلا دیکھا کہ زیادہ نہ کم، پورے بائیس کھلاڑی کرکٹ کھیلتے ہیں۔ ہم قواعد و ضوابط سے واقف نہیں لیکن جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا، اسی کی قسم کھا کر عرض کرتے ہیں کہ کرکٹ درحقیقت صرف ایک ہی شخص کھیلتا ہے، مگر اس کھیل میں یہ وصف ہے کہ بقیہ اکیس حضرات سارا سارا دن اس مغالطے میں مگن رہتے ہیں کہ وہ بھی کھیل رہے ہیں۔ حالانکہ ہوتا یہ ہے کہ یہ حضرات شام تک سارس کی طرح کھڑے کھڑے تھک جاتے ہیں اور گھر پہنچ کر اس تکان کو تندرستی سمجھ کر پڑے رہتے ہیں۔

(مشتاق احمد یوسفی)

عائشہ، تحریم۔ گوجرہ

اناڑی باؤلر،

مشتاق باؤلر سے کوئی خائف نہیں ہوتا۔ وہ زیادہ سے زیادہ وکٹ ہی تو لیتا ہے۔ جان تو اناڑی سے نکلتی ہے۔

(مشتاق احمد یوسفی)

نشانہ،

ایک کرکٹر اپنی ساس کو مرعوب کرنے کے لیے میچ دکھانے لے گیا۔ جب اس کی باری آئی تو اس نے اپنے ساتھی بلے باز سے کہا۔
"میری ساس بھی تماشائیوں میں موجود ہیں اور میں زبردست شاٹس لگانے کی کوشش کروں گا۔"
اس پر ساتھی بلے باز نے بے تکلفانہ انداز میں کہا۔
"تم احمق ہو، بھلا تم اپنی ساس کو اتنے تماشائیوں میں کیسے نشانہ بناؤ گے؟"

آسیہ جاوید۔ علی پور چٹھہ

ستم،

دلی میں جب نادر شاہ کے سپاہی ہزاروں شہری قتل کر چکے اور شہر کو لوٹ چکے تب محمد شاہ رنگیلا نے اپنا وزیراعظم نادر شاہ کے حضور بھیجا۔
نظام الملک ننگے پاؤں اور ننگے سر دربار میں حاضر ہوا اور امیر خسرو کا یہ شعر پڑھا۔
ترجمہ:۔ "اور کوئی نہیں بچا جسے تو اپنی تیغ ناز سے قتل کرے سوائے اس کے کہ تو مردوں کو زندہ کرے اور دوبارہ قتل کرے۔"

خالدہ جیلانی

اقرأ عزیز ـــــــــ گاؤں دریاخان جلبانی

رات گہری تھی ڈر بھی سکتے تھے
ہم جو کہتے تھے کر بھی سکتے تھے
تم کو جو بچھڑے ہم سے یہ بھی نہ سوچا
ہم تو پاگل تھے مر بھی سکتے تھے

مدیحہ نورین مہک ـــــــــ گجرات

وہ کب کا بھول چکا ہو گا دوستی کا قصہ
بچھڑ کر کسی سے کسی کو کسی کا خیال کہاں رہتا ہے

رائے عذرا سرفراز ـــــــــ فیصل آباد

ان انگلی سیدھی ریکھاؤں کو پہروں چوما کرتے تھے
میں اپنی ہتھیلی دیکھوں تو کچھ لوگ بہت یاد آتے ہیں
وہ پل بھر کی ناراضیاں اور مان بھی جانا پل بھر میں
اب ارشد خود سے روٹھوں تو کچھ لوگ بہت یاد آتے ہیں

رضوانہ شکیل راؤ ـــــــــ لودھراں

جس طرف دیکھا مقام تُو نظر آیا
کچھ نظر آیا نہیں جب تُو نظر آیا

یاسمین کنول ـــــــــ پسرور

کیسے لمحے ہیں بھولتے ہی نہیں
وہ جو گزرے ہیں کامیابی سے
جب کبھی سوچ میں انہیں لاؤں
رنگ بکھرتے ہیں کچھ گلابی سے

عائشہ خالد ـــــــــ کراچی

ثبوت ہے یہ محبت کی سادہ لوحی کا
جب اس نے وعدہ کیا، ہم نے اعتبار کیا

ملائکہ کوثر ـــــــــ بسم اللہ پور

ہوائیں روز بجھاتی ہیں خواہشوں کے دیے
یہ زندگی بھی اندھیرے مکان جیسی ہے
میں اپنے ساتھ ہوں یا کوئی دوسرا ہے ضیاء
یقین کی یہ گھڑی بھی گمان جیسی ہے

نخبہ اکرم ـــــــــ گاؤں گوئیکی

حکایتِ غم دنیا طویل تھی، کہہ دی
حکایتِ غم دل مختصر ہے کیا کہیے
جدائیاں تو یہ مانا بڑی قیامت ہیں
رفاقتوں میں بھی دکھ کس قدر ہے کیا کہیے

فضہ یوسف ـــــــــ بہاولپور

ہم اپنے قرب کے کم زور دھاگے
جھٹک کے توڑ دیں ہمت نہیں ہے
یہ زہر اب پی ہی لیں جرأت نہیں ہے
کبھی سچ بول دیں عادت نہیں ہے

فوزیہ ثمر بٹ ـــــــــ گجرات

یہی مت سمجھنا تم ہی زندگی ہو
بہت دن اکیلے بھی ہم نے گزارے

نمرہ اقرأ ـــــــــ کراچی

محبت کا تعلق ٹوٹنے میں دیر لگتی ہے
ہماری امداد کی دوستی برسوں چلی آئی

مہ جبین تاج ـــــــــ کراچی

وقت کی اپنی عدالت بھی ہوا کرتی ہے
آج اس شہر میں قانون تمہارا ہی سہی

توبیہ قطب ـــــــــ کراچی

ہم ہی نہیں تھے ہماری طرح کے اور بھی لوگ
عذاب میں تھے جو دنیا سے سوچتے تھے الگ۔

اقصیٰ طیب الرحمٰن ـــــــــ گاؤں موہن ہری پور

کچھ وقت کی روانی نے ہمیں یوں بدل دیا
وفا پر اب بھی قائم ہیں مگر محبت چھوڑ دی ہم نے

تسنیم کوثر ـــــــــ کراچی

ایک مدت سے نہ قاصد ہے نہ وفا نہ پیام
اپنے وعدے کو تو کر یاد، مجھے یاد نہ کر

امۃ الصبور

اُجالوں کی ڈائری

عائشہ فاطمہ کی ڈائری سے

موجودہ صورت حال اور درپیش معاملات کے تناظر میں احمد فراز کی یہ غزل قارئین کی نظر۔

لب کشا ہیں لوگ، سرکار کو کیا بولنا ہے
اب لہو بولے گا، تلوار کو کیا بولنا ہے

خلقتِ شہر ہے چپ، شاہ کے فرمان کے بعد
اب کسی واقفِ اسرار کو کیا بولنا ہے

وہی جانے پسِ پردہ جو تماشا گر ہے
کب، کہاں، کون سے کردار کو کیا بولنا ہے

بکنے والوں میں جہاں ایک سے ایک آگے ہو
ایسے میلے میں خریدار کو کیا بولنا ہے

لو چلے آئے عدالت میں گواہی دینے
مجھ کو معلوم ہے کس یار کو کیا بولنا ہے

جہاں دربار ہوں، شاہوں کے مصاحب ہوں
وہاں غالب کے طرف دار کو کیا بولنا ہے

اقصیٰ، عزہ، اقراء کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر رشید کامل کی غزل قارئین کی نذر۔

کسے ہے طرح وقت پر دوام سوچتے رہے
لکھے ہوئے تھے کیسے کیسے نام، سوچتے رہے

رہِ حیات میں دکھا ہے کون کتنی دیر کو
مسافروں کا وقفۂ قیام سوچتے رہے

اُجڑ کے دل بسا نہیں، بچھڑ کے وہ ملا نہیں
عذاب ہے کہ ہجر صبح و شام سوچتے رہے

جو ملا تھا راستے میں، کیا بتائیں کون تھا
وہ یاد آگیا تو اس کا نام سوچتے رہے

کچھ ایسے بے خبر نہ تھے شکاریوں کی چال سے
جب آگئے طیور زیرِ دام سوچتے رہے

رشید ساری عمر اسی خیال میں گزر گئی
کہ ظالموں سے لیں گے انتقام، سوچتے رہے

حمدہ خان کی ڈائری سے

انسانی فطرت میں جو بے چینی بے صبری قدرت نے رکھی ہے، وہ اسے کبھی خوش نہیں رہنے دیتی۔ لاحاصل کی خواہش اسے ہمیشہ ایک تشنگی کی کیفیت میں مبتلا رکھتی ہے۔ احمد ندیم قاسمی نے انسانی فطرت کے اسی رُخ کو بیان کیا ہے۔

آدمی بھی عجیب چیز ہے
جو نہیں ہے اسے ڈھونڈتا ہے
مگر جس کو پاتا ہے
اس کو جب تک کھو نہ دے
کتنا بے چین رہتا ہے
حاضر کو غائب میں
غائب کو حاضر میں

یوں کھو جاتا ہے
کہ جیسے وہ خود کہیں کھو گیا ہے

سحر سہیل کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر جاوید اختر کی یہ غزل زندگی کی تلخ حقیقتوں کی ترجمان ہے۔ وہ حقیقتیں جن سے راہِ زیست میں نہ چاہتے ہوئے بھی گزرتے ہیں۔

درد کے پھول بھی کھلتے ہیں، بکھر جاتے ہیں
زخم کیسے بھی ہوں، کچھ روز میں بھر جاتے ہیں

راستہ روکے کھڑی ہے یہی الجھن کب سے
کوئی پوچھے تو کہیں کیا کہ کدھر جاتے ہیں

چھت کی کڑیوں سے اترتے ہیں مرے خواب مگر
میری دیواروں سے ٹکرا کے بکھر جاتے ہیں

نرم الفاظ، بھلی باتیں، مہذب لہجے
پہلی بارش میں ہی یہ رنگ اتر جاتے ہیں

اس دریچے میں اب کوئی نہیں اور ہم بھی
سر جھکائے ہوئے چپ چاپ گزر جاتے ہیں

عنبرین ولی کی ڈائری سے

لیاقت علی عاصم کی شاعری سادگی اور پُرکاری کا بہترین نمونہ ہے۔ ان کی شاعری میں بے ساختگی اور برجستگی کے ساتھ ساتھ ایک خاص رنگ و آہنگ اور لب و لہجہ ہے جو انہیں دوسروں سے منفرد کرتا ہے۔ ان کی ایک غزل قارئین کے لیے۔

عشق بارِ دگر ہوا ہی نہیں
دل لگایا تھا دل لگا ہی نہیں

ایک سے لوگ، ایک سی باتیں
گھر بدلنے کا فائدہ ہی نہیں

ماہنامہ کرن

جولائی 2018ء کا شمارہ شائع ہوگیا

"کرن کا دسترخوان"

اب ہر ماہ کرن کے ساتھ مفت حاصل کریں

- فنکارہ "رمشا خان" سے شاہین رشید کی ملاقات،
- فنکار "وہاج علی" کہتے ہیں "میری بھی سنیے"،
- اس ماہ "سعدیہ وحید سعدی" کے "مقابل ہے آئینہ"،
- آواز کی دنیا سے "آر جے سہیل خان" اس ماہ مہمان ہیں،
- "شبِ غم کی سحر" رخ چوہدری کا نیا سلسلہ وار ناول،
- "ہوائیں رخ بدل گئیں" نگہت عبداللہ کا سلسلہ وار ناول،
- "لذتِ غمِ عشق" صائمہ قریشی کا مکمل ناول،
- "اباجی میں اور تم" اُم ایمان قاضی کا مکمل ناول،
- "غم ہے یا خوشی ہے تو" تنزیلہ ریاض کا ناولٹ،
- "سورما" نظیر فاطمہ کا ناولٹ،
- فرح بھٹو، عمارہ خان، کشف بلوچ، عمارہ امداد اور رضوانہ اسحاق کے افسانے اور مستقل سلسلے،

ہم جہاں بھی گئے، پلٹ آئے
کوئی تیری طرح ملا ہی نہیں

ڈھونڈ لاتے وہیں سے دل لیکن
پھر وہ میلہ لگا ہی نہیں

اس طرح ٹوکتا ہوں اوروں کو
جیسے میں جھوٹ بولتا ہی نہیں

ورنہ سقراط مر گیا ہوتا
اس پیالے میں زہر تھا ہی نہیں

نوال افضل گھمن کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر یہ چند لائنیں عزیز از جان ماریہ اعجاز گھمن کے نام۔

ہوائیں سرد ہو جائیں
یا لہجے برف ہو جائیں
ہم اس کی یاد کی چادر کو
خود پہ تان لیتے ہیں
سنو...!
درویش لوگوں کی
کوئی دنیا نہیں ہوتی
ملے جو خاک رستے میں
اسی کو چھان لیتے ہیں
اگر وہ روٹھ جاتا ہے
ہماری جان نکلتی ہے
یہ سانس جاری رکھنے کو
ہم اس کی مان لیتے ہیں

حمدہ واجد کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر یہ غزل آپ سب بہنوں کے لیے۔

ہم نے کھلنے نہ دیا بے سروسامانی کو
کہاں لے جائیں مگر شہر کی ویرانی کو

صرف گفتار سے زخموں کا رفو چاہتے ہیں
یہ سیاست ہے تو پھر کیا کہیں نادانی کو

کوئی تقسیم نئی کر کے چلا جاتا ہے
جو بھی آتا ہے گھر کی نگہبانی کو

اب کہاں جاؤں کہ گھر میں بھی دشمن اپنا
اور باہر مرا دشمن ہے نگہبانی کو

ستارہ چوہدری کی ڈائری سے

محسن نقوی میرے پسندیدہ شاعر ہیں، اللہ پاک ان کے درجات بلند فرمائے۔ ان کی اس غزل کے باعث ہمارا ان سے تعارف ہوا جو کہ مجھے بہت پسند ہے۔

ہم یوسفِ زماں تھے ابھی کل کی بات ہے
ہم تم پہ مہرباں تھے، ابھی کل کی بات ہے

ہم ہی تیری زبان پہ تھے اے دوست
موضوعِ داستاں تھے، ابھی کل کی بات ہے

اے کاروانِ انقلاب دگی تم کو یاد ہو
ہم میرِ کارواں تھے ابھی کل کی بات ہے

جن دوستوں کی کمی ہے آج حیات میں
وہ اپنے درمیان تھے، ابھی کل کی بات ہے

کچھ حادثوں سے گر گئے محسن زمین پہ ورنہ
ہم رشکِ آسماں تھے ابھی کل کی بات ہے

بہنوں کا
شعاع
اپنا ماہنامہ

جولائی 2013

- ''شہرزاد'' صائمہ اکرم کا ناول،
- ''خواب شیشے کا'' عفت سحر طاہر کا ناول،
- ''بن پاکھی'' فرح بخاری کا مکمل ناول،
- ''تیری ایک نگاہ کے اسیر ہیں'' نادیہ احمد کا مکمل ناول،
- ''خواہشوں کے دیار میں'' حمیرا نوشین کا مکمل ناول،
- ''نہ جائے ماندن'' ام طیفور کا ناولٹ،
- اف شین نعیم، نیر فہیم خان، انیلا طالب، حمیرا عروش اور فاطمہ زیدی کے افسانے،
- معروف فنکارہ ''زارا نور عباس'' کا ''بندھن''،
- ''دستک'' معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ،
- ''جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے''،
- ''پیارے نبی ﷺ کی پیاری باتیں'' اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں،

شعاع ہر ماہ پوری محنت سے ترتیب دیتے ہیں، لیکن آپ کے خط ہمیں بتاتے ہیں کہ ہم اپنی محنت میں کتنے کامیاب ٹھہرے، ہمیں خط لکھنا نہ بھولیے گا۔

شعاع جولائی 2013 کا شمارہ آج ہی خرید لیں

نادرۂ خاتون

خط بھجوانے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ، 37-اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com

شعوانہ عائز......مردان

اس بار شمارہ بے حد انتظار کے بعد ہاتھ آیا۔ ہمارے دھیان کے سارے دھاگے تو اسی سے جُڑے رہتے ہیں۔ روز پتا کرواتے مگر بے سود۔ آخر کراچی سے مردان، فاصلہ بھی تو زیادہ ہے اوپر سے روزے اور گرمی۔ اللہ اللہ کر کے رسالہ ملا تو ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالا۔ ہر بار خیالوں میں ایک خط آپ کو لکھتے ہیں اور آپ کی طرف سے خود کو خود ہی جواب دے ڈالتے ہیں۔ اور مزے کی بات تو یہ ہے کہ آنے والے شمارے میں قارئین کے خطوط میں کہیں نہ کہیں ہمارے دل کی وہ باتیں موجود ہوتی ہیں اور آپ کے جوابات حسب توقع۔ آپ کے ادارے سے دلی وابستگی کا اتنا طویل عرصہ گزرا کہ ہماری ذہنی ہم آہنگی کمال کی ہو چکی ہے لیکن اس بار شبانہ طارق کے سوال پر خود کو روک نہیں پائے۔ ان سے عرض ہے کہ سرسوں کے پھول فروری 2012ء کے شعاع میں چھپی تھی اور میری پسندیدہ کہانیوں میں سے ایک ہے۔

اس بار شمارہ سرورق سے آخر تک لاجواب تھا۔ عید کا سروے پڑھ کر معلوم ہوا کہ سب کی عیدیں ایک ہی طرز پہ گزرتی ہیں۔ زینب احمد کی باتیں بس ٹھیک تھیں۔ دشتِ جنوں شکر ہے تھوڑا سا بدلاؤ آیا۔ حالم بہت غیر متوقع صورت حال سے دوچار ہے۔ نمرہ احمد بھی کچھ بھی کر سکتی ہیں۔ سوچ سے ماورا۔ مکمل ناول میں سمیرا حمید ایک بار پھر ایک اچھوتی تحریر کے ساتھ رونق افروز ہیں۔ افسانے بس ٹھیک تھے۔ سمیرا لیپلک تو سمیرا حمید کی کہانیوں کی ہیروئن کی طرح محنتی، پُرعزم اور کچھ کر کے دکھانے والی۔ بہت متاثر کیا۔ نفسیاتی الجھنیں پڑھ کر ان بہنوں سے ہمدردی محسوس ہوتی ہے "بیوٹی بکس" کے مشورے آزمودہ اور قابل عمل۔ یہ تو تھا اس بار کا شمارہ۔ اب آپ سے ایک بات پوچھنی ہے کہ کیا عنیزہ سید اور رفعت ناہید سجاد کی تحاریر کتابی شکل میں آ چکی ہیں؟ وقت کے ساتھ تبدیلی ناگزیر ہے۔ نئے لکھنے والے بھی اچھے ہیں لیکن ہم پرانی مصنفین کو بہت یاد کرتے ہیں ان کی بات ہی کچھ اور ہے۔

ایک بات اور۔ ہم جانتے ہیں کہ عموماً پٹھان کا نام لیتے ہی پہاڑ، گھیر دار لباس اور نسوار ہی ذہن میں آتے ہیں لیکن آپ کو بتاتے چلیں کہ صوبہ خیبر میں میدانی علاقے بھی بہت ہیں اور عام طور پر لوگ قومی لباس پہنتے ہیں اور سبھی پٹھان نسوار کا استعمال نہیں کرتے۔ دل چاہتا ہے کہ اپنے ملک کا یہ رنگ ساری دنیا سے متعارف کرنے کے لیے قلم اٹھائیں اور کہانیاں لکھ ڈالیں جو ہمارے ذہن میں پکتی رہتی ہیں" تاہم ہمت نہیں کی۔

ج: پیاری شعوانہ! مردان کا کراچی سے فاصلہ کتنا ہی ہو، دلوں میں فاصلہ نہیں آنا چاہیے اور بھئی پٹھان کا نام لیتے ہی ہمارے ذہن میں تو کھڑے نقشے

کے حسین چہرے گھوم جاتے ہیں جن کے دل ان کے چہروں کی طرح اجلے اور معصوم ہیں اب بھلا عجب گل اور شاہد آفریدی کو دیکھ کر کس نالائق کے ذہن میں نسوار کا خیال آئے گا؟ اور ٹیلی پیتھی تو ہمیں آتی نہیں اس لیے براہ راست آپ ہی سے پوچھ رہے ہیں، یہ شعوانہ عائذ کا کیا مطلب ہے؟

عنیزہ سید اور رفعت ناہید سجاد کے ناول کتابی شکل میں آ چکے ہیں۔ آپ 021-32735021 پر فون کر کے ان کے بارے میں دریافت کر سکتی ہیں۔

شازیہ ستار......ڈی جی خان

باجی! عید سروے میں میرے جوابات کیا اتنا برے تھے کہ آپ کو ذرا بھی پسند نہیں آئے؟ میں نے تو سب سے ہٹ کر اپنے دل سے جوابات دیے تھے کیا آپ کو میری کسی بات میں اٹریکشن محسوس نہیں ہوئی؟ اب آپ ہمارے افسانے کو جگہ دیں گی تو میں دوسرا افسانہ شروع کروں گی۔

عید نمبر اس دفعہ مزہ دے گیا۔ احادیث نبویؐ سے آنکھوں و دل کو منور کیا۔ (الحمدللہ)

''رنگ عید اور آپ'' جوابات اچھے تھے سب کے، زینب احمد سے ملاقات اچھی تھی ''دشت جنوں'' میں یقین کریں مجھے پہلے سے پچھلی قسط سے ہی شک ہو گیا کہ بدروح ''میڈم آئے کت'' ہے داد تو دیں ہمیں بھئی ہمارے اندازے پر؟ (ھی ھی ھی) حیا بخاری کا افسانہ ''تم آؤ میری عید ہو'' میں زبردست قسم کا سبق دیا گیا، چھوٹے سے افسانے میں بڑا سبق نہاں تھا ان لڑکیوں اور خواتین کے لیے جن کے ہاں فیس بک ٹویٹرز انٹرنیٹ کا بڑا ہی رواج آ چکا ہے۔ عندلیب زہرا کا افسانہ اچھا تھا۔ افشین نعیم ''اب کے برس کی عید'' میں بچوں نے اپنے امی ابو کو جس طریقے سے منوایا۔ دل کو گداز کر گیا۔ پیار آ گیا بچوں پر، قانتہ رابعہ ''دن زیست کے'' میں بہت ہی پیارا پیغام دے گئیں۔ قانتہ رابعہ کے افسانے سبق آموز ہوتے ہیں۔ امت العزیز شہزاد کی ''یہ شادی نہیں ہو سکتی'' نے خوب خوب ہنسایا سیاست دانوں پر تاک تاک کے وار کیے۔ اس دفعہ اس ماہ کا بیسٹ ناول، ٹاپ پر سمیرا حمید کا ''مہر میراں'' رہا۔ آپ لوگوں نے بے چاری کو کیوں زہر پلا دیا بھئی سمیرا حمید نے کیوں زہر پلوایا؟ اور ایک بات آپ لوگوں نے واضح نہیں کی مہر کا پورا واضح سین آپ لوگوں نے نہیں دکھایا کہ کب اور کہاں زہر دیا گیا نہ ہی ان رشتہ داروں کا دکھ درد دکھایا گیا کہ ان پر کیا گزری جو اس کو ہر وقت گانے اور راگ پر اکستائی رہتی تھیں؟؟؟ بہرحال میراں نے زبردست اینڈ کیا' بہت اچھے طریقے سے بہرام خود غرض کو سزا دی۔ ''حالم'' کے ۔ تو کیا کہنے زبردست ترین موڑ پر آ چکی ہے۔ نمرہ ویل ڈن جی! شازیہ جمال کی ''باحیا'' میں کمال کا سبق تھا بعض دفعہ ظالم لوگ ۔ مظلوم بن جاتے ہیں اور مظلوم کو ظالم بنا دیا جاتا ہے۔ زبردست اور آپ نے ''فریدہ گوہر'' کو مشورہ دیا ہے سمیرا حمید بن کر نہ لکھیں فریدہ بن کر لکھیں۔ جی میں تو ''شازیہ ستار'' بن کر لکھتی ہوں۔ باجی مجھے کراچی آنے کا بہت شوق ہے۔ مجھے بہت محبت ہے کراچی سے، شروع سے ہی ایک عجیب سی اٹریکشن محسوس ہوتی ہے مجھے۔ کراچی کے حالات اب ٹھیک ہو چکے ہیں ناں؟؟؟

ج: پیاری شازیہ! ہمیں اپنی تمام قارئین کا خط لکھنا، تبصرہ کرنا بہت اچھا لگتا ہے آپ دل برداشتہ نہ ہوں۔ آپ کے سروے کے جواب بہت اچھے تھے۔ پسند کیوں نہ آتے۔ سروے کی بہت بڑی تعداد ابھی ہمارے پاس محفوظ ہے زہر نہ سمیرا نے پلایا نہ ہم نے پلایا، زہر تو زیام منصور نے پلایا تھا زیام منصور ہر دور میں کسی نہ کسی نام سے موجود رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ نواز شریف حکومت میں جو اقدامات کیے گئے ۔ اس کے بعد کراچی کے حالات بالکل ٹھیک ہیں۔ آپ شوق سے کراچی آئیں۔ کراچی کا سمندر دیکھ کر آپ ایک ناقابل بیان سی کیفیت محسوس کریں

گی۔

سائرہ محمود، آمنہ اکرام، مہک ندیم......ظفروال

مئی کا شمارہ ہاتھ میں آتے ہی سرورق پر ماڈل کو دیکھا تو دل خوش ہوگیا۔ سب سے پہلے کرن کرن روشنی پڑھا۔ پھر آمنہ ریاض کے "دشت جنوں" پہ چھلانگ لگائی۔ نمرہ احمد مائی دی موسٹ فیورٹ رائٹر حالم تو چھا گیا۔ یہ ہمیں ملاکہ میں ہی پہنچا دیتا ہے۔ سمیرا حمید کا ناول بہت اچھا تھا۔ باقی شمارہ سارا ہی اچھا تھا۔

ج: پیاری سائرہ! خواتین کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔ ہمیں افسوس ہے کہ آپ کی کہانیاں شائع نہیں ہوسکتیں۔ آپ میں صلاحیت ہے آپ باقاعدہ کہانی بنا کر لکھیں۔ آپ نے جو لکھا ہے وہ محبت کے موضوع پر محض فلسفیانہ ہے۔

ناہید اسماعیل......کراچی

آپ سب کو عید کی ڈھیروں مبارکباد۔ آپی آپ نے جن الفاظ میں ہمارے تبصرے کا جواب دیا اس سے آپ پر ہمارا مان اور بھی کئی گنا بڑھ گیا حقیقت تو یہ ہے کہ یہ جو ہم چند لفظوں کو جوڑ کے کچھ جملے لکھ پاتے ہیں، اس کا سہرا بھی آپ اور آپ کے ان رسالوں کے سر ہی ہے ورنہ ہم کہاں اتنے قابل۔

اس بار ڈائجسٹ کھولتے ہی پہلا صفحہ کھلا "ایک سوال نامہ کا جواب نامہ" پڑھنا شروع کیا مسکراہٹ سے اور ختم ہوا کھلکھلاہٹ پر۔ پھر "حالم" کی طرف بڑھے اکثر کہانیاں ایسی ہوتی ہیں جنہیں پڑھتے ہوئے قاری آگے کے واقعات کا اندازہ لگانے میں کامیاب رہتے ہیں لیکن "حالم" وہ منفرد کہانی ہے جس میں آگے کا کچھ پتا نہیں چل رہا اور تجسس ہے کہ بڑھتا ہی جاتا ہے، کیا خوب لکھا نمرہ نے کہ "تخت و تاج کے لیے جنگیں لڑنے والے......محلوں میں رہنے والے......آخر میں کس مقام پہ آ کے روتے تھے؟ ایک دل تھا جو امیر غریب سب کا ایک ہی طرف دھڑکتا تھا......"

یعنی اس بار "تالیہ" میں حالم کے ساتھ ساتھ ایک ایسی لڑکی کی جھلک بھی نظر آئی جس کے کچھ خواب و خواہشات تو ضرور ہیں لیکن جو خودداری اور عزت نفس کی دولت سے مالا مال بھی ہے، بلاشبہ نمرہ احمد نے شاہکار تخلیق کیا ہے۔ "دشت جنوں" بھی فیصلہ کن موڑ پر ہے یہ قسط بھی بھرپور رہی، سومعاویہ نے آئے کت کو سزا دے ہی ڈالی تھی۔ افسانوں میں حیا بخاری کی تحریر اچھی رہی۔ ذرا عندلیب زہرا کو تو دیکھیں ننھی منی سی تحریر میں عورت کی پوری زندگی کو تین ادوار میں بیان کر کے جیسے دریا کو کوزے میں بند کر دیا۔ "اب کے برس" میں کوئی نئی بات نہیں لگی یوں لگا جیسے بچوں نے پرانی موویز بہت دیکھ رکھی تھیں۔

شازیہ جمال کا افسانہ بھی پسند آیا لیکن اختتام تھوڑا بڑھا کر لکھ دیتیں تو تشنگی نہ محسوس ہوتی۔ دلچسپ عنوان سے عزین امت العزیز کی تحریر "یہ شادی نہیں ہوسکتی" سیاسی پارٹیوں پر جملے بازی نے ماحول کو گل و گلزار بنا دیا، طنز و مزاح اور ہنستے مسکراتے رنگوں سے سجی تحریر بہت اچھی لگی۔ نگہت عبداللہ کی تحریر بھی اچھی رہی، ویسے ہماری بہن پوچھ رہی ہیں "ہائے داوے ایسے باس ملتے کہاں ہیں؟" "نسخہ ہائے وفا" کی پہلی قسط تو بہت اچھی لگی اب یہ جاننے کا تجسس ہے کہ آخر عظمیٰ پھپھو نے ایسا کیا کیا جو عرش سے فرش پر آ گئیں۔ پلیز زیادہ لمبا مت چلایئے گا۔ اب بات کریں گے اس ماہ کی بہترین تحریر "مہر میراں" کی، جس نے ہمیں اردگرد سے بالکل غافل کیا، کیا منفرد موضوع ہے اور کیا غضب لکھا سمیرا آپ نے کہ......

"دل کا کرب آنسوؤں سے دھل جائے تو یہ بھی بڑی نعمت ہے۔ زخموں کو دوا مل جاتی ہے، زخموں کو دعا لگ جاتی ہے......ناسور کو دوا ملے نہ دعا لگے......" بہرام اور زیام جیسے ایک ہی سکے کے دو رخ فیلڈ میں جو بھی ہو سیاست اور سازشیں ڈیڑھ صدی پہلے اور بعد بھی وہی ہیں، لیکن جیتنے والے جیت ہی جاتے ہیں، جیسے مہر اور میراں، ایک "مر" کے جیتی تو

دوسری ''جی'' کے۔

سمیرا الیبلک کا انٹرویو اچھا لگا۔ سروے پسند آیا۔ نفسیاتی الجھنیں میں تینوں بہنوں کی زندگیوں میں آسانی کی دعا کی۔ ہماری بہن کی ایک فرمائش ہے کہ پلیز نسیم آمنہ شاہ اور ہما کوکب بخاری کی پرانی تحریریں شائع کیجیے۔

ج: پیاری ناہید! اچھی چیز کی تعریف نہ کرنا بھی ہمارے نزدیک نا انصافی ہے۔ آپ کا تبصرہ ہمیشہ کی طرح جامع اور مکمل ہے۔

ایسے باس ہم نے بھی نہیں دیکھے۔ نگہت عبداللہ سے پوچھ کر بتائیں گے کہ کہاں ملتے ہیں۔ ویسے ہمارا خیال تو یہ ہے کہ ایسے باس صرف اور صرف کہانیوں میں ہی ملتے ہیں۔ آپ کی بہن کی فرمائش ضرور پوری کریں گے، کچھ کہانیاں واقعی اتنی اچھی ہوتی ہیں کہ ''قند مکرر'' کا لطف آتا ہے۔

سحر تبسم سحری...... مغل پورہ

عید نمبر کے حوالے سے ٹائٹل اے ون تھا۔ ''کہی سنی'' عید کا مفہوم زبردست اگر لوگ سمجھیں تو ''کرن کرن روشنی'' سبحان اللہ، ''ایک سوال نامہ'' انشا جی کا لکھا ہمیشہ عمدہ رہا لیکن آپ پہلے ان کی شاعری دیا کرتے تھے وہ زیادہ لاجواب ہوتی تھی۔

''میری ڈائری سے'' نمرہ اقرا اور رضوانہ کی شاعری میرے دل کے حال جیسی تھی...... زینب احمد کا انٹرویو خوب رہا پلیز شاہین رشید باجی انٹرویو دے دیں۔ پلیز پلیز۔ انٹرویو ''رنگ عید اور آپ'' اقرا جٹ اور فریدہ رحیم کے جوابات اچھے تھے۔ ''حالم'' نمرہ کی کیا تعریف کریں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ سمیرا احمد کی میں نے تعریف نہیں کرنی ہے۔ وہ بہت بہت آگے ہیں آپ سمجھ جاؤ۔ نعیمہ ناز کیا واقعی آپ قسط وار لکھ رہی ہیں؟ شکر ہے آپ ہر ماہ پڑھنے کو ملے گا۔ نگہت عبداللہ کا ناولٹ اچھا تھا۔ امت العزیز کی تحریر میں نے اپنی چھوٹی بہن کو پڑھنے کو کہا۔ اسے پسند آئی اسے مطالعہ کا شوق نہیں ہے۔ افسانے میں حیا بخاری ہمیشہ افسانے پہ ٹرخا دیتی ہیں ناول کیوں نہیں لکھتیں ہیں؟ عندلیب اور قانتہ، شازیہ کی تحاریریں بھی اچھی تھیں افشین! تم افسانے بہت اچھے لکھتی ہو افسانے ہی لکھا کرو (آہم) رنگا رنگ سلسلہ میں کنیز، نمرہ، نوال، عذرا، نادیہ اور آسیہ ونڈرفل، عید کے پکوان لاجواب ''الجھنیں'' پیاری حجاب تم بالکل اپنی محبت سے شادی کرو کیونکہ آج کل کے زمانے میں تو نیکی کوئی یاد نہیں رکھتا اور نفیسہ تم اپنے ابو کا خیال کرو وہ بیمار ہیں انہیں تمہاری ضرورت ہے، باپ کی کمی کوئی مجھ سے پوچھے میں چار سال کی تھی جب بابا چلے گئے! ''آپ کی بیاض سے'' میں ہما فاروق، شبانہ، میمونہ، سدرہ، نجمہ اکرم لاجواب، اس دفعہ فوزیہ ثمر اور کوثر خالد کی کمی رہی۔

ج: پیاری تبسم! باپ سائبان ہوتا ہے اس کا وجود تحفظ اور عافیت ہوتا ہے لیکن باپ اپنے فرائض کو نہ سمجھے تو اسے کیا کہا جائے۔ نفیسہ صدیقی کا معاملہ مختلف ہے ان کی سوتیلی ماں انہیں گھر میں رکھنے پر تیار نہیں تو پھر وہ باپ کا خیال کیسے رکھیں۔

اعتذار

اس ماہ آمنہ ریاض کے ناول ''دشت جنوں'' کی آخری قسط آنا تھی۔ آخری قسط میں ناول کے تمام کرداروں کو انجام تک پہنچانا اور واقعات کو سمیٹنا ہوتا ہے تاکہ کوئی پہلو تشنہ نہ رہ جائے۔ اس لیے آمنہ ریاض اس ماہ قسط نہ لکھ سکیں۔

ان شاءاللہ آئندہ ماہ ''دشت جنوں'' کی آخری قسط شامل ہوگی۔

شاہین رشید کسی صورت انٹرویو دینے پر آمادہ نہیں ہم ان تک آپ کی فرمائش پہنچا رہے ہیں۔
خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

ارم ربانی......سوہدرہ تحصیل وزیرآباد

کتنے خوش قسمت ہوتے ہیں وہ لوگ جو ہاتھ بڑھاتے ہیں اور ان کا ہاتھ تھام لیا جاتا ہے۔ پہلی دفعہ آپ کی محفل میں شرکت کی اور آپ نے میرا ہاتھ تھام کر جو حوصلہ افزائی فرمائی ہے۔ وہ میری خوش قسمتی ہے۔ خواتین میرا بچپن کا ساتھی ہے، بڑھاپے میں بھی ساتھ ہے، لیکن کبھی اس میں شرکت اس نظریہ پر نہیں کی کہ میں کسی کہانی پر تبصرہ کروں یا ڈائجسٹ کی تعریف و تنقید کروں کیونکہ تخلیق جیسی بھی ہو کسی کی امید ہوتی ہے۔ اس لیے میرے نزدیک ہر رائٹر بہتر سے بہتر کوشش کر رہی ہے۔

ج: ارم بہن! خواتین آپ کے بچپن کا ساتھی ہے تو یقیناً آپ کی عمر ایسی نہیں کہ آپ کو بوڑھا کہا جا سکے۔ ویسے بھی دل جوان ہونا چاہیے۔ یوں تو خواتین کے ساتھ آپ کا اتنا طویل تعلق ہی اپنی جگہ ایک جامع تبصرہ ہے لیکن کیا ہی اچھا ہوتا کہ آپ کہانیوں کے بارے میں بھی اظہار خیال کرتیں۔ تنقید کا مطلب حوصلہ شکنی نہیں اصلاح بھی مقصود ہو سکتی ہے۔ لکھنے والے کو پتا ہونا چاہیے کہ اس کی تحریر میں کیا کمی یا خامی ہے تاکہ وہ اپنی اصلاح کر سکے۔

اقراعزیز جلبانی......دریاخان جلبانی

خواتین وقت پر نہیں ملتا۔ روٹھے ہوئے محبوب کی طرح اس کا انتظار کرنا پڑتا ہے اس دفعہ بھی تبصرے سے پہلے میں سائرہ رضا کو مبارک باد پیش کرتی ہوں حسن المآب سے بہت کچھ سیکھا۔ حلیمہ جیسے لوگ میرے آس پاس رہتے ہیں، پر افسوس ہم ان کو کچھ کہہ نہیں سکتے کیونکہ ان کے پاس ہر دلیل ہوتی ہے اپنے لیے گنجائش نکال لیتے ہیں۔ دوسری وجہ یہ کہ ہر پرچا ہمارا ہے ہم سب قاری دوست کی طرح ہیں سو ایک بات میں آپ سے شیئر کرنا چاہتی ہوں وہ یہ کے میں نے مسلسل دو راتیں اقراجٹ، انیلا طالب اور مہوش طالب کے نام سنے جیسے کوئی بار بار ان کے نام کی گردان کر رہا ہو۔ اب اقرا اور انیلا کو تو بحیثیت قاری کے میں جانتی ہوں یہ مہوش طالب پتا نہیں کون ہیں خیر میں نے ان کے لیے دل سے خیر و سلامتی کی دعائیں مانگی تھی اب پلیز کوئی بھی بہن یہ نہ سمجھے کہ میں پالیہ بننے کی کوشش کر رہی ہوں یا کچھ اور بس جو بات تھی شیئر کی۔ ماڈل بہت ہی پیاری تھی سب سے پہلے "حالم" پڑھا۔ اس ناول کا نام حالم کے بجائے وقت کے قیدی ہونا چاہیے تھا۔ نمرہ کے ہر ناول سے ہم بہت کچھ سیکھتے ہیں "حکم اذن" وہی پرانا گھسا پٹا موضوع خاص متاثر نہیں کیا۔ نعیمہ ناز میں کیا کہوں کاوش بے سود کے بارے میں؟ عثمان کے کردار نے تو مانو رُلا ہی دیا۔ بہت ہی پیارا ناول تھا یہ جالب اپنے حبیب جالب ہی تھے نا؟ افسانوں میں سمیرا حمید آئیں اور چھا گئیں ہمیشہ نئے انداز نئے موضوع کے ساتھ قیافہ شناس تو پڑھا تھا یہ ردا تو سوچ شناس نکلی خیر دنیا عجائب گھر ہے یہاں سب ممکن ہے۔ قدرت کے شاہکار ہر جگہ موجود ہیں۔ قرۃ العین خرم ایک "دھی چھوٹی" اچھا لگا اب کچھ نئے انداز نئے ٹاپک پہ لکھیں "وحشت جنوں" آیو شمتی آخر ظاہر ہو ہی گئی (ابھی اینڈ رہتا ہے) یہ سلیپ پیرالیس کا کوئی حل ہے؟ کیونکہ یہ میرے ساتھ بھی دو تین دفعہ ہوا ہے اور یہ کیوں ہوتا ہے؟

آخر میں ایک سوال ہے آپ سے یہ نمرہ اقراء خط کیوں نہیں لکھتیں باقی تو ہر سلسلے میں شرکت کرتی ہیں بنت سحر، کنیز نبوی میں ہر ماہ آپ کی تحاریر کا انتظار کرتی ہوں۔ انیقہ انا نسبت زہرہ کہاں گم ہو۔

ج: پیاری اقرا! پلین کیک کی ترکیب اس ماہ شعاع میں شامل ہے۔ آپ نے ان ناموں کی گردان بار بار سنی تو اس سے پریشان نہ ہوں، خواتین ڈائجسٹ میں یہ نام اکثر و بیشتر آپ کی نظر سے

گزرتے ہیں۔ تو آپ کے لاشعور کا حصہ بن جاتے ہیں۔

خواتین ڈائجسٹ لیٹ ملتا ہے یہ شکایت ہماری دیگر قارئین کو بھی ہے۔ انتظار تو ہمیشہ ہی مشکل ہوتا ہے لیکن محبوب کا انتظار تو کچھ زیادہ ہی جان گسل ہوتا ہے۔ خیر کوشش کر رہے ہیں کہ آپ کو خواتین انتظار کی کوفت سے گزرے بغیر وقت پر مل جایا کرے۔

سیمی خان......بنوں

میں نہیں جانتی کہ خط وہ بھی اتنے بڑے ادارے کو کیسے لکھتے ہیں۔ مجھے تو بس جو اپنائیت اور محبت و تربیت ملی ہے اس ادارے سے اس کی بنا پر اپنے دل کی آواز پر آپ کو یہ لیٹر لکھ رہی ہوں۔

میں نے ڈائجسٹ کی وجہ سے بہت مار اور بے عزتی کھائی ہے کیونکہ ابا ____ پہلے نہیں پڑھنے دیتے تھے۔ اب وہ کچھ نہیں کہتے تو مزہ ہی نہیں آتا ڈائجسٹ کے سب سلسلے بہت پسند ہیں شاہین رشید سے ایک گزارش ہے کہ مغرور اور نک چڑھے لوگوں کا انٹرویو کرنے کے بجائے ہم جیسی سیدھی اور معصوم بچیوں کا کرلیا کریں انٹرویو۔

کوثر خالد، ثمینہ اکرام، ثریا شاہ اور وہ جو آپ کو خط لکھتی تھی۔ پہلے مجھے اس کا نام یاد نہیں آرہا اب وہ خط کیوں نہیں لکھتی "بنوسی" ہے وہ "بنوسیوں" جاگ جاؤ پلیز خط لکھا کرو میں آپ کو بنوں کے ایک بہت ہی پیارے اور سرسبز گاؤں سے خط لکھ رہی ہوں۔

ج: پیاری سیمی! سادہ الفاظ اور خلوص دل سے لکھی ہوئی تحریر میں جو لطف ہے وہ بھاری بھر کم مشکل الفاظ میں کہاں۔ آپ نے بنوں کے ایک گاؤں سے خط لکھا۔ ہمارے لیے یہ ہی بڑی بات ہے۔ آئندہ بھی لکھتی رہیں۔ ہمیں خوشی ہوگی۔ کہانیوں کے لیے، ابھی مزید آپ کو محنت کی ضرورت ہے۔

ابا کچھ نہیں کہتے تو پڑھنے میں مزا ہی نہیں آتا پڑھ کر اس محاورے پر یقین آگیا کہ چوری کے بیر زیادہ میٹھے ہوتے ہیں۔

ایمان کنول......چکوال

خواتین اور شعاع سب سے معیاری پرچے ہیں۔ مجھے کتابیں پڑھنے کا بہت شوق ہے۔ گھر میں ڈائجسٹ پڑھنے کی اجازت نہیں ملتی۔ پچھلی دفعہ میں نے بہت ضد کر کے اپریل اور مئی 2017ء میں خواتین پڑھے۔ اس میں حسن المآب مجھے بہت پسند آئی مگر بعد میں یہ سلسلہ پڑھائی کی وجہ سے رک گیا۔ پلیز اس کی آخری قسط کا شمارے کا مہینہ اور سال بتا دیں۔ اس دفعہ شمارہ بہت اچھا تھا اور اس کی ساری کہانیاں ابھی بہت اچھی تھیں۔ تمام افسانے، ناولٹ اور ناول اچھے تھے۔ مجھے سب سے زیادہ سمیرا حمید کا ناول ٹیولپ پسند آیا۔ ابوبکر کی بے بسی نے آنکھیں نم

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے
بہنوں کے لیے خوب صورت ناولز

ملال زیست	آمنہ ریاض	300/-
بڑا آدمی	نسیم سحر قریشی	400/-
فصل غم کا گوشوارہ	رضیہ جمیل	300/-
دل اک گلشن	رضیہ جمیل	300/-
سوچ نگر کی رانی	رضیہ جمیل	350/-
حنا	نادرہ خاتون	550/-
چلمن	نادرہ خاتون	300/-

مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37 [illegible] 32216361

کر دیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ میں بھی معذور ہوں۔ اور اس لفظ سے مجھے سخت چڑ ہے۔ مگر بعد میں یہ سوچا اور اللہ کا شکر ادا کیا کہ میں تو بہت بہتر ہوں۔ اگرچہ مجھے محتاجی کا سامنا کرنا پڑتا ہے مگر پھر بھی کسی کو میرے منہ میں نوالہ نہیں ڈالنا پڑتا ہے۔ قارئین سے التماس ہے کہ میری صحت کے لیے دعا کریں۔

ج: پیاری ایمان! اللہ تعالیٰ آپ کو صحت دے۔ ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ آپ کی ہمت اور جذبہ قابل تحسین ہے کہ آپ نے معذوری کو مجبوری نہیں بنایا۔ حسن الماآب کی آخری قسط جنوری 2018ء میں شائع ہوئی تھی۔

فضہ یوسف...... بھاول پور

میری عمر 15 سال ہے۔ میٹرک کے پیپرز دیے ہیں۔ سرورق پہ ماڈل کی آنکھیں بہت اچھی لگیں۔ نمرہ احمد، سمیرا احمد اور نایاب جیلانی مجھے بہت پسند ہیں۔ سمیرا آپی کا طرز تحریر اور جملوں کی پختگی کی میں داد دیے بغیر نہیں رہ سکتی۔ نمرہ آپی آپ کا حالم زبردست ہے۔ مجھے وان فاتح اور ان کی بیٹی کا کردار پسند ہے۔ نایاب آپی! آپ کے ناول وہ اک لمحہ، چاند رات اور سرخ گلابوں پہ شبنم پڑھ کر تو میں بھی آپ کی فین ہوگئی۔

دشت جنوں میں آمنہ آپی کمال کا لکھ رہی ہیں مگر آمنہ آپی! آئے کت کا مطلب کیا ہے۔ یہ مسلمانوں والا نام نہیں لگتا نہ ہی پہلے کبھی سنا ہے۔ خبریں وبریں میں واصفہ آپی ہاتھ ہولا رکھا کریں پلیز۔

اپیا! مجھے رسالے کی صحیح تاریخ کا نہیں پتا۔ مجھے بتایئے یہ کب آتا ہے پلیز۔ میں شاعری بھی کر لیتی ہوں اور دو ناول بھی لکھ کر رکھے ہیں۔ بھیجتی اس لیے نہیں کہ اگر شائع نہ ہوئے تو بے عزتی ہو جائے گی میری۔ میری ایک ریکویسٹ ہے اگر آپ مان لیں تو۔ پلیز میں بہت مان سے کہہ رہی ہوں۔ F.M 107 کے آر جے ساحر لودھی کا انٹرویو شائع کر دیں پوری تفصیل سے۔

میرے گھر ٹی وی نہیں سو میں ٹی وی پہ شو بھی نہیں دیکھ سکتی۔ جو تھوڑی سی عقل میں نے سیکھی ہے وہ اس رسالے سے سیکھی ہے۔ میری مما، خالہ، میری کزنز اور گاؤں کی (جہاں سے چھٹیاں گزار کر واپس آئی ہوں) ساری لڑکیاں خواتین اور شعاع پڑھتی ہیں۔

ج: پیاری فضہ! تھوڑی تو نہیں اچھی خاصی عقل سیکھ لی ہے تب ہی تو شاعری نہیں بھیجی شاباش۔ پہلے دل لگا کر تعلیم حاصل کرو ان جھمیلوں میں بعد میں پڑنا۔ ٹائٹل گرل اتنی محنت سے تیار ہوئی تھی آپ نے شاعروں کی طرح صرف آنکھوں کی تعریف کر دی۔ یہ تو زیادتی ہے۔ آئے کت چودھویں کے چاند کو کہتے ہیں اتنی دفعہ تو بتایا ہے اس کا مطلب، اب تو یاد ہو جانا چاہیے تھا۔

خواتین ڈائجسٹ
کی طرف سے
بہنوں کیلئے خوبصورت ناول
یہ گلیاں یہ چوبارے
فائزہ افتخار
قیمت -/400 روپے
منگوانے کا پتہ:
مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37، اردو بازار، کراچی
فون نمبر:
32735021

ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے پرچوں ماہنامہ شعاع اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ٹی وی چینل پہ ڈراما، ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

خبریں وبریں

واصفہ سہیل

بادشاہ

ان دنوں ہر طرف آم کی بہار ہے۔ مختلف قسم کے آم مختلف ناموں سے بازار میں نظر آرہے ہیں۔ اس پھل میں مزے کے ساتھ ساتھ بہت سے طبی فوائد بھی ہیں۔ مثلاً آم میں موجود اینٹی آکسیڈنٹ مرکبات ہمیں بریسٹ کینسر، پروسٹیٹ اور بلڈ کینسر سے محفوظ رکھتے ہیں۔ اس کے پتے ابال کر پینے سے ذیابیطس کے مریضوں میں انسولین کی سطح مناسب رہتی ہے۔ حال ہی میں کی گئی تحقیق کے مطابق نظام ہضم کی خرابیوں کو دور کرنے میں جتنا فائدہ آم کھانے سے ہوسکتا ہے اتنا کسی اور پھل سے نہیں ہوتا (جب ہی تو اسے پھلوں کا بادشاہ کہا جاتا ہے) اس میں ریشے یا فائبر کے ساتھ ایسے غذائیت بخش اجزاء ہوتے ہیں جو قبض کو دور کرنے میں اور آنتوں کی سوزش ختم کرنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ یہ فوائد اسپغول اور دیگر ریشے والی دواؤں سے بھی حاصل نہیں ہوتے۔

شکر

پاکستان میں بہوویں اس بات پر شاکی رہتی ہیں کہ انہیں سسرالی ماحول اور روایات کو اپنانا پڑتا ہے۔ لیکن یہ صرف مشرق میں ہی نہیں ہوتا بلکہ برطانیہ میں بھی بہو کو سسرال کے طور طریقے اپنانے پڑتے ہیں۔ اب یہی دیکھ لیں کہ سابق امریکی اداکارہ میگن مرکل جو برطانوی شہزادے ہیری سے شادی کے بعد اب شاہی خاندان کی بہو ہے۔ اسے اب شاہی خاندان کا ہر حکم ماننا لازمی ہے۔ شاہی روایات کے مطابق میگن کو اس بات کا پابند کیا گیا ہے کہ وہ گھر سے باہر جاتے ہوئے یا کسی بھی تقریب میں شرکت کے وقت شاہی خاندان کا لباس اپنائیں گی۔ میگن کو شاہی خاندان کی دیگر خواتین کی طرح سر

پر ہیٹ پہننے کی ہدایت کی گئی ہے۔

انہیں اس بات کی بھی تاکید کی گئی کہ وہ زیادہ سے زیادہ فلاحی کاموں میں حصہ لیں۔ حد تو یہ ہے کہ شادی سے قبل ہی میگن مرکل کو شاہی روایات اور آداب سکھانے کے لیے تربیتی کلاسز لینا پڑیں (شکر کریں جی! ہمارے یہاں یہ نہیں ہوتا، کیوں کہ اگر یہاں بھی شادی سے پہلے کلاسز ہوں سسرال میں رہنے کی تو......؟)

اعتراف

صحیفہ جبار (تیری میری کہانی کی ہیروئن) کا کہنا ہے کہ ''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں ان ماؤں، بیٹیوں یا بیویوں کو کیا مشورہ دوں جو مجھے بتاتی ہیں کہ انہیں خودکشی کرنے کے خیالات آتے ہیں یا وہ اندر سے خوشی محسوس نہیں کرتیں۔ ان کے گھر والے انہیں نہیں سمجھتے اور وہ خود کو نقصان پہنچانا چاہتی ہیں یا کہیں

بھاگ جانا چاہتی ہیں۔"

آج پہلی بار میں ان کے سامنے یہ اعتراف کرنا چاہتی ہوں کہ مجھے اینگزائٹی کی بیماری ہے۔ مجھے بھی خودکشی کے خیالات آتے ہیں جب کہ میں انتہائی خوش نصیب ہوں کہ مجھے بہترین شوہر، والدین اور سسرال ملا۔ میں اپنی پروفیشنل اور نجی زندگی میں کامیاب ہوں پھر بھی مجھے کبھی کبھی لگتا ہے کہ میں اندر سے ادھوری ہوں۔ جن لوگوں کو ایسے خیالات آتے ہیں میں ان سے کہنا چاہتی ہوں کہ گھبرائیں نہیں۔ ایک دن سب ٹھیک ہو جائے گا پھر ہم راتوں کو نہیں جاگیں گے۔

اجازت

مہوش حیات بہت جلد بے نظیر بھٹو کا کردار ادا کرتی نظر آئیں گی۔ بے نظیر بھٹو کی زندگی پر بنائی جانے والی فلم کے بارے میں مہوش حیات کا کہنا ہے کہ انہوں نے کبھی سیاست میں دلچسپی نہیں لی۔ البتہ وہ اس بات کو نظر انداز نہیں کر سکتیں کہ بے نظیر نے مردوں کے معاشرے میں خواتین کے لیے جدوجہد کی۔ مہوش حیات نے بتایا کہ بہت جلد اس فلم پر کام شروع ہوگا (کون کرے گا..... بھئی کام شروع؟)

اُدھر بے نظیر بھٹو کی بیٹی بختاور زرداری نے کہا ہے کہ اگر ایسی کسی فلم پر کام ہو رہا ہے تو اس کی اجازت ان کے وارثوں یا بچوں سے نہیں لی گئی ہے۔ اور یہ بات ان کے لیے مکمل طور پر ناقابل برداشت ہے۔ ہم اس کے خلاف قانونی ایکشن لیں گے۔

صدمہ

ڈراما سیریل "سایہ" کے ہیرو اداکار سہیل سمیر کا کہنا ہے کہ "ہمارے یہاں سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ آپ کس چینل کے اداکار ہیں۔ اس سے بڑی ہماری توہین کیا ہوگی۔ ایکٹر ایکٹر ہوتا ہے، یہ نہیں کہ آپ فلاں فلاں چینل کے ایکٹر ہیں (اچھی اداکاری اپنا آپ منوا ہی لیتی ہے جناب) یہ تو ایکٹر کی موت ہے۔ (ہاں جی بات تو ٹھیک ہے) میں صرف کام کرنا چاہتا ہوں۔ اچھا کام کرنا چاہتا ہوں (تو آپ کام کر تو رہے ہیں۔) کام کی کمی نہیں ہے (تو پھر......؟) اچھے کام کی کمی ہے (یہ اچھا اور برا کام کیا ہوتا ہے جی......!) ٹیلنٹ کی کمی بھی نہیں ہے۔ سب اچھا کام کر رہے ہیں (کون سب......؟) کاسٹنگ کے وقت یہ دیکھ لیا جائے کہ اداکار اس کردار کے لیے موزوں

ہے کہ نہیں" (یعنی آپ اپنے کام سے مطمئن نہیں ہیں......؟)

تبدیلی

سونیا حسن معاشرے میں خواتین کے ساتھ ہونے والے ناروا سلوک کے بارے میں کہتی ہیں کہ مائیں، بہنیں، بیٹیاں اور بیویاں ہمارے معاشرے کا اہم حصہ ہیں۔ ان کا احترام کرنا سب سے زیادہ ضروری ہے۔ میں چاہتی ہوں ہمارے ملک میں ایسا قانون بنے جہاں مجرم اس قسم کے جرائم کرنے سے قبل ان کی خطرناک سزاؤں سے ڈریں۔ میں نے بہت سی خواتین کو مردوں کے ہاتھوں ہراساں ہوتے دیکھا ہے۔ (سب ہی دیکھتے ہیں سونیا! پر عمل......؟) میں چاہتی ہوں کہ تبدیلی آئے (تبدیلی صرف کہنے سے نہیں آتی سونیا! سوچ کو بدلنا ہوگا) تبدیلی آئے گی تو خواتین آزادی سے گھوم سکیں گی جب انہیں کسی قسم کا ڈر نہ ہوگا نہ کوئی ان پر الزام لگایا جائے گا۔ (سونیا! اس

تبدیلی کے لیے خواتین کو اپنے طرز عمل میں تبدیلی لانا پڑے گی۔ اپنے بیٹوں، بھائیوں کی سوچ کو بدل کر انہیں ماں بہن بیٹی کے بجائے عورت کی عزت کرنا سکھانا ہوگا۔ تب ہی تبدیلی آئے گی ورنہ......؟)

☆☆☆

کچھ ادھر اُدھر سے

☆ 2013ء میں تمام سیاسی ہنگاموں کے باوجود آئندہ حکومت میں سیاسی استحکام کی امید موجود تھی۔ بدقسمتی سے 2018ء کے انتخابات کی طرف بڑھتے ہوئے یہ خوش فہمی دور ہو چکی ہے۔

(وجاہت مسعود......تیشۂ نظر)

☆ جب ڈاکٹر کہتا ہے کہ اچھی خبر یہی ہے کہ کوئی بری خبر نہیں تو اس کا کیا مطلب ہوتا ہے جب اس جاں کنی کے عالم میں انفیکشن ہونے کی اطلاع ملتی ہے تو اہل خانہ پر کیا گزرتی ہے۔ نواز شریف اور ان کے بچے اس وقت جس کیفیت سے گزر رہے ہوں گے، اس الم کو صرف وہی جان سکتے ہیں۔ ہماری مذہبی قومی اور اخلاقی روایات یہ سکھاتی ہیں کہ اس لمحے کا احترام لازم ہے۔ اس مرحلے پر دل جوئی فرض ہے۔

(عمار مسعود......آپ)

☆☆☆

☆ 2013ء کے انتخابات کے نتیجے میں جو حکومت سامنے آئی اس نے توقعات کے برعکس سابق فوجی آمر پرویز مشرف پر آئین کے آرٹیکل چھ کے تحت مقدمہ چلانے کا اعلان کردیا۔ 2013ء کے موسم خزاں میں سامنے آنے والے اس قضیے کے بعد مسلم لیگ (ن) کی حکومت زمین پر پاؤں نہیں جما سکی۔

(وجاہت مسعود...... تیشۂ نظر)

سرورق کی شخصیت

ماڈل ---- اریج خان

میک اپ ---- روز بیوٹی پارلر

فوٹو گرافی ---- موسیٰ رضا

آپ کا باورچی خانہ

فرزانہ انصاری

میں ایک ہاؤس وائف ہوں۔ میری شادی کو چھ سال ہو چکے ہیں اور الحمدللہ پانچ سال کا میرا بیٹا ہے۔

شادی سے پہلے بھی کچن کی ذمہ داری مجھ پر تھی اور شادی کے بعد تو ہر لڑکی پر کچن کی ذمہ داری آ جاتی ہے۔ میرا کچن میں جانا بھی ایک عجیب واقعے سے ہوا۔

ہمارے ہاں عام طور پر پانچویں جماعت کے بعد سے ہی تھوڑا بہت کام کروانا شروع کر دیتے ہیں تو چھٹی کلاس سے شام کو پورے گھر کی صفائی، دوپہر کے ڈھیروں کھانے کے برتن اور شام کی چائے کی ذمہ داری مجھ پر تھی۔ حالانکہ اس وقت ہمارے گھر میں چار بھابھیاں اور تین بہنیں غیر شادی شدہ تھیں' اس کے باوجود امی نے بچپن سے ہی کام کرنے کی عادت ڈالی۔

جب میں میٹرک کے پیپر دے کر فارغ ہوئی تو مجھے میری بڑی بہن' بھانجی اپنے دادا کے چہلم میں شرکت کے لیے نواب شاہ لے گئیں۔ اب میری بھانجی ناہید (جو مجھ سے دو سال بڑی ہے) روٹیاں پکانے بیٹھی تو مجھے بھی ساتھ بٹھا لیا۔ ''چلو دونوں روٹیاں پکاتے ہیں۔''

مجھے تو آٹا بھی گوندھنا نہیں آتا تھا۔ اب گھر مہمانوں سے بھرا ہوا' میں پیڑہ بنانے کی کوشش کرنے لگی تو مجھ سے بن ہی نہیں رہا۔ (اس سے پہلے کبھی کچھ پکایا نہیں تھا سوائے چائے کے) یقین جانیں اس قدر شرمندگی ہوئی کہ میں بتا نہیں سکتی۔ بس پھر تو میں نے عہد کر لیا اب بس کھانا بنانا سیکھنا ہے۔

اتفاق کی بات بھابھیاں علیحدہ ہو گئیں' میری دو بہنوں کی شادیاں ہو گئیں۔ ایک بہن کو ٹائیفائیڈ ہو گیا۔ بڑی بھابی جو کہ ہمارے ساتھ تھیں' ان سے امی کھانا نہیں پکواتی تھیں (وہ ہائی بلڈ پریشر کی مریضہ تھیں اور گرمی سے ان کی حالت خراب ہو جاتی تھی) تو جب سے میں نے بنانا شروع کیا۔

امی بتاتی رہتی تھیں' میں پکاتی تھی اور الحمدللہ ایک سال میں ہی میرے پکائے ہوئے کھانوں کی ہر جگہ تعریف ہونے لگی۔ دعوتوں تک کا کھانا بنانے لگی تھی۔ سوائے بریانی کے، بریانی آج تک مجھے ڈھنگ کی بنانی نہیں آئی۔ سالن بنوا لیں جو دل چاہے۔

بریانی اور کھیر میری بڑی بہن ہی بناتی تھیں۔ میں کہتی مجھے کھیر تو بنانا سکھا دیں۔ شادی کے بعد سب سے پہلے کھیر میں ہاتھ ہی لگتا ہے اور اس چیز سے میں بہت ڈرتی تھی۔

پہلی مرتبہ میں نے کھیر شادی کے بعد ربیع الاول میں بنائی (میری شادی عید کے بعد ہوئی تھی) میری بہن فون پر گائیڈ کر رہی تھیں (وہ حیدرآباد میں رہتی ہیں) آپ یقین کریں جب سب کو بھجوائی تو کوئی یقین نہیں کر رہا تھا کہ میں نے پہلی مرتبہ بنائی ہے۔ سب کہہ رہے تھے ضرور تم نے کھویا وغیرہ ڈالا ہے جبکہ میں نے صرف اور صرف خالص دودھ کی بنائی تھی بنا پانی ڈالے۔

س: کھانا پکاتے ہوئے آپ کن باتوں کا خیال رکھتی ہیں؟

ج: شادی سے پہلے تو امی کا حکم اور میرے بھتیجے کی فرمائش چلتی تھی۔ تو جو ان دونوں کی پسند ہوتی' وہی پکتا تھا۔ یہ محاورہ تو مشہور ہے ہی کہ ''مرد کے دل کا راستہ معدے سے ہو کر گزرتا ہے'' اور اس میں کوئی شک بھی نہیں ہے۔ تو کھانا پکاتے وقت ان کی پسند ناپسند کا بھرپور دھیان رکھتی ہوں۔ جو انہیں پسند ہو وہی پکاتی ہوں۔ غذائیت ان کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ یہ

گوشت خور ہیں، ان کا بس چلے تو روز گوشت پکوائیں۔ (مگر آج کے دور میں روز گوشت پکانا مڈل کلاس کے لیے ناممکن سا ہے) تو پھر ہفتہ وار مینیو میں ایک دن گوشت کی کوئی بھی ڈش، دوسرے دن دال یا سبزی تیسرے دن پھر گوشت اور اس سے اگلے دن دال سبزی تو اسی طرح روٹین چل رہی ہے۔

کبھی نہیں بھی موڈ ہوتا تو نہیں پکاتی (یہ اور بات ہے کہ بعد میں پچھتاتی ہوں، باہر کا کھانا بہت مہنگا پڑتا ہے۔) میرے شوہر ماشاء اللہ اچھا کھانا کھانے کے بے حد شوقین ہیں۔ تو اس وجہ سے بجٹ بھی اپ سیٹ ہوتا رہتا ہے۔

س: کھانے کا وقت ہے، اچانک مہمان آجائیں، کسی ایسی ڈش کی ترکیب جو فوری طور پر تیار ہو سکے؟

ج: شادی سے پہلے تو ہمارا گھر ہر وقت کے مہمانوں سے بھرا رہتا تھا۔ مسلسل دوسرے شہروں سے آنے والے مہمان بھی ٹھہرے ہوتے تھے۔ ہماری امی ابو کے رشتہ دار حیدر آباد، نواب شاہ، سکھر، ملتان، شجاع آباد، لاہور، اسلام آباد (یہاں تک تو ہم گئے ہیں شادی سے پہلے) اور نجانے کہاں کہاں سے آ کر رہتے تھے۔ آج سے بیس سال پہلے جب بھی کوئی رشتہ دار آتا ہمارے ہاں ہی ٹھہرتا تھا (یہ اس وقت کی بات ہے جب والد صاحب حیات تھے اور کام کرتے تھے) ہمارے گھر سے کوئی بنا کھائے نہیں جا سکتا تھا۔ (چاہے اگلے کو بھوک ہی نہ ہو) امی ابو کی مہمان نوازی بے مثل تھی۔

اس وقت سادگی بھی بہت تھی۔ دکھاوا نہیں تھا۔ گھر میں جو کچھ بھی تازہ بنا ہوا ہوتا وہی مہمان کے آگے پیش کر دیا جاتا تھا۔ زیادہ ہوا تو سویوں کا زردہ بنا لیا (جو جلدی سے بن جاتا تھا) امی نے ہمیں بھی یہی سکھایا۔ کسی مہمان کو سوکھے منہ نہیں ٹرخانا، گھر میں جو کچھ بھی پکا ہوا ہے وہی پیش کر دو۔ (تازہ تازہ) اور اگر کچھ نہیں پکا ہوا ہوتا (کبھی موڈ نہیں ہوتا) تو سب کی طرح میں بھی چکن کڑاہی ہی بناتی ہوں۔

میں کبھی گوشت فریز کر کے نہیں رکھتی۔ اللہ کا شکر ہے، گلی سے نکلتے ہی کھانے پینے کا بازار ہے تو فوراً ان سے گوشت وغیرہ منگوا لیتی ہوں۔ باقی سامان تو گھر میں ہوتا ہی ہے۔ میری چکن کڑاہی میں میری دو چیزیں اپنی شامل کردہ ہیں۔ ایک تو چھوٹی ہری مرچ اور دوسرا لیموں کا رس، ترکیب حاضر ہے۔

چکن کڑاہی

مرغی کا گوشت	آدھا کلو (دھو کر رکھ لیں)
ٹماٹر	ڈیڑھ پاؤ (چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں کاٹ لیں)
چھوٹی ہری مرچ	چار سے چھ عدد (لمبائی میں دو ٹکڑے کاٹ لیں ٹماٹر کے ساتھ)
پسا ہوا ادرک لہسن	دو بڑے کھانے کے چمچے
تیل	آدھا پاؤ سے تھوڑا زیادہ
زیرہ	ایک چھوٹا چائے کا چمچ
چکن کڑاہی مسالا	دو کھانے کے بڑے چمچے
کٹی ہوئی لال مرچ	ایک چھوٹا چائے کا چمچہ
نمک	حسب ضرورت (میں ایک بڑا چمچ استعمال کرتی ہوں)
بڑی ہری مرچ	تین سے چار عدد (سجاوٹ کے لیے)
ادرک	تھوڑی سی باریک کٹی ہوئی (سجاوٹ کے لیے)
لیموں	ایک بڑے سائز کا

سب سے پہلے ایک پتیلی میں تیل گرم کر کے زیرہ، لہسن ادرک پیسٹ، مرغی کا گوشت (ایک کے بعد ایک چیز) ڈال کر فرائی کر لیں۔ اب اسی میں کٹے ہوئے ٹماٹر، چھوٹی ہری مرچ، کڑاہی مسالا، کٹی ہوئی مرچ، نمک ڈال کر ڈھکن ڈھک کر دس منٹ تیز آنچ پر پکائیں۔ پانی بالکل نہ ڈالیں۔ دس منٹ بعد جب ٹماٹر نرم پڑ جائیں تو انہیں چمچ سے مسل لیں۔ اب آنچ دھیمی کر کے ٹماٹروں کا پانی خشک ہونے تک گوشت بھونیں۔ (چکن ٹماٹر کے پانی میں ہی گل جاتی ہے۔) اب ثابت ہری مرچ ڈال کر

(تیل اوپر آنے کے بعد) پانچ منٹ دم پر رکھ دیں۔ ڈش میں نکالنے سے پہلے لیموں کا رس شامل کر کے مکس کرلیں۔ ساتھ میں نمک بھی چکھ لیں۔ ڈش میں نکال کر کٹی ہوئی ادرک سے گارنش کر کے گرم گرم تندور کی روٹی یا گھر کی روٹی کے ساتھ پیش کریں۔

میرا دعوا ہے مہمان انگلیاں چاٹتے رہ جائیں گے۔ آپ گھر میں آزما کر دیکھ لیں۔

س: کچن عورت کے سلیقے کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ آپ کچن کی صفائی کے لیے کیا خصوصی اہتمام کرتی ہیں؟

ج: یہ بالکل سچ ہے۔ ہم نے آپ کے ڈائجسٹ سے ہی سیکھا ہے۔ گھر کے ساتھ کچن' واش روم کو بھی صاف رکھنا۔ گھر تو ہر کوئی سجا کر رکھتا ہے۔ میں کچن کی صفائی پر بھی خصوصی توجہ دیتی ہوں۔ (زیادہ ٹائم تو وہیں گزرتا ہے نا)

میری عادت ہے' میں جب بھی کھانا پکاتے وقت برتن جمع نہیں کرتی، ہاتھ کے ہاتھ دھوتی رہتی ہوں۔ کچرا باسکٹ میں ڈالتی رہتی ہوں چاہے مجھے دس مرتبہ کچن سے باہر آنا پڑے۔ میں کچن میں ڈسٹ بن نہیں رکھتی۔ بو ہوتی ہے۔ چاہے کچھ بھی پکاؤں' سوائے چولہے پر چڑھی ہانڈی اور ساتھ رکھے چمچ کے علاوہ کوئی برتن گندا نہیں ملے گا۔ (اس بات پر گھر والے بھی اور یہ بھی مجھے نفسیاتی کہتے ہیں تو کیا واقعی صفائی رکھنا نفسیاتی پن ہے؟)

کچن کی تفصیلی صفائی پندرہ دن بعد ضرور کرتی ہوں۔ پورا کچن خالی کر کے اچھی طرح جھاڑ کر کونے کونے میں کیڑے مار پاؤڈر ضرور ڈالتی ہوں۔ (اس کی وجہ سے کاکروچ وغیرہ بالکل نہیں ہوتے) چولہے وغیرہ روز کے روز صاف کرتی ہوں۔ ہر چیز اچھی طرح دھو خشک کر کے رکھتی ہوں۔ جب کچن بالکل صاف ہو جاتا ہے تو تھکن کے ساتھ بے پناہ خوشی کا بھی احساس ہوتا ہے۔ (اس دن کھانا پکانے کی چھٹی ہا، ہا، ہا)

س: صبح ناشتے میں آپ کیا بناتی ہیں، کوئی خصوصی ڈش؟

ج: شادی سے پہلے تو کبھی صبح کی چائے بھی نہیں بنائی تھی (چاہے بعد میں سارا دن گدھے گھوڑوں کی طرح کام کرتے) مگر ناشتہ کے ٹائم ہم بادشاہ ہوتے تھے۔ جب تک میری بڑی بہن روبی کی شادی نہیں ہوئی تھی' ناشتہ وہی بناتی تھی۔

میں اور میری بھتیجی "کرن" اپنی بہن کو بہت ستاتے تھے۔ ہمارا آرڈر تھا کہ جب ہم منہ دھو کر آئیں تو ہمارا من پسند ناشتہ تیار ہونا چاہیے۔ نہ چائے پہلے سے بنا کر رکھیں اور نہ ایک منٹ لیٹ ہو۔ (جو ذرا سی دیر ہو جاتی تو منہ پھول جاتا) ہمارا بس چلتا تو چائے کے بغیر ہم سانس بھی نہ لیں (نعوذ باللہ) بہن یا امی اپنی مرضی سے کچھ بناتیں یا منگواتیں تو ہمارے نخرے' اف توبہ۔

"ہمارا تو آج یہ دل چاہ رہا تھا، آج تو یہ کھانا تھا۔"

تو اس معاملے میں اپنی بڑی بہن اور امی کو بہت ستایا (اب احساس ہوتا ہے) جب کرن اور میں منہ دھو رہے ہوتے تب امی پوچھتیں۔

"مہارانیوں بتادو۔ کیا کھانا ہے (طنزیہ)۔"

ہمارے ہاں بیکری قریب تھی اور حلوہ پوری بھی آسانی سے مل جاتی تھی۔ تو کبھی بھی ناشتہ میں کھانا ہوتا' امی ہی لا کر دیتی تھیں۔ (باقی سب سو رہے ہوتے تھے) اور ہم دونوں کے سوا سب ہی چائے پراٹھا کھاتے تھے۔ تو ہم کبھی حلوہ پوری، کبھی پائے، بیکری کے سارے ہی آئٹم، ایک ایک کر کے منگواتے تھے۔ (بس کسی طرح امی کے پیسے خرچ کروانے ہوتے تھے) امی بعد میں ہم سے سارا دن کام کرواتی تھیں۔

بہرحال شادی کے بعد تو سارے نخرے رکھے رہ جاتے ہیں۔ میں شروع سے ہی چائے کے ساتھ کچھ بھی لیتی ہوں۔ (صبح میں پراٹھا سالن نہیں کھایا جاتا) یہ تو دو بجے کے بعد ہی اٹھتے تھے تو سردیوں میں چائے کے ساتھ بھی پراٹھا کبھی بن وغیرہ کھاتے تھے اور گرمیوں میں لسی اور ملک شیک بنواتے ہیں۔ کبھی رات میں رنگین سویاں بنوا کر رکھ لیتے ہیں۔

صبح ناشتے میں ٹھنڈی میٹھی سویاں بہت مزیدار

لگتی ہیں۔ اب جب سے حسن اسکول جانے لگا ہے تو اس کے لنچ بکس کے لیے بہت اہتمام کرنا پڑتا ہے۔ کبھی انڈا پراٹھا، کبھی کباب پراٹھا، کبھی بوٹی پراٹھا تو کبھی آلو کا پراٹھا، جمعہ کو ہاف ڈے ہوتا ہے تو سینڈوچ بنا دیتی ہوں۔ (سچ ہے ماں بننا آسان نہیں)۔

س: مہینے میں کتنی بار کھانا کھانے باہر جاتی ہیں؟

ج: مہینے میں...... یوں پوچھیں سال میں؟ حسن کی پیدائش سے پہلے تو اکثر یہ کھانا کھلانے لے جاتے تھے۔ اب تو سال میں دو یا تین مرتبہ ہی جا پاتے ہیں۔ اول تو ان کو چھٹی نہیں ملتی۔ چھٹی ملتی ہے تو پیسے نہیں ہوتے۔ پھر بھی حسن کی سالگرہ یا عید، بقرعید پر ضرور جاتے ہیں۔ ہاں بازار وغیرہ جائیں تو دہی بڑے ضرور کھاتے ہیں۔ اگر تکہ وغیرہ کھانا ہو تو یہ رات کو گھر پر ہی لے آتے ہیں اور کچھ نہیں منگواتی۔ حسن کو چکن بریانی بہت پسند ہے وہ بھی باہر کی تو وہ بہت لاتے ہیں۔

س: کھانے کے انتخاب میں موسم کا خیال رکھتی ہیں؟

ج: جی بالکل! گرمیوں میں مونگ، مسور کی دال کے ساتھ تلی ہوئی مسالہ بھری ہری مرچیں، بیسن کی روٹی اچار اور چٹنی کے ساتھ، کھچڑی یا سادے چاول دہی کے رائتے کے ساتھ جو مزہ دیتے ہیں تو سردیوں میں پائے، شلجم گوشت، بھنی بھنی کلیجی اور بھیجہ فرائی سردیوں کا مزہ دوبالا کر دیتا ہے۔ اسی طرح برسات میں سموسے پکوڑے نہ بنائیں تو برسات کا مزہ نہیں آتا۔ بارش میں آلو کے پراٹھے بھی ضرور بنتے ہیں اور گڑ کی میٹھی روٹیاں بھی۔ میں موسم کی مناسبت سے ہی پکاتی ہوں۔ خود بھی کھاتے ہیں اور اوروں کو بھی کھلاتے ہیں۔

س: کھانے میں محنت کی کتنی قائل ہیں؟

ج: شادی سے پہلے تو امی کے حکم سے پکاتی تھی۔ مگر شادی کے بعد اپنے موڈ کی قائل ہوں۔ اگر آپ کا موڈ اچھا ہوگا تو کھانا اچھا بنے گا۔ اگر آپ کا موڈ خراب ہے تو یہ فرمائش کر دیتے ہیں۔ جب بھی موڈ بنتا ہے۔ بنا دیتی ہوں ورنہ اپنی مرضی سے ہی پکاتی ہوں۔ (جو ان کو پسند ہوتا ہے) حسن بھی فرمائش کرتا رہتا ہے۔ اسے چکن کڑاہی اور شامی کباب بہت پسند ہیں۔ تو اتوار کے دن زیادہ تر یہی بناتی ہوں۔

بہت سے گھروں میں تو شامی کباب مہمانوں کے لیے فریز کر لیے جاتے ہیں۔ میں نے بھی بہت مرتبہ کوشش کی، اتنا سارا سارا قیمہ سل پر پیس کر مہمانوں کے لیے رکھا مگر نہ جی' ہمارے شوہر اور بیٹے بھی چھوڑیں تب نا، جب تک وہ ختم نہ ہو جائیں، دوسری چیز نہیں پک سکتی۔ میں جوسر، بلینڈر کے بجائے سل بٹہ زیادہ استعمال کرتی ہوں۔ جو مزہ سل پر پسی چٹنی کا ہوتا ہے وہ بلینڈر میں نہیں آتا۔

اسی طرح اگر دال کے بڑے (منگوچیاں) بنانی ہوں یا کوفتے، کباب سب کچھ سل پر ہی پیستی ہوں۔ ایسے ہی جو مزہ لسی کا بنانے میں ہے وہ جوسر میں نہیں آتا۔ رئی سے بنی لسی گاڑھی گاڑھی مزے دار لگتی ہے۔ جوسر میں تو بالکل پتلی ہو جاتی ہے۔

س: اگر آپ کوئی ٹپ دینا چاہیں؟

ج: کھانا پکاتے ہوئے سب سے پہلے بسم اللہ شریف پڑھیں۔ اس کی برکت سے کھانا کبھی کم نہیں پڑے گا...... اور اپنے کھانے میں سے ضرور ایک آدمی کا کھانا کسی نہ کسی کو بھجوائیں، چاہے مسجد ہو یا مدرسہ، اپنے کسی رشتہ دار کے، پڑوسی کے یا مانگنے والوں کے، کسی کو بھی ضرور دیں۔ چاہے سالن ہی کیوں نہ دیں یا ایک روٹی ہی دے دیں۔ اللہ آپ کے رزق میں بے تحاشا برکت دے گا۔

آپ کو ایک بات اور بتاتی چلوں' گردے میں تکلیف کی وجہ سے مجھ سے زیادہ دیر بیٹھا نہیں جاتا' اس کے باوجود میں آپ سب کی محبت میں ایک ہی نشست میں بیٹھ کر خط مکمل کرتی ہوں۔ پتا نہیں کیوں مگر ایسا لگنے لگا ہے میرے پاس اب بہت مختصر وقت رہ گیا ہے۔ اب تو سفر آخرت کی تیاری ہے۔ اللہ مجھے اتنی زندگی دے میں جو کرنا چاہتی ہوں وہ کر پاؤں۔ جب اس دنیا سے جاؤں تو لوگ اچھے الفاظ میں یاد کریں۔ پیاری فرزانہ! اللہ تعالیٰ آپ کو صحت مند لمبی زندگی دے اور آپ اپنے پوتوں کی خوشیاں دیکھیں۔ آمین۔

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

چکن کھڑا مسالہ

اجزاء:

چکن (بڑی بوٹیاں)	ایک کلو
لہسن ادرک (پسا ہوا)	دو کھانے کے چمچے
ٹماٹر	دو سے تین عدد
پیاز	دو عدد
نمک	حسب ذائقہ
ہلدی پاؤڈر	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
دھنیا پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
لال مرچ پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
ثابت دھنیا	آدھا چائے کا چمچہ
زیرہ	آدھا چائے کا چمچہ
گرم مسالا پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
ثابت لال مرچیں	دو عدد
ہری مرچیں	چار عدد
ہرا دھنیا	ایک گٹھی
گھی	آدھا کپ

ترکیب:

پتیلی میں گھی گرم کر کے اس میں ثابت دھنیا، زیرہ اور ثابت لال مرچ ڈال کر چند سیکنڈز تک پکائیں۔ اس کے بعد اس میں پیاز ڈال کر گلابی ہونے تک فرائی کریں۔

چکن، نمک اور پسا ہوا ادرک لہسن ڈال کر چھ سے آٹھ منٹ تک فرائی کریں۔ اس کے بعد اس میں ٹماٹر، ہلدی پاؤڈر، دھنیا پاؤڈر، لال مرچ پاؤڈر، گرم مسالا پاؤڈر اور ہری مرچیں ڈال کر دو سے تین منٹ تک فرائی کریں اور ایک کپ پانی ڈال کر ڈھکن ڈھک کر پکائیں۔ گوشت گل جائے اور پانی خشک ہو جائے تو اس میں ہرا دھنیا چوپ کر کے ڈالیں۔

اسپائسی فرائیڈ بیف رائس

اجزاء:

گوشت	ایک کلو
نمک	حسب ذائقہ
لال مرچ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
پیاز	ایک عدد
ٹماٹر	چار عدد
ادرک لہسن	ایک کھانے کا چمچہ
ہلدی پاؤڈر	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
دھنیا پاؤڈر	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
گرم مسالا پاؤڈر	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
تیل	حسب ضرورت
چاول	دو کپ (ابلے ہوئے)

ترکیب:

کسی برتن میں تیل گرم کر کے اس میں پیاز ڈال کر سنہری کریں۔ اس کے بعد اس میں گوشت، نمک اور پسا ہوا لہسن ادرک ڈال کر پانچ سے آٹھ منٹ تک بھونیں۔ لال مرچ پاؤڈر، ٹماٹر، ہلدی پاؤڈر، دھنیا پاؤڈر، گرم مسالا پاؤڈر ڈال کر مزید پانچ سے چھ منٹ تک بھونیں۔

گوشت گلنے کے حساب سے پانی ڈال کر ڈھکن ڈھک کر ہلکی آنچ پر پکائیں۔ گوشت گل جائے اور پانی خشک ہو جائے تو ڈش میں پہلے ابلے ہوئے چاول ڈالیں۔ اس کے اوپر بھنا ہوا گوشت رکھیں اور

سروکریں۔

فرائیڈ چکن بائیٹ

اجزاء:

بون لیس چکن	آدھا کلو
پسا ہوا ادرک لہسن	ایک چائے کا چمچہ
چاٹ مسالا پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
ہلدی پاؤڈر	ایک چٹکی
نمک	حسب ذائقہ
لال مرچیں (کٹی ہوئی)	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
دہی	ایک کھانے کا چمچہ
سویا ساس	دو کھانے کے چمچے
کارن فلور	چار کھانے کے چمچے
یخنی	آدھا کپ
کیچپ	دو کھانے کے چمچے
سرکہ	دو کھانے کے چمچے
چلی گارلک ساس	دو کھانے کے چمچے
لہسن کے جوے	دو عدد
ہری مرچیں (چوپ کرلیں)	دو عدد
تیل	حسب ضرورت

ترکیب:

چکن میں نمک، پسا ہوا لہسن، چاٹ مسالا، دہی، ہلدی پاؤڈر، کٹی لال مرچیں، ایک چمچہ، سویا ساس اور کارن فلور ملا کر ایک گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ اس کے بعد گرم تیل میں فرائی کر کے نکال کر ایک طرف رکھ دیں۔ ساس پین میں تیل گرم کر کے اس میں چوپ کیا ہوا لہسن اور ہری مرچیں اور بقیہ سویا ساس ڈال کر پکائیں۔ آمیزہ گاڑھا ہونے لگے تو اس میں فرائی کی ہوئی چکن ڈالیں۔

مزے دار فرائیڈ چکن بائیٹ تیار ہے۔ ابلے چاولوں کے ساتھ سروکریں۔

بہاری کباب

اجزاء:

پسندے کا گوشت	آدھا کلو
پیاز (کچی پسی ہوئی)	ایک عدد
نمک	حسب ذائقہ
لال مرچ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
گرم مسالا پاؤڈر	ڈیڑھ کھانے کا چمچہ
سرسوں کا تیل	ایک کپ
دہی	آدھا کپ
ادرک پیسٹ	آدھا چائے کا چمچہ
پپیتا	ایک چائے کا چمچہ

ترکیب:

پسندوں کو دھو کر اچھی طرح خشک کرلیں۔ سب سے پہلے اس پر نمک، ادرک، پپیتا اور دہی لگا کر برتن کو ڈھک کر رکھ دیں۔ اس کے بعد پیاز، گرم مسالا پاؤڈر لگا کر رکھیں۔ اس میں سرسوں کا تیل، لال مرچ پاؤڈر لگا کر رکھ دیں۔ سیخوں پر پسندے لگائیں۔ اور کوئلے پر سینک لیں یا گرل کرلیں۔ پیاز اور سلاد کے ساتھ گرم گرم سروکریں۔

رنگ برنگی قلفی

دودھ	ایک کلو
چینی	آدھا کپ
قلاقند	ایک کپ
کارن فلور	ایک کھانے کا چمچہ
بادام (چوپ کرلیں)	آدھا کپ
پستہ ایسنس	دو قطرے

دودھ کو پکا کر گاڑھا کرلیں۔ اس میں چینی، کارن فلور، علیحدہ دودھ میں ملا کر ڈالیں۔ اس کے بعد قلاقند شامل کر کے اچھی طرح ہلائیں اور چولہا بند کردیں۔

ٹھنڈا ہونے پر بادام اور ایسنس ڈال کر قلفی کے مولڈ میں جمادیں۔ قلفی تیار ہے۔

عدنان

نفسیاتی ازدواجی الجھنیں

نادیہ......لاہور

س: میرے شوہر کے انتقال کو ایک سال ہو گیا ہے۔ انہیں کسی نے ٹارگٹ کر کے گولی ماری۔ وہ موقع پر ہی شہید ہو گئے۔ شادی کے بعد صرف ڈھائی سال کا مختصر عرصہ میں نے ان کے ساتھ گزارا۔ جب ان کی شہادت ہوئی تو میری بچی صرف چھ ماہ کی تھی۔ اب وہ ڈیڑھ سال کی ہے۔

میرے شوہر میری محبت تھے۔ وہ میرے چچازاد تھے۔ بچپن میں ہی دادا نے رشتہ طے کر دیا تھا۔ ان کی محبت کی جڑیں میرے دل میں بہت گہری تھیں۔ کچھ انہوں نے مزاج اور طبیعت بھی ایسی پائی تھی کہ سب ہی ان سے محبت کرتے تھے۔ انتہائی نرم خو اور نیک دل تھے۔ شاید ہی دنیا میں کوئی ایسا ہو گا جس کو انہوں نے کوئی تکلیف پہنچائی ہو، پتا نہیں قاتلوں کو ان سے کیا دشمنی تھی۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ دہشت گرد لاشوں کی گنتی میں اضافہ کرنا چاہتے تھے۔ یہ سامنے آئے تو ان کو گولی ماردی۔

اتنی اچانک موت کہ وہ کوئی وصیت بھی نہ کر سکے۔ جس گھر میں، میں رہتی ہوں۔ اس میں میرے جیٹھ جٹھانی اور دونوں بچے بھی رہتے ہیں۔ میں جانتی ہوں کہ یہ گھر دونوں بھائیوں نے مل کر تعمیر کیا تھا۔ اوپر کے پورشن میں، میں رہتی ہوں جبکہ نچلی منزل میں جیٹھ، جٹھانی اور ان کے بچے رہتے ہیں۔

اب جیٹھ اور جیٹھانی کہتے ہیں کہ تم یہ گھر چھوڑ دو۔ یہ ہمارا ہے۔ مجھے یہ بھی علم نہیں کہ گھر کس کے نام ہے۔ میرے والدین کا انتقال ہو چکا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہاں جاؤں، کیا کروں؟ بھائی ہیں لیکن ان کا رویہ بہت سرد ہے۔ میرے پاس کوئی بڑی ڈگری نہیں ہے۔ بی اے کا امتحان دیا تھا کہ شادی ہو گئی۔

ج: نادیہ بہن! انسان ظالم بھی ہے اور جاہل بھی۔ اسے اپنے آنے والے پل کا علم نہیں لیکن وہ سامان سو برس کے کرتا ہے۔ آپ کے جیٹھ یہ بھول رہے ہیں کہ اس گولی کا نشانہ وہ بھی بن سکتے تھے۔ تب ان کی بیوی، بچے کہاں جاتے۔ اللہ تعالیٰ ان کو ہدایت دے۔

آپ کی بچی ابھی بہت چھوٹی ہے...... آپ کے لیے فی الحال کوئی کام کرنا بھی مشکل ہو گا۔ آپ اپنے جیٹھ اور جٹھانی سے بات کریں۔ ان سے کہیں کہ جب آپ اپنا کوئی بندوبست کر لیں گی تب یہ گھر چھوڑ دیں گی۔ فی الحال وہ آپ کو ڈسٹرب نہ کریں۔ اس دوران آپ کوئی ہنر سیکھیں یا پرائیویٹ پڑھائی مکمل کرنے کی کوشش کریں۔

یہ اچھی بات ہے کہ جیٹھ تایازاد ہیں۔ آپ اپنے خاندان کے بزرگوں، رشتہ داروں سے مدد لیں۔ انہیں درمیان میں ڈالیں۔ ان سے کہیں کہ وہ جیٹھ سے بات کریں۔ مقدمہ بازی کا مشورہ اس لیے نہیں دیا جا سکتا کہ یہاں عدالتوں کا حال سب کو معلوم ہے۔ اول تو مقدمہ کے اخراجات ہی بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ پھر جج بھی رشوت لے کر فیصلہ کرتے ہیں۔ مقدمہ بازی میں آپ جیت نہیں پائیں گی۔

س۔ک......کراچی

س: چھوٹی سی عمر میں، والدین نے میرا رشتہ تایازاد سے کر دیا تھا۔ ہمارے گھر میں غربت بہت ہے۔ اس لیے والدین کا ہاتھ بٹانے کے لیے لوگوں کے کپڑے سیتی ہوں۔ میری ایک بہن پولیو زدہ ہے۔ اس کی دیکھ بھال کے علاوہ چھوٹے پانچ بہن بھائیوں کو سنبھالنا بھی میری ذمہ داری ہے۔ نکاح کو پانچ سال ہو گئے ہیں۔ تایا کئی دفعہ رخصتی کی

بات کر چکے ہیں مگر میرے والدین کا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔ ان کا خیال ہے میری شادی ہو جائے گی تو آمدنی کا ذریعہ ختم ہو جائے گا۔ ماں کو گھر سنبھالنا پڑے گا۔ والدین کی ان باتوں نے مجھے ذہنی مریض بنا دیا ہے۔ میں خود بھی اس غربت اور مشقت سے تنگ آ گئی ہوں۔ مگر والدین کو احساس نہیں۔ وہ ہر صورت اس رشتے کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔

ج: آپ کا خط پڑھ کر دلی دکھ ہوا ہے۔ یہ آپ کا ہی نہیں ان بہت سارے گھروں کا مسئلہ ہے جہاں لڑکیاں نوکری یا محنت کر کے کماتی ہیں اور ان کی کمائی سے گھر چلتا ہے۔ آپ نے اپنی پولیو زدہ بہن کے بارے میں نہیں لکھا کہ وہ کس حد تک معذور ہیں۔ اگر وہ صرف ٹانگوں سے معذور ہیں تو بیٹھ کر کپڑے با آسانی سی سکتی ہیں۔ آپ انہیں کپڑے سینا سکھا دیں۔ چھوٹے بہن بھائی بھی یقیناً آپ سے بہت زیادہ چھوٹے نہیں ہوں گے۔ دو چار سالوں میں آپ کی کوئی بہن آپ کی جگہ لے سکتی ہے۔ آپ اپنی والدہ سے کھل کر بات کریں۔ ان سے کہیں کہ وہ تایا کے ساتھ بدسلوکی کر کے اس رشتہ کو ختم کرنے کی کوشش نہ کریں بلکہ ان سے کچھ عرصہ کی مہلت لے لیں۔ آپ کے تایا آپ کے والد کے بھائی ہیں، وہ اپنے بھائی کی مجبوریاں سمجھتے ہوں گے۔ یقیناً مان جائیں گے۔ آپ کا نکاح ہو چکا ہے۔ آپ اپنے شوہر سے بھی اس سلسلے میں بات کر سکتی ہیں۔ انہیں اپنے گھر والوں کی مجبوریاں بتائیں۔

اپنی امی کو بھی سمجھائیں کہ یہ منگنی نہیں نکاح ہے۔ اگر یہ سلسلہ ختم ہوا تو آپ کی پیشانی پر طلاق کا داغ لگ جائے گا۔ اپنے حق کے لیے زبان کھولنا بے حیائی نہیں۔ آپ کو اپنے حق کے لیے آواز اٹھانا ہو گی۔

آسیہ خان...... جام پور

س: میں ایک ایسے گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں جہاں مذہبی اقدار و روایات کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ میری منگنی بچپن سے پھوپھی زاد سے طے تھی۔ مگر پھوپھا کے انتقال کے بعد ان کا سارا کاروبار چوپٹ ہو گیا۔ میری انتہائی امیر پھوپھی ملازموں کی بدعنوانی کے باعث کوڑی کوڑی کی محتاج ہو گئی ہیں۔

مسئلہ یہ ہے کہ اب میری والدہ اپنی غریب نند کے گھر میرا رشتہ نہیں کرنا چاہتیں۔ میں نے بچپن سے پھوپھی زاد کا نام ہی اپنے نام کے ساتھ سنا ہے۔ مگر والدہ کی خواہش ہے کہ میری کسی فارن نیشنلٹی کے حامل شخص سے شادی ہو جائے تاکہ میرے چھوٹے بھائیوں کا باہر جانے کا راستہ کھلے۔

میں تین بھائیوں کی اکلوتی بہن ہوں۔ والد، والدہ کی ضدی طبیعت سے واقف ہیں اور کچھ بھی کرنے سے قاصر ہیں۔ میں والدہ کی نافرمان نہیں ہوں مگر پھوپھی زاد کے علاوہ کسی اور کا تصور بھی میرے لیے سوہان روح ہے۔

ج: آپ نے لکھا ہے کہ آپ کے گھرانے میں مذہبی اقدار و روایات کو اہمیت دی جاتی ہے۔ تو ایسے گھرانے میں تو زبان اور رشتوں کی پاس داری کرنا چاہیے۔

آپ پہلے اپنے ذہن کو یکسو کریں۔ اگر آپ میں اتنی ہمت اور حوصلہ ہے کہ اپنے غریب شوہر کا ساتھ دے سکیں۔ اس کے ساتھ زندگی کی مشکلات کا سامنا کر سکیں تو یہ رشتہ قائم رکھیں ورنہ اس رشتہ کا ختم ہو جانا ہی بہتر ہے۔ آپ کو بتا دوں کہ جو لوگ غربت کے ماحول کے عادی نہیں ہوتے اُن کے لیے غربت میں زندگی گزارنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ آپ مسائل اور مصائب کا مقابلہ نہ کر سکیں۔ ایسی صورت میں آپ اپنے لیے ہی نہیں اس لڑکے کے لیے بھی پریشانی کا باعث بن جائیں گی۔ صرف محبت ہی کافی نہیں، مشکل حالات میں ساتھ دینے کے لیے حوصلہ اور ہمت کی بھی ضرورت ہوتی ہے، اگر آپ خود میں واقعی یہ ہمت پاتی ہیں تو اپنے والدین سے بات کریں۔ انہیں بتا دیں کہ آپ اپنا رشتہ قائم رکھنا چاہتی ہیں۔ اب حالات کافی حد تک بدل گئے ہیں۔ ممکن ہے کہ آپ کی والدہ آپ کی مرضی جان کر اس رشتہ کو ختم نہ کریں۔ ایسی صورت میں یہ اور بھی ممکن ہے کہ آپ کے والد اس رشتہ کو قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن آپ کو ثابت قدم رہنا ہو گا۔

☆☆

امت الصبور

بیوٹی بکس

شازیہ عمران ...... پتوکی

س : میں بہت چھوٹے سے گاؤں میں رہتی ہوں۔ بھائی شہر میں نوکری کرتے ہیں۔ میری شادی ہونے والی ہے۔ گاؤں میں بیوٹی پارلر کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ میں چاہتی ہوں کہ میں شہر سے میک اپ کی کچھ چیزیں منگوالوں تاکہ شادی والے دن تیار ہوکر اچھی لگ سکوں۔ میرا رنگ گندمی مائل سانولا ہے۔ یہ بھی بتائیں مجھ پر کس رنگ کی لپ اسٹک اچھی لگے گی؟

ج : شازیہ! آپ اپنے بھائی سے درج ذیل اشیاء منگوائیں۔

کلینزنگ ملک ، موسچرائزر، اسٹرنجنٹ ، فاؤنڈیشن (لیکوئڈ) فیس پاؤڈر، بلش آن، آئی شیڈو، کاجل اور لپ اسٹک کے ریڈ کلر میں تین مختلف شیڈ۔

1- شادی سے ایک دن پہلے آپ چہرے پر کلینزنگ ملک لگائیں پھر روئی سے چہرے کو صاف کر لیں۔

2- اب چہرے کو بھاپ دیں۔ دس منٹ بعد چہرا اچھی طرح صاف کرلیں۔ اگر چہرے پر کیل ہیں تو وہ بھاپ سے نرم ہو جائیں گی۔ انہیں دبا کر نکال دیں۔

3- اب اسٹرنجنٹ لگائیں۔ اس سے جلد کے کھلے مسام بند ہو جائیں گے اگر جلد پر داغ یا دھبے ہیں تو ختم ہو جائیں گے۔ اسے روئی کی مدد سے لگائیں۔

4- شادی والے دن آپ کسی اچھے صابن سے منہ دھونے کے بعد چہرے پر کلینزنگ ملک لگائیں۔ پھر ٹشو سے چہرہ صاف کرلیں۔

5- چہرے پر موسچرائزر لگائیں۔ اسے بھی ٹشو سے صاف کرلیں۔

6- اب فاؤنڈیشن لگائیں۔ اسے نقطوں کی شکل میں لگائیں پھر ہلکے سے نم اسفنج کی مدد سے پورے چہرے پر پھیلائیں اور اچھی طرح ہموار کرلیں۔ فاؤنڈیشن اپنی جلد کی رنگت کے مطابق لیں بہت زیادہ سفیدی مائل ہونے کی صورت میں وہ آپ کی جلد سے مطابقت نہیں رکھ سکے گا۔

7- اب چہرے پر فیس پاؤڈر لگائیں۔ فیس پاؤڈر کا رنگ بھی فاؤنڈیشن سے میچ کرتا ہوا لیں۔ اور بہت ہلکا لگائیں۔

8- اب چہرے کی ہڈیوں کے ابھار سے کنپٹی کی طرف بلش آن لگائیں۔ اس سے آپ کے چہرے پر چمک پیدا ہوگی۔

9- آئی شیڈو...... شادی والے دن آپ لباس کی مطابقت سے آئی شیڈو لگائیں۔ ہلکا سنہری یا میرون رنگ کا آئی شیڈو استعمال کرسکتی ہیں۔

10- آنکھوں پر آئی لائنر بھی لگا سکتی ہیں لیکن بہتر یہی ہے کہ کاجل لگائیں۔

11- اب آخر میں لپ اسٹک لگائیں۔ عروسی جوڑا عموماً سرخ رنگ کا ہوتا ہے اس لیے سرخ لپ اسٹک لگائیں پہلے میرون رنگ سے آؤٹ لائن لگائیں پھر برش کی مدد سے سرخ رنگ کی لپ اسٹک لگائیں۔

ایک بات ذہن میں رکھیں۔ دلہن کو میک اپ سے زیادہ جو چیز دلکش بناتی ہے، وہ اس کے چہرے پر ہلکی سی شرمیلی مسکان ہے۔ اس سے چہرہ پر چمک آتی ہے اور چہرہ تروتازہ نظر آتا ہے۔